

سالانہ نمبر 2

گھر گھر ہر فرد کے لئے

کراچی

پاکیزہ

مئی 2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK

میرزا احمد زبیر طاہر

انجم انصار، نعت معراج،

نگہت سہ، رُخ چوہدری، میمونہ خورشید

مکتبہ خیرات، خیرات پبلشرز، لاہور



مدیر اعلیٰ
عذر رسول
مدیر
احمد احمد
معاون
آمنہ

افسانے

- 53 رفعت سراج
99 صائمہ حیدر
139 نگہت یاسمین
175 رخ چوہدری
185 سعدیہ رئیس
199 قانتہ رابعہ
229 ربیعہ علی سید

- خواب غریب کی ریت
ہم دنیا
جیت تیرا
پکھیاں خوابوں کی
اسیران قفس
صلح زر
زندگی پھر گنگنائے

مدیرہ 15

عذر رسول 266

عمیرہ احمد 18

ناہید سلطان اختر 68

رضوانہ پرنس 281

مستقل عنوانات

- 16 ادارہ
268 مدیرہ
291 عظمیٰ آفاق سعید
294 انجم انصار

- فنائین حقیقت ہے
دین کی باتیں
بہنوں کی محفل
پاکیزہ داری
جلت رنگ

میمونہ خورشید 104

عذرا بیگ 236

انجم انصار 143

نگہت سیما 205

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے

خصوصی گوشہ

ہارٹی سنے انتخاب

مسئلے وازناول

عکس
زندگی

مکمل ناول

لے دل ناں

پھر کوئی خواب ہو

ناولٹ

کالج کی لڑکی

دوڑھ کا جلا

پاکیزہ بہنیں 306

ادارہ 308

310

آمنہ حماد 299

پاکیزہ بہنیں 302

صغریٰ زیدی 304

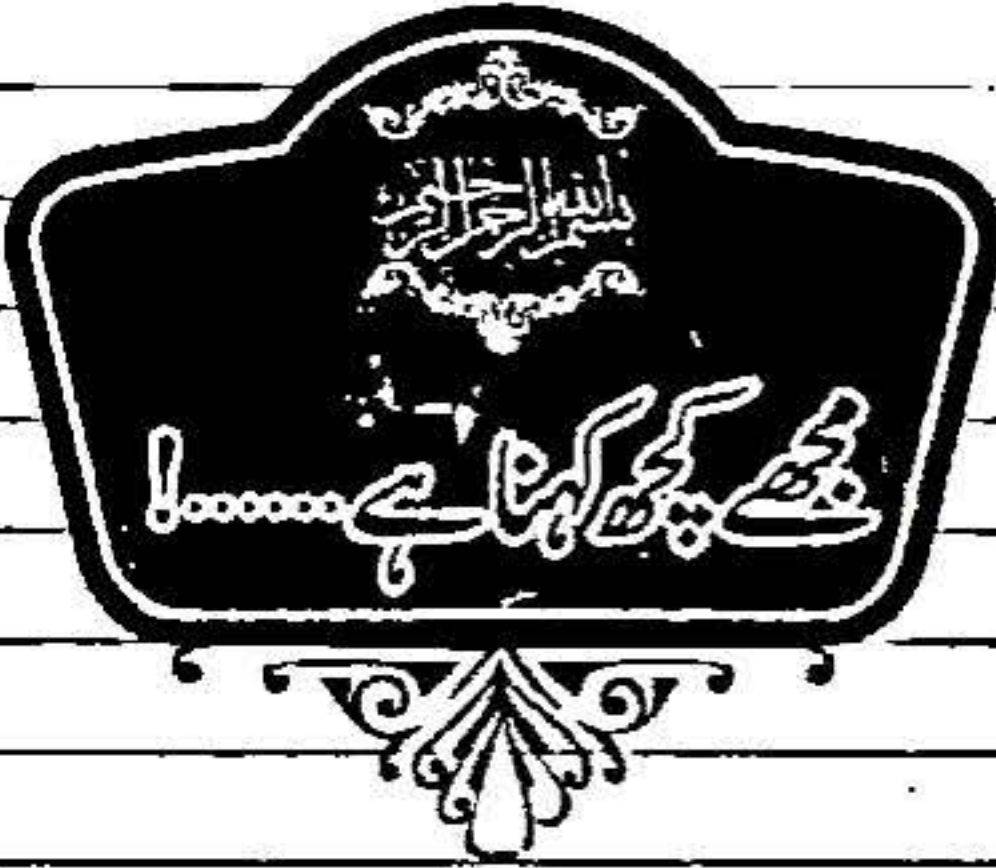
میرا انتخاب

جس لیے

میرا شہ گنگنائی ہو

شعبہ غیر اشتہارات نمبر 0333-2256789 نمبر 0333-2168391 محمد رمضان خان
اشتہارات نمبر 0332-4214400 نمبر 0323-2895528 رائے احمد
جلد 40 • شماره 02 • مئی 2012 • ذریعہ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
پتہ: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 035895313 (021) فیکس: 035802551 (021) E-mail: jdpgroup@hotmail.com

پبلشر روبرائٹر: عذر رسول، مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن، دیفنس کمیشن ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی



زندگی میں ہمیشہ دو ہی موسم رہتے ہیں۔ پہلا خوشی کا، دوسرا غم کا۔ زیادہ تر لوگ ان ہی دو موسموں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ غم کا موسم ان کی زندگی پر جیسے طاری رہتا ہے۔ ایسے لوگ شب و روز زمانے سے شکوہ و شکایت میں مشغول رہتے ہیں اور معمولی باتوں کو بھی پہاڑ بنا کر اپنے اعصاب پر سوار کر لیتے ہیں۔ دوسری جانب ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو موسم غم سے تو گزر رہے ہوتے ہیں مگر حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ ہنستے مسکراتے رہتے ہیں بڑی سے بڑی مشکل ان کے لیے ایک معمولی بیماری سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ حقیقت ہے کہ بعض اوقات ہم اپنے آپ کو پریشانیوں کے ہجوم میں اس قدر گھرا ہوا محسوس کرتے ہیں کہ زندگی تک سے مایوس ہو جاتے ہیں..... مگر بحیثیت مسلمان ناامیدی کفر ہے..... اس لیے کبھی بھی دگرگوں حالات کے سامنے ہمت نہ ہاریں۔ آپ ہمیشہ اپنا ہر کام بسم اللہ پڑھ کر کیجیے..... اور یہ تصور کیجیے کہ آپ کی کارکردگی میں روز بروز نکھار آتا جا رہا ہے اور صلاحیتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ جب آپ اپنے اندر کی بے یقینی کو ختم کر دیں گے تو مشکلات کا سامنا کرنا آسان ہوگا۔ یاد رکھیں..... خیال کا گھوڑا اسی وقت تیز تر دوڑ سکتا ہے جب وہ محنت کا عادی ہو اور کسی بھی فرد کا اعتماد..... اس کا سب سے بڑا ساتھی ہوتا ہے اور ہم سب کو اپنے اوپر یہ اعتماد کرنا ہوگا کہ ہم محنت سے اپنے حالات بدل سکتے ہیں۔

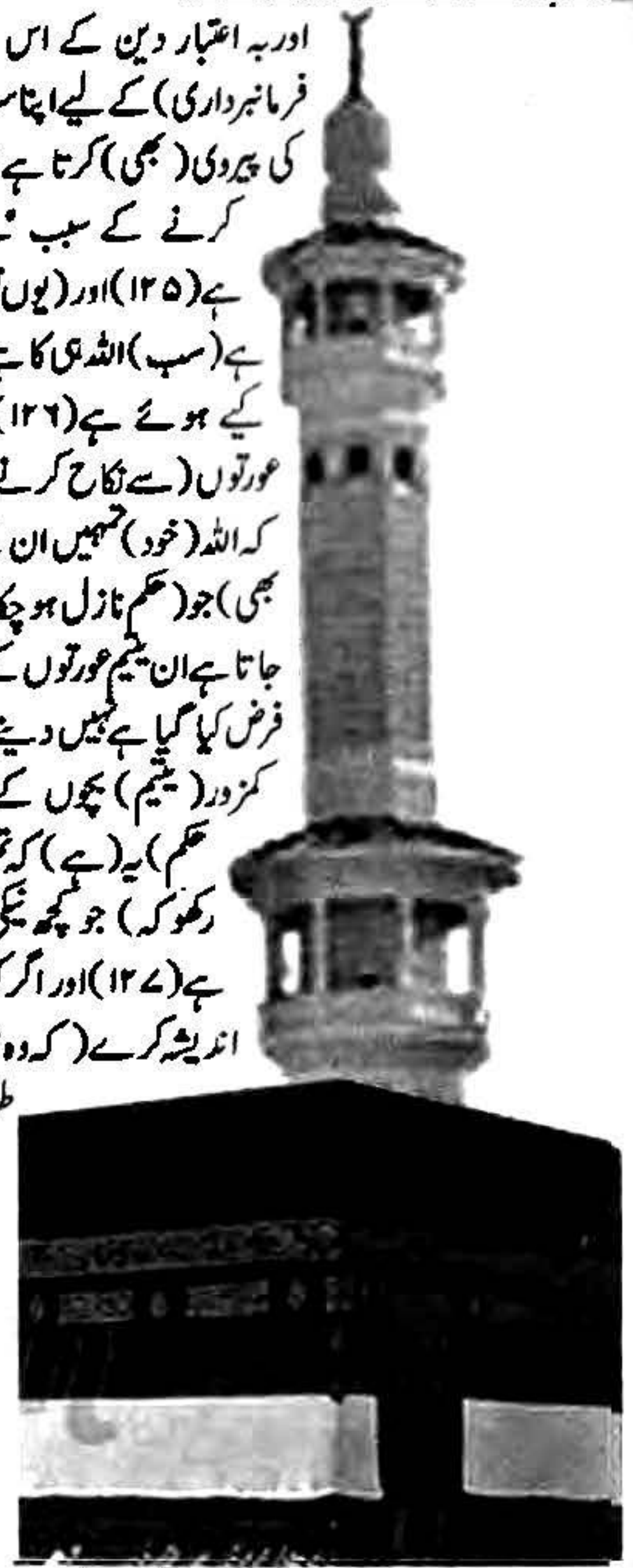
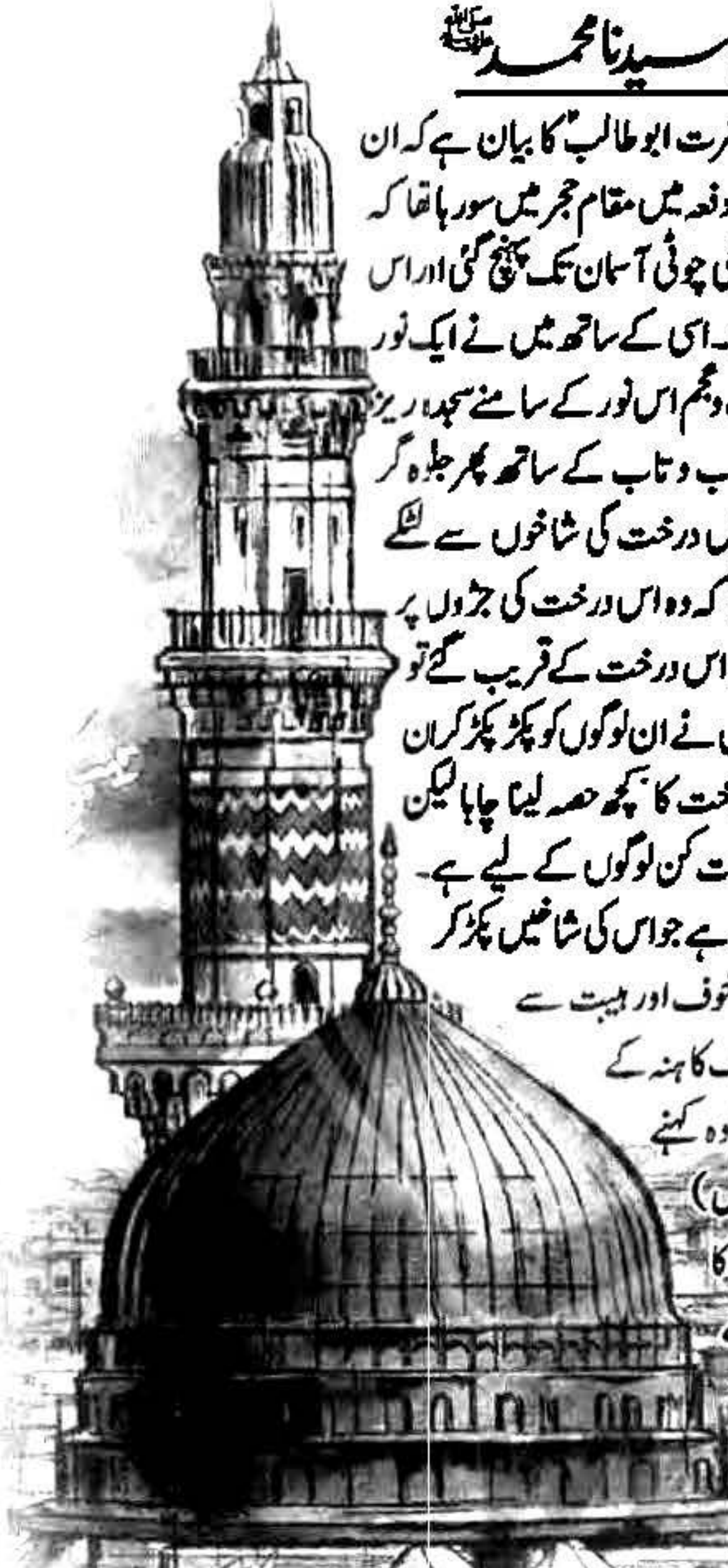
اور بہ اعتبار دین کے اس سے اچھا کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ (کی فرمانبرداری) کے لیے اپنا سر جھکا دیا وہ نیکو کار (بھی) ہے اور وہ طریقہ ابراہیم کی پیروی (بھی) کرتا ہے جو (شرک سے بالکل) یکسو تھا اور (اسی شرک نہ کرنے کے سبب سے) اللہ نے ابراہیم کو (اپنا) دوست بنالیا ہے (۱۲۵) اور (یوں تو) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (سب) اللہ ہی کا ہے اور اللہ ہر چیز کو (اپنے دائرہ قدرت میں) احاطہ کیے ہوئے ہے (۱۲۶) اور (اے نبی ﷺ) یہ لوگ تم سے (یتیم) عورتوں (سے نکاح کرنے) کے بارے میں فتویٰ طلب کرتے ہیں تم کہہ دو کہ اللہ (خود) تمہیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور (اس سے پہلے بھی) جو (حکم نازل ہو چکا ہے اور وہ) تمہیں کتاب (اللہ) میں پڑھ کر سنایا جاتا ہے ان یتیم عورتوں کے حق میں جنہیں تم ان کا وہ (حق یعنی مہر) جو تم پر فرض کیا گیا ہے نہیں دیتے اور چاہتے ہو کہ (یہ جبر) ان سے نکاح کرو اور کمزور (یتیم) بچوں کے بارے میں (بھی تمہیں حکم دیتا ہے) اور (وہ حکم) یہ (ہے) کہ تم یتیموں کے لیے انصاف پر قائم رہو اور (یقین رکھو کہ) جو کچھ تمہیں تم کرو گے تو بے شک اللہ اس کا جاننے والا ہے (۱۲۷) اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی ناخوشی یا بے رغبتی کا اندیشہ کرے (کہ وہ اسے طلاق دے دے گا) تو اس میں کہ باہم کسی طرح صلح کر لیں دونوں (میں کسی) پر گناہ نہیں اور صلح (کر لینا طلاق دینے سے) بہتر ہے اور (لوگوں کی) طبیعتیں (تو) حرص سے نزدیک کر (دی) گئی ہیں اور اگر تم (عورتوں سے) اچھا برتاؤ کرو اور (ان کی حق تلفی سے) بچتے رہو تو بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے (۱۲۸)

(سورہ نسا آیت نمبر ۱۲۵ تا ۱۲۸)

آنحضرت ﷺ کے اساتذہ گرامی سیدنا محمد

روایت ہے کہ حضور ﷺ کے چچا حضرت ابو طالب کا بیان ہے کہ ان کے والد عبدالمطلب نے انہیں بتایا کہ ایک دفعہ میں مقام حجر میں سو رہا تھا کہ خواب میں دیکھا کہ ایک درخت اگا اور اس کی چوٹی آسمان تک پہنچ گئی اور اس کی شاخیں مشرق سے مغرب تک پھیل گئیں۔ اسی کے ساتھ میں نے ایک نور دیکھا جو سورج سے ستر گنا بڑا تھا۔ تمام عرب و عجم اس نور کے سامنے سجدہ کر رہے تھے۔ کبھی یہ نور چھپ جاتا اور کبھی پوری آب و تاب کے ساتھ پھر جلوہ گر ہو جاتا۔ میں نے قریش کے کچھ لوگوں کو اس درخت کی شاخوں سے لٹکے ہوئے دیکھا اور قریش کے ایک گروہ کو دیکھا کہ وہ اس درخت کی جڑوں پر کھانا چلانے کا قصد کر رہے ہیں۔ جب وہ اس درخت کے قریب گئے تو ایک خوب صورت و جہیز لڑکا انہیں ہوا اس نے ان لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ان کی کمرس توڑ ڈالیں۔ میں نے بھی اس درخت کا کچھ حصہ لینا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ میں نے پوچھا کہ یہ درخت کن لوگوں کے لیے ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ درخت ان لوگوں کے لیے ہے جو اس کی شاخیں پکڑ کر لٹکے ہوئے ہیں اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ خوف اور ہیبت سے میرا جسم لرز رہا تھا۔ میں اسی وقت قریش کی ایک کاہنہ کے پاس گیا اور اس کے سامنے اپنا خواب بیان کیا وہ کہنے لگی اگر یہ خواب سچا ہے تو تیری مصلحت (مسل) سے کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو مشرق اور مغرب کا مالک ہوگا اور مخلوق خدا اس کی اطاعت کرتے گی۔ ایک روایت ہے کہ اس خواب کی بنا پر جناب عبدالمطلب نے اپنے آپ کو اپنے گھر سے نکال دیا اور گرامی محمد ﷺ کے پاس پہنچے۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس





عکس **قسط 10**
عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے
 کرداروں کے تھے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار
 زندگی میں چونکادینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور
 پراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی
 ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ
 صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکادینے والے موڑ
 دیکھیں گے بلکہ ان کی مہارانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے
 کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا
 عکس اودا پنا سایہ پر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی
 کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری
 یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی
 ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول
 شاعر...

اس کائنات محبت میں ہم مثل شمس و قمر کے ہیں
 اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے



شیردل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیردل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ترمین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لومیرج کا نتیجہ ہے..... یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے..... جہاں صرف وہ اور شیردل ہوتے ہیں..... دونوں کی دہائی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر..... نے اپنے بچے کو بڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں کلک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک بی بی بھی حلیمہ جیسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کر دیتا ہے جس سے اس کی ایک بی بی تولد ہوتی ہے، ایک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بیوی آنزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے باموں کے گھر آتے ہیں ایک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایک سے شش کھیلنا سیکھتی ہے اور ایک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ چڑیا کی باری ڈول سے دوستی ہو جاتی ہے، چڑیا اسکول میں باری ڈول کا خیال کر لی ہے اور اسے چڑیا سے ملتی ہے، اس سے پہلا تعارف شیردل کا بلک سروس کمیشن کے امتحان کے رزلٹ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی پوزیشن شیردل کی متوجہ تھی لیکن وہ پہلی پوزیشن حاصل نہ کر سکا پہلی پوزیشن عکس مراد علی نے لی تھی۔ چڑیا ایک کے رویے سے بہت ہرٹ ہوئی ہے اور ایک کو نظر انداز کر کے تو ایک سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شہر بانو جب دس سال کی تھی تو اس کے باپ شہباز کا انتقال ہو گیا تھا اور شرمین دوسری شادی فاروق سے کرتی ہے اس کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے۔ فاروق اور شرمین کی ایک بی بی ہوئی تھی جو مر جاتی ہے۔ شرمین کو شہر بانو جب شیردل کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایک چڑیا سے سوری کرتا ہے اور اسے رات کو ملاتا ہے تاکہ اسے میٹنگک جیسے دکھائے لیکن ایک خود سوچتا ہے اس کی آنکھ کسی کے رونے اور چیخنے سے ملکتی ہے یہ چڑیا کی آواز تھی وہ ہاں نکل کر جو منظر دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔ چند ساتھیوں نے اسے شہد کی دلدل کا ٹانگل دے دیا تھا۔ اتنے عرصے بعد شیردل عکس کو میٹنگ میں دیکھتا ہے تو اس کو عکس میں کوئی فرق نہیں لگتا وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خیر دین پر چوری کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو اس بات پر یقین نہیں آتا باری ڈول، چڑیا کے اسکول نہ آنے سے پریشان ہوتی ہے۔ عکس، شیردل کے گھر ڈر پر آتی ہے تو اس کی ملاقات شہر بانو سے ہوتی ہے۔ خیر دین کی تھانے سے رہائی کے بعد خیر دین، چڑیا اور حلیمہ کو لے کر گاؤں چلا جاتا ہے۔ گاؤں میں جب سب کو خیر دین کی نوکری ختم ہونے کا پتا چلتا ہے تو ان کے رویے بدل جاتے ہیں۔ چڑیا کے اسکول کا نتیجہ جب خیر دین دیکھتا ہے تو سوچ میں پڑ جاتا ہے، باری ڈول اپنی می کو بتاتی ہے کہ پاپا نے اسکول آکر سسٹریٹس سے چڑیا کو اسکول سے نکالنے کا کہا ہے۔ فاطمہ ایک کوڈ بیٹ کے لیے آج پر جاتا دیکھ کر زبردست ہو جاتی ہے۔ فاطمہ کو دیکھ کر ایک یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اسے پہلے کہاں دیکھ چکا ہے فاطمہ کے زبردست ہونے سے نوین نے پہلی پوزیشن لی لیکن ثانی ایک اور اکبر نے لی۔ ڈی سی کی بیوی اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کیوں چاہتا ہے کہ چڑیا اسکول چھوڑ دے، ڈی سی اپنا ٹرانسفر کر لیتا ہے اور باری ڈول کے اسکول اپنی بیوی کے ساتھ سرٹیفکیٹ لینے جاتا ہے۔ باری ڈول اسکول سے جانے سے پہلے ایک بار چڑیا سے ملتا اور اس کو اپنے جانے کے بارے میں بتاتا جانتی ہے لیکن مل نہیں پاتی، خیر دین گاؤں سے جانے کا اور زمین نیچے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے بھائی زمین اپنے نام کر لیتے ہیں۔ خیر دین شہر واپس آتا ہے تو چڑیا کو واپس اسکول میں داخل کراتا ہے خیر دین نے ڈاکٹر فرح کے شوہر کو فون کیا تو پتا چلا کہ فرح کی ڈی تھ ہو گئی ہے لیکن عابد چڑیا کی میس دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ شیردل پر فیشنل کورس کے لیے سنگاپور جا رہا تھا تو شہر بانو نے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ شیردل ٹرانسفر ہو کر عکس کی جگہ آیا تھا۔ وہ پہلا سرکاری گھر تھا جو شہر بانو کو خوش کر گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے کہنے پر میو سسٹی کے اہلکار خیر دین کی ریڑی کا سامان پھینک دیتے ہیں اور اسے اس علاقے میں ریڑی لگانے سے منع کر دیتے ہیں۔ باری ڈول اسکول کے آخری دن چڑیا سے ملنے اپنی می کے ساتھ جاتی ہے۔ شیردل اور عکس لاہور میٹنگ انیڈ کرنے جاتے ہیں، مثال اور شہر بانو بھی شیردل کے ساتھ ہیں وہ دونوں اگلی رات کی فلائٹ سے امریکا جانے والی ہیں۔ خیر دین حلیمہ کی دوبارہ شادی کر دیتا ہے اور وہ کویت چلی جاتی ہے۔ خیر دین سسٹریٹس کو سچائی بتا کر چڑیا کا ایڈمیشن دوبارہ کر دیتا ہے۔ جواد کو پولیس نے شہر کی حالت میں پکڑی ہے اور وہ عکس سے اپنا رشتہ ظاہر کرتا ہے۔ نیوز چینل پر یہ خبر بار بار آتی ہے۔ شیردل اپنے تعلقات استعمال کر کے اس خبر کو روک دیتا ہے۔ ایک، فاطمہ سے ملتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ شاید پہلے بھی اس سے ملا ہے لیکن کہاں اور کب یہ یاد نہیں۔ فاطمہ، ایک سے باقاعدہ طور پر رشتہ بھیجنے کے لیے کہتی ہے۔ ایک بتاتا ہے کہ اس کی مکنی اس کی کزن سے ہوئی ہے، وہ اسے ختم کرنے کی کوشش میں ہے۔ خیر دین نے گاؤں جا کر اپنے خاندان پر جلسہ سازی کے ذریعے زمین ہتھیانے کی ایف آئی آر درج کرائی۔ خیر دین کے خاندان نے ایف آئی آر کے جواب میں ایک مقامی ایم پی اے کی مدد لی جس کے حلقے میں وہ ووٹر تھے۔ خیر دین کو حالات سے نکلوانے کے بعد چڑیا اور وہ گاؤں میں نہیں رہے۔

(اب آگے پڑھیں)

آئینے میں ابھرنے والے عکس نے چڑیا کو روک لیا تھا۔ کسی پرانے، مہربان واقف حال، نمکسار دوست کی طرح اس کے دل اور قدموں دونوں پر بیک وقت کند ڈالی تھی..... ایسا دوست جس نے اس گھر میں اس کی زندگی کے بہترین دن اور بدترین رات دیکھی تھی۔

چڑیا بہت دیر تک غم آنکھوں کے ساتھ اس آئینے میں عکس کو دیکھتی رہی۔ آخری بار اس نے یہاں کھڑے ہو کر اس آئینے میں ایک پنک فرائک والی ایک ریشمی سیاہ بالوں والی سانولی چمکدار آنکھوں والی ایک پری کو دیکھا تھا وہ اس حادثے سے ایک شام پہلے کی بات تھی۔ اس دن اس نے اپنا دودھ کا تیسرا دانت گنوا یا تھا اور اس آئینے میں وہ اور ایک ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے تھے۔ وہ جانتی تھی ایک اس کے دانت کا خداد کچھ دیکھ کر ہنس رہا تھا لیکن وہ ایک کو اس طرح ہنستا دیکھ کر اپنے دانتوں کی مضحکہ خیز حالت بھول گئی تھی۔

اس آئینے میں وہ بونوں کو ڈھونڈا کرتی تھی۔ آج اس نے اس آئینے میں اپنے بچپن کو کھوجنے کی کوشش کی تھی۔ آئینہ اب اسے ایک سفید کوٹ کا لڑا لے لائن لائنگ شرٹ، سیاہ چوڑی دار پاجامہ اور سیاہ جیکٹ میں ملیوس بے حد اسارٹ اور ویل ڈریسڈ لڑکی دکھا رہا تھا جس کے کانوں کے ڈائمنڈ اسٹنڈ اور سفید شرٹ کے کھلے کالر سے بہت نمایاں طور پر ابھری ہوئی کالر بون کے درمیان سنہری زنجیر میں چمکتا ایک ڈائمنڈ پینڈنٹ کسی بھی پرائس ٹیگ کے بغیر بھی اس کے متمول ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ اس عکس میں اس سے پنک فرائک اور کسی ریڑھی سے دو روپے میں ملنے والے ایک اتنے ہی سستے تیلیوں والے پنک ہیئر بینڈ والی اس آٹھ سالہ بچی کو ڈھونڈنا مشکل تھا۔ صرف وہ تھی جو اس ”عکس“ میں ”چڑیا“ کو کھوج رہی تھی اور کھوج پار ہی تھی۔ صرف وہ تھی جو اس آئینے میں وہ دیکھ رہی تھی جو دوسرا کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس آئینے میں اس نے وہ بونا دیکھا تھا جسے دیکھنے کی تمنا میں وہ گھنٹوں اس میں جھانکتی رہتی تھی اور پہلی بار وہ بونا نظر آ جانے پر وہ خوف سے فریز ہو گئی تھی۔ وہ اس کی بد صورتی سے ڈر گئی تھی۔ زندگی نے اسے سکھایا تھا کہ ظاہری بد صورتی خوف کھانے والی شے نہیں ہوتی۔ یہ انسان کے اندر کی بد صورتی ہوتی ہے جس سے ڈرنا چاہیے۔ اس آئینے میں اسی دن اس نے انسان نام کا ایک بے حد خوب صورت بونا بھی دیکھا تھا جس سے خوف اور گھن نام کی کوئی شے اسے محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس بونے نے اس کی زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ زندگی میں بعض ولن ہیرو کی شکل میں اور بعض ہیرو ولن کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں لیکن ہم ان کی شناخت بہت دیر سے کر پاتے ہیں۔

چڑیا نے اس آئینے میں نظر آنے والے اس بد صورت بونے کو اس گھر میں دوبارہ دیکھا تھا۔ ایک بار اس آئینے میں جب وہ اسے دیکھ کر خوف کے عالم میں مل بھی نہیں سکی تھی اور دوسری بار اس بونے نے کسی اور کو فریز کر کے.....

چڑیا نے یک دم آئینے سے نظر ہٹائی تھی۔ وہ سات بونے یک دم اتنے سالوں کے بعد اسے اپنے اس اپنے گھر میں دیکھ کر خوشی سے جیسے پاگل ہو گئے تھے کتنا اس ہیل والے بند جوتے پر چھلانگ مار کر ہنسا تھا اور اس کی پنڈلی سے لپٹ گیا تھا۔ وہ اپنی خوشی کا اظہار ہمیشہ ایسے ہی کرتا تھا۔ منٹا اچھل کر اس

کی جیکٹ کی آستین سے لٹک گیا تھا۔ اسے ہمیشہ اس طرح جھولنے میں مزہ آتا تھا۔ سب سے موٹا بونا ٹوکوا اپنے تھر تھراتے ہوئے پیٹ کے ساتھ اور پھولے سانس کے ساتھ اس کے ارد گردنا چتا پھر رہا تھا۔ آنکھیں گھمانے والا کٹو خوشی سے بے حال اپنی ہی جگہ دروازے کی دہلیز پر پھر کی طرح ایک ہی جگہ گھومتا جا رہا تھا۔ ٹٹو نے اس کے دوسرے جوتے پر چڑھنے کی کوشش میں چھینک چھینک کر خود کو بے حال کر لیا تھا۔ ٹو فو بھاگتے ہوئے اپنی عینک کہیں گرا بیٹھا تھا اور اپنے بازو پھیلائے چڑیا کو ڈھونڈنے کی کوشش میں ادھر ادھر چیزوں سے ٹکراتا پھر رہا تھا..... اور چڑیا کا فیورٹ ڈیڈ وڈہ بس اس کے پیروں میں کھڑا بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا ہی جا رہا تھا..... سب کچھ وہیں تھا جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی یا اسے جانا پڑا تھا..... ایس اپنے ونڈر لینڈ میں لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک کی بات پر اس کے قریب سے گزرتے گزرتے جیسے واپس لوٹ آئی تھی۔ اس کی اطلاع نے فاطمہ کو جیسے اسی طرح حیران کیا تھا۔
”آئی مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟“ اس نے کالج کے کاریڈور کی دیوار سے ٹکے ایک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خلاف توقع بہت سنجیدہ تھا۔

”یہ تو تمہیں می ہی بتا سکتی ہیں، مجھے تو انہوں نے صرف تمہیں یہ میج دینے کے لیے کہا تھا۔“ فاطمہ کچھ دیر اچھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے اور ایک کے درمیان اتنی سی بات بھی کئی دنوں کے بعد ہو رہی تھی۔ وہ کالج میں ایک کو مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے تھی اور اس کی اس کوشش نے ایک کو جیسے بری طرح زچ کر دیا تھا اور اب یک دم وہ اس کے سامنے یہ مطالبہ لے کر آ گیا تھا کہ مسز سلطان اس سے ملنا چاہتی تھیں۔

الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ اگلے دن مسز سلطان کے آفس میں آئی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس سے انتہائی گرم جوشی اور شفقت کے ساتھ ملی تھیں۔

”کتنے دن ہو گئے تم سے ملاقات ہوئے..... میں نے کئی بار ایک سے تمہارے بارے میں پوچھا لیکن اس نے کہا تم اس سے کچھ خفا ہو۔“ وہ اپنے آفس میں اپنی ٹیبل سے..... فائلز سمیٹتے ہوئے بولیں۔ چند لمحوں کے لیے فاطمہ کو عجیب سی شرمندگی ہوئی۔ اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ ایک اپنی ماں سے اس کی خفگی کو اتنے کھلے طریقے سے شیئر کرے گا۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ گڑ بڑا کر صفائی دینے والے انداز میں بولی۔
”تو پھر تم دونوں نے کبائسٹ اسٹڈی کیوں بند کر دی..... آپس میں ملنا جلنا کیوں چھوڑ دیا؟ ایک تمہارے اس رویے کی وجہ سے بے حد آپ سیٹ ہے اور اسی وجہ سے میں نے سوچا کہ میں تم سے خود بات کروں۔“ فاطمہ کو بڑی مشکل ہوئی مسز سلطان کے سوالوں کا جواب ڈھونڈنے میں۔ وہ بھی مسز سلطان سے اپنے اور ایک کے تعلق کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔ خاص طور پر اب جبکہ ایک کی زندگی میں اس کی فیملی کی منتخب کردہ ایک اور لڑکی آچکی تھی لیکن اس کی مشکل کو مسز سلطان نے خود ہی حل کر دیا تھا۔

”ایک تمہیں بہت پسند کرتا ہے اور یہ پسندیدگی ایک کلاس فیلو اور دوست کی حیثیت سے نہیں ہے۔“ فاطمہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ جو آخری شے وہ مسز سلطان سے توقع کر سکتی تھی وہ بات تھی جو انہوں نے ابھی کی تھی۔

”ایک نے مجھ سے اس پسندیدگی کو کبھی نہیں چھپایا لیکن کچھ فیملی پرابلز ایسی ہو گئیں کہ ایک کی بات طے کرنی پڑی مجھے..... لیکن بیٹا ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ خوش اسلوبی کے ساتھ یہ معاملہ ختم ہو جائے۔ ایک اور میری بیٹی میں کسی قسم کی کوئی compatability نہیں ہے اگر فیملی کا معاملہ نہیں ہوتا تو یہ رشتہ بہت پہلے ختم کر دیتی میں کیونکہ مجھے اپنے بچوں کی خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہے لیکن بس فیملی کی کچھ مجبوریوں ہیں جن کی وجہ سے یہ رشتہ لٹک ہی گیا ہے۔“ فاطمہ بے یقینی کے عالم میں مسز سلطان کی باتیں سن رہی تھی۔ آسمان اس کے سر پر گر جاتا تو اسے اس قدر شاک نہیں پہنچتا جتنا ابھی پہنچ رہا تھا۔ مسز سلطان اس کے اور ایک کے بارے میں پہلے ہی سارے اندازے اور قیاس لگائے بیٹھی تھیں جو سونی صد ٹھیک تھے اور اب وہ اسے اس بچھتاوے سے آگاہ کر رہی تھیں جو اس رشتے کی صورت میں انہیں ہوا تھا۔

”بیٹا میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اور ایک اپنی دوستی پہلے کی طرح رکھو، اکٹھے پڑھو..... ساتھ گھومو پھرو جیسے پہلے تھے۔ میں تمہیں یقین دلا رہی ہوں کہ ہاؤس جاب ختم ہونے تک یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ میں ایک کی شادی وہیں کروں گی جہاں وہ چاہتا ہے اور میں جانتی ہوں کہ وہ کہاں شادی کرنا چاہتا ہے۔“ انہوں نے آخری جملہ بے حد معنی خیز انداز میں کہا۔ ایک عجیب الجھے کے عالم میں فاطمہ اس دن ان کے آفس سے اٹھ کر آئی تھی۔ مسز سلطان نے اسے صرف یہی نہیں کہا تھا۔ انہوں نے اس سے اور بھی بہت سی باتیں کی تھیں۔ بہت ساری یقین دہانیاں، خوش گمانیاں، بہت ساری تسلیاں اور آخر میں بار بار ایک ہی ریکوریٹ کہ وہ ایک کے ساتھ کبائسٹ اسٹڈیز جاری رکھے۔ وہ اس کی عدم توجہی کی وجہ سے اپنی اسٹڈیز پر فوکس نہیں کر پار رہا تھا اور مسز سلطان کے لیے یہ بہت تکلیف دہ اور ناقابل برداشت بات تھی خاص طور پر اس صورت میں جب وہ ایک کو آگے اسپیشلائزیشن کے لیے باہر بھجوانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

فاطمہ بہت الجھے ذہن کے ساتھ مسز سلطان کے آفس سے واپس آئی تھی۔ اسے ایک عجیب سی صورت حال میں ڈال دیا تھا انہوں نے۔ ایک طرف جہاں اسے مسز سلطان کی بات پر بے حد خوشی ہوئی تھی دوسری طرف وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش کا شکار بھی ہو گئی تھی۔ پتا نہیں یہ سب ٹھیک تھا یا نہیں۔ پتا نہیں یہ سب اسے کرنا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔ وہ خیر دین سے یہ مسئلہ ڈسکس کرنا چاہتی تھی لیکن وہ متاثر تھی۔ اسے خیر دین کے جواب کا اندازہ تھا اور کہیں نہ کہیں چڑیا خیر دین سے وہ جواب نہیں چاہتی تھی بلکہ خیر دین سے مسئلہ ڈسکس کیے بغیر اس مسئلے کا کوئی حل بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”تمہیں میری بات پر یقین کیوں نہیں آ رہا..... خاص طور پر اب جب می کے منہ سے تم نے سن لیا کہ وہ بھی یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔“ اگلے دن ایک بڑے معمول کے انداز میں بے تکلفی سے اس نے آکر ملنا تھا اور اس نے ہمیشہ کی طرح اس سے بڑے گرم جوش انداز میں بات چیت کا آغاز کیا تھا۔

نہ چاہنے کے باوجود چڑیا اس سے بات کرنے لگی تھی لیکن اس کے انداز میں ایسا کچھ ضرور تھا جس نے کچھ دیر کے بعد ایک کوزج کر دیا تھا۔

”ایک مجھے یوں لگ رہا ہے میں کسی کی زندگی کے ساتھ کھیل رہی ہوں۔“ فاطمہ نے بے حد سنجیدگی سے ایک سے بالآخر اپنی ذہنی کیفیت شیر کی تھی۔ وہ جیسے حیران رہ گیا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کس کی زندگی کے ساتھ کھیل رہی ہو تم؟“

”تمہاری منگیتری..... اور جانتے بوجھتے۔“ ایک اس کے احساس جرم پر قہقہہ مار کر ہنسا تھا۔

”تم بھی بہت عجیب ہو، اس ساری صورت حال میں تم کہاں سے قصور وار ہو گئی ہو۔“

”میں درمیان میں نہ آتی تو تمہیں اس منگنی پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔“ فاطمہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”تم میری زندگی میں ناجیہ سے پہلے آئی تھیں۔ ناجیہ سے پہلے سے ہو پھر تم اس طرح کیوں سوچ رہی ہو؟“ ایک نے جیسے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ فاطمہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ وہ بچی نہیں تھی کہ اس معاملے کی نزاکت کو نہ سمجھ پاتی اور کہیں نہ کہیں ایک سے محبت کرنے کے باوجود اسے اندازہ تھا کہ ایک اس معاملے میں بے حد خود غرضی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پہلے اس نے بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا جب اس نے اپنی فیملی کے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے فاطمہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مکمل طور پر فراموش کرتے ہوئے ناجیہ سے منگنی کر لی تھی اور نہ صرف اس نے منگنی کر لی تھی بلکہ اس نے اس منگنی سے اس کو مکمل طور پر بے خبر بھی رکھا تھا اور اب وہ اس کے ساتھ اسی طرح کے تعلقات استوار رکھے ہوئے اس لڑکی کی زندگی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

”ناجیہ جانتی ہے کہ تم یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہو اور کہیں اور انٹرنیٹ ہو؟“ فاطمہ نے یک دم بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔ ایک ایک بار پھر جواب دینے میں متاثر ہوا پھر بالآخر اس نے کہا۔

”ہاں وہ جانتی ہے، میں نے اسے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے اور وہ تمہارے بارے میں جاننے کے بعد خود بھی اس رشتے میں زیادہ انٹرنیٹ نہیں ہے۔ یہ اب صرف دو فیملیز کی انا کا زیادہ مسئلہ ہے اور کچھ نہیں..... اسی لیے تو میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ بس تم تھوڑا وقت دے دو مجھے۔ یہ رشتہ ختم ہو جائے گا کیونکہ میں اور ناجیہ دونوں خود بھی اس رشتے کو قائم رکھنے میں انٹرنیٹ نہیں ہیں۔“ ایک نے اسے بے حد تفصیل سے بتایا۔

”فاطمہ بے اختیار پُر سکون ہوئی۔ ایک عجیب سا بوجھ تھا جو اس کے دل اور کندھوں سے ہٹا تھا۔ ناجیہ اس ساری صورت حال سے واقف تھی..... مطلب فاطمہ کسی ایسے کھیل کا حصہ نہیں تھی جس میں ناجیہ کی زندگی خراب ہوتی۔ وہ ایک کا انتظار کر سکتی تھی۔ اسے موقع دے سکتی تھی کہ وہ اس تمام مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کر لے۔ اس دن کالج گراؤنڈ میں ایک کے ساتھ بیٹھے اس نے یہی فیصلہ کیا تھا۔ زندگی ایک بار پھر اسی پرانی ڈگر پر آ گئی تھی..... وہی خواب..... وعدے..... خواہشات، یقین دہانیاں، خوش گمانیاں..... فاطمہ ایک بار پھر اپنے مستقبل کو انہی سارے دھاگوں سے بننے لگی تھی۔ خیر دین کو اگلے کئی ہفتوں تک ایک کے ساتھ اس کے patch up کے بارے میں پتا نہیں چلا لیکن پھر آہستہ

آہستہ فاطمہ نے ایک بار پھر خیر دین کو باور کروانا شروع کر دیا تھا کہ وہ اور ایک ایک بار پھر سے اکٹھے ہو گئے تھے۔ خیر دین شروع میں اس سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ وہ صرف دوستی تھی یا..... اسے توقع تھی کہ یہ صرف دوستی ہی ہو سکتی تھی۔ چڑیا ایک کی منگنی ہو جانے کے بعد کیسے اس کے ساتھ کوئی جذباتی تعلق بحال کر سکتی تھی۔ خیر دین بہت دیر سے سہی فاطمہ سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا اور فاطمہ کے جواب نے اسے بھی اسی طرح الجھا ہوا چھوڑا تھا جس طرح فاطمہ خود شروع میں الجھی تھی۔ فاطمہ سے اس نے بہت سارے سوال جواب کیے تھے اور فاطمہ نے بہت مدافعتانہ انداز میں ایک کا دفاع کرتے ہوئے اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ خیر دین فاطمہ کے جوابوں میں دیکھنے والے پیوندوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی باتیں سنتا اور سر ہلاتا رہا تھا۔ وہ کچی عمر کی پہلی محبت تھی اور وہ اپنی نواہی کو بے رحمی اور بے حس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دنیا بہت ظالم، خود غرض اور جھوٹی ہوتی ہے..... فریب در فریب کے جال بنتی اور پھینکتی رہتی ہے..... اور یہ کہ لوگوں کی زبانوں کے کھن میں بہت ساز ہوتا ہے جو سکھایا نہیں ہوتا کہ فوری اثر کرے لیکن مارنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔ دنیا کی ایک بھیانک تصویر اس کی نواہی بچپن میں دیکھ چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی دنیا کو ایک بار پھر کالے اور گہرے رنگوں سے خراب کرے۔ خیر دین چڑیا کا اعتبار رشتوں، دوستوں، انسانوں سے نہیں اٹھانا چاہتا تھا..... پر اب اس کے لیے پریشانی یہ تھی کہ وہ اپنی عزیز نواہی کو کسی آنے والی تکلیف کی طرف بڑھتے دیکھ کر کیسے بچائے۔

”ایک بات بتاؤ چڑیا..... اگر ایک کی منگنی ختم نہیں ہوئی تو؟“ فاطمہ خیر دین کی بات پر حیران رہ گئی تھی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا نا..... میں نے آپ کو بتایا ہے وہ اور اس کی منگیتر دونوں یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے بے حد یقین سے کہا۔

”ایک سال سے وہ یہ کوشش کر رہے ہیں ابھی تک تو ختم نہیں کر سکے۔“ وہ کچھ دیر خیر دین کی بات کا جواب نہیں دے سکی۔

”لیکن وہ کوشش کر رہے ہیں۔“ اس نے مدافعتانہ انداز میں کچھ دیر کے بعد کہا۔

”ہاں لیکن وہ کوشش ابھی تک کامیاب نہیں ہوئی۔ بعض کوششیں کبھی کبھار کامیاب نہیں بھی ہوتیں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں اسے آگے آنے والے گڑھے سے خبردار کیا۔ ”تم نے یہ سوچا ہے اگر یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی تو تم کیا کرو گی؟“ فاطمہ الجھے انداز میں خیر دین کو دیکھتی رہی۔

”میں کیا کروں گی؟“ اس نے جیسے حیرانی سے خیر دین کے سوال کو دہرایا تھا۔

”زندگی میں ہمارے پاس ہمیشہ ایک پلان بی ہونا چاہیے۔ ہر بڑی ناکامی کے بعد زندگی میں آگے بڑھتے رہنے کے لیے ایک متبادل راستہ..... اگر ہم زندگی میں وہ نہ پاسکیں یا وہ نہ کر سکیں جو ہمارا ٹارگٹ ہے تو پھر ہمارے پاس ایک دوسرا آپشن ہونا چاہیے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے۔“

فاطمہ نے خیر دین کی بات بڑی لچکی سے سنی تھی۔ وہ دنیا کا پہلا نانا تھا جو اپنی نواہی کو محبت میں ناکامی کے بعد ایک متبادل آپشن ڈھونڈ کر رکھنے کی ہدایت دے رہا تھا۔ فاطمہ ہنس پڑی تھی ایک typical مہلک لڑکی کی طرح جسے یقین تھا کہ کم سے کم زندگی میں اسے کسی متبادل آپشن کی ضرورت نہیں

پڑے گی۔ خیر دین اس کے ہنسنے پر مسکرا دیا تھا اسے اس سے اس عمر میں اس مسئلے پر اسی غیر سنجیدگی کی توقع تھی۔

”زندگی میں ہم نقصان کسی بھی کام میں ناکام ہونے کی وجہ سے نہیں اٹھاتے..... ایک اچھا پلان بی نہ ہونے کی وجہ سے اٹھاتے ہیں۔“ خیر دین اسے سمجھانے لگا تھا۔ وہ خیر دین کی بات بغور سنتی رہی تھی۔ ایک کے معاملے پر وہ فارمولہ اپلائی کرتی نہ کرتی زندگی کی اور بہت سی چیزوں پر وہ فارمولہ لگ سکتا تھا۔ فاطمہ بڑی ردائی سے وہی گھسا پٹا جملہ خیر دین سے بولنا چاہتی تھی..... نانا ایک ایسا نہیں ہے لیکن پھر وہ رک گئی تھی۔ ایک ایسا نہیں تھا اس کے باوجود ایک سال پہلے اس نے چپ چاپ اپنی کزن سے منگنی کر لی تھی۔ ایک سال میں ایک بار بھی فاطمہ کو اس بات کا علم ہونے نہیں دیا تھا..... نہ ایک نے نہ ہی مسز سلطان نے..... وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دامہوں کی ڈور سے الجھ گئی تھی۔

”آپ کیا چاہتے ہیں نانا؟“ اس نے مبہم انداز میں خیر دین سے پوچھا۔

”میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی دوسرے کی ناکامی اور کوتاہی کے لیے خود کو کبھی مجرم مت ٹھہرانا۔ زندگی اُن ہونیوں اور معجزات کا دوسرا نام ہے۔“ فاطمہ خیر دین کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ اس کے الفاظ اس رات اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے تھے۔

صبح ہونے تک اس نے خیر دین کی تنبیہ کم نصیحت کو بھلا دینے کی کوشش کی تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ایک کا چہرہ دیکھتے ہی خیر دین کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے تھے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اسے اس شخص کے لیے خیر دین کی ہدایات کی ضرورت تھی۔ وہ خیر دین کو اس شام کہنا چاہتی تھی کہ اندھی محبت واحد چیز ہوتی ہے جس میں ناکام ہونے کے بعد کوئی پلان بی کام نہیں آتا..... اور دراصل محبت کرتے وقت بھی انسان کوئی پلان بی نہیں رکھتا..... اندھی محبت زندگی میں انسان کو صرف ایک بار ہوتی ہے..... بعد میں گزارہ ہوتا ہے بعض دفعہ عادت اور زیادہ تر ضرورت..... لیکن پھر اندھی محبت نام کی شے انسان کو عقل سے پیدل نہیں کرتی۔

ایک سلطان کو میڈیکل کے آخری تمام سال کے دوران وہ صرف اسی ترازو میں تولتی رہی تھی۔ کیا اسے اس سے اندھی محبت تھی.....؟ کیا وہ اس کے بغیر زندہ رہ سکے گی اس طرح جس طرح رہتی آئی تھی؟ کیا وہ اس کے بعد کسی دوسرے مرد کو اپنی زندگی میں قبول کر سکے گی؟ کسی ایک سوال کا جواب اسے واضح نہیں مل پاتا تھا۔ کوئی ایک کاٹنا تھا جو خیر دین کے لفظوں نے اس کے اندر گاڑ دیا تھا اور اس سے اٹھنے والی ٹیسس اسے حواس سے باہر نہیں ہونے دیتی تھیں۔

وہ دونوں ہاؤس جاب کر رہے تھے جب تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد بالآخر فاطمہ نے ایک بار پھر ایک سے اپنے اور اس کے رشتے کے حوالے سے کوئی حتمی فیصلہ کرنے کے لیے کہا تھا اور اس کے جواب نے فاطمہ کو سن کر دیا تھا۔ اس کے اور ناجیہ کے نکاح کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور ایک نے بے حد معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ فاطمہ کو اس بار پہلے سے زیادہ بے یقینی ہوئی تھی کیونکہ اس بار ایک کے لہجے میں کوئی پریشانی کوئی اضطراب نہیں تھا۔ وہ بے حد مطمئن اور پرسکون تھا یوں جیسے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ایک عجیب سی جھک محسوس کی تھی فاطمہ نے اس

کے انداز سے۔ اس نے ایک سلطان سے کوئی اگلا سوال جواب نہیں کیا تھا۔ کوئی بحث و مباحثہ نہیں۔ نہ وہ اس پر چلائی تھی نہ اس نے ایک سلطان کو برا بھلا کہا تھا۔ وہ شل ہوتے اعصاب کے ساتھ ہاسٹل واپس آ گئی تھی۔

اسے زندگی میں کبھی شادی کی خواہش تھی نہ ہی کوئی جلدی..... ایک سلطان نے ہی اس کے اندر شادی کی خواہش پیدا کی تھی اور خیر دین اور اس کی ماں کے بار بار کے تقاضوں اور دباؤ سے شادی کی جلدی کا مطالبہ..... اور اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا صرف تکلیف کا ایک عجیب سا احساس تھا جو باقی رہ گیا تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے کی طرح وہ دنوں نہیں روئی تھی نہ ہی اس نے پہلے کی طرح خیر دین کو پریشان کیا تھا۔ اس نے ایک سلطان اور اس کے ساتھ تمام یادوں سے اپنے آپ کو cut off کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہی میٹل بلاک جو اس نے بچپن کے اس حادثے کو بھلانے کے لیے اپنے آپ پر لگایا تھا وہ اب بھی کام آتا تھا..... لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب وہ ہر روز ایک سلطان سے ملتی تھی۔ اس سے بات بھی کرتی تھی اور اس نے بڑے محل کے ساتھ اس سے اس کے نکاح کی تقریب کا دعوت نامہ بھی لے لیا تھا۔

”میں تو سمجھ رہی تھی تم دونوں committed ہو اور وہ تم سے شادی کرے گا۔“ اس کی روم میٹ فائزہ نے ایک سلطان کے نکاح کی خبر سننے پر جیسے بے حد شاک کے عالم میں فاطمہ سے کہا تھا۔ ”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں تھی..... ہم صرف دوست تھے۔“ اس نے بڑے محل کے ساتھ بات کو گول مول کیا تھا۔ وہاں کسی کے ساتھ بیٹھ کر اپنی تکلیف اور تذلیل شیمز کرنے کا مطلب ہاسٹل کی دیواروں پر اپنا اشتہار لگانا تھا اور فاطمہ کو اس ”ناموری“ کی خواہش نہیں تھی۔

”تم نے اس کے لیے بہت کچھ کیا ہے..... اگر ایک کی کوئی پوزیشن آتی ہے تو یہ صرف تمہاری وجہ سے ہوگی۔“ اس نے فائزہ کو ٹوک دیا۔

”نہیں، میں نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا..... وہ خود بہت لائق ہے۔“ ”ہوگا لیکن ایک سلطان پیراسائٹ ہے اس نے ساری زندگی یہی کیا ہے، اسکول میں تھا تو سب سے لائق لڑکی کے ساتھ فرینڈ شپ کروائی ہوئی تھی اس کی ماں نے..... کالج کے دو سال ایک اور لڑکی کے ساتھ چپک کر گزارے اس نے..... اور پھر میڈیکل کے پانچ سالوں کے لیے تو تمہاری شکل میں اس کی لائٹری نکل آئی۔“ وہ بے حس و حرکت فائزہ کی شکل دیکھتی رہی۔ اسے کچھ دیر کے لیے اس کی بات کی سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔

”اس کا بھائی میری بہن کا کلاس فیلو تھا اور اس کا بھی یہی طریقہ تھا۔ مسز سلطان نے اپنی اولاد کو پیراسائٹس کی طرح پالا تھا..... جو نکلیں نہیں ہوتیں جو دوسروں کا خون چوس چوس کر پلتی ہیں بالکل ویسے دوسروں کی قابلیت کا خون چوس کر اپنی اولاد کو قابل بنایا ہے انہوں نے۔“ اس نے آج پہلی بار فائزہ کو بولتے سنا تھا۔

”اب کہ فیملی کی امریکن نیشنل لڑکی مل گئی ہے۔ اس کے سر پر امریکا میں ریزیڈنسی اور اسپیشلائزیشن ہوگی۔“ فاطمہ، فائزہ کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا۔

”تم ایک کی فیملی کو کیسے جانتی ہو؟“ اس نے بہ مشکل اس کو ٹوکے ہوئے کہا تھا۔

”اس کی فیملی کو..... میں تو ان کی سات پشتوں کو جانتی ہوں اور خاص طور پر مسز سلطان کو..... ان کی شفقت محبت اور نرم مزاجی کے سارے ڈھکوسلوں سے واقف ہوں میں۔ میری کزن کے ساتھ تین سال ایک کے چھوٹے بھائی کا افیئر رہا تھا..... topper تھی وہ بھی اور اس نے اپنا بیڑا غرق کر لیا تھا ایزد سلطان کے چکر میں..... دونوں بیکن میں تھے..... اب ایزد صاحب تو اطمینان سے علامہ اقبال میڈیکل کالج میں پہنچ گئے ہیں اور میری کزن کو بہ مشکل فیصل آباد میں ایڈمیشن ملا ہے اور اب ایزد صاحب کا ایک اور topper لڑکی کے ساتھ افیئر زوروں پر ہے اور میری کزن نے بریک اپ کے بعد خودکشی کی بھی کوشش کی اور ایزد صاحب اب اس سے چھپتے پھرتے ہیں۔“ فائزہ بڑی سختی سے کہہ رہی تھی۔

”مسز سلطان اے لیوئر تک میرے خالو کی فیملی کو یہی جھانسا دیتی رہیں کہ انہوں نے ایزد کی شادی نکالیں سے ہی کرنی ہے بس ذرا ایزد میڈیکل میں چلا جائے پھر دونوں کی منگنی یا نکاح کر دیں گے اور میڈیکل میں ایزد کے پہنچتے ہی انہوں نے میری کزن پر ہر طرح کے الزام لگانے شروع کر دیے۔ یوں جیسے میری کزن کوئی بڑی بدکردار لڑکی تھی جس نے ان کے پانچ وقت کے نمازی بیٹے کا کردار اور ایمان خراب کر دیا..... انتہائی گھٹیا خاندان ہے مسز سلطان کا۔“ فاطمہ ہونٹوں کی طرح فائزہ کی شکل دیکھ رہی تھی۔

”تم نے پہلے کبھی مجھ سے یہ سب ڈسکس نہیں کیا۔“ ایک لمبی خاموشی کے بعد فاطمہ نے بالآخر اپنی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ اس کے گلے کو عجیب گرہ لگ گئی تھی۔

”میں نے چند بار تم سے ذکر کیا تھا لیکن تم نے ایک کے بارے میں یا مسز سلطان کے بارے میں کسی قسم کی بات چیت میں دلچسپی نہیں لی تو پھر میں نے بھی سوچا کہ میں کیوں خواہ مخواہ تمہارے سامنے یہ قصے لے کر بیٹھوں..... ویسے بھی اگر تمہاری کوئی ایسوشنل انوالومنٹ نہیں تھی اس کے ساتھ تو پھر تمہیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا..... لیکن میں پھر بھی سمجھتی ہوں کہ تم نے ایک کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔“

زندگی میں وہ پہلا موقع تھا جب فاطمہ کو اپنے آئی کیو لیول پر شبہ ہوا۔ اپنی ذہانت صرف ایک وہم لگی اور اپنا آپ چغدا اور احمق۔ فائزہ غلط نہیں کہہ رہی تھی اس نے ایک کے لیے واقعی ضرورت سے بڑھ کر کیا تھا۔ ایک دوست کی طرح نہیں..... وہ اسے اپنا مستقبل سمجھ کر اپنا ہونے والا جیون ساتھی سمجھتے ہوئے اسے مدد دینے کی کوشش کرتی تھی۔ ایک سلطان نے پانچ سال اسٹڈیز کے معاملے میں اپنا سارا بوجھ فاطمہ پر ڈال لے رکھا تھا۔ فاطمہ کو اب یاد آ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اس کا بیسٹ فرینڈ ہمیشہ ایک ٹاپر ہی رہا ہے۔ فائزہ نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ اسکول میں عائشہ نامی ایک لڑکی کے بہت قریب رہا تھا اور کالج میں رابعہ نامی ایک اور لڑکی کے ساتھ..... فاطمہ نے اکثر اس کے منہ سے ان کا ذکر سنا تھا۔ وہ اس کے لیے جو جو کیا کرتی تھیں اس نے ان کے قصے بھی سنے تھے لیکن وہ دونوں لڑکیاں میڈیکل کے پانچ سالوں میں ایک کی زندگی میں کبھی بھی نمودار نہیں ہوئیں۔ وہ اس کی بیسٹ فرینڈ تھیں۔ اور ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی کنگ ایڈورڈ تک نہیں پہنچ سکی تھی اور ایک کے لیے ان کی یونیورسٹی ختم ہو گئی

تھی۔ میڈیکل کے پانچ سال اس نے فاطمہ کو ٹشو پیپر کے طور پر استعمال کیا تھا اور اسے کبھی اندازہ نہیں ہوا وہ اسے محبت سمجھتی رہی۔ پتا نہیں یہ خوش فہمی کی حد تھی یا بے وقوفی کی۔ ایک سلطان کا معما اس نے بہت دیر سے حل کیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی کتنی سلجھانے میں پانچ سال نہیں لیے تھے۔ ایک ہوتی ہے محبت میں ناکامی..... ایک ہوتا ہے محبت کے نام پر الو بننا..... وہ محبت میں ناکام نہیں ہوئی تھی الو بنی تھی۔ اس نے ایک بار کسی سے سنا تھا دنیا میں سب سے کارگر اور بدترین exploitation محبت کے نام پر ہوتی ہے اور اسے پہلی بار اپنی زندگی کے ایک تلخ تجربے نے سمجھایا تھا کہ یہ کیسے ہوتا تھا۔

خیر دین کا تجربہ ایک بار پھر جیت گیا تھا۔ چڑیا کے یقین کو ایک بار پھر مات ہوئی تھی اور اس مات نے ایک بار پھر چڑیا کو خیر دین کی نصیحت پر غور کرنے پر مجبور کر دیا تھا..... ”پلان بی“ اسے اب ایک پلان بی کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

اپنے تھے ہوئے جسم کو حتی الامکان ریلیکس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک نے پہلی بار اس آئینے کو دیکھا..... وہ اب بھی ویسے ہی وہاں کھڑا تھا..... اپنے اسی استقبالی، خیر مقدی انداز میں..... اسی غرور اور طنطنے کے ساتھ..... اسی پراسراریت میں لپٹے جس نے پہلی بار ایک کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ برآمدے میں قدم بڑھاتے ہوئے اس نے آئینے پر ایک نظر اور دوڑائی تھی۔

اس گھر میں اس کی آمد 26 سال بعد ہوئی تھی اور ان 26 سالوں کو اس نے جیسے ایک مونوسکیٹڈ میں کیلکولیٹ کر لیا تھا۔ گھر کے اندر دنی دروازے کو اس کے انتظار میں کھڑے ملازم نے کھولتے ہوئے اسے سلام کیا تھا۔ اس نے سانس روک کر اس دروازے سے اندر قدم رکھا تھا۔ اس کا ماتحت عملہ اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا پی اے اس گھر کی تفصیلات سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ایک کا دل چاہا وہ اسے روک دے..... اسے اس گھر کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھر اس کی یادداشت کا وہ انٹ حصہ تھا۔ جسے کھرچ کھرچ کر مٹا دینے کی ہر کوشش ناکام رہی تھی۔

ہال میں پہنچ کر چند لمحوں کے لیے اس کے قدم فریز ہو گئے تھے۔ وہ میٹر حیاں اب اس کے سامنے تھیں۔ میٹر حیاں جنھیں اور.....

”وہ وہاں کچن کا دروازہ ہے۔“ پی اے کا جملہ اسے جیسے کرنٹ کی طرح لگا تھا جو اسے حال میں واپس لے آیا تھا۔ اس نے چونک کر ان میٹر حیوں سے نظریں ہٹائیں اور پی اے کو دیکھا۔

”پانی مل سکتا ہے؟ اپنے اعصاب اور حواس پر بیک وقت قابو رکھنے کی کوشش میں اس نے لگاتار ہلاتے ہوئے پی اے کو ٹوکا۔ پی اے فوری طور پر اس کی پیاس بجھانے کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ اسے اپنے گرد جو خاموشی چاہیے تھی وہ چند منٹوں کے لیے ہی سہی لیکن مل گئی تھی۔ جسم میں سے گزرتی خوف کی ایک لہر کو اس نے جیسے خود کو ساکت رکھتے ہوئے earth کیا۔ غیر محسوس انداز میں اسے ہاتھوں کی مٹھیاں پہنچتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنی کلائی پر ڈالی..... اس کے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔ اسی غیر محسوس انداز میں ہاتھ جھٹکتے اور نظریں چراتے ہوئے اس نے پانی کا وہ گلاس تھاما

جو اس کے سامنے ایک ٹرے میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نے ایک سانس میں وہ گلاس خالی کیا تھا۔ وہ گھرا ایک کو کس طرح ہیبت زدہ کرنے والا تھا یہ اس کے لیے کوئی اچھے کی بات نہیں تھی..... اس نے وہاں پوسٹ نہ ہونے کی مقدور بھرکوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ آسب زدہ گھر 26 سالوں کے بعد جیسے اسے ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

”مجھے اس گھر کو ایک نظر دیکھنے دیں۔“ اختر نے اس کے پانی کا گلاس رکھتے ہی دوبارہ بولنا شروع کیا ہی تھا جب اس نے اسے ٹوک دیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ماتحت عملے نے کچھ حیران نظروں کا تبادلہ کیا لیکن پھر کچھ کہے بغیر اس کے ہمراہ ہو لیے۔

گھر بہت تبدیل ہو چکا تھا لیکن وہاں موجود پرانی چیزوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں تھی جسے ایک نے ایک ہی نظر میں نہ پہچان لیا ہو۔ اسے رہائشی عمارت کا جائزہ لینے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس گھر نے اس کی زندگی میں ideal اور idealism نام کی چیز کو چھین لیا تھا اور بہت سارے سوال دے دیے تھے جنہیں اس کا دماغ بہت سالوں تک کھوجتا رہا..... لکھتا رہا..... ناکام ہوتا رہا..... اور پھر جب بالآخر اسے جواب ملا تھا تو بے یقینی کی ایک عجیب سی کیفیت نے اگلے کئی سال اسے اپنے حصار میں رکھا اور بے یقینی وہ واحد شے نہیں تھی جو بہت عرصے اس کے ہمراہ رہی تھی..... ایک ناقابل بیان اذیت بھی..... شرم اور دکھ کا ایک عجیب احساس بھی اور ان تمام احساسات کے درمیان چڑیا کا چہرہ بھی جو اپنی آنکھوں میں خوف اور دہشت لیے اسے دیکھ رہا تھا..... صرف چند سیکنڈز کے لیے ملنے والی وہ نگاہ جس کا تصور بھی اسے ٹھنڈے پسینے دلانے کے لیے کافی تھا۔

اوپر والے فلور کے تقریباً تمام کمرے لاکڈ تھے۔ اس نے کسی کمرے کو نہیں کھلوا یا..... وہاں اب ایسا کچھ نہیں تھا جسے دیکھنے کی اسے خواہش تھی۔ اس گھر کا ماسٹر بیڈ روم بھی لاکڈ تھا اور صرف وہ واحد کمرہ تھا جس کے دروازے کے باہر اس کے قدم چند لمحوں کے لیے فریز ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کمرے میں جانے کی شدید خواہش نے اسے آن گھیرا تھا پھر اس نے اسی رفتار سے اس خواہش کو جھٹک دیا تھا۔

”باہر چلتے ہیں۔“ اس نے جیسے منٹوں میں عمارت کے اندرونی جائزے کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ وہاں اندر کھڑے بہت سی چیزوں اور یادوں کا ایک سیلاب تھا جو اسے بہائے لیے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے وجود کو غرق ہونے سے بچانے کی جیسے ایک اور کوشش کی تھی۔

عمارت کے ارد گرد موجود لان پہلی نظر میں اسے ویسا ہی لگا تھا..... اور دوسری نظر نے اسے وہ خار دار جھاڑیاں، کھوکھلے ہوتے تنے اور سوکھے ہوئے پیڑ پودے دکھانے شروع کر دیے تھے جو بظاہر اس تراش خراش کے دم پر کھڑے تھے جو یقیناً اس کی آمد سے ایک دن پہلے کی گئی تھی۔ 26 سال پہلے وہ لان اس حالت میں نہیں تھا..... نہ وہ لان نہ وہاں کے درخت اور پودے اور نہ ٹینس کا وہ کورٹ جس پر آخری میچ یقیناً سالوں پہلے کھیلا گیا تھا..... سب کچھ بوسیدہ اور خستہ حال تھا ان تکلیف دہ یادوں کی طرح جو اس کے اندر سرکنڈوں کی طرح سر نکالے ہمہ وقت موجود رہنے کے باوجود ایک لمبے عرصے سے وہ کاٹ اور چھین کھو چکی تھیں جس نے اس کے بچپن کے ایک بڑے حصے کو بے حد بے رحمی سے لہو لہان اور

سرخ کیا تھا۔

”اس طرف سرونٹ کوارٹرز ہیں۔“ پی اے نے اسے کسی رہنمائی کا انتظار کیے بغیر لان کے عقبی حصے میں کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح جاتے ہوئے دیکھ کر کچھ حیرانی کے ساتھ کہا۔ اس کو ایک کے انداز میں اس عمارت کے لیے ایک عجیب سی familiarity مانوسیت، واقفیت نظر آرہی تھی۔

”پتا ہے۔“ اس کے انداز میں واقعی ایک عجیب سی مانوسیت تھی اس گھر کے لیے..... کوئی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا تب بھی اس کے لیے عمارت کے عقبی حصے میں اس جگہ جانا دشوار نہ ہوتا..... اس کے قدم اب جس رستے پر تھے وہاں اس کی زندگی کی بہترین اور بدترین یادیں بکھری تھیں۔

کچن کے عقبی دروازے سے کئی فرلانگ دور..... عمارت کے بالکل عقب میں..... وہاں اب وہ کوارٹرز نہیں تھا..... چند لمحوں کے لیے اس نے اپنے آپ کو اسی شاک اور بے بسی کی حالت میں پایا جو اس نے 26 سال پہلے اس رات محسوس کی تھی۔ وہ closure اب بھی نہیں ہوا تھا جس کی خواہش اسے وہاں تک لے آئی تھی..... وہ آسب اب بھی اس کے وجود کے اندر ہی رہنے والا تھا۔

☆☆☆

شیردل پورا راستہ ایک پلان بی ڈھونڈتا آیا تھا اس آسب سے لڑنے کے لیے جواتنے سال ایک وہم نما خوف کی صورت میں اس کے وجود کے اندر پلتے رہنے کے بعد اب یک دم اس کے تدر مقابل آگیا تھا..... ایک بھیانک خواب کی صورت میں..... وہ شاکڈ تھا..... اسے شاکڈ ہی ہونا چاہیے تھا۔ بے یقینی کے عالم میں تھا..... وہ بھی فطری بات تھی لیکن اس صدمے اور اذیت کی کیفیت کو وہ سمجھ نہیں پارہا تھا جس نے یک دم اسے جکڑ لیا تھا۔ اس کی فیملی ایک بہت بڑے کرائس کا سامنا کرنے والی تھی اور اس کرائس کی تمام جڑیں اس کی اپنی طرف جاتی تھیں۔

واپسی کا پورا راستہ وہ ماضی کے بارے میں سوچتا آیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں دنیا گول ہے اور دنیا اس کے لیے واقعی گول ثابت ہوئی تھی۔

عکس مراد علی..... اس ایک نام سے آگے وہ کچھ سوچ نہیں پاتا۔ اس کے ساتھ سالوں گزارنے کے بعد وہ اتنا بے وقوف کیسے ثابت ہوا تھا کہ اسے کبھی پہچان نہیں سکا۔ اس کے ایجنڈے کو کبھی نہیں جان سکا۔ ایجنڈا؟ وہ شاید اس کے لیے ایک بہت سخت لفظ استعمال کر رہا تھا لیکن اس کے پاس جیسے اسے اپنا دشمن سمجھنے کے علاوہ وقتی طور پر کوئی آپشن ہی نہیں تھا..... اس عورت کو اپنا دشمن سمجھنا جسے وہ بے انتہا چاہتا تھا۔ اس کا دل کچھ اور بوجھل ہو گیا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس کے سیل فون پر شہر بانو کا ٹیکسٹ آیا تھا۔ وہ اسے skype پر آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ جسمانی طور سے زیادہ یہ ذہنی تھکن تھی جو اسے بے حال کیے ہوئے تھی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو شہر بانو سے بات کرنے سے نہیں روک سکا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ اپنا لیپ ٹاپ لے کر اپنے بیڈ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اسکرین پر شہر بانو کا چہرہ دیکھتے ہی شیردل کو ایک عجیب سی تکلیف ہوئی تھی۔ وہ کافی کا ایک گنگ پکڑے لاؤنج کے ایک وسیع دعریش صوفے پر ٹیکسی ہوئی تھی پھر اس نے لیپ ٹاپ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ شیردل اس کے عقب میں کھڑکی کے

شیشوں پر بارش کی بوندیں دیکھ رہا تھا۔ کیلی فورنیا میں اس وقت بارش ہو رہی تھی شہر بانو کو بارش پسند تھی۔ شیردل جانتا تھا کہ وہ اب گھنٹوں کھڑکی کے سامنے اسی طرح کافی کا ایک گگ تھا بٹھی رہ سکتی تھی۔ شہر بانو اب مثال کو پاس لے آئی تھی۔ شیردل کا دل اپنی اولاد کو دیکھ کر جیسے کسی پرندے کی طرح خوشی سے پھڑ پھڑایا تھا۔ مثال بڑے ایکساٹڈ انداز میں اسے امریکا میں اپنی مصروفیات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ سارا دن کیا کرتی تھی، وہ اور اس کی می کہاں کہاں گئیں، کون کون ان سے ملنے آیا، کس کس نے اسے کیا کیا تحفہ دیا..... اور یہ کہ ان سب کے باوجود وہ شیردل کو مس کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ باپ فوراً اس کے پاس آجائے۔ اپنی چار سالہ بے حد خوب صورت اور معصوم بیٹی کی باتیں سنتے ہوئے شیردل کو کوئی اور یاد آیا تھا..... ایک اور ایسا ہی خوب صورت چمکا، کھلکھلاتا وجود..... اس کے دل پر کسی نے منوں برف ڈالی تھی۔ ملا کسی بارش کی پھوار کی طرح اس کے وجود کو بھگو گیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی کھلکھلاہٹ میں چڑیا کی چہچہاہٹ سن رہا تھا۔ اس کی بیٹی کی عمر میں اور چڑیا کی عمر میں چار سال کا فرق تھا۔ شاید پانچ سال کا فرق۔ وہ کسی میکا کی انداز میں نہ چاہتے ہوئے بھی چڑیا کے بارے میں سوچتا جا رہا تھا۔ مثال سے اس کا موازنہ کرنے لگا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، کوئی اس کی بیٹی کو نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کرتا تو شیردل اس کو شوٹ کر دیتا۔ یہ ایک چیز تھی جس پر شیردل کی ڈکٹری میں کسی کے لیے کوئی معافی نہیں تھی اور یہی ایک چیز تھی جس کا خوف عجیب طرح سے اسے اپنے حصار میں لیے رہتا تھا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ وہ شہر بانو کے سوال پر بری طرح چونکا تھا۔

”ہاں کیوں؟ کیا ہوا؟“ وہ اسکرین پر مثال کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ شہر بانو کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ مثال اب لاؤنج میں ادھر سے ادھر کچھ toys پکڑے وقتاً فوقتاً آتی جاتی ہوئی نظر آرہی تھی اور ہر بار اس کی جھلک نظر آنے پر شیردل کی نظر عجیب طرح سے اس کے تعاقب میں جاتی تھی۔

”تم بہت تھکے ہوئے اور پریشان لگ رہے ہو۔“ شہر بانو نے بے ساختہ کہا۔ ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ایک کمرے کی آنکھ سے شیردل کو Scan کر لیا تھا۔ شیردل نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”ہاں یار تھکن ہے کافی..... ابھی ابھی لاہور سے آیا ہوں..... سارا دن بڑی مصروفیت رہی۔“ شیردل نے اسے ٹالنے کے بجائے جھوٹ بولنا زیادہ بہتر سمجھا تھا۔

”اچھا تو سو جاتے پھر بلکہ ابھی سو جاؤ۔“ شہر بانو نے فوری طور پر جیسے اپنے شوہر کی فکر کی۔

”ہاں سو جاؤں گا ابھی۔“ شیردل نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ نیند تو آج اسے مرکز بھی نہیں آنے والی تھی۔ خالی گھر میں ناشی کی بازگشتوں کے گرداب میں چکرانے سے شہر بانو اور مثال سے باتیں کرتے رہنا بہتر تھا کم از کم عارضی طور پر ہی لیکن وہ خود کو کچھ پرسکون رکھ پارہا تھا۔

”سو جاؤ۔“ شہر بانو نے ایک بار پھر اسے ہدایت کی۔

”سو جاؤں گا۔“ شیردل نے پھر ٹالا اور بھی اس نے شرمین کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

”می سے بات کرو گے؟“ شہر بانو کو ایک دم پتا نہیں کیا خیال آیا۔ شیردل فوری طور پر ”نہیں“ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا۔

”ہاں کروادو۔“ اس نے اپنے لہجے میں کچھ گرم جوشی پیدا کرنے کی کوشش کی جو اس کے اور شرمین کے درمیان کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ شرمین کے لیے اس کی می کی ناپسندیدگی تھی۔ ان کی شادی کے اتنے سال بعد بھی شرمین اور اس کی فیملی میں عجیب سی غیریت اور اجنبیت کی دیواریں تھیں اور یہ دونوں طرف سے تھیں اور دونوں طرف سے ہی اسے گرانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ شیردل کی فیملی خاص طور پر اس کی ماں شرمین کو اپنے اکلوتے بھائی کی موت کا ذمے دار سمجھتی تھی..... شیردل کی رائے اس بارے میں بالکل محفوظ تھی۔ وہ نیوٹرل تھا یا نہیں لیکن اس نے شہباز کی موت کے حوالے سے ہونے والی کسی گفتگو میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ کبھی کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ شادی سے پہلے اس کی خاموشی کی وجوہات اور تھیں۔ شادی کے بعد ان وجوہات میں شہر بانو کی اپنے باپ سے attachment اور کسی تبصرے سے اس کی ممکنہ طور پر ہرٹ ہو جانے کی وجہ بھی شامل ہو گئی تھی۔ شہر بانو اور شیردل کے درمیان اتنے سالوں میں شہباز کا ذکر بہت کم آیا تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر آیا تھا۔ شیردل جانتا تھا شہباز اپنی اکلوتی بیٹی کے بارے میں جنون کی حد تک پوزیسو تھے اور شہر بانو بھی شہباز کی شیردل سے خاص attachment کے حوالے سے تھوڑی بہت یادیں رکھتی تھی اس کے باوجود ان دونوں نے کبھی شہباز کو ڈسکس نہیں کیا تھا۔

”کیسے ہو بیٹا؟“ شرمین نے علیک سلیک کے بعد شیردل سے وہی رکی سوال کیا۔ شیردل نے ہمیشہ والی تمیز اور احترام کے ساتھ جواب دیتے ہوئے اُن سے اُن کا حال پوچھا۔ چند منٹ دونوں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی پھر شہر بانو کو ایک بار پھر شیردل کے آرام کا خیال آ گیا تھا۔ اس بار شیردل نے اسے ٹالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسے خدا حافظ کہہ کر آف لائن ہو گیا تھا۔

شرمین شیردل سے بات کرنے کے بعد بھی وہیں بیٹھی رہی تھی۔ ایک عجیب سی تکلیف اور اذیت تھی جو ہر بار اسے شیردل کو دیکھتے ہی ہوتی تھی۔ وہ شکل صورت اور قد کاٹھ میں شہباز سے بہت مماثلت رکھتا تھا اور ہر بار اسے دیکھتے ہوئے اسے شہباز یاد آتا تھا۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی..... ایک دوسرے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود بھی..... اور شہباز کے گھناؤنے روپ کے بارے میں جاننے کے بعد بھی وہ شہباز سے نفرت نہیں کر سکتی تھی۔ بس اس نے اسے زندگی سے نکال دیا تھا کیونکہ اس کے ساتھ رہنا شرمین کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اس سے بیک وقت محبت اور نفرت کر رہی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھودیتی وہ اس کی زندگی سے نکل آئی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہیں می؟“ وہ شہر بانو کی آواز پر یک دم چونکی تھی۔

”کچھ نہیں..... شیردل پہلے سے زیادہ اسماٹ ہو گیا ہے۔“ شہر بانو نے مسکرا کر اپنے ہینڈسم میاں کے بارے میں ماں کا تبصرہ فخریہ انداز میں سنا۔ وہ جانتی تھی شیردل سے شادی کی شدید مخالفت کرنے کے باوجود شرمین شیردل کو پسند کرتی تھی اور شادی کے اتنے سال گزرنے کے بعد یہ پسندیدگی بہت بڑھ گئی تھی۔ شیردل نے شہر بانو کو بہت خوش رکھا ہوا تھا اور شرمین کے لیے اس سے زیادہ مطمئن کرنے

”تم اس کے ساتھ بہت خوش ہونا؟“ وہ شرمین کے سوال پر مسکرا دی تھی۔

”بہت ایک ایسا لفظ ہے جو میری خوشی کے لیے بہت چھوٹا ہے می۔ میں جانتی ہوں آپ کہیں گی آئیڈیل کچھ نہیں ہوتا لیکن میں اس کے ساتھ ایک آئیڈیل زندگی گزار رہی ہوں۔ ویسی زندگی جیسی کبھی میں پاپا کے ساتھ گزارتی تھی۔“ وہ یہ مثال نہیں دینا چاہتی تھی لیکن شہر بانو کو احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کے لاشعور نے اسے دھوکا دے دیا تھا۔ شرمین کے چہرے پر مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی تھی۔ لاؤنج میں کچھ دیر کے لیے ایک عجیب مجرمانہ سی خاموشی چھائی رہی پھر شرمین نے کہا۔

”اللہ نہ کرے تم کبھی اس کے ساتھ ویسی زندگی گزارو جیسی میں نے تمہارے پاپا کے ساتھ گزار دی تھی۔ اللہ نہ کرے شیردل کبھی تمہارے پاپا جیسا نکلے۔“

”داؤد آج آرہا ہے؟“ شہر بانو نے یک دم ماں کی بات کاٹ دی تھی۔ شرمین جانتی تھی وہ اس کا احتجاج تھا وہ شہباز کے بارے میں اگر کوئی اچھی بات نہیں سنتی تھی تو پھر کوئی بری بات بھی نہیں سن سکتی تھی۔ شہباز حسین ان کے درمیان خاموشی کی ایک بڑی اونچی دیوار کھڑی کر دیتا ہے جس کے پار ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ پارہی تھیں۔

”ہاں آج رات کو ڈنر پر انوائٹڈ ہے یہاں، پرسوں کی فلائٹ سے ڈلاس جا رہا ہے۔“ شرمین نے موضوع بدل کر جیسے اس کے احتجاج کے سامنے گھٹنے ٹیکے تھے۔

”divorce ہو گئی ہے اس کی؟“ شہر بانو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”دو ہفتوں تک ہو جائے گی۔“ شرمین نے بتایا۔ داؤد شرمین کے دوسرے شوہر فاروق کا بھانجا تھا۔ شہر بانو اور وہ ہائی اسکول تک کلاس فیلو رہے تھے اور شیردل سے شادی کے تنازعے پر اس کے لیے جس most eligible bachelor کا نام آیا تھا وہ اسی کا تھا۔ وہ شرمین کا چہیتا تھا۔ شہر بانو کو یہ ماننے میں عار نہیں تھا کہ داؤد کسی کا بھی چہیتا ہو سکتا تھا۔ شیردل اگر اس کی زندگی میں نہ آیا ہوتا تو وہ داؤد جیسے لڑکے کے ساتھ خوشی خوشی شادی کر لیتی۔ ان دونوں کی آپس میں اتنی واضح ذہنی مطابقت تھی لیکن شیردل اس کی زندگی میں بڑے صحیح وقت پر آیا تھا۔ وہ شادی ہو جانے کے بعد بھی کبھی داؤد سے ٹوک جھوک میں یہ بات کہہ دیتی تھی اور داؤد جواباً اسے کہا کرتا تھا۔ ”صحیح وقت پر یا غلط وقت پر؟“ اس بار بڑے لمبے عرصے کے بعد داؤد سے اس کی ملاقات ہونے والی تھی۔

”مجھے کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ داؤد جیسے شخص کی شادی بھی ناکام ہو سکتی ہے۔“ شہر بانو نے کہا۔

”قصور کس کا تھا؟“ اسے جیسے عجیب سی کرید ہوئی تھی۔

”شادی کبھی بھی صرف ایک شخص کی وجہ سے ناکام نہیں ہوتی زارا اور اس کی اچھی بھہر رہی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا چانک سے ہم لوگوں نے جھگڑوں کے بارے میں سننا شروع کر دیا اور پھر یک دم پتا چلا کہ زارا نے divorce کے لیے کیس فائل کر دیا۔“ شرمین نے اسے تفصیلات بتانی شروع کیں۔

”داؤد پچھلے کئی سالوں میں کچھ زیادہ ہی کیریئر اور پیسہ ہو گیا تھا اس کا اثر اس کی شادی پر پڑنا ہی تھا خاص طور پر اگر بیوی بھی اسی طرح کی ہائی پرو فائل جاب پر ہو تو۔۔۔۔۔“ شہر بانو اس کی بات سنتے

”اے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ شرمین کچھ عرصے پہلے ہی کیلی فورنیا کے اس علاقے میں شفٹ ہوئی تھی اور شہر بانو، فاروق اور شرمین کے اس نئے اور بے حد وسیع و عریض گھر میں پہلی بار آئی تھی۔ قد آدم کھڑکیوں سے باہر برسنے والی اس بارش سے وہ بے حد عجیب انداز میں محفوظ ہو رہی تھی۔

شرمین اب مثال کی طرف متوجہ ہو گئی جو ایک ٹیم پکڑے اس کے پاس کچھ دکھانے آئی تھی۔ شرمین نے اس کا چہرہ چومتے ہوئے اسے گود میں بٹھالیا۔

”اس کی شکل بالکل تم سے ملتی ہے جب تم چار سال کی تھیں تو تم بھی بالکل مثال کی طرح لگتی تھیں۔“ شرمین نے مثال کے اصرار پر TV آن کرتے ہوئے شہر بانو سے کہا۔ شہر بانو مسکرا دی۔

”شیردل بھی یہی کہتا ہے۔۔۔۔۔ وہ تو کہتا ہے مثال اور میں اب بھی بالکل ایک جیسی لگتی ہیں اسے۔۔۔۔۔ بلکہ اسے لگتا ہے مثال مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے۔“ شرمین شہر بانو کے پیار بھرے شکوے پر ہنس دی۔ ٹی وی پر بچوں کے چینلوں پر مثال کے لیے کوئی موزوں کارٹون پروگرام ڈھونڈتے ہوئے وہ ایک چینل پر چلنے والی سنووائٹ اور سات بونوں کی animated فلم پر رک گئی تھی۔ مثال ٹیم چھوڑ کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کھڑکیوں سے باہر جھانکتی ہوئی شہر بانو نے بھی سنووائٹ کے کسی جملے پر گردن موڑ کر ٹی وی دیکھا اور پھر اسے جیسے یک دم کچھ یاد آیا تھا۔

”ممی آپ کو پتا ہے ہماری پچھلی پوسٹنگ جہاں تھی اس گھر میں بونے تھے۔۔۔۔۔ real life dwarfs“ شرمین کا چہرہ منٹوں میں زرد پڑ گیا تھا۔

”کس گھر کی بات کر رہی ہو تم؟“ شہر بانو نے بے حد حیرت سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ اس نے ماں کے چہرے پر جو تاثرات دیکھے تھے وہ انہیں کبھی بھول نہیں سکتی تھی۔

”آپ کو بتایا تو تھا میں نے شیردل کی پچھلی پوسٹنگ کے بارے میں۔“

”تم نے کہا تھا تم لوگ ریسیٹ ہاؤس میں رہو گے جب تک متبادل انتظام نہیں ہو جاتا۔“ شرمین فن رنگت کے ساتھ اس سے کہہ رہی تھی۔

”ہاں لیکن پھر ہم اسی سرکاری گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ شیردل نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ سے جھوٹ بول دوں کہ ہمیں کوئی اور گھر مل گیا ہے رہنے کے لیے۔“ شہر بانو کو بات کرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ شرمین عجیب گم صم حالت میں اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی بات سن رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ میں اس گھر کے بارے میں سب جانتی ہوں۔“ شہر بانو نے یک دم شرمین کو دلا تے ہوئے سنا۔ اسے ماں کی بات پر جھٹکا لگا تھا۔

”آپ کیسے جانتی ہیں؟“ اس نے بے ساختہ ماں سے پوچھا اور پھر ماں کے کچھ کہنے سے بھی پہلے اسے جواب مل گیا تھا۔

”پاپا وہاں پوسٹڈ رہے تھے کیا؟“ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

شرمین نے جواب نہیں دیا تھا لیکن شہر بانو نے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب دیکھا تھا۔

آئینے پر ایک اور نظر ڈالتے ہوئے اندر جانے سے پہلے چڑیا نے پلٹ کر ایک نظر برآمد کے سامنے پھیلے ہوئے لان کو دیکھا۔ وہ اب اس کا گھر تھا۔ کم از کم تب تک جب تک۔ "سرکار" اسے وہاں رکھتی اور اس گھر میں موجود ہر چیز بھی اس کی سرکاری تحویل اور تصرف میں تھی۔ چڑیا نے سامنے لان میں گئے فلیگ پول پر لہراتا جھنڈا دیکھا جو اس گھر کے مالک کی اپنی رہائش میں موجود ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ اس لان میں اس نے سارا بچپن کھیلتے ہوئے گزارا تھا۔ اس فلیگ پول کی اہمیت یا ضرورت سے واقف ہوئے بغیر اس کے گرد گھومتے چکر کاٹتے ہوئے..... یادیں اس گھر کے چپے چپے پر بکھری ہوئی تھیں..... وہ ساری یادیں اچھی تھیں..... اس ایک رات کے علاوہ جو اس کی پوری زندگی پر پھیل گئی تھی۔ اس گھر میں اس نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ اس نے، حلیمہ نے اور خیر دین نے۔

چند منٹ پہلے اسی پورچ میں اسٹاف کار سے اترتے ہوئے اس کے عملے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ اس شہر میں تعینات ہونے والی پہلی ڈپٹی کمشنر تھی اور اس کی ذات میں اس کے عملے کا تجسس اور دلچسپی ایک لازم سی بات تھی۔ وہیں پورچ میں اس گھر میں کام کرنے والے عملے سے چڑیا کی پہلی ملاقات اور تعارف ہوا تھا۔ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے اُن میں سے کوئی بھی ایسا چہرہ یا نام نہیں تھا جو چڑیا کے ماضی سے وابستہ تھا۔ وہ سب زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال سے وہاں کام کر رہے تھے۔ گھر کا سب سے پرانا ملازم 18 سال سے وہاں تھا۔ کوئی پرانا چہرہ پہچاننے کی کوئی خواہش لے کر وہ وہاں آئی بھی نہیں تھی۔

اس کا ماتحت عملہ اس گھر کی پہلی خاتون آفیسر کو بے حد مروجیت کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کوئی اس کی ذہنی کیفیت اور اضطراب سے واقف نہیں تھا۔ واقف ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ چڑیا کو اپنے چہرے کے تاثرات اور اعصاب پر قابو رکھنا آتا تھا۔ اپنے ماتحت عملے کی رہنمائی میں گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ بالآخر اس ہال کمرے میں آگئی تھی۔ زندگی میں اس سے زیادہ تذلیل اور بے بسی کے احساس سے وہ کہیں دو چار نہیں ہوئی تھی۔ اس جگہ نے اس کی رسوائی کا تماشا دیکھا تھا..... وہ میٹریاں..... جن سے بھاگتے ہوئے اس نے اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد کی تھی اور وہ گیلری جہاں کھڑے ایک کے حلق سے نکلنے والی ہڈیانی چیخوں نے اس کی زندگی بچائی تھی۔ اسے اپنے حلق پر کسی کے ہاتھوں کی جان لیوا گرفت محسوس ہوئی اور پھر اس نے پل بھر میں اس گرفت کو ڈھیلا پڑنے دیکھا۔ اس پر جھکے اس کا گلا دبلتے شہباز حسین نے کرنٹ کھا کر اوپر گیلری میں کھڑے لکڑی کی ریلنگ پکڑے پاگلوں کی طرح روتے اور چلاتے ہوئے ایک کو خوف اور بے بسی سے دیکھا تھا۔ وہ اس سے اتنی دور تھا کہ وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا نہ اس کو روک سکتا تھا اور بالکل اس لمحے چڑیا نے بھی ایک کو دیکھا تھا۔ زمین پر پڑی چند لمحے پہلے سانس لینے کی جدوجہد کرتی بے دم چڑیا نے..... اور پھر وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شہباز حسین اسے دوبارہ پکڑا اور گرا نہیں سکا تھا۔ کچن کے دروازے سے تب تک ہڑبڑایا ہوا خیر دین اس ہال کمرے میں آگیا تھا۔

"میڈم اوپر چلیں؟" ایڈمن آفیسر نے اس کو بالکل ٹھیک وقت پر ٹوکا تھا۔ سر ہلاتے ہوئے اس

اپنی آنکھوں میں آئے پانی کو پلکیں جھپکاتے ہوئے روکا تھا۔ ڈاکٹر عکس فاطمہ اس گھر میں آنے سے پہلے یہاں آ کر نہ رونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ یہاں چڑیا بن کر رہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہاں "عکس مراد علی" بن کر آنا اور رہنا چاہتی تھی۔ اس شہر کی طاقتور ترین عورت۔

☆☆☆

"تم طاقت حاصل کرنا چاہتی ہو؟" خیر دین نے عجیب افسردگی کے عالم میں چڑیا کو دیکھا اور اس کا جملہ دہراتے ہوئے کہا۔ چڑیا نے کچھ کہے بغیر سر ہلادیا۔ اس نے کچھ دیر پہلے خیر دین کو یہ بتایا تھا کہ وہ میڈیسن پریکٹس نہیں کرے گی وہ سول سروس جوائن کرنا چاہتی تھی۔ اس کا فیصلہ خیر دین کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ اگلے کئی منٹ وہ کچھ بول ہی نہیں سکا تھا۔ وہ جس کیفیت کا شکار تھا چڑیا اس کا اندازہ کر سکتی تھی۔ اس گھر سے نکل آنے کے بعد سے اب تک اس نے خیر دین کو کبھی بھولے سے بھی کسی سے یہ ذکر کرتے نہیں سنا تھا کہ وہ کبھی کسی ڈی سی ہاؤس میں سرکاری ملازم کے طور پر کئی دہائیاں کام کرتا رہا تھا۔ خیر دین نے گاؤں میں اپنے گھر کے باہر سے اپنی نیم پلیٹ کے ساتھ ہی اپنی زندگی میں سے اپنے ماضی کے اس حصے کو بھی اتار پھینکا تھا۔

چڑیا نے نو سال کی عمر تک خیر دین کو ہر جگہ اور ہر شخص کو بے حد فخریہ طور پر اپنی اس سرکاری ملازمت کے بارے میں بتاتے سنا تھا۔ خیر دین کو اپنی ذات اور زندگی کے اس حوالے پر عجیب فخر تھا، عجیب مان تھا اور ایک نو سال کی بچی کے طور پر بھی چڑیا اس اثاثے کی قدر و قیمت سے واقف تھی جو خیر دین نے اس کی وجہ سے گنوا دیا تھا۔ لیکن زندگی میں اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ خیر دین کا یہ اثاثہ لوٹانے کے لیے کبھی کچھ کر پائے گی۔

کئی سالوں سے خیر دین اپنی وال کی وجہ سے اس سارے علاقے میں مشہور تھا۔ اس کے نام کا حوالہ اس علاقے کی بہترین وال کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی زبان پر تھا۔ ایسی شہرت اس نے ڈی سی ہاؤس میں کام کر کے حاصل نہیں کی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس..... ڈی سی ہاؤس سے نکل آنے کے بعد خیر دین نے زندگی میں بڑی ترقی کی تھی۔ چند سو روپے سے ایک ریڑھی پر شروع ہونے والا بزنس بارہ سالوں میں شہر کے ایک گنجان آباد اور بے حد مہنگے کاروباری علاقے میں ایک دکان میں تبدیل ہو چکا تھا جس کی مالیت تقریباً 50 لاکھ روپے تھی۔ اس کے پاس اپنا ڈبل اسٹوری گھر تھا، گاڑی تھی۔ اس کی دکان پر آنے والے بڑے بڑے لوگوں سے اس کی اچھی سلام دعا تھی۔ ایک وال والا ہونے کے باوجود اس کا اٹھنا بیٹھنا بہت اچھے لوگوں میں تھا لیکن اس کے باوجود چڑیا جانتی تھی کہ خیر دین کی زندگی کا سب سے بڑا رنج اس گھر سے اس بے عزتی کے ساتھ بے دخلی اور اس غیر منصفانہ انداز میں لوکری سے برخاستگی کا تھا جو یک طرفہ شنوائی کے نتیجے کے طور پر کی گئی تھی۔ اسے یقین تھا اس کی طرح اس کے نانا نے بھی اپنی زندگی کی ان تمام یادوں پر مینٹل بلاک لگا دیا تھا۔ کوئی اپنی بے بسی اور ذلت کے احساس کو بار بار relive نہیں کرنا چاہتا۔

اور اب اتنے سالوں بعد چڑیا کے فیصلے نے اسے جس طرح ہلایا ہو گا وہ چڑیا کے لیے سمجھنا مشکل

”میری زندگی کا خواب تھا کہ تم ایک ڈاکٹر بنو۔“ خیر دین نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا تھا۔ وہ چڑیا کی آنکھوں میں کون سی شے دیکھنے سے گریزاں تھا وہ یہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

”میں نے آپ کا خواب پورا کر دیا۔ ڈاکٹر تو بن چکی ہوں میں۔“ چڑیا نے سنجیدگی اور اطمینان سے کہا۔

”میری خواہش تھی کہ تم انسانیت کی خدمت کرو۔“ خیر دین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا وہ چڑیا کے سامنے کتنا گھسا پٹا جملہ دہرا رہا تھا، وہ جو صدیوں سے اخباروں میں پڑھتا اور لوگوں کی زبان سے سنتا آ رہا تھا۔

”انسانیت کی خدمت صرف ڈاکٹر بن کے ہی تو نہیں ہوتی مجھے لگتا ہے میں سول سروس کے طور پر انسانیت کی زیادہ خدمت کروں گی خاص طور پر اس معاشرے میں۔“ خیر دین جانتا تھا وہ چڑیا کو لا جواب نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے چڑیا کو logic کی گھٹی دے کر پالا تھا اور اب وہ اس کے منہ سے logic ہی سن رہا تھا۔

”انسانیت کی خدمت سرکار اور اس کے عہدے داروں کی خدمت سے بہتر ہوتی ہے۔“ پتا نہیں خیر دین کے اندر درد کا کون سا آبلہ پھوٹ کر بہا تھا جس کی ٹیس چڑیا تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ اس چھوٹے سے جملے میں خیر دین کی زندگی کا نچوڑ نہیں تھا اس کی درد بھری کتھا تھی۔ اس کا رنج، تکلیف، اس طبقاتی اور غیر مساواتی نظام کے سامنے اس کی بے بسی اور مایوسی جہاں نچلے طبقے کا کوئی شخص انصاف کے لیے پکار سکتا تھا لیکن حق نہیں لے سکتا تھا۔ اس جملے میں بے بسی اور تذلیل کی جو تاریخ چھپی تھی چڑیا بھی اس کا ایک باب تھی وہ اسے پہچانتی تھی۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں نانا۔“ خیر دین نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنی نواسی کو کہتے سنا۔ لیکن سرکار اور حکومتی مشینری میں ہماری نمائندگی ہونی چاہیے تاکہ وہاں بھی ”انسان“ نظر آئیں ”خدا“ نہیں۔“

”ایک فرد پورے نظام کو نہیں بدل سکتا۔“

”پھر ایک پچھلی پورے جل کو گندہ کرنے کی طاقت کیسے رکھتی ہے؟“

”چیزیں تبدیل کرتے کرتے زندگی گزر جاتی ہے انسان کی۔“

”تبدیلی کا حصہ بن کر زندگی گزارنا اور بہتری کی جدوجہد کرنا ایک معاشرے کی برائیاں گنتے

ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے بیٹھے زندگی گزارنے سے بہتر ہے۔“ ایک عمر میں انسان اپنی ہی سکھائی ہوئی logic سے مار کھاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے ایک نای گرائی پہلوان اپنے اکھاڑے میں اپنے ہی کسی پٹھے سے دہ داؤ کھا کر چیت ہو جو اسی کا سکھایا ہوا تھا۔

”میں پاور حاصل کرنا چاہتی ہوں کیونکہ اس کے بغیر میں اپنی بقا کی جنگ عزت سے نہیں لڑ سکتی، میں نے آپ کے ساتھ رہ کر دیکھا ہے زندگی میں..... اچھا اور شریف انسان ہونا بہت اچھی بات ہے نانا لیکن اچھا اور شریف ہونا ایک اچھی زندگی کی گارنٹی نہیں ہوتا اس معاشرے میں..... یہ خطرات کو

بڑھا دیتا ہے، کمزوری کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔“ خیر دین اپنی 23 سالہ نواسی کے منہ سے وہ باتیں سن رہا تھا جو اس نے اسے نہیں سکھائی تھیں جو زندگی اور تجربے جیسے دو ظالم استادوں کی دین تھیں۔

”میں دھکے کھا رہی ہوں ہاؤس جاب کے دوران topper ہونے کے باوجود..... جن کے پاس اثر، رسوخ ہے ان کو ابھی سے جاب سکیورٹی ہے، مجھے نہیں پتا مجھے جاب ملے گی یا نہیں..... جن کے پاس پیسہ ہے وہ ہاؤس جاب کے بغیر ہی ریڈیڈیسی کے لیے امریکا چلے گئے ہیں یا جا رہے ہیں..... وہاں سے اسپیشلائزیشن کریں گے..... پانچ دس سالوں میں واپس آ کر اپنی پرائیوٹ پریکٹس کریں گے اور million (لاکھوں) بنائیں گے۔ میں پاکستان میں رو دو کر بغیر سہولتوں والی ایک نوکری کروں گی..... دھکے کھا کھا کر مزید پڑھوں گی..... اور پانچ دس سال کے بعد بھی اسی طرح دھکے کھا رہی ہوں گی۔ میرے پاس باہر کی ڈگری نہیں ہوگی اس لیے مریضوں کو میری اہلیت اور خلوص نیت پر شبہ رہے گا۔ ایمانداری سے زیادہ قابل بھروسہ چیز ان کے لیے امریکا یا برطانیہ سے اسپیشلائزیشن ہے۔“ وہ بہت کڑوا سچ بہت مٹھاس کے ساتھ بول رہی تھی۔ سچی نہیں تھی بس حقیقت پسندی تھی اس کی زبان میں۔ وہ اپنے عوام کی نفسیات اور ترجیحات کو خیر دین سے زیادہ اچھی طرح جانتی تھی۔

”میں تمہیں آگے پڑھنے کے لیے باہر بھیجوں گا۔“ خیر دین نے یک دم اسے ٹوک کر کہا۔ وہ ہنس پڑی۔

”آپ کو پتا ہے باہر بھیجنے کے لیے آپ کو مجھ پر کتنا پیسہ لگانا پڑے گا..... لاکھوں میں۔“

”میرے پاس اب لاکھوں ہیں۔“ خیر دین نے بے ساختہ کہا۔

”گھر دکان اور گاڑی کی صورت میں..... بینک بیلنس کی صورت میں نہیں۔“ چڑیا نے کہا۔

”میں سب کچھ بیچ دوں گا تمہارے لیے چڑیا۔“ خیر دین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بے حد جذباتی انداز میں کہا۔

چڑیا کو عجیب تکلیف ہوئی تھی محبت کے اس بے لوث اظہار پر۔

”بس یہی میں اب نہیں چاہتی نانا..... میں اب اس عمر میں آپ کو در بدر نہیں کروں گی..... آپ

نے جتنا بوجھ اٹھانا تھا اٹھالیا۔ اب مجھے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اپنا بوجھ اٹھانے کی عادت ڈالنے دیں۔“ چڑیا نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”آپ نے ہی ایک بار کہا تھا، زندگی میں کپ اور ایوارڈ کچھ نہیں ہوتے لیکن قابلیت رکھتے ہوئے بھی ان کو حاصل نہ کرنا بد قسمتی ہے۔ مجھے بھی اب اپنی قسمت آزمانے دیں..... آپ نے مجھے ایک بہت اچھا اور مثبت سوچ والا انسان بنایا ہے۔ میں اس کے لیے آپ کی بہت شکر گزار ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ اب آپ مجھے وہ کام کرنے دیں جو زندگی میں مجھے اور آپ کو بے بس اور مجبور نہیں رہنے دے گا۔“ چڑیا خیر دین سے مشورہ نہیں کر رہی تھی نہ ہی وہ اس سے رائے لے رہی تھی۔ خیر دین چڑیا کو اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ اس کے عزم کو پہچان جاتا جو اس کے لہجے میں تھا۔ وہ خیر دین سے بات کرنے سے پہلے اپنے اس فیصلے کے بارے میں بہت غور و خوض کر چکی تھی۔

”اور اگر تمہاری یہ ساری باتیں سننے کے بعد بھی میں یہ نہ چاہوں کہ تم مقابلے کا امتحان دو تو؟“ خیر دین نے یک دم اس سے پوچھا۔

”تو میں نہیں دوں گی۔“ جواب ایک لمحے کے تامل کے بغیر آیا تھا۔ خیر دین دم بخود ہو گیا تھا۔ وہ چڑیا سے اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ چڑیا کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے یقین تھا وہ ویسا ہی کرتی جو وہ اسے کہتا۔ ننھا بگلا پہلی پرواز اس سے سیکھنے کے بعد اب اس سے لمبے سفر پر جانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ خیر دین کا دل بھر آیا۔ یہ کیسے ممکن تھا وہ چڑیا کی خواہش پوری نہ کرتا وہ اس کی زندگی کا فوکل پوائنٹ تھا۔ خیر دین کی پوری زندگی چڑیا کی خوشی، ناخوشی، پسند، ناپسند سے جڑی ہوئی تھی۔ انہی چیزوں کے گرد گھومتی تھی۔

چڑیا کے طفیل خیر دین کی زندگی میں فخر کے بہت سے لمحے آئے تھے۔ ہر بورڈ کے امتحان میں اخبار میں پوزیشن ہولڈرز کی تصویر خیر دین عجیب فخر اور غرور کے ساتھ اپنی دکان پر آنے والے ہر شخص کو کئی کئی دن دکھاتا رہتا۔ CSS کے امتحان میں ڈاکٹر عکس مراد علی کی پہلی پوزیشن کی خبر والا اخبار خیر دین کی زندگی کا وہ پہلا اخبار تھا جسے پکڑے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر اور ہلکے ہلکے کر رہا تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی اپنی ننھی چڑیا کا ایسا عروج اور ایسا نصیب نہیں دیکھا تھا۔ اس نے یہ کہاں سوچا تھا کہ اس کی چڑیا ایک دن اس کے نام کا اس قدر معتبر حوالہ بنے گی۔ وہ افسروں کا خدمت گار رہا تھا۔ ساری زندگی افسروں کے لیے کھانے پکاتے، کپڑے استری کرتے، جوتے پالش کرتے گزار دی تھی اس نے اور اس کا خیال تھا اس کا عروج بس وہی تھا..... اس سے زیادہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک لوہاروں کے خاندان سے تعلق رکھنے والا اس جماعت پاس آدمی کیا سوچ سکتا تھا..... اپنی اگلی نسل میں وہ افسر دیکھنا جس کے جوتے سیدھے کرتے ہوئے خیر دین نے عمر گزار دی تھی۔ مجزے سے کم نہیں تھا..... اور مجزے قدرت کی طرف سے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان میں کبھی کبھی انسانی محنت اور عقل کا نمایاں دخل ہوتا ہے۔

کئی ہفتے خیر دین کی دکان پر مبارک باد دینے کے لیے لوگ آتے رہے تھے۔ چند گھنٹوں میں اس بازار میں خیر دین کا اسٹیشن بدل گیا تھا جہاں اس کی دکان تھی۔ پہلے خیر دین کی ایک لائق نواسی تھی اب خیر دین ایک افسر نواسی کا نانا تھا..... تعارف کا حوالہ بدل گیا تھا۔ خیر دین کو پھر بھی خوشی تھی اور اس کا یہ تعارف گاؤں میں اس کے خاندان تک پہنچ گیا تھا۔

کئی سالوں کے بعد اس کے بھائی اور بھتیجے مبارک باد دینے کے لیے اسے ڈھونڈتے ہوئے اس کی دکان پر پہنچے تھے۔ خیر دین صدے سے دم بخود رہ گیا تھا۔ وقت کیسی ظالم شے ہے۔ دنوں کو پلایا تا ہوتا انسانوں کا اصل دیکھ کر ان سے گھن کھانے کو جی چاہتا ہے۔ خیر دین کو بھی بہت دیر سمجھ نہیں آئی تھی وہ ان خونی رشتے داروں کے ساتھ کیسے پیش آئے جو سورج کبھی کی طرح اس کے اچھے دن دیکھتے ہی اس کی طرف لوٹ کر آنے لگے تھے۔ اس نے انہیں دکان پر بٹھا کر کھانا کھلایا ان کی مبارک باد وصول کی لیکن انہیں چڑیا سے ملوانے گھر نہیں لے کر گیا۔ گھروں تک لے جانے والی اب کوئی بات رہ ہی نہیں گئی تھی۔

اس رات چڑیا اور خیر دین پھر جاگتے رہے تھے۔ گاؤں میں گزارہ ہوا وہ سارا وقت نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دُہراتے رہے تھے۔ خیر دین نے چڑیا کو اپنے خاندان والوں سے ملنے والی اور بہت سی تکلیفوں اور باتوں کو پہلی بار چڑیا کے ساتھ بانٹا تھا اور ان کا ننھا جیسی باتوں کو دُہراتے ہوئے بار بار رویا تھا۔ چڑیا اسے کھکتی بھلاتی رہی تھی۔ اس کا نانا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بوڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ جلد ہنس پڑتا تھا اور اس سے بھی جلد رو پڑتا تھا۔

”دیکھو چڑیا زندگی میں نام اور رتبہ بہت کم لوگوں کو ملتا ہے لیکن اس سے بھی کم لوگ اس نام اور رتبے کو سنبھال پاتے ہیں۔ رتبہ ملنا اعزاز کی بات ہے لیکن یہی سب سے بڑا امتحان بھی ہے۔“ چڑیا کو سول سروسز اکیڈمی ٹریننگ کے لیے چھوڑنے جانے سے ایک رات پہلے خیر دین نے اسے بہت ساری نصیحتیں کی تھیں۔ چڑیا ہمیشہ کی طرح خیر دین کی باتیں سنتی رہی تھی۔

”یہ جو طاقت اور افسری ہوتی ہے یہ انسان کو اندھا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، عقل والے اچھے انسانوں کو بھی..... تم عاجز رہنا، اپنے ماضی کو کبھی مت بھولنا اور اس ملک کی خدمت کرنا۔“ خیر دین بات کرتے کرتے رکاتے رکاتے تم مردوں کے ساتھ اور ان کی طرح کام کرو گی لیکن چڑیا تم مرد مت بن جانا۔ مردوں کی طرح دلیری اور بہادری دکھانا لیکن اپنی فطرت کی نری اور نسوانیت کھوئے بغیر عزت اور وقار سے کام کرنا۔ یہ نام و نسب سے زیادہ بڑی چیزیں ہیں۔“ چڑیا سر جھکائے خیر دین کی ایک ایک بات پر سر ہلاتی گئی تھی۔

”آپ کو پتا ہے جاب ملنے کے بعد میں پہلا کام کیا کروں گی؟“ اس کی باتیں سنتے ہوئے چڑیا نے یک دم خیر دین سے پوچھا تھا۔

”کیا؟“ وہ اس سے بات کرتے کرتے چونک گیا۔ وہ بے حد پراسرار انداز میں اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”دو کام کرنے ہیں نانا میں نے۔“ خیر دین حیران ہوا تھا۔

”کون سے دو کام؟“

”وقت آنے پر بتاؤں گی نانا۔“ اس نے بہت عجیب انداز میں خیر دین سے کہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خیر دین نے ان تمام ممکنہ کاموں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی تھی جو چڑیا کر سکتی تھی۔ اس کا ذہن کسی ایسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ سکا تھا جس کے بارے میں چڑیا نے بھی اس سے ذکر کیا تھا۔

چڑیا وہ کام سات سال بعد کر سکتی تھی..... پہلا کام بھی اور دوسرا کام بھی۔ پہلے کام کے لیے اس نے خیر دین سے اجازت لی تھی دوسرے کام کے لیے نہیں۔ وہ چڑیا کی زندگی کی پہلی نافرمانی تھی۔ خیر دین اگر وقت پر اس کے بارے میں جان جاتا تو وہ مرکز بھی چڑیا کو یہ قدم نہ اٹھانے دیتا۔ چڑیا اس سے زیادہ گہری تھی جتنا وہ اسے سمجھتا تھا..... چڑیا اس سے زیادہ ذہین تھی جتنا وہ خیر دین کو ساری زندگی ثابت کرتی رہی تھی..... اور چڑیا اس سے زیادہ شاطر تھی جتنا خیر دین اسے شطرنج کے بورڈ پر مانتا تھا۔

☆☆☆

”میں جب بڑی ہو جاؤں گی نانا تو میں ایک کھیل بناؤں گی چیس کی طرح کا..... جس میں سب کوئین کے لیے لڑیں گے اور کوئین ہی بادشاہ ہوگی۔“ سیاہ اسٹاف کار کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے۔ خیر دین نے اس کوئین کو ڈی سی ہاؤس کے وسیع و عریض داخلی گیٹ سے چند قدم آگے دونوں گارڈ پوسٹ کے درمیان کھڑا دیکھا تھا۔ ڈی سی ہاؤس کا گیٹ پورا کھلا ہوا تھا۔ گاڑی ڈی سی ہاؤس سے پہلے آنے والا آخری اسپید بریکر اس کر کے ابھی اس گیٹ کے سامنے آئی تھی۔

عکس مراد علی گھر میں آنے والے اس مہمان کا استقبال وہاں نہیں کر رہی تھی جہاں ڈی سی سب کا کیا کرتا تھا۔ وہ خیر دین کا استقبال وہاں اس دروازے پر کر رہی تھی۔ جس دروازے سے 26 سال پہلے ایک رات ان تینوں کو اٹھا کر باہر پھینکا گیا تھا۔ خیر دین کو یاد تھا اس ڈی سی ہاؤس کے گارڈز اسے گریبان سے پکڑے ٹھیکے اور دھکے دیتے ہوئے اسی گیٹ کو کھول کر باہر لائے تھے اور باہر کھڑی ایک پولیس موٹار میں ڈال کر لے گئے تھے۔ خیر دین کو یہ بھی یاد تھا اس نے اپنے پیچھے روتے ہوئے بھاگتی چڑیا سے واپس حلیمہ کے پاس جانے کے لیے کہا تھا۔ وہ نو سال کی بچی اس خوف اور سراسیمگی کی حالت میں بھی نانا کے حکم پر رک گئی تھی لیکن خیر دین اس کی پکار کو ساتھ لے کر جیل گیا تھا۔

”میرے نانا کو مت ماریں، میرے نانا کو مت ماریں۔“ کیا ذلت سی ذلت تھی اس جملے میں..... بے بسی کا ایک سمندر تھا..... وہ اس سمندر کے پار آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

خیر دین نے واسکٹ کی جیب سے رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں اور سر اٹھا کر فخر سے اسے دیکھا۔

اس کی چڑیا اس کھلے گیٹ کے بیچوں بیچ کھڑی تھی..... ویسے ہی مستعد اور مودب گارڈز کے بیچ میں جو گیٹ کے دونوں اطراف میں اب اپنی گارڈ پوسٹ سے باہر تھے۔ ڈرائیور کو جیسے سمجھ نہیں آیا وہ گاڑی آگے بڑھائے یا وہیں روک دے۔ خیر دین جانتا تھا وہ کھلا دروازہ کس بات کا اظہار تھا کس بات کا اعلان کر رہا تھا وہ قلعہ کنجیر کر لیا گیا تھا۔

ڈرائیور کی گاڑی کے رکتے ہی ایک گارڈ نے بڑی مستعدی سے آگے بڑھ کر خیر دین کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

”آپ جب وہاں آئیں گے تو روئیں گے نہیں.....“ اس نے فون پر خیر دین سے کچھ دیر پہلے کہا تھا۔

”لیکن کہاں بلا رہی ہو تم مجھے؟“ خیر دین حیران ہوا تھا۔

”ایک جگہ۔“ چڑیا نے اس سے کہا۔

”کھانا کھلانے۔“ خیر دین کو اس کی ٹرانسفر کے بارے میں پتا نہیں تھا نہ ہی یہ پتا تھا کہ وہ آج وہاں آ کر چارج لے چکی ہے۔ وہ قریبی شہر میں تھی اکثر اسے گاڑی بھیج کر بلوایا کرتی تھی۔ خیر دین آج بھی یہی سمجھ کر آیا تھا۔ گاڑی اور ڈرائیور دونوں وہ نہیں تھے جو اسے پہلے لینے آیا کرتے تھے۔ وہ پھر بھی نہیں چونکا تھا۔ وہ ڈی سی روڈ پر لیا جانے والا موٹر تھا جس نے خیر دین کو چونکا دیا تھا۔ اس شہر میں اتنے سالوں سے رہنے کے باوجود یہ وہ واحد سڑک تھی جس پر وہ کبھی مجبوری کی حالت میں بھی نہیں آیا تھا۔ اس سڑک پر موجود ایک گھر کے ساتھ اس کی ایسی یادیں وابستہ تھیں کہ وہ اس سڑک پر تھوکنہ بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے ڈرائیور سے پوچھا تھا۔

”ڈی سی ہاؤس۔“ ڈرائیور نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔ چند لمحوں کے لیے خیر دین کنگ رہ گیا تھا۔ اسے تب بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ وہاں اس گھر کے مالک کے طور پر اسے بلا رہی تھی۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ وہ وہاں کسی بیچ پر آئی تھی۔ وہ خفا ہوا تھا یہ سوچ کر کہ اس نے اس طرح بے خبری میں اسے وہاں بلایا تھا۔

سیاہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ کئی گز دور کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے چمکدار سیاہ آنکھوں میں کٹے ہوئے بال مسلسل چلتی ہوئی نرم ہوا کے جھونکوں سے اس کے ماتھے اور گالوں پر آرہے تھے جنہیں وہ گردن کی ہلکی سی حرکت سے بار بار جھٹک رہی تھی۔ خیر دین کو وہ ایک چھوٹی بچی لگی تھی جو بڑے فخریہ انداز میں اپنے اس پسندیدہ کھلونے کے ساتھ کھڑی تھی جس کو اس نے بڑی محنت اور ضد سے لیا ہو۔

وہ گیٹ سے باہر کھڑا تھا اور کئی گز اندر وہ اس کے بالمقابل کھڑی تھی۔ اسے خیر دین کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ وہ وہاں کس حیثیت سے کھڑی تھی۔

پانی کے ایک ریلے نے عکس مراد علی کا چہرہ دھندلا دیا تھا۔ خیر دین نے سر جھکا کر اپنے رومال کے ماتھے اس دھندلاہٹ کو صاف کر کے دوبارہ گردن اوپر اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا وہ چند گز کے اس فاصلے کو

سمیٹتے ہوئے اس کے بالکل قریب اس کے سامنے کھڑی تھی پوں کہ خیر دین اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ سکتا تھا پھر اس نے خیر دین کی آنکھوں کی نمی کو بیک وقت اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کی پوروں سے صاف کیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کئی سال پہلے اس گھر کی چھت پر کٹھن کباڑ کے ڈھیر میں سے اسے نکال کر اس کی آنکھیں پوچھیں تھیں اس کو سمیٹ لیا تھا۔ 26 سال بعد اس نے چڑیا کو روئے دیا تھا۔ آج چڑیا نہیں روئی تھی نہ ہی وہ خیر دین کو روئے دے رہی تھی۔ وہ دنیا کا واحد شخص تھا جو اس کے سامنے ٹوٹا تو وہ بھی ٹوٹی اور عکس مراد علی اس گھر اور شہر میں آنے والی پہلی خاتون آفیسر تھی۔ وہ اس گھر کے ماتحت مرد عملے کے سامنے وہ کمزور لمحے نہیں دکھانا چاہتی تھی جو اس کی عدم موجودگی میں اس کا مذاق اڑانے کے لیے استعمال ہوتے۔

خیر دین کی پشت کو تھوڑا سا رگڑتے، تھوڑا سا تھکتے ہوئے وہ اس سے الگ ہو گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ ڈی سی ہاؤس کے اندر جانے والے اس راستے پر چلنے لگی جو رہائشی عمارت کی طرف جارہا تھا۔

”یہ تمہارا دوسرا کام تھا جو تم میرے لیے کرنا چاہتی تھیں۔“ خیر دین نے یک دم اس دوسرے کام کو بوجھنے کی غیر متوقع کوشش کی۔ چڑیا نے گردن موڑ کر ساتھ چلتے ہوئے خیر دین کو مسکرا کر دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ خیر دین فخریہ انداز میں مسکرایا وہ چڑیا کا پہلا کام نہیں بوجھ سکا تھا لیکن دوسرا بوجھ گیا تھا۔ چڑیا ایک بار پھر بہت آرام سے خیر دین کو خوش فہمی کا شکار کر گئی تھی۔

”تمہیں یاد ہے یہاں اس راستے پر میں تمہیں سائیکل پر بٹھا کر اسکول لے کر جایا کرتا تھا۔“ اس ڈرائیو دے پر چلتے ہوئے خیر دین کو کیا کیا یاد آنے لگا۔ چڑیا نے اسے بولنے دیا۔ اس شخص نے اپنی جوانی کے پندرہ بہترین سال اس گھر میں گزارے تھے۔ اس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے اندرونی دروازے کے باہر برآمدے میں گئے اس آئینے کے سامنے آ کر رک گئے۔ خیر دین نے آخری بار جب اس آئینے میں اپنا عکس دیکھا تھا تو اس کا لباس..... اس کا چہرہ..... اور اس کا جسم..... اور ان تینوں چیزوں سے بھی بڑھ کر اس کی روح، اس کی زندگی اور اس کے وجود کے پر خچے اڑ گئے تھے..... اب 26 سالوں بعد وہاں اس آئینے کے سامنے کھڑے اپنے آپ کو دیکھنا کیسا صبر آزما کام تھا کوئی اس سے پوچھتا..... لیکن اگر کسی کو یہ پتا ہوتا کہ وہاں اس پر اور اس کے خاندان پر کیا گزری تھی تو کوئی بھی اس سے کچھ بھی نہیں پوچھتا۔

وہ ایک نظر جو اس آئینے کے سامنے سے چہنچہ چلاتے اس نے اپنے چہرے پر ڈالی تھی..... وہ چند سیکنڈ اس کے اندر سمندر کی کسی شوریدہ سرلہر کی طرح پلٹ کر آئے تھے..... سب کچھ اٹھل پھل کرتے..... ایک طوفان تھا جو اس کے اندر آیا تھا اور ایک طوفان تھا جو اس کی آنکھوں میں آیا تھا۔ پانی نہیں تھا وہ جو اس کی آنکھوں سے برس رہا تھا..... پانی ہوتا تو بہہ جاتا..... ہاتھ سے پونچھ لیا جاتا..... وہ تو آبلے تھے جو اس گھر میں داخل ہو کر اس آئینے تک آتے آتے یوں پھوٹے تھے کہ پھوٹے ہی چلے گئے تھے..... اور کیا کیا تھا جو ان آبلوں سے نہیں بہہ نکلا تھا..... درد کا ایسا سمندر اس کے اندر

اسے سالوں سے یوں قید تھا..... اس کو خود بھی کبھی پتا نہیں چلا۔ تکلیف تو تھی..... اذیت تو تھی..... جس کو اپنے وجود کے اندر مقید کرتے کرتے اس پر خاموشی کے تالے لگاتے لگاتے اس نے بہت سا وقت گزار دیا تھا..... اور وہ تکلیف وہ اذیت یوں پٹی بڑھی تھی اس کے اندر کہ ایک قطرے سے سمندر ہو گئی تھی۔ وہاں اس گھر کے دروازے پر اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر رونا خیر دین کی زندگی کی خواہشات میں کبھی شامل نہیں تھا۔ اس گھر کو دوبارہ دیکھنا وہاں دوبارہ آنا بھی اس کی زندگی کی خواہشات میں نہیں تھا..... لیکن وقت اسے وہاں لے آیا تھا اور کیسے لے کر آیا تھا..... آبلوں سے رسنے والی اذیت، دلت، اب تشکر بننے لگا تھا..... عاجزی، احسان مندی، تشکر..... اس کائنات کے حاکم اس ذات کے لیے تشکر اور احسان مندی..... جو دن پلٹا سکتا تھا اور جس نے دن پلٹا دیے تھے۔

زمین پر گھٹنوں کے بل گرتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے خیر دین نے اس گھر کے حاکم کے طور پر پہلا سجدہ کیا تھا..... اور وہ سجدہ کبھی ختم نہیں ہوتا اگر چڑیا کا وہ مہربان نرم مضبوط ہاتھ اس کی پشت کو مشفقانہ انداز میں نہ تھپکنے لگتا..... اس نے چڑیا کی تمام ہدایات اور نصیحتوں کو یکسر فراموش کر دیا تھا..... چڑیا نے سہارا دے کر اسے اوپر کھینچ لیا تھا۔ ساری زندگی اس ہاتھ نے یہی کیا تھا اس کے لیے..... اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے ساتھ اسے کسی ننھے بچے کی طرح چپکائے وہ دونوں اس گھر کے اندر جا رہے تھے۔ وہ صرف ایک چیز باہر بھول گئے تھے..... بد قسمتی۔

☆☆☆

بد قسمتی..... حماقت..... خوش فہمی..... پتا نہیں کیا چیز تھی جس نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی تھی۔ ایک شیردل نے لاہور اتر پورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں داخل ہونے سے بھی پہلے بہت دور سے اسے دوسرے ساتھی آفیسرز کے ساتھ خوش گپیاں لگاتے دیکھ کر سوچا تھا۔ وہ سنگاپور روانہ ہونے کے لیے لاہور اتر پورٹ پر اکٹھے ہو رہے تھے۔ آٹھ گھنٹے کے بعد انہیں لاہور سے کراچی پہنچ کر سنگاپور کے لیے روانہ ہونا تھا۔

اپنا ٹرائل بیک کھینچتے ہوئے ایک شیردل لاؤنج میں داخل ہو گیا تھا اور اس پر پہلی نظر ڈالنے والی وہی تھی۔ ایک سی گرین سوٹ کے اوپر بیچ کمر کا کوٹ پہنے اور گردن کے گرد ایک بال گرین اور بیج کلر کا پرنڈ سلک کا اسکارف لپیٹے وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح اسٹائلش تھی۔ اسٹائلش اور اٹریکٹو..... اور شیردل ہمیشہ کی طرح اس سے نظریں نہیں ہٹا پایا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہی گرم جوش، خوب صورت نرم مسکراہٹ جس کے لیے وہ اکیڈمی میں مشہور تھی۔ شیردل کوشش کے باوجود اس مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دے سکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ عکس مراد علی سے نظریں چرا گیا تھا۔ لاؤنج میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے وہاں بیٹھے دوسرے لوگوں سے ہاتھ ملایا پھر وہ عکس کے پاس آیا تھا۔

”ہمیشہ کی طرح سب سے آخر میں آئے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے شیردل کو جیسے یاد دلایا۔ وہ اکیڈمی میں ٹریننگ کے دوران ہر فیلڈ ٹرپ میں سب سے آخر میں پہنچنے والوں میں سے ہوتا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر اس کے قریب خالی صوفہ پر بیٹھ گیا تھا۔ عکس نے اسے بغور دیکھا اور پھر کہا۔

”خیریت؟“ شیردل نے گردن موڑ کر اس کو دیکھا۔ اس عورت کو جسے وہ زندگی میں سب سے

زیادہ چاہتا تھا جس سے وہ متاثر تھا، مرعوب تھا، fascinated تھا۔ جس سے زیادہ اس نے زندگی میں کسی عورت کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ صوفے پر ایک دوسرے کے برابر بیٹھے وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بے حد قریب سے..... ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے..... اور اس دن وہاں بیٹھے ایک شیردل نے پہلی بار اس چہرے کے نقوش میں چڑیا کو کھوجنا شروع کیا..... ذہانت سے بھرپور وہ چمکدار کالی گہری آنکھیں..... وہ آنکھوں سے آگے کہیں نہیں جاسکا۔ کسی اور مشابہت کی ضرورت ہی نہیں تھی اسے..... وہ چڑیا کی آنکھیں تھیں۔ عکس مراد علی آنکھوں کے علاوہ کچھ بھی ہی نہیں..... وہ اندھا تھا..... شیردل نے اس کے چہرے سے بے اختیار نظریں ہٹائیں اور گردن موڑ کر جیسے اپنے چہرے کو عکس کی نظروں سے بچانے کی کوشش کی۔ وہ چہرہ اسے بار بار کسی سے مشابہت کا احساس دلاتا تھا لیکن وہ بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ مشابہت اس کی زندگی کے بھیانک ترین خواب کے مرکزی کردار سے تھی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ اس بار اس نے دوبارہ شیردل سے پوچھا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے میں ایک سگریٹ پی کر آتا ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر یک دم اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔ عکس نے اسے اسموکنگ ایریا کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ ایک بلو casual چیز اور سفید شرٹ میں تھا..... اپنی چیز کی پاکش ٹوٹا سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرتے ہوئے..... عکس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی تھی۔ اس نے زندگی میں کسی کو اس مرد سے زیادہ نہیں چاہا تھا..... خیر دین کے بعد۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ بھی اس کو حاصل نہیں کر سکتی تھی..... وہ اس کے لیے نہیں تھا۔

اس کائنات محبت میں ہم مثل شمس و قمر کے ہیں
ایک رابطہ منسلک ہے ایک فاصلہ منسلک ہے
ہم خود کو بیچ دیں پھر بھی ہم تجھ کو پا نہیں سکتے
میں عام سا ہمیشہ ہوں، تو خاص سا منسلک ہے

لیکن بہت سی چیزوں پر دل کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ ایک شیردل سے 26 سال پہلے ملی تھی اور وہ 26 سال اس سے نہ ملنے کی خواہش رکھنے کے باوجود غیر ارادی طور پر ہر جگہ ہر شخص میں اسے ہی ڈھونڈتی رہی تھی۔ ہر ایک کے لیے لاشعوری طور پر وہ نرم گوشہ رکھتی تھی..... ایک سلطان سے ہونے والی طوفانی محبت بھی اس کے نام کی وجہ سے تھی..... وہ شعوری طور پر نہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی لیکن اس کا لاشعور جانتا تھا وہ ایک کے نام کی طرف کسی مقناطیس کی طرح جاتی تھی۔

ایک شیردل اس کا پہلا بیسٹ فرینڈ تھا..... بیرونی دنیا میں جھانکنے میں مدد دینے والی وہ کھرکی جس میں سے دیکھی جانے والی دنیا کو وہ بھی نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ ایک خوف ناک واقعہ رونما نہ ہوا ہوتا تو 26 سال پہلے وہ گرمیوں کی چھٹی کے چند ہفتے اس کی زندگی کی سب سے بہترین چھٹیاں ہوتیں۔ اس نے ایک شیردل کے ساتھ دنیا اور زندگی کے بہت سے حصوں اور چیزوں کو explore کیا تھا..... دوستی، ساتھ، وفاداری، بے وفائی، تجدید تعلقات..... ایک بچے کے طور پر وہ



مسافر

زندگی ایک سفر ہے اور ہم سب مسافر

لیکن اس داستان کے مسافر کا سفر طویل، سنسنی خیز اور دلچسپ ہے

حساس اور نرم دل کرداروں کا سفاک و سنگ دل حریفوں سے تصادم

رنگین سنگین واقعات جو نازک جذباتوں اور دل گداز لمحوں میں پروان چڑھتے ہیں

ان کے لیے جوا چھی کہانیوں کے رسیا ہیں

سطر سطر اپنی گرفت میں رکھنے والی اس یادگار سلسلے وار کہانی

آخری اترن تماشائے عشق مزاج آشنا اور جنت

کے تخلیق کار ناصر ملک کے قلم سے

سنسنی کے تازہ شمارے میں ملنا حظہ فرمائیں



خواب سفر میں رہے

رفعت سراج

طارق حسن بہت تھکے تھکے سے لاؤنج میں اہل ہوئے..... ایک ہاتھ میں بریف کیس تھا اور دوسرے ہاتھ سے ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کر رہے تھے۔ ان کی نظر اپنی دونوں بچیوں پر پڑی..... حراجس کی ماٹ سال تھی ہوم ورک کر رہی تھی، حساب جس کی لڑائی سال تھی..... کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ سلام کر کے دونوں کو متوجہ نہ والوں میں کاغذ پھاڑنے کی آواز سنائی

دی۔ ”چہ..... چہ۔“

حراجس کی کتاب کا صفحہ بے وردی سے پھاڑ رہی
ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء 53

ایک کے ساتھ اپنے اس مختصر relationship میں ہر سبج سے گزری تھی۔

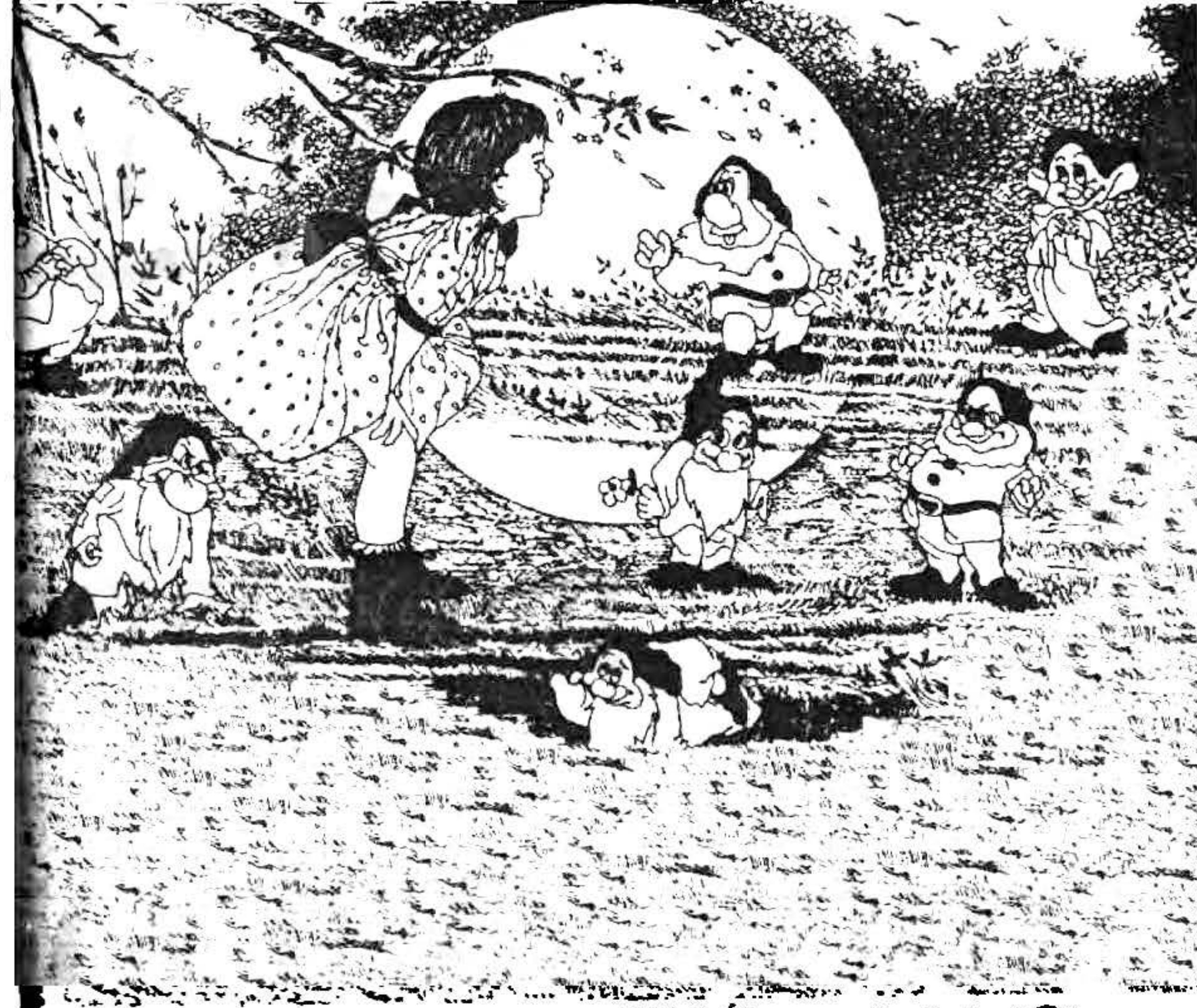
وہ اسے ایک بار پھر نظر آنے لگا تھا۔ اسی casual انداز میں..... تیز قدم اٹھاتا ہوا..... اسی دھیان میں کم..... وہ آج بھی وہاں بیٹھی بہت سی خواتین کی نظروں کو بھٹکانے کا باعث بن رہا تھا اور وہ اس سے بے خبر تھا۔ عکس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ پتا نہیں کیوں لیکن اسے بھی شیردل کو عورتوں مرکز نگاہ بننے دیکھ کر حسد نہیں ہوا تھا۔ ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوتا تھا۔

وہ دوبارہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا..... دونوں کے درمیان خاموشی تھی..... اور وہ دونوں خاموشی کے عادی نہیں تھے۔

”تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟“ عکس نے بالآخر اس خاموشی کو توڑا۔ شیردل نے کوئی تاویل سوچی لیکن پھر جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“

”کہو۔“ ایک شیردل نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے پھر شیردل نے یک دم بے حد غیر محسوس انداز میں اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لپا تھا۔ ”یہ مت کرو چڑیا۔“ اس نے بے حد گہری آواز میں اس سے کہا۔ (باقی آئندہ)



تھی۔ طارق کے تھکے تھکے ذہن پر جیسے کوئی ہتھوڑا برسا..... حرا ایک اچھے اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ نصابی کتب بہت مہنگی تھیں۔

”ثریا..... ثریا بھی کہاں ہو.....؟“ انہوں نے بہت برہم ہو کر اپنی بیوی کو آواز دی۔ ثریا کچن سے گرتی پڑتی باہر آئی، شوہر کے لہجے کی ہر آہٹ اسے قدم اٹھانے کی سمت بتا دیتی تھی۔

”السلام علیکم..... آپ کب آگئے..... پتا ہی نہیں چلا.....“ وہ طارق کے چہرے کو تو لٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”تمہیں تو کچن میں مھنے کے بعد کوئی ہوش نہیں رہتا..... یہ دیکھو اس نے نئی کتاب کا کیا حشر کیا ہے۔“ طارق نے حرا کی طرف اشارہ کیا، جبکہ دونوں بچیاں باپ کے موڈ کی پروا کیے بغیر پاس آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔

”پاپا..... آپ میرے چاکلیٹ لائے ہیں نا.....؟“ حبالاڈ سے باپ کے کندھے سے جمول گئی۔

”پاپا..... وہ میرے ریکٹ.....“ حرا کو بھی کچھ یاد آ گیا۔

”آپ دونوں نے پاپا کو سلام کیا..... کتنی بری بات ہے۔“ ثریا نے دونوں کو گھورا۔

”سوری پاپا..... میں بھول گئی۔ وہ میرے ریکٹ.....“ حرا نے سوری بھی یوں کہا جیسے جان چھڑائی ہو فوراً اپنے مطلب پر آ گئی۔

”میرے چاکلیٹ.....“ حرا سوری۔ طارق نے بچیوں کے معصوم چہروں پر نظر ڈال کر اپنا خراب موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی اور حرا کو گود میں بٹھالیا۔

”آپ نے پاپا کو غصہ دلایا ہے نا..... کتنی مرتبہ سمجھایا ہے اپنی بک خراب نہیں کرتے۔ جج نہیں پھاڑتے۔“

”میری دوست نے اس پر اوور رائٹنگ کر دی تھی۔ مجھے گندا لگ رہا تھا۔“ حرا نے بڑی شان سے نیازی سے جواب دیا۔

”آپ نے اپنی دوست کو بک کیوں دی تھی سب کے پاس اپنی اپنی بک ہوتی ہیں؟“

”وہ اپنی بک گھر بھول کر آ گئی تھی۔“ حرا نے اسی طرح معصومیت اور بے پردائی سے جواب دیا۔

”اچھا آپ جا کر اپنا ہوم ورک پورا کریں۔“ کوریٹ کرنے دیں۔

”ثریا..... یہ نت نئے کھانے پکانے کے چکر سے نکلو۔ ان بچیوں کی تربیت کرو۔ اتنی مہنگائی ہو گئی ہے۔ ایک تنخواہ میں مہینہ پورا کرنا عذاب ہوتا ہے۔ حرا کی بکس حرا کے کام آئیں گی..... دو تین ہزار کا خرچہ کم ہوگا۔“

”میں تو حرا کی ہر چیز ہی حرا کے کام میں لے آتی ہوں۔ مجھے خود احساس ہے کہ مہنگائی کے اس عذاب نے کھل کر سانس لینا دو بھر کر دیا ہے۔“ ثریا نے حرا، حرا کی کتابیں اٹھا کر بڑبڑاتے ہوئے کہا اور کتابیں، کاپیاں ان کے بیک میں رکھنے لگی۔

☆☆☆

”آپا صرف ہزار روپے مہینے کی تو بات ہے..... پچیس ہزار کی بیسی ہے۔ یہ بھی بچت کا ایک طریقہ ہے۔“ ثریا کی چھوٹی بہن نائلہ آج سویرے آگئی تھی اور نئی بیسی کی ممبر شپ کے لیے ثریا پر زور ڈال رہی تھی۔

”ہزار روپے مہینہ..... پورے دو سال ایک ماہ کی بات ہے۔“ ثریا غور و خوض کرتے ہوئے کہہ رہی تھی چہرے پر تفکرات کی لکیریں واضح تھیں۔

”دو سال پتا بھی نہیں چلیں گے۔ کوئی درمیان کا نمبر آپ کو دے دوں گی۔“ نائلہ نے پھر کونٹیں کرنا

شروع کیا۔

”بات تو ٹھیک ہے، پچیس ہزار ہاتھ میں آئیں گے تو کوئی خاص کام ہی ہو جائے گا۔ بچوں کے سٹیشن پر سہولت ہو جائے گی۔ عید کے زمانے میں ذرا ہاتھ کھل جائے گا۔“ ثریا نے سوچنا شروع کر دیا۔

”آپا! بچیوں کا ساتھ ہے کل کو شادی بیاہ بھی کرنا ہے۔ بچیوں کے جہیز کے لیے کوئی چیز خریدی جاسکتی ہے۔“ نائلہ نے پھر راستہ سمجھایا۔

”بات تو ٹھیک ہے۔ ہمارا کون سا بیٹا ہے جس کے جوان ہونے کے بعد زندگی میں کسی سہولت کا آسرا ہو۔

”آپ بھی بس بہت سیدھی ہیں۔ مردوں کو تو اپنی بچت کا تانا ہی نہیں چاہیے، وہ تو اپنی کوئی ضرورت نکال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بس آپ چپکے سے ڈال لیں۔“ نائلہ نے پھر صائب مشورہ دیا۔

”ہوں..... مگر ہزار روپے مہینہ تنخواہ سے الگ کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔“ ثریا نے نئے سرے سے غور کرنا شروع کر دیا۔

”بس آپ کل شام تک مجھے بتا دیجیے گا پھر مجھے نمبر فائل کرنا ہیں۔“ نائلہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”تم تو ایک دم کھڑی ہو گئیں، دوپہر کا کھانا کھا کر جانا۔“ ثریا نے تکلفات نبھائے۔

”بس ثریا آپا..... بہت کام ہیں..... پھر کسی روز فرصت سے آؤں گی تو کھانا بھی کھالوں گی۔“ نائلہ پر اب جانے کی جھلک سوار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”اب درمیانہ طبقہ رہا ہی کہاں ہے ایک طرف ریل کیل ہے تو دوسری طرف چادر کے ساتھ کھینچا ہائی..... سر ڈھانپو تو پاؤں نیچے، پاؤں ڈھانپو تو سر نکلا۔“ طارق نے آج کی شاہنگ ثریا کے سامنے رکھتے ہوئے ہزاری سے کہا۔

”یہ سوئٹر تو حرا کے بڑا ہوگا.....“ ثریا نے ایک سوئٹر کھول کر پھیلا یا اور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”میں نے جان بوجھ کر بڑا لیا ہے..... دو تین سال حرا پہن لے گی پھر حرا کے کام آجائے گا۔“ طارق نے تھکے تھکے انداز میں کہہ کر صوفے کی بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

”اگر رُواں آ گیا تو بیکار ہو جائے گا۔“ ثریا نے متفکر انداز میں پھر سوئٹر کا جائزہ لیا۔

”اسی لیے مہنگا والا لیا ہے..... سوئٹر تیزن میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔ ہر سال ہزار دو ہزار کے سوئٹر خریدو تو مفت کا خرچہ بڑھتا ہے۔ اب اسی طرح بچت ہو سکتی ہے۔“

”میں تو حرا کے کپڑے حرا کو پہناتی ہوں..... خود بخود بچت ہو جاتی ہے۔ حرا کے بجائے بیٹا ہوتا تو دو بچوں کے خرچے ساتھ ساتھ چلتے۔“ ثریا نے طارق کے لائے کپڑے اور سوئٹر سمیٹتے ہوئے کہا۔

”بیٹے جوان ہو کر خرچے پورے بھی کر دیتے ہیں۔ بیٹیوں پر تو زندگی بھر خرچ ہی کرنا ہوتا ہے۔ پڑھ کر فارغ ہوں گی تو شادی کی فکریں۔“ طارق نے دور کھڑی حرا پر کھوئی کھوئی نظر ڈال کر کہا۔

”اب وہ زمانہ نہیں..... لڑکیاں بھی پڑھ لکھ کر اچھے عہدوں پر کام کرتی ہیں۔“ ثریا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”مگر فائدہ تو شوہر کو پہنچاتی ہیں۔ باپ کے گھر سے تو ایک دن رخصت ہو جاتی ہیں۔“

”آپ تو بعض اوقات اس طرح سے جتانے ہیں جیسے میں بیٹیاں جہیز میں لائی تھی۔“ اب ثریا چڑ گئی۔

”کیسی باتیں کرتی ہو؟ میری بیٹیاں میری اولاد ہیں اور اولاد جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ وہ تو ایک بات چلی تو کہہ دیا..... تم کبھی کبھی زیادہ ہی حساس ہو جاتی ہو۔“ طارق کو فوراً ثریا کے جذبات کا احساس

ہوا۔ پرس خالی ہو جائے تو خوب صورت و خدمت گزار بیوی بھی دل نہیں بہلاتی۔ وہ پریشانی کی کیفیت میں گھر میں داخل ہوئے تھے اور بیوی کے سامنے کچھ سے کچھ بول پڑے۔ مگر ثریا کی آزر دگی نے انہیں فوراً محتاط کر دیا تھا۔ ابھی انہوں نے ثریا کو یہ نہیں بتایا تھا کہ کل انہیں آفس میں نفی صاحب سے ہزار روپے قرض لینے ہیں کیونکہ ابھی تنخواہ ملنے میں پورے سات دن باقی ہیں۔

”یار ایک کپ چائے تو پلا دو..... بہت تھک گیا ہوں۔“ طارق نے اب بڑی اپنائیت سے کہا۔

”ابھی لائی..... حرا..... حبا..... جلدی سے اپنا ہوم ورک کمپلیٹ کر دینا۔“ ثریا بولتے ہوئے کچن کی طرف جا رہی تھی۔

☆☆☆

وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا..... ثریا اور طارق کے سر میں چاندی اترنے لگی اور حبا، حرا..... نے خوب صورت دو شیزاؤں کا روپ دھار لیا۔ حرا کا شروع سے رجحان میڈیکل کی طرف اور حبا کا فائن آرٹس کی طرف تھا۔ ثریا اور طارق نے تو پورا زور لگایا تھا کہ کسی طرح حبا بھی میڈیکل لائن ہی منتخب کر لے مگر حبا کو میڈیکل سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں تھی۔ حرا اور حبا میں ڈھائی سال کا فرق تھا مگر جوان ہونے کے بعد دونوں جڑواں ہی نظر آتی تھیں۔ دیکھنے میں خوش شکل و سرور قامت تھیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ ثریا اور طارق ہر ہفتے آنے والے رشتوں سے حواس باختہ سے ہو گئے۔ متوسط طبقے میں لڑکی کی شادی کوئی مذاق بات نہیں ہوتی مگر طارق کی ریٹائرمنٹ قریب تھی اس لیے قدرے اطمینان تھا کہ شادیاں تو ہو جائیں گی مگر مکان نہیں بن سکے گا۔ بڑھاپے میں کیا ہوگا۔ کوئی بیٹا بھی نہیں جس کے گھر میں بہو کی لعن طعن سننے ہوئے زندگی کے دن پورے کیے جاسکیں۔

حرا کو ایک خاتون نے محلے کی شادی میں پسند کیا تھا اور رشتے کی بات چھیڑتے ہی حتیٰ فیصلہ سنا دیا تھا کہ آپ کے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گی۔ لڑکا ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ گریجویٹ انجینئر تھا۔ باپ کا ذاتی کاروبار تھا۔ خاندان اچھا تھا۔ کوئی بھی بات ایسی نہیں تھی جسے بنیاد بنا کر انکار کیا جاسکے مگر حرا نے انکار کر دیا..... وہ بہت حساس تھی گھر میں ماں باپ کی بظاہر سرگوشیوں میں ہونے والی باتیں اس کے کان میں بھی پڑتی تھیں۔ وہ اپنے ماں باپ کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی اس نے وقتی طور پر بہانہ بنا دیا کہ اس کی پڑھائی ڈمرب ہوگی فی الحال اس کی شادی کی باتیں نہ چھیڑی جائیں۔

ثریا نے دل پر پھر رکھ کر انکار کر دیا۔ حرا کے کیریئر پر وہ کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے تھے جو بچاتے تھے اس پر لگاتے تھے مگر لڑکے کی ماں انکار سن کر ذرا بد مزہ نہ ہوئیں جھٹ حبا کے لیے سوال کر دیا کہ بیٹی تو آپ ہی کی لٹی ہے۔ آپ جیسا خاندان ہمیں کہاں ملے گا۔ ثریا اور طارق پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ نانکھ نے سنا تو گرتی پڑتی آگئی اور لگی بہن کو سمجھانے کہ اچھے رشتے ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے۔ آخر حبا کی بھی تو ایک دن کرنا ہی ہے..... وہ تو فائن آرٹس پڑھ رہی ہے۔ اس کا کوئی حرج نہیں ہوگا۔ شادی کے بعد بھی امتحان دے سکتی ہے۔ آخر کار حبا کے لیے رشتہ منظور کر لیا گیا۔

”آپ کے کپڑے کتنا میں تو میرے پاس خود بخود آتی رہیں اب رشتہ بھی آپ سے گزر کر ہی مجھ تک پہنچا۔“ وہ حرا کے سامنے ہنستے ہوئے بولی مگر اس ہنسی کو فوراً ہی زخم لگ گیا۔ زخم بھی ایسا کہ آٹھ پہر خون رسنے لگا۔ اس کا منگیتر فہد ایک حادثے میں تیز رفتاری کی بنا پر ہو گیا۔ جوان جنازہ اٹھتا ہے تو ہر طرف کالی آندھی اٹھتی ہے پھر کسی گھر کا اکلوتا چشم و چراغ..... پھر تو نہ مٹنے والے اندھیرے ڈیرا ڈال دیتے ہیں۔ مرنے

والے کے گھر میں ہر طرف سے تعزیت گئی اور وہاں سے حبا کے لیے منحوس ہونے کا الزام آیا..... ماں، بہن کرتے ہوئے دنیا سے کہہ رہی تھی کہ اس لڑکی کی محبت میرے بیٹے کو کھا گئی۔ ثریا اور طارق کو اس الزام سے جو زخم لگنا تھا مگر حبا نے حرا سے کہا۔

”آپ..... آپ کی ہر چیز مجھے ملتی ہے..... اصولی طور پر تو یہ الزام آپ کے سر لگنا تھا..... مگر یہ بھی آپ کی ہر چیز کی طرح میرے پاس خود بخود آگیا۔“ حبا تو اتنا کہہ کر چلی گئی مگر حرا کو جیسے بہت کچھ سوچنے کے لیے دے گئی۔

☆☆☆

”ثریا آپا..... سمجھ نہیں آئی کہ بیٹھے بٹھائے بچی کے ساتھ کیا ہو گیا۔“ نانکھ آج صبح صبح صبح سے ملنے آئی تھی اور بہت دھمکی ہو رہی تھی۔

”میں بھی سوچتی ہوں چار دن منگنی رہی..... نہ ہوتی تو کیا ہو جاتا۔ ہمیں تو کوئی جلدی نہیں تھی بلکہ ہم نے تو ابھی ان دونوں کی شادیاں کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔“ ثریا بھی غمزہ انداز میں بولیں۔

”بس شاید ایک داغ لگنا تھا پھول سی بچی کو..... اسے قسمت ہی کا لکھا کہیں گے۔“ نانکھ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”میں نے تو سوچا ہے اب میں دونوں میں سے کسی کی منگنی نہیں کروں گی جہاں بھی ہاں کہوں گی ڈائریکٹ شادی کی بات کروں گی۔ منگنی کے نام سے ہی اب تو میرا دل کانپتا ہے۔“ ثریا بولیں۔ نانکھ نے ایک دم ثریا کو گلے سے لگایا۔

”آپا وہم نہ کریں..... ایک ہونی تھی ہو کر رہی..... اچھا سوچیں اور ان کے لیے دعا کریں۔“ وہ بہن کو دلا سادے لگی جبکہ اس کی اپنی آنکھیں نم تھیں۔

☆☆☆

طارق کے چھوٹے بھائی صدک کی بیٹی کی شادی

مختصر ہسٹری قصہ چک رامدا اس

چک مبارک چار سو سال قبل دریائے جہلم کے کنارے بنجاب جنوب بھیرہ جمادریاں روڈ آباد ہوا۔ 1891-92 سے 285 سال قبل نور دین بادشاہ کے دور میں چک مبارک کا نام چک مبارا تھا مبارا پنجوتھ کے ہاں اولاد نہ تھی چک مبارا سے 35 کوس دور جلال پور شریف سے ہندو سادھو کنیش داس ذات رامدا اس جس کی بیوی کا نام رامدی تھا کو دعا کے لیے چک مبارا میں بلوایا جس کی دعا سے مبارا پنجوتھ کی اولاد یعنی بچہ پیدا ہوا جس کی خوشی میں مبارا نے آدھا گاؤں کنیش داس کو نذرانے میں دے دیا جس کے بعد ہندو یہاں آکر آباد ہوئے اور بعد ازاں بقیہ گاؤں بھی ہندوؤں کی ملکیت میں چلا گیا۔ 1891-92 میں ہندوؤں نے اس وقت کی حکومت سے مبارا کی جگہ رامدا اس تبدیل کروالیا۔ صدر پاکستان سردار فاروق لغاری کے چک رامدا اس کے خطاب کے موقع پر کینوں کے بھرپور احتجاج پر تبدیلی نام چک رامدا اس سے چک مبارک رکھ دیا گیا۔ 13 اگست 2004ء کو گورنر پنجاب کی طرف سے ضلعی ناظم سرگودھا کی خصوصی دلچسپی سے نوٹیفکیشن جاری ہو گیا۔

مرسلہ: جیس ہاشمی..... بھیرہ ضلع سرگودھا

اچانک ٹھہر گئی تھی۔ اب ثریا کو فکریں لگ گئی تھیں۔ وہ ہر وقت سوچ میں گم نظر آنے لگیں تو جانے پوچھ لیا۔
”ای! کیا بات ہے، آج کل آپ بہت چپ چپ رہنے لگی ہیں؟“

”صدمہ کی بیٹی کو کیا دوں..... سمجھ نہیں آرہی۔“
”جیسے دے دیں جیسے شادیوں میں سب لوگ دیتے ہیں۔“ جہا کو ماں کی الجھن سمجھ نہیں آئی تو بڑی سادگی سے حل بتا دیا۔ ثریا نے گہری سانس لے کر اپنی کم عمر بے خبر بیٹی کی طرف دیکھا۔

”تمہارے سگے چچا کی بیٹی ہے اور اتنی قریبی شادی میں ہزار دو ہزار نہیں دیے جاتے..... کوئی بڑا گفٹ دینا پڑتا ہے۔“ ثریا نے وضاحت کی۔
”اگر کسی کے پاس نہ ہو تو کیا ڈاکا مارے؟“ جہا نے چڑ کر سوال کیا۔

”بیٹا..... کچھ روایتیں چلی آرہی ہیں۔ بھانا پڑتی ہیں۔“ ثریا نے جواب دیا۔
”تو پھر چچی جان سے مشورہ کر لیں۔ جو ضروری چیز رہتی ہو وہ آپ دے دیں۔“ جہا نے بے پروائی سے مشورہ دیا۔

”تم نے تو بڑی آسانی سے کہہ دیا..... اگر انہوں نے بڑا اودن یا فریج کا کہہ دیا تو کہاں سے بیس پچیس ہزار لاؤں گی؟“ ثریا دہل کر بولیں پھر سوچتے ہوئے کہنا بھی تو حرا کی فیس بھر کر بیٹھی ہوں۔ پھر شادی پر تم لوگوں کے کپڑے بھی بنانا ہوں گے..... آخر گھر کی شادی ہے۔“ ثریا متفکر ہو کر کہہ رہی تھیں۔

”میں برات والے دن اپنا عید کا سوٹ پہن لوں گی اور ویسے میں آپا کا۔ آپ آپا کے سوٹ بنا دیجیے..... مجھے تو آپا کی اترن کی عادت ہے مگر ان کو کسی کی اترن پہننے کی عادت نہیں ہے۔“ جہا نے ایک نظر ماں کی طرف دیکھا اور عجیب سے انداز میں مسکرا کر بولی۔ ثریا نے تڑپ کر جہا کو گلے سے لگالیا۔

”بیٹا بہن کی اترن، اترن نہیں ہوتی..... اس کی شادی ہو جائے گی تو پھر تمہارا ہی کرتا ہے۔“
”تو میں کون سا آپ سے شکایت کر رہی ہوں..... میں تو آپ کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کر رہی ہوں..... آپ کو پریشان دیکھ کر میں بہت ڈسٹرب ہو جاتی ہوں۔“ جہا نے بڑی محبت سے ماں کے گرد اپنے بازو لپیٹ کر کہا۔
”جتنی رہو، اللہ تمہیں ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔“
ثریا نے جہا کی پیشانی چوم لی۔

☆☆☆

ثریا روٹین کی گروسری شاپنگ کر کے گھر آرہی تھیں تو پتا چلا پڑوس والا گھر برسوں بعد آباد ہو گیا ہے۔ باہر کار بھی کھڑی ہوئی تھی اور رنگ دروغن کرنے والے مزدور بھی ادھر ادھر کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ ثریا کو اس خالی گھر سے بڑی وحشت ہوتی تھی کیونکہ دیوار سے دیوار ملی تھی۔ اندھیرے میں ڈوبے گھر کو دیکھ کر کسی بھوت بنگلے کا تصور ہی آتا تھا۔ رات کو ثریا نے طارق کو خوش خبری سنائی تو پتا چلا طارق کو تمام تفصیلات پتا ہیں۔

”ارے بھی ایکسائز کے کوئی ریٹائرڈ افسر ہیں۔ تین بچے ہیں۔ ایک بیٹا us میں ہے۔ ایک بیٹی اور بیٹا غیر شادی شدہ ہیں۔“
”تو آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا.....؟“ ثریا کو حیرت ہوئی۔

”بھئی یہ کون سی خاص خبر تھی..... ایک خالی گھر تھا۔ آباد ہو گیا اچھی بات ہے۔“ طارق نے بے نیازی سے کہہ کر بریف کیس سے ایک فائل نکالی اور ٹاک پر عینک لگا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔
”حد ہو گئی..... پڑوس آبا و ہو گیا۔ ہمیں جانا چاہیے۔ سلام دعا کرنی چاہیے۔“ ثریا نے اپنا سر پیٹ کر طارق کی بے نیازی پر گویا احتجاج کیا۔

”تو چلی جانا..... ویسے آج کل پڑوسیوں کو ہچمنے کا فیشن ہی کہاں رہا ہے۔“ طارق نے ریڈ چین سے پیپر انڈر لائن کرتے ہوئے اسی طرح بے نیازی سے جواب دیا۔

”پڑوسیوں کا بہت حق ہوتا ہے..... مشکل وقت میں رشتے دار بعد میں اور پڑوسی پہلے پہنچتے ہیں۔ میں تو صبح کوئی سویٹ ڈش بنا کر لے جاؤں گی۔ اس طرح ایک دوسرے سے تعارف بھی ہو جائے گا..... پھر کسی دن چائے پر بھی بلا لوں گی۔“ طارق کی خاموشی کا مطلب تھا انہیں ثریا سے اختلاف نہیں ہے۔ ثریا کے چہرے پر ایک طمانیت سی تھی۔

”شکر ہے یہ گھر بھی آباد ہوا..... سنا ہے کسی بے اولاد بوڑھے کی پر اپنی تھی۔“ ثریا کرے سے جاتے جاتے رک کر طارق سے پوچھنے لگیں۔

”اللہ نے دوکان سننے کے لیے ہی دیے ہیں۔ سنتی رہو۔“ طارق نے معروف انداز میں کہہ کر ظاہر کیا کہ انہیں فی الحال اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ثریا نے برامان کر شوہر کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

ثریا نے دیکھتے ہی دیکھتے پڑوس میں اچھی خاصی راہ و رسم بڑھ چکی تھی۔ خاتون خانہ کو بھی ثریا سے ایک لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ ثریا آئے روز کچھ نہ کچھ بنا کر بھجوانی رہتی تھیں۔ زیادہ تر وہ خود ہی لے جاتیں کبھی کبھی جہا کے ہاتھ بھجوا دیتیں۔ اس گھر میں اس کی ہم عمر لڑکی بھی تھی۔ مہا کو خود بخود نئے پڑوس سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ صاحب خانہ کا نام اکرم ہاشمی تھا..... ہاشمی صاحب سے معروف تھے۔ خاتون خانہ کا نام عائشہ اور بیٹی کا نام نادیہ تھا جبکہ لانا luma میں پڑھ رہا تھا جسے گھر میں پیار سے جگنو لالہ تھے اصل نام نادیہ ہی نے بتایا تھا کہ بھائی کا نام لالہ لے بہت مشکل رکھا تھا مختصر ہاشمی..... اس لیے ماما لے ان کا یہ تک نیم رکھا۔ اکثر نادیہ اور عائشہ جگنو کا ذکر

کرتی تھیں جو چھٹیوں میں گھر آتا تھا۔ جگنو..... عرفیت کے لحاظ سے جہا کے ذہن میں ایک کم عمر سادہ بلا پتلا کھنڈر لڑکا بس گیا تھا..... مگر آج جب وہ ماں کا بتایا ہوا انڈوں کا حلوہ لے کر آئی تو یہ دیکھ کر شیشا..... گئی کہ ایک چھ فٹ کا صحت مند کسرتی جسم والا لوجوان پائپ لگائے پائپ لگائے چڑھائے کار دھور ہا تھا..... اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ جگنو ہو سکتا ہے، شراپ شراپ ادھر ادھر پائپ سے پانی کی دھار گر رہی تھی۔ جہا پانی کے چھینٹوں سے خود کو بچاتے ہوئے ایک طرف کھڑی ہو گئی کہ وہ لوجوان پانی بہانا بند کرے تو وہ آگے بڑھے۔ جگنو نے گھبرائی سی الجھنی لڑکی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا جو ہاتھ میں ایک قاب لیے راستہ ملنے کی منتظر تھی۔

”آپ کی تعریف.....؟“ جگنو نے آگے بڑھ کر پائپ بند کرتے ہوئے جہا سے پوچھا۔

”وہ..... یہ..... حلوہ.....“ جہا اس خود اعتماد لوجوان کے سامنے اپنا اعتماد دکھوٹ گئی۔

”حلوہ.....؟ لیکن مجھے تو جلوہ نظر آ رہا ہے۔“ لوجوان نے شوخی کا مظاہرہ کیا تو جیسے جہا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پہلی بار کسی لوجوان نے اس کے ساتھ اس طرح شوخ انداز میں بات کی تھی۔

”وہ عائشہ آئی..... نادیا گھر پر ہیں؟“ جہا نے خود کو بہ مشکل سنبھالا۔

”اوہ..... آئی ایم سوری..... میں تو آپ کو کوئی الجھنی سمجھا تھا..... مگر آپ تو شناساؤں میں سے نکلیں.....“ جگنو کے انداز میں پھر شرارت تھی۔

”جی، مجھے اندر آنٹی کے پاس جانا ہے۔“ جہا اب خود کو مکمل طور پر سنبھال چکی تھی۔

”تو میں نے آپ کو پکڑا ہوا تو نہیں ہے۔ میری طرف سے آپ آزاد ہیں۔ آگے بڑھیں۔“ جگنو lums میں پڑھ رہا تھا۔ ”کلاس“ میں نشست د

کے دل میں کچھ ہے۔
 ”لڑکی دیکھ لی ہے؟“ ثریا نے بڑی بے نیازی سے پوچھا۔
 ”لڑکی تو دیکھ لی ہے..... آگے نصیب۔“ عائشہ نے اپنے کپ پر نظریں جما کر ذمہ لے لی۔ جواب دیا۔
 ”تو بات آگے نہیں بڑھائی؟“ ثریا نے پوچھا۔
 ”بڑھا رہی ہوں۔ اسی لیے تو آپ سے بات کر رہی ہوں۔“ عائشہ کے دل کی بات بالآخر زبان پر آ گئی۔ ثریا نے چونک کر عائشہ کی طرف دیکھا۔
 ”میرے بیٹے جگنو کو تو آپ دیکھ ہی چکی ہیں۔“ اس کے لیے میں آپ سے حرامانگ رہی ہوں..... مجھے مایوس مت کیجیے گا۔“ عائشہ نے بڑی آس سے ثریا کی طرف دیکھا۔
 ”حرا.....؟ اس کا رشتہ تو ہو چکا ہے۔ کل ہی ہم نے لڑکے والوں کو جواب دیا ہے۔ میں آپ کو یہ خوش خبری سنانے ہی والی تھی۔“ ثریا کے چہرے پر دلی خوشی کا عکس چمک رہا تھا۔
 ”ادہ..... اچھا..... بہت بہت مبارک ہو آپ کو..... اسے کہتے ہیں تقدیر، میں تو آپ سے پہلے یہ بات کر چکی ہوئی بس جگنو کی چھٹیوں کا انتظار کر رہی تھی۔ چاہتی تھی آپ پہلے جگنو سے مل لیں۔ خیر..... ابھی آپ کی ایک پیاری سی بیٹی ہے ناں..... میں جا کی بات کر رہی ہوں۔ اصل میں مجھے آپ دونوں میاں بیوی کی سادگی اور گھر کے اچھے ماحول نے بہت متاثر کیا ہے..... آپ خاندانی لوگ ہیں۔ مجھے تو آپ سے رشتے داری کر کے فخر محسوس ہوگا۔ ساری خوبیاں ایک جگہ مشکل ہی سے ملتی ہیں۔ آپ کی بیٹیاں بھی بہت پیاری اور نیک ہیں۔“
 ”اللہ کا احسان ہے۔“ ثریا نے انکساری سے کہا۔
 ”آپ طارق بھائی سے صلح مشورہ کر لیں پھر

کر لیں..... ای پاپا تو یوں خوش ہیں جیسے ان کی لاٹری لکل آئی ہو۔ دونوں مل کر اپنا اسپتال کھول لیجیے گا۔ اس سے زیادہ شاندار کیریئر کیا ہوگا؟“ جانے حرا کے قریب آ کر لپٹا پ کی اسکرین پر نظریں جما کر کہا۔
 ”کیا دیکھ رہی ہو؟“ حرا نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے پوچھا۔
 ”میں دیکھ رہی تھی اس وقت احسن بھائی تو فیس بک پر شیئر نہیں کر رہے۔“ جانے جانتے ہوئے بولی اور داش روم کی طرف بڑھ گئی۔ حرا بھی مسکرانے لگی۔

☆☆☆

”آج کل اچھے لڑکے تو جیسے روڈ سے ہائی جیک ہو جاتے ہیں۔“ پڑوسن عائشہ، ثریا کے گھر آئی ہوئی تھیں موضوع بچیوں کی شادی تھا۔
 ”واقعی لگتا ہے کہ اچھے لڑکوں کا تو کال پڑ گیا ہے۔“ ثریا نے چائے بنا کر عائشہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔
 ”میرے بڑے بیٹے نے امریکن سے شادی کی تو میں مدے سے بے ہوش ہو گئی۔“ عائشہ کے لہجے میں بڑا کرب سا تھا۔
 ”بیٹا گود میں آتے ہی ماں بہولانے کے خواب دیکھنے لگتی ہے۔ کتنی محنت کے بعد ایک بچہ جوان ہوتا ہے۔“ بولتے بولتے عائشہ کی آواز بھر اٹھی۔
 ”چھوڑیں عائشہ آپا..... جو ہو چکا بس ہو چکا..... آپ ماں ہیں، بچوں کی خوشیوں کے لیے اٹھ کھڑی کریں۔“ ثریا نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے بڑی رمانیت سے تسلی دی اور گھونٹ بھرا۔
 ”خیر پانچ سال ہو گئے..... صبر آ ہی گیا..... اب مہو لے بیٹے جگنو کے لیے سوچ رہی ہوں اس کے فائل مٹانے ہی نکاح کر دوں گی۔ منگنی دگنی نہیں کروں گی۔“ عائشہ نے بات کرتے ہوئے ثریا کی طرف دیکھا۔ ایک لاشعوری عمل تھا جو ظاہر کرتا تھا کہ ان

تعریف کر رہا تھا..... اس کے بہت پرانے ملنے والے ہیں۔“
 ”تو پھر حرا سے آپ خود بات کر لیں۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔“
 ”وہ میں کر لوں گا..... اس کے فائل میں چند ماہ تو رہ گئے ہیں۔ جلدی شادی کے لیے کہیں گے تو ہم کر دیں گے۔“ طارق کی بات سے لگ رہا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بالکل تیار ہو چکے ہیں۔ آخر ان کا اپنا سا بھائی مٹا رہا تھا۔

☆☆☆

”شکر ہے آپ کی شادی ہو رہی ہے، اب آپ کی استعمال شدہ چیزوں سے تو مجھے نجات ملے گی۔“ حرا دارڈ روپ سے پہننے کے لیے کپڑے نکال رہی تھی ساتھ ہی شوخی سے حرا سے باتیں بھی کر رہی تھی جو نیٹ پر فیس بک کھولے بیٹھی تھی۔
 ”نہیں، میری شادی کے بعد تو تمہیں اور زیادہ اچھے اچھے کپڑے پہننے کو ملیں گے۔“ حرا نے بھی شرارت سے جواب دیا۔
 ”وہ تو میں نہیں پہنوں گی..... نیم کے سوکھے پتے اور فائل کی گولیاں کپڑوں میں رکھ کر محفوظ کر لیجیے گا۔ آپ کی بیٹی جوان ہو کر پہن لے گی۔“
 ”اس وقت نہ جانے کیا فیشن چل رہا ہوگا۔“ حرا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔
 ”بھئی آپ کے جانے کے بعد تو صرف میرے ہی کپڑے بنا کر میں گے پھر مجھے آپ کی اترن کی ضرورت نہیں رہے گی۔“
 ”بے وقوف بہنوں میں اترن و ترن نہیں چلتی۔ جہاں کئی بہنیں ہوں وہ ایک دوسرے کی چیزیں استعمال کرتی ہیں۔ میں تو فی الحال شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ کیریئر بنانے کا سوچ رہی تھی۔“
 ”خدا کے لیے بس جلدی سے شادی

برخواست تھی۔ رنگ روپ، جوانی سب کچھ تھا..... اس لیے خود اعتمادی کا وصف بہت نمایاں تھا۔ جانشین پشتم اندر دوڑ گئی جہاں نادیا گویا اس کے استقبال کو تیار کھڑی تھی۔
 ”میں نے بھائی کی آواز سن لی تھی۔ تمہیں تنگ تو نہیں کیا.....؟ بہت شر ہیں رات ہی آئے ہیں..... صبح سے اٹھ کر آفت مچائی ہوئی ہے۔ کہتے ہیں ہمارے لاہور میں دیر تک سونے والوں کو منحوس کہتے ہیں۔“ نادیا ہنس ہنس کر بھائی کی شوخیاں بیان کرنے لگی۔ جواب میں حرا کے پاس کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

اچانک گھر میں پھر سے حرا کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ صمد کی بیٹی کی شادی میں کسی خاتون کو حرا بہت پسند آگئی تھی اور یہ جاننے کے بعد کہ وہ ایم بی بی ایس کر رہی ہے وہ بہت اچھی امیدیں لے کر رشتہ لے کر آ گئیں۔ کیونکہ ان کا بیٹا بھی ڈاکٹر تھا اور یہی بات ثریا اور طارق کے دل کو بھی لگ رہی تھی۔
 ”میاں بیوی دونوں ڈاکٹر ہوں گے تو ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھیں گے، شیئر کریں گے، حل کریں گے۔“ طارق نے اپنی رضامندی کا عندیہ دے دیا تھا مگر ثریا کو فکر تھی کہ شاید حرا جلدی شادی کے لیے رضامند نہیں ہوگی۔
 ”وہ پہلے بھی کہہ چکی ہے کہ ہاؤس جاب کے بعد وہ چند سال پریکٹس کرے گی اس کے بعد.....“ ثریا نے متفکرانہ انداز میں کہا۔ طارق کہیں باہر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ بہت عجلت میں تھے مگر انہوں نے ثریا کی پریشانی دور کرنے کے لیے چند منٹ دے دیے۔
 ”وہ بچی ہے۔ اس کی اپنی سوچ ہے۔ بچوں کو سمجھانا ہمارا کام ہے۔ آج کل اچھے اور جوڑے رشتے آسانی سے ملتے ہی کہاں ہیں۔ صمد اس فیملی کی بہت

ہم باقاعدہ آپ سے جا کا رشتہ مانگتے آئیں گے۔“
عائشہ بولیں۔

”میں ضرور ان سے بات کروں گی۔ مگر ایک بات بالکل صاف صاف کہوں گی کہ ہم دو بیٹیوں کی شادی ساتھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“ ثریا نے کہا۔ ”کیونکہ حرا کی سسرال والے ایک مہینے میں شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔“ ثریا نے اب ذرا متفکر ہو کر اپنی بات مکمل کی۔

”شادی تو ہم بھی جلدی نہیں کر سکتے۔ ابھی جگنو کے فائل میں چار مہینے باقی ہیں۔ پھر وہ جاب پر چلا جائے گا۔ آپ کو تو پتا ہوگا وہ lums میں پڑھ رہا ہے۔ فائل ہوتے ہی اسے جاب بھی مل جائے گی۔“ عائشہ نے ثریا کو گویا بڑی وضاحت سے تسلی دی۔

”ٹھیک ہے، میں طارق سے بات کرتی ہوں۔۔۔۔۔ اب جو اُن کا فیصلہ ہو۔“ ثریا نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

”لوگ تو بہت اچھے ہیں ثریا۔۔۔۔۔ کھانا پیتا گھرانا ہے۔۔۔۔۔“ طارق نے ثریا سے تفصیل سننے کے بعد کہا۔

”یہی میں سوچ رہی ہوں۔۔۔۔۔ آج کل اچھے لڑکے چھوڑتا ہی کون ہے۔ پھر پڑھائی کے دوران بھی چکر چل جاتے ہیں۔ بچے فیصلہ کر لیتے ہیں۔ والدین خواب دیکھتے رہ جاتے ہیں۔“ ثریا نے طارق کو پکا کرنے کی نیت سے ایک مضبوط دلیل دی۔

”ہاں، یہ بھی پتا کر لو۔۔۔۔۔ لڑکا کسی سے وعدے کر کے تو نہیں بیٹھا ہوا ہے؟“ طارق نے اپنے دھیان سے چونک کر ثریا کی بات پکڑ لی۔

”وہ آج کل گھر آیا ہوا ہے۔ عائشہ آپا اس سے بات کر کے ہی اتنے اعتماد سے بات کر سکتی ہیں۔“ ثریا

نے جواب دیا۔

”بہر حال۔۔۔۔۔ میں سال بھر پہلے نکاح کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ دیکھا یہی ہے کہ نکاح ہوتے ہی سسرال والے طرح طرح کے ریزن لے کر جلدی رخصتی کا شور مچانے لگتے ہیں۔“ حرا کی شادی کے بعد میں ایک سال تک کوئی بڑا خرچہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گا۔“ طارق نے دو ٹوک انداز میں بات کی۔۔۔۔۔ ثریا نے گہری سانس لے کر طارق کی طرف دیکھا۔

”میں پہلے ہی اس طرح کی بات ان کے کان میں ڈال چکی ہوں۔“

”اگر وہ ایک سال رکے پر تیار ہیں تو سنڈے کو انہیں کھانے پر بلا لو کیونکہ رشتہ پڑوس سے آیا ہے اور پڑوسی سے کچھ چھپایا نہیں جاسکتا۔ سب لوگ ہی اکرم صاحب کی شرافت کو مانتے ہیں۔ ان کی بہت عزت کی جاتی ہے۔“ ثریا نے مسکرا کر طارق کی طرف دیکھا۔

”میں تو ایک اور وجہ سے بھی اس رشتے کو اہمیت دے رہی ہوں۔ بیٹی پڑوس میں ہوگی تو ہمارے اچھے برے وقت میں پاس تو ہوگی۔“ طارق کے ہونٹوں پر تذمّم سی مسکراہٹ تھی جیسے وہ ثریا سے اتفاق کر رہے ہوں۔ انہوں نے فی وی بند کر کے برابر میں پڑی فائل اٹھا کر دیکھنا شروع کر دی۔ دونوں کے چہروں پر سکون و خوشی کا تاثر واضح تھا۔ ثریا چائے کے برتن اٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

☆☆☆

شادی کی تیاری کے لیے ایک مہینے سے بھی کم دن ملے تھے جو بھاگتے دوڑتے یوں گزر رہے تھے پر لگا کر اڑے ہوں اور شادی کا دن بھی آگیا۔ عائشہ نے شوہر اور بچوں کے ساتھ تمام تقریبات میں حصہ لیا۔ اگرچہ جانے کیا سوچ کر طارق نے کہہ دیا تھا کہ ہم حرا کی شادی کے بعد جواب دیں گے۔ بات جا

”یہ تو بہت خوب صورت سوٹ ہے۔۔۔۔۔“ حرا، حرا سے کہہ رہی تھی جو دو تین دن میکے میں آرام کرنے آئی ہوئی تھی۔

”مگر تمہیں پتا ہے نا میں یہ کمر نہیں پہنتی۔“ حرا نے پرل سوٹ پر نظر ڈال کر قدرے بیزار سے کہا۔ ”ہائے تو آپ احسن بھائی کی خوشی کی خاطر پہن لیں۔ کتنے پیار سے لائے ہوں گے۔“

”پہن لیا تھا ایک ڈنر میں۔۔۔۔۔“ حرا نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”بس یونہی لے آئے تھے، کہنے لگے مال گیا تھا اچھا لگا تو تمہارے لیے لے لیا۔“ حرا نے آنے والی جماعت کو بڑے جتن سے روکا۔ وہ واقعی بہت تھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔

”یہ تو بہت قیمتی ہے۔۔۔۔۔ پانچ ہزار کا تو ہوگا؟“ حرا نے سوٹ الٹ پلٹ کر دیکھا۔

”بہت پیسہ ہے ان لوگوں کے پاس۔۔۔۔۔ پانچ

کے کانوں تک پہنچ چکی تھی یہی وجہ تھی کہ عائشہ آئی اور گھر والوں سے بات چیت میں اب تکلف آگیا تھا بلکہ جگنو کے سامنے جاتے ہوئے وہ جھجکنے لگی تھی جسے حرا کی شادی کے بہانے اس گھر میں آنے جانے کا راستہ مل گیا تھا۔ جہاں کہیں اس کا حبا سے سامنا ہوا اس کی خاموش نگاہوں سے پیغام محبت ضرور پہنچا۔ حبا کے دل کے تاروں کو اس نے چھیڑ دیا تھا جن سے ایک الوہی سی دھن ہر وقت پھوٹنے لگی تھی۔

حرا، احسن کے ساتھ رخصت ہوئی اور گھر کی رونقیں یوں ختم ہوئیں جیسے روشن چراغ ایک پھونک سے بجھ گیا ہو مگر حبا کے دل کی رونقیں بڑھ چکی تھیں۔ اب حرا اس کے ساتھ کمرے میں نہیں تھی مگر جگنو کے تصور سے کمر اردن ہو چکا تھا۔ جو اسے اپنے دائیں بائیں آگے پیچھے چلتا پھرتا محسوس ہوتا تھا۔ بے کیف و بے رنگ معمولات میں بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی۔

☆☆☆

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ڈائجسٹ

ماہنامہ

سفر

سفر

سفر

سفر

سفر

سفر

سفر

سفر

سفر

سفر

سفر

سفر

سفر

سفر

سفر

مئی 2012ء بدلتے موسم کی سرخشاں

آخری صفحات پر ایچ اقبال کا دل کو چھو لینے والا انداز ”اچھوتی مصیبت“ چاہت کی خواہشوں میں بے سمت اڑان بھرنے والے بچے کا انجام۔۔۔۔۔ جس نے جیون کی دھوپ چھاؤں کا کھیل سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

دوراھا۔۔۔۔۔ قارئین کے اصرار پر طاہر جاوید مغل کے سحر انگیز قلم سے۔۔۔۔۔ سیکھتے جذبوں اور گہرے خیالات کا قصہ۔۔۔۔۔ دلوں میں چنگی لیتی ایک یادگار تحریر۔

ایک دریا کے دو کنارے۔۔۔۔۔ بچا بچے کی محبت اور اقتدار کی جنگ۔۔۔۔۔ ”فصل اجڑ گئی“ تاریخ کے حمر دلوں سے یادگار ادراک۔۔۔۔۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی بزم آرائی

مسافر۔۔۔۔۔ خوابوں کی طلسماتی گلیوں میں سہکتے مسافر کا فسانہ حیات۔۔۔۔۔ جسے امبر کو پھرنے کی خواہش تو تھی مگر اپنی مٹی سے بغاوت بھی منظور نہ تھی۔ ناصح ملک کے قلم سے زمین و زمان میں ہونے والی خونچکاں اور دل گداز داستان کی تیسری قسط

ہزار سے ان پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”پھر بھی گفت تو گفت ہوتا ہے۔“

”سالوں پڑا رہے گا..... میں نے سوچا تم کالج کے فنکشن وغیرہ میں پہن لوگی بس احسن کے سامنے پہن کر مت آنا۔ مجھے بہت زور کی نیند آرہی ہے، پلیز جبالاٹ آف کر دو۔ ایسا لگ رہا ہے سالوں سے نہیں سوئی۔“ حرا کسل مندی سے بولی۔

”احسن بھائی سونے نہیں دیتے.....“ جانے شرارت سے پوچھا۔

”بھئی گنتے بچے بھی سوؤ..... آٹھ بجے ساس صاحبہ کے ساتھ ناشتا کرنا ہوتا ہے۔ پھر ملنے جلنے والے آتے رہتے ہیں۔ نئی دلہن کو کہنی دینا پڑتی ہے۔“ وہ تکیہ سینے کے ساتھ لگا کر آنکھیں بند کیے کہہ رہی تھی۔ جانے اس کی حالت کے پیش نظر مزید بات چیت موقوف کر دی اور لائٹ آف کر کے کمرے سے باہر آ گئی۔

☆☆☆

عائشہ کے بہت اصرار کے بعد بہر حال طارق نے منگنی کی ہائی بھری تھی۔ نکاح کے لیے تو انہوں نے صاف منع کر ہی دیا تھا۔ پندرہ بیس مہمانوں کے درمیان انہوں نے جگنو کے نام کی انگوٹھی جا کو پہنا دی تھی۔ اب جا کی زندگی میں حقیقی معنوں میں رنگ بکھر گئے تھے۔ جگنو سے اب فون پر بات چیت بھی ہو جاتی تھی۔ وہ بہت کم بولتی تھی مگر جگنو کے پاس کرنے کے لیے بے حساب باتیں تھیں۔ جا کو اس کی باتیں سننا بہت اچھا لگتا تھا..... اب آٹھ پہر اسے جگنو کی طرف سے آنے والی کال کا انتظار رہنے لگا تھا۔

پھر ایک روز وہ کالج سے آئی تو ایک خوش خبری اس کی منتظر تھی۔ ثریا ایک چھوٹے سے سوسٹر کی تنگ کر رہی تھیں۔

”ای کس کا سوسٹر بن رہی ہیں؟ اس نے حیران ہو کر سوسٹر کی طرف دیکھا۔

”بھئی یہ تو میں نے بہت پہلے شروع کیا تھا کہ تم دونوں میں سے کسی کے بچے کے کام آجائے گا۔ اب حرا کی طرف سے خوش خبری ملی ہے کہ تم خالہ بننے والی ہو تو میں نے دوبارہ شروع کر دیا۔ کیونکہ تمہارے بھانجے کی آمد سردیوں میں متوقع ہے۔“

”بھانجا.....؟“ جا پھر حیران ہوئی۔

”بھئی یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے..... کیا خبر بیٹی ہے یا بیٹا..... بس اچھے شکون کے لیے اس طرح کہہ دیتے ہیں۔“ ثریا نے مسکرا کر وضاحت کی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ خوشی تو جا کو بھی بے پناہ ہوئی۔ اسے فوراً ہی حرا کے ساتھ ایک پیارا سا بچہ شرارتیں کرتا چاروں طرف نظر آنے لگا۔ اس نے پہلی فرصت میں فون کر کے حرا کو مبارک باد دی تھی۔

☆☆☆

دن دھوئیں کے بادل کی طرح اڑ کر یہاں وہاں گم ہو گئے..... گیارہ ماہ خوب صورت باتوں اور حسین تصورات کے سائے سائے گزر گئے۔ عائشہ اب شادی کی تاریخ مانگ رہی تھیں۔ ثریا نے حرا کی ڈیوری تک کی مہلت مانگی کہ بیٹی پہلی بار ماں بننے جا رہی ہو تو ماں کی مصروفیات بہت بڑھ جاتی ہیں پھر سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ اس حال میں حرا بہن کی شادی میں بھرپور حصہ نہیں لے سکے گی۔ اب ایک ہی تو بہن ہے اس کی۔ بہر حال ثریا اور طارق کا عذر دوسری جانب قبول کر لیا گیا مگر ساتھ ہی عائشہ نے شاپنگ کے لیے جا کو ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی کہ کپڑوں میں کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔ کبھی کڑھائی والے چکر لگواتے ہیں کبھی ٹیلر..... طارق نے قدرے رد و کد کے بعد اجازت دے دی مگر اس شرط پر کہ جہاں جگنو کے ساتھ تنہا نہیں جائے گی.....

آپ ساتھ جائیں گی۔

ثریا اور طارق آج کل کے حالات کی وجہ سے

بہت محتاط تھے..... انہیں لڑکے، لڑکیوں کی بے مہار آزادی بالکل پسند نہیں تھی۔ جا کی زندگی میں برستے رگوں میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کس چیز کی کیا قیمت ہو سکتی ہے مگر اس نے جو منتخب کیا اسے مل گیا۔

پہلی بار ڈھیروں ملبوسات اس کے نام سے خریدے گئے جن میں سے ایک بھی اس کی بہن کا پہنا ہوا نہیں تھا۔ اصل مزہ تو اسے جیولری شاپ میں آیا..... تیز روشنیوں میں جگمگاتے زیورات..... کولڈ ڈرنکس اور چائے سے تواضع..... اور خوش اخلاقی کی انتہا..... سارے سیز مین عائشہ کے سامنے بچھے مارے تھے۔ عائشہ نے جا کو ڈیزائن پسند کرنے کی مکمل چھوٹ دی تو اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”آئی مجھے تو پتا نہیں کس سیٹ کی کیا پرائز ہے۔“

”آپ سے ڈیزائن پسند کر رہے ہیں محترمہ..... بے منت نہیں کرائیں گے۔“ جگنو نے شریرا انداز میں اسے چھیڑا۔ سب مسکرانے لگے۔

”تم دو سیٹ پسند کر لو..... اور کنکرن چوڑی کا ڈیزائن..... میرے پہلے پہلے بیٹے کی بری بن رہی ہے..... اپنے سارے ارمان پورے کروں گی۔“ عائشہ کے لہجے میں چھپی ہوئی اداسی کو صرف جگنو ہی محسوس کر سکتا تھا..... ماں کی اداسی نے اسے بھی سنجیدہ کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا اس وقت ماں کو بڑا بیٹا یاد آ رہا ہے جبکہ جا ہر شے سے بے نیاز زیورات کے ڈیزائن اکٹھے میں گمن تھی۔

☆☆☆

انسان کے ارادے اور خواہشات کوئی معنی نہیں دیتے..... قدرت بے نیاز ہے، وہ اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ شاید قدرت کو جا کی خوشی اس وقت منظور نہ تھی۔

۱۱۰ پیارے بیٹے کا تحفہ احسن کو دے کر دنیا سے

باتیں

باقی چار طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو ہونٹوں لٹکی اور کونھوں چڑھی۔ یہ کوئی نہ کوئی آفت ضرور ڈھاتی ہے۔ دوسری بات وہ کہ کسی کے لیے اس میں فائدہ مضر ہوتا ہے کسی کے لیے نقصان تیسری وہ بات کہ جس میں نہ فائدہ ہو نہ نقصان! یہ سراسر وقت کا زیاں ہے۔ اس کا حاصل کچھ نہیں۔ باتوں کی چوتھی صورت وہ ہوتی ہے جس میں سراسر نفع ہوتا ہے۔ معلوم ہوا ان چار قسموں میں صرف ایک چوتھائی باتیں کام کی ہیں۔

حضرت عیسیٰ سے کسی نے کہا کہ فرض کیجیے کہ ثواب کے دس حصے ہوں تو آپ انہیں کس طرح بانٹیں گے؟ حضرت عیسیٰ نے فرمایا..... تو حصے ثواب خاموشی میں ہے اور ایک حصہ لوگوں سے دور رہنے میں۔

مرسلہ: صائمہ یا سرشاہ، راول پنڈی

☆☆☆

ملن

جیون ہجر کا تپا صحرا

برسارے آکے

پیار کا ساون

چاہت کو نہل پھوٹ پڑے گی

سونی ہستی میں

جوت جکے گی

کرب کا طوقاں تھم جائے گا

وصل کی رات چمک اٹھے گی

شاعرہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

رخصت ہو گئی۔ دونوں گھرانوں میں گویا صاف ماتم بچھ گئی۔ اس لو مولود کو دیکھ کر تو ان کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے جو شاید کسی کی موت پر نہ روئے تھے۔

جبا اور ثریا کی حالت تو اتنی خراب ہو گئی کہ اسپتال میں ایڈمٹ کرانا پڑا۔ جبا کو ذرا ہوش آیا تو سب سمجھانے لگے کہ تم خود کو سنبھالو تاکہ ماں کو سنبھال سکو۔۔۔۔۔ ماں کی بے چارگی اسے ایک دم ہوش کی دنیا میں لے آئی۔ اسے خوف لاحق ہوا کہ خدا نخواستہ ماں کو کچھ نہ ہو جائے۔۔۔۔۔ اس نے ثریا کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دیئے وہ ماں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہتی تھی۔

”امی۔۔۔۔۔ میں بھی تو ہوں۔۔۔۔۔ مجھے بھی تو ماں کی ضرورت ہے۔ میری خاطر خود کو سنبھالیں۔“ آخر کار اس کی محنت رنگ لائی۔۔۔۔۔ ثریا نے بستر چھوڑ دیا مگر وہ خاموش ہو کر رہ گئیں۔ خود کو سمجھا رہی تھیں اللہ سے صبر کی توفیق مانگ رہی تھیں۔

☆☆☆

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ابھی تو میری بیٹی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔“ ثریا حیرانی کی حالت میں حرا کی ساس کو دیکھ رہی تھیں۔

”بات شادی بیاہ کی نہیں ہے ثریا۔۔۔۔۔ ایک معصوم بچے کو ماں کی ضرورت ہے۔ احسن کو تو ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ مل سکتا ہے مگر میرے پوتے کو شاید ماں نہ مل سکے۔۔۔۔۔ سوتیلی ماں کے نام سے ہی خوف آتا ہے۔ سگی خالہ پھر سگی خالہ ہوتی ہے۔ اپنی بہن کی نشانی کو خالہ ہی سینے سے لگا سکتی ہے۔“ حرا کی ساس نے انداز میں منت کی تھی۔

”وہ تو آپ کی بات ٹھیک ہے مگر ہم تو جبا کی معنی کر چکے ہیں۔“ ثریا نے الجھے الجھے انداز میں جواب دیا۔

”مگنی ہوئی ہے نکاح تو نہیں ہوا۔۔۔۔۔ جتنی فکر

مجھے اپنے پوتے کی ہے، اتنی ہی آپ کو بھی ہونی چاہیے۔ آپ کی پیاری بیٹی کے جگر کا ٹکڑا ہی ہے۔“ یہ کہہ کر حرا کی ساس رونے لگیں تو ثریا کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔

”دیکھیں اس وقت مجھے کچھ بھائی نہیں دے رہا۔ آپ ہمیں بہلت دیں۔۔۔۔۔ پھر جبا سے بھی پوچھنا ہے۔ اس وقت مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔۔۔۔۔“ ثریا نے بے بسی سے کہا تھا۔

”میں تو سوالی بن کر دوسری بار آپ کے دروازے پر آئی ہوں۔ آپ ضرور سوچیں۔۔۔۔۔ صرف بیٹی کے لیے نہیں۔۔۔۔۔ نواسے کے لیے بھی سوچیں۔“ یہ کہہ کر حرا کی ساس پھر رونے لگیں۔ ثریا خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

”اگر ایسا ہو جاتا ہے تو یہ جبا کی بہت بڑی قربانی ہوگی۔“ طارق بہت دکھ سے کہہ رہے تھے۔

”میرا دل نہیں مان رہا۔۔۔۔۔ مگر حرا کے بیٹے کی طرف دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جانے اس معصوم بچے کو دوسری ماں کیسی ملے۔“ ثریا نے درد کی ٹیمیں سہتے ہوئے کہا۔

”ظاہری بات ہے۔۔۔۔۔ انسان کی شکل پر تو نہیں لکھا ہوتا۔۔۔۔۔ بہر حال بات غور طلب ہے۔ اس لیے کہ احسن بہت اچھا ہے۔۔۔۔۔ حرا اس کے ساتھ بہت خوش تھی اکثر اس کی تعریف ہی کرتی تھی۔۔۔۔۔“ طارق نے سر آہ بھر کر کہا۔

”اس میں تو کوئی شک نہیں۔۔۔۔۔ احسن جیسے داماد تو نصیب سے ملتے ہیں۔“ ثریا نے اسی طرح الجھے الجھے انداز میں کہا۔

”کیا لکھا ہے میری بیٹی کے نصیب میں۔ ایک بار مگنی ہوئی تو کوئی جان سے گیا۔۔۔۔۔ کہنے والوں نے میری بیٹی کو منحوس تک کہہ دیا۔۔۔۔۔ پھر اللہ نے احسان کیا

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپ کے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک دی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے



قسط 5

زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں... وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے لوگ، بہت سے مواقع ایسے ضرور ملتے ہیں... جب محبت دستک دیتی ہے... اور اس کی خوشبو میں روشنی کی تابناکی بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ... مکر و فریب... سفاکی اور تنگ نظری کے سانے... ازل سے محبت کرنے والوں کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی کبھی تڑپ کی دگی بھی حکم کے آگے کوکاں دیا کرتی ہے...

ہماری مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک شاہکار ناول

جس کی سطر سطر میں زندگی سگر کرتی نظر آئے گی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

دولت خان آفریدی تھے اور ماہتاب شنواری..... دولت خان کی پہلی منکوحہ بی بی جان تھیں۔ بی بی جان کی پہلی شادی دولت خان کے بڑے بھائی رحمت خان آفریدی سے ہوئی۔ رحمت خان اپنے ساتھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے ان کے بعد پانچ بیٹیں اور پھر دولت خان تھے۔ رحمت خان سے بی بی جان کے دو بیٹے ایاز خان اور ارباز خان تھے۔ دولت خان اپنے بڑے بیٹے ایاز خان کے ہم عمر تھے۔ رحمت خان کو دل کا دورہ پڑا تو بی بی جان کی عدت کے بعد روایت کے مطابق ان کا عقد ثانی دولت خان سے کر دیا گیا۔ دولت خان کو اس نئے رشتے سے انکی شرم آئی کہ وہ بغیر بتائے کراچی آگئے اور آٹھ نو سال ایک پلمبرگ کے استاد کے پاس رہے۔ پھر ایک ریکرونگ ایجنسی کے توسط سے کویت جانے کا موقع مل گیا۔ استاد کے کہنے پر ان کی بیٹی ماہتاب سے شادی کر لی۔ ماہتاب نے پرائمری اسکول میں نوکری کی اور بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر دولت خان کا ہاتھ بٹایا۔ دولت خان پریس میں اسی ملک عدم ہو گئے مگر ماہتاب نے انتہائی حوصلے سے حالات کا مقابلہ کیا۔ بڑی بیٹی نایاب کو ڈاکٹر بنایا اور اچھا رشتہ آنے پر اس کی شادی کر دی۔ بہت خان الیکٹریکل انجینئر تھا اور ایک پرائیوٹ ادارے سے وابستہ تھا۔ بہت کی بیوی ارم، ماہتاب کی ایک کولیگ کی بیٹی تھی۔ حجاب نے ایم اے بی ایڈ کیا اور وہ ایک محکمہ تعلیم میں سولہ گریڈ کی آفیسر تھی پھر پبلک سروس کمیشن کے توسط سے خود کو ہیڈ مسٹر لیس کی اسامی کا اہل ثابت کیا۔ ایک ثانوی تعلیمی ادارے میں حجاب کا تقرر کیا گیا۔ رہا باب انجینئر بننے جا رہی تھی۔ نایاب کے دو بیٹے تھے اور بہت کی ایک بیٹی تھی اتم۔ ماہتاب اب جا رہی تھیں کہ حجاب کی شادی ہو جائے۔ تقدیم کی اماں سولہ سال سے معذور تھیں اور اپا کینٹ بورڈ میں ملازم تھے۔ تقدیم، تمہید، تنسیم، تعظیم اور تقدیس پانچ بیٹیں اور ایک بھائی موسیٰ تھا۔ اماں کی معذوری کی وجہ سے تمہید نے پڑھائی چھوڑ دی اور ان کے ساتھ گھر میں رہتی۔ تقدیم ابلاغ عامہ میں ماسٹر کرنے کے بعد ایک این جی او سے وابستہ تھی۔ تنسیم یونیورسٹی میں شعبہ نفسیات کی طالبہ تھی موسیٰ فوج میں تھا۔ اپنی تہذیبی راہ کی بیٹی خوش بخت سے موسیٰ کی شادی کرنے کا ارادہ تھا اماں کا..... بیٹیوں کے جوڑے رشتے نہ آنے کی وجہ سے کسی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ تنسیم یونیورسٹی میں ایک سال جوئر مڈر میں انوالو تھی۔ عباد الرحمن پانچ سال کا تھا جب ابو کا ایک ایکسڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ نایابی نے چالاکی سے آپا کی گھر سے بے دخل کر کے انہیں گھر بھیج دیا۔ ماں باپ تھے نہیں بھائیوں کے گھر نوکروں سے بدتر حالت میں وہ رہیں۔ عباد الرحمن نے سول انجینئرنگ میں ڈگری لے کر تعمیراتی فرم سے وابستگی اختیار کی تو ماں بیٹا ایک فلیٹ کرائے پر لے کر اس میں رہائش پذیر ہو گئے۔ حجاب امی کے لیے جوتے لینے جاتی ہے تو وہاں الطاف کو وہ پسند آ جاتی ہے اور وہ اپنی بہنوں کو حجاب کے گھر رشتے کے لیے بھیجتا ہے۔ موسیٰ کے بیچ میٹھیل بھائی کے ماموں مصور احمد اسلام آباد میں مقیم تھے۔ عقل کے ساتھ موسیٰ کا ان کے گھر جانا ہوتا ہے۔ مصور احمد اور طاہرہ کے دو بیٹے منصور اور طہور اور بیٹی عاترہ تھی۔ مدثر اور تنسیم کا عشق شدت اختیار کر رہا ہے۔ عباد الرحمن کے سٹیل ہونے کے بعد نخیال دھیال والے اپنی بیٹیوں کے لیے عباد کی آس لگا رہے تھے لیکن عباد خاندان میں کسی سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حجاب اپنے لیے آنے رشتے کے لیے استعارہ کرتی لیکن اس کے خواب سے امی مطمئن نہیں ہوتیں اور رشتہ طے کر دیتی ہیں۔ مدثر، تنسیم کو کورٹ میرج کے لیے زور دیتا ہے، عقل چھوٹی پر جاتا ہے تو مصور احمد موسیٰ کو عاترہ کی برتھ ڈے کے لیے بلاتے ہیں، تقدیم، تنسیم کے موبائل پر مدثر کے بیچ پڑھ لیتی ہے اور سب کچھ ابا کو بتا دیتی ہے، تنسیم یونیورسٹی کے بھانے مدثر کے ساتھ جا کر کورٹ میرج کر لیتی ہے، مدثر اسے اپنے دوست نادر کے گھر لے جاتا ہے نادر کی بیوی ثریا بڑے عجیب انداز میں ان کا استقبال کرتی ہے۔ تنسیم، تقدیم کو بیچ کر دیتی ہے کہ اس نے کورٹ میرج کر لی ہے۔

حجاب، تقدیم کے آفس آکر اسے اپنے نکاح میں انوائٹ کرتی ہے۔ تقدیم ابا کو بتاتی ہے کہ تنسیم نے کورٹ میرج کر لی ہے۔ مدثر یونیورسٹی جانے سے پہلے تنسیم سے مل کر جاتا ہے تو یونیورسٹی میں تقدیم کو اپنا فخر بتاتا ہے۔ تقدیم، مدثر سے کہتی ہے کہ اگر وہ تنسیم کو بیچ دے تو وہ لوگ اپنی عزت بچانے کی خاطر کچھ لوگوں کو بلا کر اس کی رخصتی کر دیں گے۔ حجاب کے نکاح کی تقریب گھر کے بجائے الطاف کے کہنے پر قایم شاہ ہول میں ہوتی ہے۔ تقدیم آنے سے معذرت کر لیتی ہے۔ مدثر، تنسیم سے گھر جانے کو کہتا ہے تو وہ انکار کر دیتی ہے۔ الطاف نکاح کی تصویریں لے کر آتا ہے تو حجاب یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ کچھ تصویروں میں الطاف کا سر غائب تھا جیسے اس نے خواب میں دیکھا تھا۔

اب آگے پڑھیں

آؤٹ آف فوکس تصویریں دیکھ کر امی کو فوٹو گرافر کے انٹرویو پن پر غصہ آیا۔ "کبخت کیسا انٹرویو فوٹو گرافر تھا جس نے دولہا کا تو سر ہی اڑا دیا۔"

"آپ کو یاد ہے میں نے جب استعارہ کیا تو کیا خواب دیکھا تھا؟" حجاب نے امی سے پوچھا۔

"کیا؟" حجاب کو لگا امی تجاہلی عارفانہ سے کام لے رہی تھیں۔

"آپ کو یاد نہیں؟"

"اتنی پرانی بات تو نہیں ہوئی امی۔"

"ہاں کچھ یاد تو ہے۔"

"اب تم کسی نئے وہم میں مت پڑ جانا۔ بس اتفاق ہے کہ جو تم نے خواب میں دیکھا وہ سامنے بھی آ گیا۔"

نایاب باجی نے تصویریں دیکھیں تو وہ اس اتفاق پر حیران رہ گئیں۔

"ایک بات بتائیں۔" حجاب نے نایاب باجی سے سرگوشی میں کہا۔ "جب آپ کی شادی ہوئی تو کیا آپ کو بھی کوئی وہم، کوئی اندیشہ، کچھ خوف سا تھا۔"

"میرا خیال ہے ہر لڑکی ڈرتی ہے۔ اس بات سے کہ ماں باپ کا گھر چھوڑ کر نئے گھر جانا پڑے گا اور نئی ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانا ہوگا۔ شوہر اور سسرال والے اگر جانے بوجھے ہوں تو خیر ورنہ یہ خوف بھی ہوتا ہے کہ خدا جانے شوہر اور سسرال والوں کا رویہ کیسا ہوگا، بہت سارے اندیشے ہوتے ہیں بے چاری لڑکی کو۔" نایاب باجی نے اپنے آخری فقرے میں بات کو سمیٹا۔

"میرا دل تو بہت ڈر رہا ہے۔"

"ہیں بیٹی! نکاح والے دن تو تم بہت خوش خوش بیٹھی ہوئی تھیں اس کے ساتھ۔" نایاب باجی نے اسے ہمراہ۔

"منہ بنا کر بیٹھتی تو آپ سب کو گلہ ہوتا۔"

"اچھا کیا نا..... دلہن ہستی مسکراتی ہی اچھی لگتی ہے۔ تم دیکھنا انشاء اللہ کتنی خوش رہو گی اپنے سسرال میں۔ جہاں لوش حالی ہوتی ہے وہاں مسائل بھی کم ہوتے ہیں۔ امی بتا رہی تھیں کہ پانچ ہزار روپے الطاف نے تمہارے اسکول والوں کو مٹائی کھلانے کے لیے دیے ہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"زبردست! نایاب باجی نے اسے رشک سے دیکھا۔ "کتنے اسٹاف ممبرز ہیں تمہارے؟"

"تقریباً پینتیس۔"

"اتنے پیسوں میں تو تم خوب اچھی ٹریٹ وے سکتی ہو۔"

"سوچ رہی ہوں کہ کچھ رقم اپنے پاس سے ملا کر لے دوں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ چائے میں تو سو جھنجٹ ہوتے ہیں۔ ویسے الطاف ہے ہاتھ کا کھلا۔ خدادے تو آدمی خست

ہاں کرے۔ اچھا یہ بتاؤ الطاف سے تمہاری بات و ات بھی ہوئی؟"

"جی..... ہوئی؟"

"کب؟"

”کل رات..... شام کو تصویریں پہنچانے آئے تو ای سے اجازت لے گئے تھے فون کرنے کی۔“
 ”اجازت نہ بھی ہو تو اسے حق ہے اب ویسے کیا باتیں ہوئیں؟“
 ”اب یہ بھی بتاؤں۔“

”اچھا نہ بتاؤ..... خوش تو ہوں گے موصوف؟“
 ”ظاہر ہے۔“

”ظاہر ہے۔“ نایاب باجی نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھا۔
 ”دینی جانے کا پروگرام کب ہے؟“
 ”کہہ رہے تھے دو تین دن میں چلا جاؤں گا۔“

”ویسے..... جن لوگوں کے پاس یہاں اتنا پیسہ ہو ان کے لیے تو پاکستان بھی دینی ہے۔“
 ”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ بازاروں میں جاؤ تو بعض لوگوں کے والٹس پٹے پڑ رہے ہوتے ہیں نوٹوں کی گڈیوں سے۔“

”تو تم لوگوں کے والٹس میں بھی جھانکتی ہو۔“ نایاب باجی مسکرائیں۔

”لوگوں کو اپنے والٹس میں نوٹوں کی نمائش کا اتنا شوق ہوتا ہے کہ جھانکنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ سو روپے کا نوٹ نکالنے کی ضرورت ہو تو والٹ میں موجود تمام نوٹ آگے سرکا کر اس میں سے ایک نوٹ نکالتے ہیں۔“
 ”تبھی تو دن دیہانے گن پوائنٹ پر لوٹے بھی جاتے ہیں۔“ نایاب باجی خوش دلی سے بولیں۔ ”خیر تمہیں کیا تم تو دینی چلی جاؤ گی۔“

”آپ سمجھتی ہیں مجھے دینی جانے کے خیال سے خوشی ہوگی..... ہر گز نہیں..... امی سے دور جانے کا خیال تکلیف دیتا ہے مجھے..... باہر جا کر ملتا کیا ہے..... اپنوں سے دوری، پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ اس پیسے کی خاطر ہی تو بابا ساری زندگی ہم لوگوں سے دور رہے اور آخر میں ہاتھ کیا آیا..... یہ چھوٹا سا مکان جسے بڑے لوگوں کے لیے پریزنٹ ایبل بنانے کو امی بے چاری پچھلے دنوں کتنی ہلکان ہو گئیں۔ یہ مکان تو بابا ہم سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی بنا سکتے تھے۔“

”مگر شاید ہماری باقی ضرورتیں اتنی آسانی سے پوری نہ ہو پاتیں جتنی بابا کے پردیس میں رہنے سے ہوئیں کبھی کسی چیز کی تنگی تو نہیں ہوئی ہمیں۔“

”ساری زندگی وہ ہم سب کو اور ہم انہیں مس کرتے رہے بس۔“ اس کے لہجے میں کرب تھا۔
 ”آسانی کی کچھ نہ کچھ قیمت تو دینا پڑتی ہے۔“ نایاب باجی نے کہا۔

”بہت مہنگا سودا تھا۔“ حجاب کو اپنی آنکھوں کے حاشیے نم ہوتے محسوس ہوئے۔ بابا کی دوری کا دکھ اسے ان کی زندگی میں بھی رہا کرتا تھا اور ان کی موت کے بعد بھی۔ وہ اکثر اس خیال سے اداس ہو جایا کرتی تھی کہ غریب الوطنی نے بابا کو کتنا کم وقت اپنے پیاروں کے ساتھ گزارنے کی اجازت دی تھی۔

”ای بتا رہی تھیں الطاف نے کہا ہے جہیز میں ایک سوئی بھی نہیں دی جائے گی۔“ نایاب باجی نے موضوع بدل دیا۔

”ساڑھے پانچ فٹ کی لڑکی تو دے دی ہے مفت میں۔“

”مفت میں تو نہ کہو۔“ نایاب باجی کا اشارہ قیمتی زیورات، خطیر مہر اور نکاح نامے میں اس کے نام پر لکھی جانے والی جائداد کی طرف تھا۔

”لڑکی کی کوئی قیمت ہو سکتی ہے؟“

”اگر لڑکے کی پسند ہو تو کوئی نہیں۔“ نایاب باجی مسکرائیں۔

”آپ کو بھی رباب کی طرح شوخی سوچنے لگی۔“

”کیوں میں کوئی مردہ دل ہوں کیا جو مجھے شوخی نہیں سوچ سکتی۔“

”شوق سے جناب شوق سے کون منع کرتا ہے۔“

”تمہاری جاب کے سلسلے میں بھی کوئی فرمان جاری ہوا اس طرف سے؟“

”جاری ہو بھی تو پروا نہیں وہی کروں گی جو میرا دل کہتا ہے۔“

”کیا کہتا ہے تمہارا دل۔“

”نی الحال چھٹی لوں گی؟“

”بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز میں رکھا حجاب کا موبائل بجا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دراز کھولی اور موبائل نکال کر روشن اسلے پر نظر آنے والا نمبر دیکھا اور نایاب باجی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”لیجیے آگیا فون۔“
 ”کس کا؟“

”انہی کا جن کا آپ اتنی دیر سے بہانے بہانے ذکر خیر کر رہی تھیں۔“
 ”الطاف کا؟“

”اشارات میں سر ہلاتے ہوئے حجاب نے کال ریسیو کی۔ ”السلام علیکم۔“

”تجلیہ؟“ نایاب باجی نے بہت دھیرے سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”وعلیکم السلام..... کیا ہو رہا تھا سرکار؟“ الطاف کا لہجہ رد میٹنگ مگر عامیانہ تھا۔
 ”کچھ خاص نہیں۔“

”چلیں عام ہی بتا دیں۔“

”نایاب باجی آئی ہوئی تھیں ناں سے بات کر رہی تھی۔“

”بیٹھی ہیں؟“ اس کے لہجے سے محتاط ہونے کا احساس ہوا۔

”نہیں..... چلی گئیں..... دوسرے کمرے میں۔“

”تھینکس گاڈ!“

”کیوں؟“

”بندے کو ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔“

”لیکن یہ وہ والا شکر نہیں۔“

”پرپلس ہیں آپ غلطی تو پکڑیں گی۔“ اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر اطلاع دینے والے انداز میں بولا۔
 ”ہاں کی سیٹ ہو گئی ہے میری۔“

”اوپ رہی۔“

”افسوس نہیں ہوا؟“

”کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ پھر ہنسا۔

”چلو فائدے والی بات کر لیتے ہیں۔ پندرہ بیس دن بعد واپس آؤں گا۔ تمہیں اپنے گھر لانے اور تمہیں اپنے ساتھ دینی لے جانے کے لیے۔“ وہ آپ سے تم پر آگیا۔ ”نکاح نامہ ملنے کے بعد میرے بہنوئی تمہارا ارجنٹ پاسپورٹ بنوادیں گے، گھر سے کسی کو ساتھ لے کر چلی جانا ان کے ساتھ پاسپورٹ آفس۔ اس سلسلے میں آنٹی سے بات کر لوں گا میں۔ ہاں یہ بتاؤ دینی سے کوئی خاص فرمائش؟“

”کچھ نہیں۔“

”چلو فی الحال میں اپنی پسند سے لے آؤں گا پھر تم اپنی ہی پسند سے خریدا کرو گی۔ اچھا دیکھو ایک بات کہہ رہا ہوں..... تم بیوی ہو میری، تم سے ہر طرح کی بات کر سکتا ہوں میں۔“ اس نے توقف کیا پھر بولا۔ ”انسان کے سر دوست ہوتے ہیں سود دشمن..... میرے جانے کے بعد کوئی دشمن الٹی سیدھی بات کرے تو پروا مت کرنا۔“

”کیسی بات! وہ چوکی۔“

”لاحول ولا قوۃ..... میں نے تو ایک بات کہی ہے تم تو پریشان ہو گئیں۔“

”آپ نے کسی وجہ سے تو کی ہو گی ناپہ بات۔“

”کسی خاص وجہ سے نہیں..... بس یونہی..... اصل میں اپنوں اور غیروں میں بہت سے لوگ مجھے اپنی بیٹیاں دینا چاہتے تھے۔ نکاح کی خبر سن کر ہو سکتا ہے وہ کچھ الٹی سیدھی اڑانے کی کوشش کریں۔ تم نے پریشان نہیں ہونا ہے۔“

”میں واقعی پریشان ہو رہی ہوں۔“

”اوہو! میں تو سمجھ رہا تھا میں نے بڑی میچورڈ، بہت عقلمند اور سمجھدار لڑکی سے شادی کی ہے۔“

”مجھے صحیح بتائیں کیا بات ہے۔“

”تم سے تو بات کرنا غضب ہو گیا۔ کوئی بات نہیں ہے۔“

”کیا الٹی سیدھی اڑانے کی کوشش کر سکتے ہیں آپ کے دشمن؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں..... انسان دوسرے انسان کو کسی مشکل میں گرفتار کرنا چاہے تو کچھ بھی کر سکتا ہے کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ میں نے تو احتیاطاً تمہیں خبردار کیا ہے ورنہ بات کوئی بھی نہیں۔ اچھا چھوڑو..... دفع کرو..... بھول جا کہ میں نے تم سے کچھ کہا۔ اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ آج ڈنر پر چلتی ہو میرے ساتھ۔“

”جی نہیں۔“

”آنٹی سے اجازت کا مسئلہ نہیں۔ میں اُن سے اجازت لے لوں گا۔“

”وہ اجازت دے دیں تب بھی نہیں۔“

”کیوں؟“

”بس۔“

”بس کا کیا مطلب؟“

”بس کا مطلب ہے بس اب اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں۔“

”ٹھیک ہے حضور، جیسے آپ کی مرضی، ہم آپ کی خوشی میں ناخوش ہوتے ہوئے بھی خوش۔“ کل کی طرح وہ اس روز بھی اس سے کافی دیر بات کرتا رہا۔ رات کو جب وہ سو چکی تھی پھر اس کا فون آگیا۔

”سوری! نیند نہیں آرہی تھی۔ بار بار تمہارا خیال ستا رہا تھا۔ جب تک رشتہ نہیں قائم ہوا تھا نہیں ہوا تھا اب تو تمہیں چھوڑ کر دینی جانے کو بھی دل نہیں چاہتا۔“

”سو جائیں اللہ شفا دے گا۔“

”سو تو تب جاؤں جب نیند آئے، جب نیند ہی نہ آئے تو کیا کروں۔“

”انٹیں، وضو کریں، دو رکعت نماز پڑھیں اور بستر پر لیٹ کر یہ تصور باندھیں کہ آپ کو نیند آرہی ہے نیند آجائے گی۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا تمہارا اتنا دیوانہ کیوں ہو گیا ہوں میں۔“

”میرے ٹین ایجرز کے شوق ہیں ہمارے آپ کے نہیں۔“

”عشق پر کسی کی ٹھیکے داری ہے کیا؟“

”آپ انورڈ کر سکتے ہیں مجھے اسکول جانے کے لیے صبح سویرے جاگنا ہوتا ہے لہذا شب بخیر۔“

”اسکول و سکول کا چکر اب ختم کرو۔ اب نوکری کی کیا ضرورت ہے تمہیں۔“

اس نے سردست اس موضوع پر مزید بات نہ کرنے کی عافیت جانی۔ وہ صاف لفظوں میں کہہ دیتا ریزائن کر دو تو وہ قبل از وقت ہی مشکل میں پڑ جاتی۔ سرکاری ملازمت تھی۔ یہ تھوڑی کہ خدا حافظ کہا اور گھر بیٹھ رہے۔ مقررہ قواعد و ضوابط کی پابندی لازم تھی۔

☆☆☆

تقدیم کے گھر میں اس سے پہلے کبھی کسی بات کا اتنی بے تابی سے انتظار نہیں کیا گیا تھا جتنی شدت سے مدثر کی فون کال کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ گھر میں موجود ہر فون اس کی کال ریسو کرنے کو مستعد تھا۔ کیا ہوتا تنہا سے نمبر لے کر وہ کس کے موبائل پر فون کر دے۔ زیادہ امید یہی تھی کہ وہ تقدیم کے نمبر پر فون کرے گا سو اماں تقدیم کو بار بار ہدایت کر رہی تھیں۔

”تقدیم اپنا فون کھلا رکھنا۔“

”جی اماں کھلا ہے۔“ تقدیم انہیں اطمینان دلانے کو کہتی۔

”بیٹری تو چارج کی ہوئی ہے نا؟“

”جی اماں۔“

”بیل اونچی رکھنا تاکہ بجے تو فوراً سنائی دے۔“

”فل والیوم پر ہے اماں۔“

”فون کیوں نہیں آ رہا اس کا۔“

”آجائے گا اماں..... وہ اماں کو تسلی دینے کی کوشش کرتی مگر دھڑکا خود اسے بھی لگا ہوا تھا کہ اگر مدثر نے فون

دے گا تو کیا ہوگا۔

مدثر کو اپنی جگہ دھڑکا لگا تھا کہ فون نہ کرنے پر تنہا کے گھر والے کہیں پولیس کو نہ کھڑکا دیں۔ منعم کی دفعہ کچھ کم

پریشانی اور جگ ہنسائی ہوئی تھی۔ اخبار تک میں تو خبر لگ گئی تھی۔ ”نیو وائنٹ ہال ہوٹل کے مالک معین الدین کا بیٹا منعم معین لڑکی کے اغوا کے الزام میں گرفتار.....“ تقدیم سے لائینی غلط بیانیوں بھی خلش بن کر اس کے دل میں کھٹک رہی تھیں۔ اس کے استفسار پر وہ اس سے یہ بات چھپا گیا تھا کہ اس کی اپنی بھی ایک بہن تھی جو شادی کے بعد بیرون ملک مقیم تھی۔ بھائیوں کی تعداد کے بارے میں تقدیم کے استفسار پر اس نے کہا تھا صرف ایک بھائی ہے جبکہ درحقیقت اس سے چھوٹے دو بھائی تھے۔ منعم اور اس سے چھوٹا بھائی وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس نے یہ لائینی جھوٹ کیوں بولے تھے۔ کیا تھا اگر وہ اسے بتا دیتا کہ اس کی ایک بہن بھی تھی۔ وہ یہ طعنہ تو نہ دیتی اسے کہ اپنی کوئی بہن نہ ہونے کی وجہ سے اسے دوسروں کی بہنوں کی عزت کا پاس نہیں تھا اور بھائیوں کی تعداد دو بتا دینے سے کیا آسمان گر پڑتا۔ انسان کا نامہ اعمال تو چھوٹی بڑی اور بہت سی غلطیوں سے پہلے ہی خاصا سیاہ ہوتا ہے۔ جانتے بوجھتے بلا سبب لائینی غلط بیانیوں سے وہ اپنے نامہ اعمال کو مزید داغدار کیوں کیے جاتا ہے۔ پولیس کے دھڑ کے اور بے معنی غلط بیانیوں پر کوفت کے ساتھ احساس خطا اس کے ضمیر کو بار بار کھتا، نان و شبینہ کی دوڑ میں ہانپتے ایک شریف گھرانے کی عزت سے کھیل جانا کوئی لائق تحسین فعل تو نہیں تھا۔ تقدیم کے الفاظ اس کے دل کا بوجھ بنے ہوئے تھے۔

”جیتے جی مار دیا ہے تم دونوں نے ہم سب کو۔“ تسنیم نے بھی یہ بتایا تھا کہ والد کمزور اعصاب کے آدمی ہیں۔ والدہ برسوں سے وہیل چیئر پر ہیں، بھائی ابھی بڑی ذستے داریاں اٹھانے کے لائق نہیں ہے۔ چار نہیں گھر میں اور بھی ہیں..... وہ اکیلی نہیں تھی بہت سے رشتے جڑے ہوئے تھے اس سے۔ خالائیں ہیں، چچا ہیں، پھوپھیاں ہیں، اُن کے کنبے ہیں کیسے منہ دکھائیں گے ہم اُن سب کو۔“

جوانی کے منہ زور جذبات کے بہکاوے میں آکر وہ غلطی تو کر بیٹھا تھا مگر اب مسائل منہ کھولے کھڑے تھے۔ تسنیم اور وہ نادر کے گھر میں کتنے دن پڑے رہ سکتے تھے۔ ثریا بھابی کی نگاہوں میں تو مسلسل ناپسندیدگی دکھائی دے رہی تھی۔ گزارے کے لیے اخراجات کا مسئلہ بھی تھا۔ وہ تو خود ماں باپ کا دست نگر تھا تسنیم کے لیے کہاں سے لاتا۔ آخری سمسٹر تھا وہ بھی مکمل کرنا تھا۔ خدا خواستہ تسنیم کے گھر والوں کی جانب سے پولیس کا رروائی ڈال دی جاتی تو اسے یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کی تکمیل میں بھی مسئلہ ہو سکتا تھا۔ شاید تقدیم دوسرے ہی دن یونیورسٹی نہ آ پہنچی ہوتی تو اسے ان مسائل کا احساس ہونے میں دو چار دن لگتے مگر تقدیم کی یونیورسٹی آمد نے کچھ ایسا ہی کام کیا تھا جیسے قتل عمد کرنے والا اپنے جرم کی سزا سے بچنے کے لیے کسی جائے پناہ کی تلاش میں قریہ قریہ مگر مگر بھٹکنے کے بجائے گرفتاری دے کر یک سو ہو جانا زیادہ بہتر سمجھے۔

”ہمارے سامنے بس اب ایک ہی راستہ ہے تسنیم اور وہ یہ کہ تم اپنے گھر واپس چلی جاؤ اور میں می کو سب کچھ بتا دوں۔ پھر مناسب موقع دیکھ کر وہ تمہارے گھر آئیں اور میری تم سے علی الاعلان شادی ہو جائے۔“ مدثر نے تسنیم کو سمجھایا۔

”میں پہلے بھی اس بات سے انکار کر چکی ہوں مدثر۔“

”یار کوئی راستہ تو نکالنا پڑے گا نا یہاں ہم کب تک پڑے رہیں گے۔“

”یہ بات تو تمہیں پہلے موچنی چاہیے تھی۔“

”الو کا پٹھا ہوں میں جو پہلے نہیں سوچی یہ بات۔“ اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ وہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”تمہارے گھر والوں نے پرچہ کٹوا دیا تو سارے راستے بند ہو جائیں گے۔ می، ڈیڈی بھی مجھے ٹھڈے ماریں

گے اور پولیس الگ..... تمہیں بھی بند کر دیں گے لاگ اپ میں اور ہمارے تھانوں میں جو کچھ ہوتا ہے نا عورتوں کے ساتھ اس کے بعد کم از کم میں تو یہ اعتبار نہیں کر سکتا کہ تم وہاں سے صاف ستھری آؤ گی۔“

”مدثر!“ اس نے شاک کی کیفیت میں اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

”ہاں!“ وہ پوری شد و مد سے بولا۔

”ابھی کتنے دن ہوئے ہیں اور..... تم..... ایسی باتیں کرنے لگے۔“ تسنیم کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

وہ پہنچ گیا اور اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے قدرے شرمندگی سے دھیمی آواز میں بولا۔ ”کم آن یار.....“

”بھنے کی کوشش کرو..... تمہارے لیے صاف ستھرا، ہموار اور آسان راستہ تراشنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جس میں تمہاری اور میری اور ہم دونوں کے گھر والوں کی عزت پر بھی حرف نہیں آئے۔“

”وہ تو آچکا۔“

”نہیں..... تمہارے گھر والے ہمیں راستہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے یار ہم دونوں نے اتنا بڑا قدم اٹھانے کے بجائے اگر پہلے اپنے اپنے گھر والوں کو بتا دیا ہوتا کہ یا تو ہماری شادی کرو ورنہ ہم خود کر لیں گے تو وہ کچھ نہ کچھ کر ہی دیتے۔“

”بار بار پچھتاوے کا اظہار کر کے تم اپنے ساتھ مجھے بھی احساس جرم سے دو چار کرنا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو مدثر کہ میں ایک بار جو فیصلہ کر لیتی ہوں اس پر شرمندہ نہیں ہوتی۔ جو ہوا ٹھیک ہوا۔“

”اب اس کو مزید ٹھیک کرنے کے لیے تمہیں اپنے گھر جانا ہو گا۔“

”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ اپنی ہلکوں پر لرزتی می کو دوپٹے کے پلو سے پونچھتے ہوئے اس نے پہلے ایک پھر دونوں آنکھوں سے اسے کڑی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایسی ضد مت باندھو کہ مجھے تم پر خود غرض ہونے کا شبہ ہونے لگے۔“

”کیا مطلب ہے اس نے تیوری چڑھائی۔“

”تمہارے والدین تمہیں صرف اس لیے اپنے گھر سے رخصت کرنا چاہتے ہیں تاکہ کل تمہاری باقی بہنوں اور بھائی کے رشتے آئیں تو تمہارا حوالہ ان کے لیے کسی مشکل کا باعث نہ بنے اور میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے گھر میں عزت سے آؤ۔“

”ٹھیک ہے میں ہاسٹل چلی جاؤں گی۔“

”میں نے سنا ہے یونیورسٹی گرلز ہاسٹل فل ہے۔“ مدثر نے اس کا گال اپنی انگلی سے چھوتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔

”شہر بھر پڑا ہے ہاسٹلوں سے۔“

”دیکھو.....“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے دھیرے دھیرے تھکیتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہارا مسئلہ سمجھتا ہوں۔ ایک مرتبہ اس گھر سے نکل آنے کے بعد تمہیں دوبارہ وہاں جانا اور ان سب کا سامنا کرنا مشکل لگ رہا ہے لیکن اگر تمہارے اس مشکل کا سامنا کرنے سے تمہارے اماں، ابا اور بہن بھائی آئندہ بے شمار مشکلات کا سامنا کرنے سے

قائل ہوتے ہیں تو کیا انہیں بے شمار مشکلات سے بچانے کے لیے تم ایک مشکل سے نہیں گزر سکتیں۔“

وہ جڑ بزدل کھائی دینے لگی۔

”خود ہم دونوں بھی بہت سی مشکلات سے بچ جائیں گے۔“ مدثر نے مزید کہا۔

اس نے مدثر کو دیکھا۔

”فار مائی سیک مائی لو۔“

وہ چند ثانیے اسے تنگی باندھے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”مجھے اس مشکل میں کیوں ڈالتے ہو مدثر۔“ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ”میرے ساتھ وہاں کچھ برا ہو گیا تو؟“ وہ چونکا۔ کتنی دیر اندیش تھی وہ۔

”اپنے گھر والوں کو تم مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ کیا تمہارے خیال میں وہ تمہارے ساتھ کچھ برا کر سکتے ہیں؟“

”تم اخباروں میں پڑھتے نہیں ہو کیا کہ پسند کی شادی کرنے والوں کو کیسے عذابوں سے گزرنا پڑتا ہے۔“

”میں ان سے ضمانت لوں گا۔۔۔۔۔ یقین دہانی چاہوں گا۔۔۔۔۔ کہ تم جیسے جاؤ گی ویسے ہی مجھے واپس ملو گی اور تمہیں وہاں کچھ نہیں کہا جائے گا۔“

وہ اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھوں کی انگلیاں اضطرابی انداز میں چٹکانے لگی۔

دفعتاً مدثر کے موبائل فون کی رنگ ٹون بجی۔ اس نے اسکرین پر کالر کا نمبر دیکھا اور تنسیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری بہن کا فون ہے۔“

تنسیم کی سانس کی لہو جیسی ہو گئی۔

مدثر نے کال ریسیو کی اور لاؤڈ سپیکر آن کر دیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ تقدیم بات کر رہی ہوں۔“ تنسیم نے بہن کی آواز سنی۔

”جی میں پہچان گیا۔“

”تمہارے فون کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”جی بس تھوڑا سا ٹائم اور دیں میں کرتا ہوں۔“

”کب تک؟“

”جلد۔۔۔۔۔“

”پلیز!“ تقدیم کے لہجے میں لجاجت تھی۔

بات ختم کرنے کے بعد وہ تنسیم کی طرف متوجہ ہوا۔ ”میرا خیال ہے اس سلسلے میں نادر اور ثریا بھابی سے بھی مشورہ کر لیا جائے اور میں ہاتھ پاؤں جوڑ کر می کو بھی اعتماد میں لے لوں۔“

وہ اسے دیکھنے لگی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“

”شادی کی سہی کو جلدی تھی مدثر۔“

”اور تم جو کہتی تھیں کہ تمہارے والدین بڑی بہنوں کی شادی سے پہلے کسی قیمت پر تمہاری شادی نہیں کریں گے۔“

”ہاں غلط تھوڑی کہتی تھی۔“

”تو بس خوش ہو جاؤ کہ تمہاری شادی بڑی بہنوں سے پہلے ہو گئی۔“ وہ مسکرایا۔

”اتنی مصیبتوں اور پریشانیوں والی شادی!“ اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“ مدثر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

☆☆☆

گھر واپس جانے سے پہلے مدثر نے نادر اور ثریا بھابی سے بھی مشورہ کیا۔

”دیکھو بھئی مدثر، میں تو کہتی ہوں کھری بات چاہے کسی کو اچھی لگے یا بری۔ جس کی عزت جاتی ہے نا اس کا دکھ

اٹا جاتا ہے۔ میرا تو کلیجہ منہ کو آ رہا ہے یہ سوچ سوچ کر کہ نہ جانے کس دل سے تنسیم کے گھر والوں نے یہ فیصلہ کیا

ہا گا۔ ان کی شرافت کا ثبوت ہے یہ کہ کڑوے گھونٹ بھی وہ آنکھ بند کر کے بھرنے کو تیار ہو گئے ورنہ ہوتے کوئی ایسے

اپنے تو نہ اپنی عزت کی پروا کرتے نہ تمہاری عزت کی۔ پولیس کو رپورٹ کرتے اور ساری دنیا تم دونوں کا تماشا

اہلحتی۔ مفت میں ہم بھی تماشا بن جاتے۔ ہاں پولیس سے خدا بچائے بخشش تھوڑی ہے کسی کو۔“ ثریا نے مفصل صلاح

دی۔

”اس میں سب کا بھلا ہے۔“ نادر نے تائید کی۔

”ہم نے تو اس قسم کے قصوں کے بڑے بڑے ڈرامے دیکھ رکھے ہیں مدثر۔“ ثریا بھابی نے مزید کہا۔ ”سر

ازار پڑیاں اچھلتی ہیں لوگوں کی اور جوڑ کیاں یوں گھروں سے جاتی ہیں ان کا وہ حشر ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ! میں تو

کہتی ہوں تنسیم کو تم کل کے اس کے گھر پہنچاتے آج ہی پہنچا دو۔“

تنسیم نے ہڑبڑا کر ثریا کو دیکھا۔

”ہاں بھئی نیک کام میں کس بات کی دیر۔“

”ذرا می سے بھی بات کر لوں۔“ مدثر نے کہا۔

”کمر مضبوط کر لینا اپنی۔“ ثریا نے کہا۔

”اب بتانا پڑے گا بھابی۔ می کو اعتماد میں لیے بغیر آگے کام نہیں بنے گا۔“

”نادر! ایک ریگسٹسٹ ہے تم سے اور بھابی سے۔“

نادر اور ثریا دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”صرف می کو بتاؤں گا گھر میں اور گھر سے باہر یہ بات تمہیں اور بھابی کو پتا ہے بس۔“

”فکر مت کرو۔“ نادر نے اسے تسلی دی۔

”آئی کو ابھی یہ مت بتانا مدثر کہ تنسیم کو تم نے ہمارے گھر میں رکھا ہوا ہے ورنہ وہ ہم دونوں سے ناراض

ہا میں گی کہ مجھے کیوں نہیں بتایا۔ بعد میں بے شک بتا دینا۔“

”ٹھیک ہے بھابی۔“ مدثر نے ثریا کو تسلی دی۔

☆☆☆

الطاف کی دینی روایت سے ایک روز قبل ای نے اسے رات کو کھانے پر مدعو کر لیا تھا۔ زیادہ بکھیرے سے نہجے

کے لیے انہوں نے فقط بھوت بھائی کو بلا لیا تھا۔ نایاب باجی کو سمجھا دیا تھا کہ انہیں بلایا تو ارم کو بھی بلانا پڑے گا۔ سب

انہیں کے تو الطاف کہے نہ کہے اسے دل میں یہ گلہ ضرور ہو سکتا ہے کہ میری بہنوں کو نہ پوچھا۔ الطاف آیا تو لدا پھندا،

نکاحیوں کا نوکرا، بسکٹ اور چاکلیٹ کے ٹن، آئس کریم، حجاب کے لیے نورست پھولوں کا دستہ۔۔۔۔۔ اس کے آتے

ہے گھر مہک اٹھا۔

”ضرورت ہے یا نہیں پھر بھی رکھ لو۔ پیسے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔“

”میرے پاس ہیں۔“

”ہاں ہاں، میں کب کہہ رہا ہوں تمہارے پاس نہیں ہیں۔ بیوی ہو میری، تمہارا پورا حق ہے میری جیب پر ہمارے دل پر۔“

اس کے اصرار پر حجاب کو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رقم لینی پڑی۔

”دل تو یہ چاہتا ہے کہ شادی کی شاپنگ تمہیں دہی سے کرواؤں مگر ہونہیں سکتا۔ خیر کوئی بات نہیں اور بہت مواقع آئیں گے۔“

بہجت بھائی اپنی بیوی اور بیٹی کے اکیلے پن کے خیال سے کھانے کے بعد چلے گئے تھے۔ الطاف نے اٹھتے اٹھتے گیارہ بجادے۔ اس کے جانے کے بعد کچن سمیٹ کر نماز ادا کر کے وہ بستر پر لیٹی ہی تھی کہ الطاف کا فون آ گیا۔

”سوئیں تو نہیں؟“

”نہیں۔“

”مجھے بھی نیند نہیں آرہی۔“

اس کا ”بھی“ کہنا حجاب کو مسکراتے پر مجبور کر گیا۔ وہ کیا سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کا تصور باندھے جاگ رہی تھی۔ صبح رات تک پھر کی طرح گھومنے کے سبب اس کا انگ انگ بری طرح دکھ رہا تھا اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئی ہار رہی تھیں۔ اب نہ جانے کتنی دیر اس کی فون کال نے اسے جگانا تھا۔ صبح اسکول بھی جانا تھا۔

☆☆☆

مدثر کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک جاگتی رہی۔ سیلنگ فین بے تابانہ چک پھیریاں کھا رہا تھا اور اس کی لٹریں ان چک پھیریوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ سوچا کیا تھا ہو کیا گیا۔ وہ تو گھر سے یہ سوچ کر نکلی تھی کہ مدثر کورٹ نرج کے بعد اسے اپنے گھر لے جائے گا اور اس کے گھر والے اسے سینے سے لگائیں گے، سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ ان دونوں کا علیحدہ کمرہ ہو گا جس کی آرائش شاہانہ ہوگی۔ منعم کی بیوی کی طرح وہ بھی عیش کے ہنڈولوں میں ہلے گی اور منعم کی بیوی کو جوتی کی نوک پر رکھے گی کہ اس کی طرح وہ بھاگ کر تھوڑی آئی تھی مدثر کی منکوحہ بن کر آئی تھی۔ اس کے اپنے گھر والے بھی دو چار دن روگا کر چپ ہو جائیں گے۔ کچھ دن ناراضی رہے گی پھر منعم بھی جائیں گے۔ وہ نقصان میں نہیں رہے گی۔ اپنی باری کے انتظار میں عمرانہ باجی کی طرح بوڑھی ہونے کے بجائے جرات مندی کا مظاہرہ بہتر تھا۔ یونیورسٹی میں اس کی ایک ہم جماعت ربیکا نے ایک روز کینٹین میں دوستوں کی گپ شپ کے دوران کہا تھا۔

”میری ایک آنٹی کہتی ہیں بندے کو پچاس فی صد خود غرض ضرور ہونا چاہیے ورنہ دوسروں کی خود غرضیوں کے انہیں مارا جاتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ سحرش نے پوچھا تھا۔

”مطلب یہ کہ۔“ ربیکا کی جانب سے کسی توضیح کا انتظار کیے بغیر امبر نے ربیکا کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے سحرش کو کہا تھا۔ ”جس طرح میں تم، ربیکا اور نسیم اکٹھے چائے پینے کے لیے کینٹین آئے تھے مگر یہ ربیکا کی بچی صرف اپنے کپ لے کر چکیاں اڑانے لگی اور اس خوش فہمی میں ہے کہ ہم تینوں کے ہاتھوں نہیں ماری جاسکتی۔“

”آپ سے بات ہو تو یہ ضرور پوچھیے گا کون سی خوشبو لگا رکھی ہے۔“ رباب نے مسکراتے ہوئے حجاب سے

”تم خود کیوں نہیں پوچھ لیتیں؟“

”ای سے جوتے پڑوا میں گی کیا۔“

”ای تو اتنی لبرل ہو گئی ہیں کہ کھانے کے وقت مجھے ساتھ بیٹھنے کی ہدایت جاری کی ہے۔“

”اصل میں ای آپ کے میاں سے امپریسڈ بہت ہو گئی ہیں۔ میں نے سوچ لیا ہے میں بھی کسی امیر آدمی

شادی کروں گی ورنہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ؟“

”کروں گی ہی نہیں۔“

”بکو اس مت کرو آدمی کو دیکھنا آدمی کیسا ہے۔“

”ارے آدمی جیسا بھی ہو امیر ہو تو دوڑتا ہے۔“

”وہ دوڑتا ہے یا لوگ اس کے پیچھے دوڑتے ہیں۔“

”ایک ہی بات ہے، جب وہ دوڑتا ہے تو لوگ اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں۔“

کھانے کے وقت حجاب کو امی کی ہدایت کے مطابق سب کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ بہجت بھائی کی موجودگی نے اسے انتہائی شرم محسوس ہوتی رہی مگر امی کہہ چکی تھیں۔

”شوہر ہے اب وہ تمہارا۔ کھانا ساتھ بیٹھ کر کھانے میں کیا شرم۔“ کھانے کے دوران الطاف کن آنکھوں

بار بار دیکھتا رہا۔ کھانے کے دوران وہ امی اور بہجت بھائی سے ضروری امور پر گفتگو بھی کرتا رہا۔ رخصتی کی تاریخ

کی بہنوں کو طے کرنا تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ نکاح کی طرح رخصتی کی تقریب بھی مختصر مگر پر وقار ہو۔ ولیمہ البتہ ایک

بڑی تقریب کے طور پر منعقد ہونا تھا جس میں دلہن والے جتنے مہمان چاہتے لاسکتے تھے۔ نکاح خواں کی طرف

نکاح نامہ ملتے ہی حجاب کا ارجنٹ پاسپورٹ بنوانے کے لیے اس نے بہجت بھائی سے اپنی مصروفیات میں

وقت نکالنے کی درخواست کی اور اسی وقت اپنے والٹ سے فیس نکال کر بھی انہیں تھمادی تھی حالانکہ وہ سخت مترا

ہوئے۔

”اس کی ضرورت نہیں میں فیس خود جمع کر دوں گا۔“

”یہ میری ذمہ داری ہے؟“ اس نے کہا اور امی سے اس نے بعد اصرار پوچھا۔ ”دہی سے کچھ چاہیے تو بلا تکلف

بتائیں۔“ امی کا جواب اس کے اصرار کے باوجود نفی میں رہا۔ وہ اسے مسلسل دعائیں دیتی رہیں۔

الطاف کے جانے سے پہلے اسے اور حجاب کو قصد آتلیہ فراہم کیا گیا۔

”سرکار! آپ کو چھوڑ کر جانے کو دل تو نہیں چاہتا مگر بزنس دیکھنا ہے اس لیے جانا ضروری ہے۔ آؤں گا

تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ رہنے کے لیے بہترین جگہ ہے دہی۔“ اس نے کہا پھر اپنی جیب سے والٹ نکال کر اس

میں سے ہزار ہزار کے کئی نوٹ نکال کر گئے بغیر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ رکھو۔“

حجاب متردد ہوئی۔

”رکھ لیں سرکار۔“ اس نے اصرار کیا۔

”ضرورت نہیں۔“

ہامی اور کچے قیے کے کباب، گاجر کا حلوہ۔ اس کی واپسی پر دوست کئی وقت مزے اڑاتے رہے۔ چنے کی دال کے حلوے کی ٹکڑیاں اسے چوتھے دن آدھی رات کو یاد آئیں اور وہ اپنے سفری بیگ کی جیبیں کھنگالنے بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟“ کھٹ پٹ سے مونس کی آنکھ کھلی تو اس نے پوچھا۔

”یار! امی نے چنے کی دال کا حلوہ بھی بنا کر دیا تھا وہ تلاش کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”سو جا صبح دیکھ لینا۔“

”نہیں، یار سوچ رہا ہوں کہیں وہیں تو نہیں بھول آیا۔“

”کھانے کی چیز تو بھول سکتا ہے۔“

”تے بے تل گیا۔ ای نے پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر اسے ایک اور شاپر میں ڈال دیا تھا۔ کھائے گا؟“

”مونس نے ہاتھ پار دیا۔ عقل نے حلوے کا ایک ٹکڑا اس کی تھیلی پر رکھ دیا اور خود بھی بستر پر لیٹ کر حلوہ کھانے لگا۔

”ہوں! مزے کا ہے۔“ مونس نے کہا۔

”دال امی کے ساتھ اس نے پسوائی بھی یارا۔“ عقل بولا۔

”اُس نے کس نے؟“ مونس نے پوچھا۔

”میری منگیتری نے۔“

”یہ منگیتری کیا ہوتی ہے؟“ مونس جو آنکھیں موندے منہ چلا رہا تھا آنکھیں کھول کر عقل کی طرف دیکھتے

ہے بولا۔

”منگیتری فیمنائن۔“

”منگیتری، منگیتری ہوتی ہے۔ اس کی کوئی فیمنائن نہیں ہوتی۔“ مونس ہنس دیا۔

”میری جان! میں اس کا منگیتری ہوں تو وہ میری فیمنائن نہیں ہوگی۔“ عقل اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”وہ بھی تیری منگیتری ہوگی منگیتری نہیں۔“

”اچھا یار چھوڑ حلوہ کھانے دے۔“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے بڑا عجیب خواب دیکھا۔“ مونس بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا.....؟“

”جیسے..... خدا نخواستہ میری والدہ فوت ہو گئی ہیں اور میں بہت رورہا ہوں۔“

”یاراجن سے ہمیں پیار ہوتا ہے نا اُن کی فکر بھی بہت لگی رہتی ہے۔ ہم اندر ہی اندر روتے رہتے ہیں کہ انہیں

کلمہ نہ جائے اور یہ خوف ہمیں ہمارے خوابوں میں بھی ڈراتا رہتا ہے۔ میرے پیچھے تجھے صبور ماموں کے ہاں چکر

اُٹا تھا۔ تھوڑا فیملی جیسا ماحول مل جائے بندے کو تو کچھ تسلی ہو جاتی ہے۔ ویسے یارا عجیب ہے زندگی کا چکر بھی.....

اٹل مہولی، اتنی مختصر سی زندگی اس میں بھی کبھی تعلیم کے لیے، کبھی روزگار کے لیے اور کبھی کسی اور وجہ سے اپنوں سے

اٹل۔ عقل نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیپ روشن کر دیا اور مونس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا تھا..... صبور اٹل کی طرف۔“

”اچھا! عقل چوٹا۔“

حالانکہ پچاس نہیں سو فی صد خود غرضی کے باوجود بھی یہ ماری جا سکتی ہے۔ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے امبر نے ربکا کے ہاتھ سے چائے کا کپ اچک لیا تھا۔ ربکا دیکھتی رہ گئی تھی اور سحرش کھٹکھٹا کر ہنسنے لگی تھی۔ تسنیم نے نسخہ شفا چکے سے دامن دل سے باندھ لیا تھا۔ بندے کو پچاس فی صد خود غرض ضرور ہونا چاہیے ورنہ دوسروں کی خود غرضیوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔

اس نے خود غرضی سے اپنے بارے میں سوچا تھا اور پہلے تمہید باجی پھر تقدیم آپنی کو راستہ دینے کے بجائے خود باپ کے گھر سے نکل آئی تھی۔ سوچا تھا کہ کپڑاں پر قدم پڑے گا مگر وہاں تو ماں باپ کے گھر سے بڑھ کر بے یقینی تھی۔ وہاں دن میں شیرنی کی طرح گھر میں دندناتی پھرتی رات کو لمبی تان کر ہر فکر سے بے نیاز ہو کر سوتی تھی یہاں تو مدثر کے جانے کے بعد اپنی سانس کی لے بھی دھبی رکھنی پڑتی۔ آس پاس ذرا سی سرسراہٹ سے بھی خوف آتا۔ مدثر کا خیال تھا مزید مشکلات سے بچنے کے لیے اسے اپنے گھر واپس چلا جانا چاہیے۔ بجا کہ وہ اسے جلد سے جلد باعزت طور پر واپس لے آنے کی یقین دہانی بھی کر رہا تھا مگر کیا ایک بار اس گھر سے نکل آنے کے بعد واپس جانا اتنا ہی آسان تھا۔

شب ڈھائی کا عمل تھا اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور، لیٹے لیٹے تھک کر وہ اٹھ بیٹھی۔ سر ہانے رکھے بیک سے اپنا موبائل نکالا اور مدثر کو فون کرنے کے ارادے سے موبائل آن کیا۔ موبائل آن کرتے ہی میسج ٹون بجی۔ گھر کے مکیوں کی نیند میں خلل پڑنے کے احتمال سے اس نے فوراً میسج وصول کرنے کے لیے احتیاطی مٹن دبایا۔ میسج تقدیم کے نمبر سے تھا۔

”آج چھوٹی خالہ گھر آئی تھیں، تمہیں گھر میں نہ دیکھ کر تمہارا پوچھا تو اماں نے بہانہ کیا کہ یونیورسٹی کی طرف سے کسی مقابلے میں شریک ہونے لاہور گئی ہے مگر یہ جھوٹے بہانے کب تک چلیں گے۔ بس ایک دفعہ گھر آ جاؤ تاکہ اماں کی خواہش کے مطابق تمہیں عزت سے رخصت کر دیا جائے۔ اماں کی طبیعت اچھی نہیں ہے ان پر رحم کھاؤ۔“

موصولہ پیغام پڑھ کر وہ اس سے چنداں متاثر نہ ہوئی۔ اخباروں میں آئے دن اس قسم کے اشتہارات نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ فلاں ابن فلاں، فلاں بنت فلاں، فلاں زوجہ فلاں کے نام اس پیغام کے ساتھ کہ تمہارے جانے کے بعد گھر میں فلاں شخص بستر مرگ پر ہے۔ تسنیم کو تقدیم کی طرف سے ملنے والا پیغام بھی کچھ ویسی ہی نوعیت کی جذباتی بلیک میلنگ محسوس ہوئی۔ اس نے موصولہ پیغام انتہائی ناگواری اور بے رحمی سے اپنے موبائل سے حذف کر دیا۔

☆☆☆

مونس کی چھٹی حس اس سے کہہ رہی تھی کہ میں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ فون کرتا تو نہ اماں کے لہجے میں وہ حدت محسوس کرتا جو اُن کا خاصہ تھی نہ ابا اس گرجوٹی سے بات کرتے۔ بہنوں سے بات ہوتی تو وہ بھی اس قدر حزم و احتیاط سے بات کرتیں کہ وہ کھٹکے بنانہ رہتا۔ اماں، لبا، بہنوں سب کو اس نے کریدنے کی کوشش کی مگر سب ٹال گئے تھے۔ عقل چھٹی گزار کر واپس آچکا تھا۔ ”یارا گھر جاؤ تو واپس آنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔“ واپس آ کر وہ دو تین دن گھر کی یادوں میں غلطاں رہا۔ بہانے بہانے اپنی ای، ایو اور بہن بھائیوں کا تذکرہ کرتا رہا۔

”گھر جاؤ تو گھر والے سارا وقت یوں کھلانے پلانے کے چکر میں رہتے ہیں جیسے ہمیں اکیڈمی میں توفانے پڑے رہتے ہیں۔“ عقل کی ای اور بہنوں نے نوع بنوع کھانے پکا کر اس کے ساتھ کر دیے تھے۔ بریانی، تینجن،

”تیری عائرہ باجی کا برتھ ڈے تھا۔ سب نے تجھے مس کیا۔“

”میری عائرہ باجی! اور تیری؟“

مونس چپ رہا۔

”تھوڑا آج ڈیفرنس ہے..... پر..... چلتا ہے یارا۔“

مونس بدستور چپ رہا۔

”چپ کیوں ہے؟“

”تو کیا کروں؟“

”کوئی تبصرہ کوئی کمنٹس۔“

”تو کمنٹس۔“ مونس بولا۔

”اوکے۔“ عقیل نے لحظہ بھر کو توقف کیا۔ ”ای نے صبور ماسوں اینڈ فیملی کے لیے بھی کچھ چیزیں بھجوائی ہیں۔ چھٹی سے آیا ہوں اس مرتبہ تو ایک اینڈ شاید ہی ملے پروگرام بنانا بیکار ہے، اگلے ویک اینڈ پر چلیں گے۔“

”مجھے تو اس مرتبہ بھی جانا ہے۔“

”اچھا! عقیل چونکا۔ ”کوئی خاص وجہ؟“

”عائرہ نے بلایا ہے۔“

”زبردست!“

”تجھے میں نے اس لیے بتا دیا ہے کہ آئی ایم سیریس..... پر ابھی ادھر ایسی ویسی کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پانگ آؤٹ کے بعد بات منہ سے نکالوں گا۔“

”مبارک! مبارک! مبارک!.....“

”تھینک یو۔“

☆☆☆

ممی سے بات کرنے کے لیے مدثر انہیں بہانے سے گھر سے باہر لے گیا۔ منعم اور اس کی بیوی سے راز دارنی ضروری تھی۔ ممی سن کر دم بخود رہ گئیں۔ صدمے کی کیفیت میں مدثر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اُن کا نگاہوں میں حیرانی کم تھی پریشانی اور رنج و ملال کا احساس زیادہ۔ ایک بیٹے کی نادانی کو تو انہوں نے جوں توں برداشت کر لیا تھا اب دوسرا بھی لغزش کھا بیٹھا تھا۔ اعتراف خطا کے بعد وہ سر جھکائے نادم و شرمساریوں ماں کے سامنے بیٹھا تھا جیسے جہاں بھر میں وہی تو اس کے لیے اک جائے پناہ تھی۔

”یہ کروت کرنے سے پہلے ڈوب نہ مرے تم۔“ ممی نے اسے غصے سے دیکھا، نفرت سے شاید اس لیے نہیں کہ اس ناخلف نے عدم سے وجود کے مراحل ان کی کوکھ میں طے کیے تھے۔ وہ ان کی اولاد تھی اور اس کی تمام خطاؤں اور لغزشوں کے باوجود اس سے محبت کیے جانا اُن کی مامتا کی مجبوری تھی۔

”ابھی تو منعم کا کروت نہیں بھولے ہیں لوگ اوپر سے تم گل کھلا بیٹھے، اس سے تو اچھا تھا کہ میں بے اولاد ہی رہتی۔“

”معاف کر دیں ممی بھول ہو گئی۔“ مدثر نے ممی کا گھٹنا چھوتے ہوئے کہا۔

”اپنے باپ پر ہی گئے نا۔“ ممی نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنا گھٹنا پرے کر لیا اور دل و نگار لہجے میں کہا۔

”ایسا تو نہ کہیں، آپ سے تو ڈیڈی کی ارغیڈ میرج تھی۔“ مدثر نے ممی کو اپنی مسکراہٹ سے رام کرنے کی کوشش کی۔

”اور کیا کم تھیں! آج ایک کے پیچھے تو کل دوسری کے پیچھے۔“ ممی کے لہجے سے گئے دنوں کا دکھ جھلک رہا تھا۔

”اب تو بے چارے بوڑھے ہو گئے۔“ مدثر نے دوبارہ اصل موضوع پر آنے کے لیے گریز لیا۔

”عادت تو نہیں بدلی۔ ڈال تو رکھی ہے ایک رکھیل۔“

”دفع کریں، اس کا ذکر بھی نہ کریں۔ گندی عورت۔“

”اس کے بارے میں تو میں نے صبر کر لیا تھا..... سینے پر سل رکھ لی تھی۔ بہویں بھی گندی ہی رہ گئی تھیں میری قسمت میں۔“

مدثر نے چونک کر ممی کو دیکھا۔

”منعم کی آئی تو بھاگ کر..... تمہاری آئی تو بھاگ کر۔“

”وہ بھاگ کر نہیں آئی ہے ممی..... اس نے مجھ سے کورٹ میرج کی ہے۔“

”تو بھاگنا اور کسے کہتے ہیں۔ اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر وہ گھر سے نکل آئی، تمہارے ساتھ جا کر کورٹ میں شادی کر لی اور تم کہتے ہو بھاگ کر نہیں آئی ہے۔ مجھے تو دیکھے بغیر ہی اس پر غصہ آ رہا ہے۔ جسے ماں باپ کی عزت کا پاس نہیں وہ کسی اور کی عزت کا پاس کیا کرے گی۔ ایسی لڑکیاں کسی سے وفا نہیں کرتیں جو لڑکی تمہارے لیے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ آئی وہ کسی دوسرے مرد کی خاطر تمہیں چھوڑ کر بھاگنے میں کب دیر لگائے گی۔“

”نہیں امی، وہ ایسی نہیں ہے..... اچھی لڑکی ہے۔“

”نیک پروین.....“ ممی نے طنز سے کہا پھر مخفی سے بولیں۔ ”ماں باپ کی عزت سے کھیلنے والی لڑکی کو اچھا ثابت کرنے کے لیے تم چلتے توے پر بھی بیٹھ جاؤ تو میں اعتبار کرنے والی نہیں، ارے! ماں باپ کی عزت کو داؤ پر لگانے والی لڑکی کبھی اچھی ہو سکتی ہے بھلا! منعم کی بیوی اور یہ میرے نزدیک دونوں ایک جیسی ہیں۔ تھو کے جانے کے لائق۔“

”لی کے لہجے میں حقارت تھی۔“

”اسے منعم کی بیوی سے نہ ملائیں۔“

”کیوں؟ اس میں کوئی سرخاب کے پر لگے ہیں۔ دونوں ایک جیسی۔“

”منعم کی بیوی کو تو آپ نے اور ڈیڈی نے سر پر بیٹھا رکھا ہے۔“

”مجھے معلوم تھا تم یہی کہو گے..... کوئی سر، سر پر نہیں بیٹھا رکھا ہے۔ منعم کا کیا بھوگ رہے ہیں ورنہ دل میں اس کی ہر بات کے لیے نہرتی بھر محبت ہے نہ عزت، دنیا کی ہنسی سے بچنے کے لیے ظاہری خوش اسلوبی ہے بس..... اس کا یہ طاب تو نہیں کہ تم بھی شہ پا کر ہمارے سر پر ایک اور گندلا دھرو۔ ماں باپ واپس بلو رہے ہیں تو جاؤ جا کر اس گند کو لالہ میں پھینک کر آؤ۔“ ممی نے نفرت اور حقارت سے کہا۔

”ماں، باپ ہمیشہ کے لیے واپس تھوڑی بلو رہے ہیں، وہ چاہتے ہیں اسے عزت سے رخصت کر دیا جائے۔“

”امان کے رشتے داروں کو کچھ کہنے سننے کا موقع نہ ملے۔“

”عزت!“ ممی نے مدثر کو چھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور تلخ لہجے میں بولیں۔ ”ایسی لڑکیوں کے مقدر میں

ہلکے ہوتی انہیں ذلت ملتی ہے، دھکے ملتے ہیں، ٹھو کریں کھاتی ہیں۔“

”عزت!“ ممی نے مدثر کو چھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور تلخ لہجے میں بولیں۔ ”ایسی لڑکیوں کے مقدر میں

ہلکے ہوتی انہیں ذلت ملتی ہے، دھکے ملتے ہیں، ٹھو کریں کھاتی ہیں۔“

”عزت!“ ممی نے مدثر کو چھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور تلخ لہجے میں بولیں۔ ”ایسی لڑکیوں کے مقدر میں

ہلکے ہوتی انہیں ذلت ملتی ہے، دھکے ملتے ہیں، ٹھو کریں کھاتی ہیں۔“

”آپ نہیں جانتیں۔“

”شرم کر..... ڈوب مر..... بے غیرت..... تنگ خاندان..... نہ جانے کون سا وقت تھا جو میں نے تم جیسی اولادوں کو جنم دیا۔“

”مجھے بچائیں مہی۔“ مدثر نے اپنے ذہن رسا کی کامیابی پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے گرم لوہے پر مزید ضرب لگانے کی کوشش کی اور اچانک مہی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے سر پر دھرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو میری قسم۔“

”اس لڑکی کے بعد اب تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔“ مہی نے اپنا ہاتھ سرعت سے پرے کھینچا اور مدثر کو گھورتے ہوئے بولیں۔

”مہی پلیز!“ مدثر نے مہی کو خوشامد انداز نگاہوں سے دیکھا۔ ”تسним کے گھر والے یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ کورٹ میرج اس نے اپنی مرضی سے کی ہے جبکہ اس بے چاری کے ساتھ تو میں نے زبردستی کی۔ سارا قصور میرا ہے، اگر آپ اس کے گھر اس سے میرا رشتہ مانگنے اور ڈیڈی کو بھی اس کے لیے آمادہ کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں تو میں اسے سمجھا بچھا کر اس کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ بس ایک مسئلہ ہوگا کہ آپ کو میری اس سے جلد از جلد شادی کر کے اپنے گھر لانا ہوگا باقی تمام مسئلے خود بخود ختم ہو جائیں گے، نہ کسی کو ہنسنے کا موقع ملے گا نہ باتیں بنانے کا۔ منعم کی بیوی بھی شیر نہیں ہوگی۔“

”بہت دکھ دیا ہے تم دونوں بھائیوں نے مجھے۔ کیسے کیسے خواب دیکھتی تھی میں تم لوگوں کے لیے۔ کیا کیا ارمان تھے میرے۔“ مہی رو ہانسی ہو گئیں۔

”مبشر ہے نا آپ کے ارمان پورے کرنے کو۔“

”تم نے بڑا مجھے سکھ دیا جو مبشر دے گا۔ چھوٹے اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔“

”اس کے لیے آپ سے میرا وعدہ ہے۔ دائیں بائیں نہیں ہونے دوں گا اسے۔“

”رہنے دو..... جسے اپنے اوپر کنٹرول نہیں وہ دوسرے کو کیا قابو کرے گا۔“

”غلطی کی ہے آپ جو مرضی آئے کہہ لیں۔“ اس نے مہی کے سامنے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”غلطی تو ہوگئی اب کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ اسے اس کے گھر پہنچاؤ فوراً۔“ مہی نے اسے تنبیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”رشتہ مانگنے جائیں گی نا آپ؟“

”پہلے تمہارے باپ کو راضی کرنا پڑے گا۔ وہ تو اپنے بھائی کے ہاں تمہارا رشتہ کرنے کا سوچ رہے تھے۔“ مہی کے لہجے سے ناگواری جھلک رہی تھی تاہم وہ نرم پڑ گئی تھیں۔

”اس موٹی بھدو ماہا سے۔“

”دیکھوں گی تم نے کون سی ابلہ پری پھانسی ہے۔“

”خیر دیکھ کر تو آپ خوش ہو جائیں گی۔“

”شرم کرو۔“

”بس ایک آپ ہی سے شرم کرنے کو جی نہیں چاہتا باقی تو سب سے شرم آتی ہے۔“

”ادھو!“ مہی کو یکایک خفقان ہوا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے بولیں۔ ”یہ تو نے کیا مصیبت

ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء (91)

”منعم کی بیوی تو عیش کر رہی ہے۔“ مدثر جسے مہی سے اتنی جلی کٹی سننے کی امید نہیں تھی کچھ خفگی سے شاکی لہجے میں بولا۔

”پھر وہی بات.....“ مہی نے مدثر کو غصے سے گھورا۔ ”میں تمہاری اس بات کا جواب دے چکی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ مدثر نے مفاہمانہ انداز میں کہا پھر اپنے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”اسے میرا قصور سمجھیں..... میرا کیا بھی برداشت کرنا ہوگا آپ کو۔“

”زبردستی ہے؟“ مہی نے اسے ابرو چڑھا کر دیکھا۔

”یہی سمجھیں۔“ مدثر کا لہجہ جارحانہ تھا۔

”مہی اس کا منہ دیکھنے لگیں۔“

”اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ منعم اور اس کی بیوی کو میری اور تسنیم کی کورٹ میرج کا ہتھ چلے۔“

”کیوں؟“ مہی نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر اُن کی نگاہوں نے مدثر سے پوچھا۔

”تسним ایک شریف لڑکی ہے مہی۔ اس کی والدہ معذور ہیں اور والد ریٹائرمنٹ کے قریب۔ ایک بھائی ہے ج

فوج میں ٹریننگ پر ہے۔ چار بہنیں ہیں اس کی دو اس سے بڑی، دو چھوٹی۔ تسنیم مجھے پسند تھی۔ میں نے اس سے

شادی کی بات کی تو اس نے کہا جب تک میری بڑی بہنوں کی شادی نہیں ہو جاتی میری شادی کا کوئی سوال ہی نہیں۔

ایک روز جب وہ یونیورسٹی کے لیے اپنے گھر سے نکلی تو میں اسے اپنی گاڑی میں لفٹ دینے کے بہانے کورٹ لے گیا

اور وہاں جا کر میں نے اس سے کہا اسے مجھ سے کورٹ میرج کرنا ہوگی ورنہ میں پوری یونیورسٹی میں اسے بدنام

کر دوں گا۔ شریف اور سادہ لڑکی تھی ڈر گئی۔ اس نے وہی کیا جو میں نے چاہا۔ اس کا کوئی قصور نہیں سارا قصور میر

ہے۔“ مہی کے جارحانہ تیور دیکھ کر مدثر نے اُن کے دل میں تسنیم کے لیے نرم گوشے پیدا کرنے کے لیے اصل حقائق کا

قدرے توڑ مرڈ کر ایک جذباتی سی کہانی ہاتھوں ہاتھ بتائی۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تو تم کہہ رہے تھے تم دونوں کی مرضی تھی۔“ مہی نے اسے گھورا۔

”میں نے غلط کہا تھا..... سوری..... سوری مہی.....“ اس نے اپنا بیان بدلنے پر معذرت چاہی پھر بولا۔ ”بر

مہی غلطی ہوگئی۔“

”غلطی!“ مہی نے اسے گھورا۔ ”جانتے ہو ایسی حرکتوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ منعم کی تو تھانے کچھری سے اس

لیے جلدی جان بخشی ہوگئی کہ لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ تمہارے لیے اگر لڑکی پولیس کو یہ بیان دے دے کہ تم نے اس

کے ساتھ زبردستی کی ہے تو تمہارے باپ کا اثر سوخ بھی تمہاری گلو خلاصی نہیں کرا سکتا۔“ مدثر نے سر جھکا لیا۔ مہی نے

اس کے سر پر چپٹ لگائی اور دانت پیستے ہوئے بولیں۔ ”تم دونوں بھائیوں نے کسی کو منہ دکھانے کا رکھا ہے، میں۔“

”سوری!“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”سوری کے بچے اپنی خیر منا..... لڑکی ہے کہاں؟“ مہی نے تو تڑاق شروع کر دی۔

”وہ..... ایک دوست کے گھر۔“

”کس دوست کے گھر؟“

”ہے ایک۔“

”کچھ نام تو ہوگا اس کا۔“

ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء (90)

کھڑی کردی ہے مدثر۔

”پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے می کوتلی دی۔

می لا چاری سے اس کا منہ دیکھنے لگیں۔

”چلیں میں آپ کو گھر چھوڑ دوں پھر اسے اس کے گھر پہنچانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“

”کسی اور مصیبت میں نہ پھنس جانا..... چلو میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“

”نہیں، نہیں، ابھی آپ کی ضرورت نہیں۔ جب ہوگی بتا دوں گا۔“

”کیسی کیسی آزمائشوں میں ڈال دیتے ہوں تم لوگ ماں باپ کو..... اپنی عزت کا بدلہ لوگ برسوں بعد بھی لیتے

ہیں۔ منعم گھر سے باہر جاتا ہے تو جب تک واپس نہ آجائے میرے دل میں سو سو طرح کے وہم آتے رہتے ہیں۔ اب

تمہاری طرف سے بھی سولی پر لٹکی رہا کروں گی میں۔“

”منعم کے سسرال والے کچھ اور قسم کے لوگ ہیں۔ یہ بے چارے تو حالات کے مارے ہوئے لوگ لگتے

ہیں۔“

”بیٹیوں کو کیوں کھلا چھوڑ دیتے ہیں حالات کے مارے ہوئے لوگ۔“ می کی بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔

کتنا عرصہ تسنیم اس کے ساتھ یونیورسٹی میں اور یونیورسٹی سے باہر بھی بے مہار گھومتی پھرتی رہی تھی۔ اس کے گھر سے

کبھی کوئی آیا تھا یہ دیکھنے کے لیے کہ یونیورسٹی میں اس کے چھل بل کیا تھے۔ ایک تسنیم ہی کیا ایسی بے شمار لڑکیاں تھیں

یونیورسٹی میں جنہیں ان کے والدین اور سرپرستوں نے حصول علم کے لیے یونیورسٹی بھیجا تھا مگر وہاں اپنی حرکتوں

سے اپنے خاندانوں کی ناموس خاک میں مل رہی تھیں۔ کسے کیسے واقعات ہو جاتے تھے یونیورسٹی میں۔ نوجوان

لڑکیوں کی بے آبروئی تو جیسے کھیل بن گئی تھی۔ والدین اور سرپرست اس وقت خبر لیتے جب پانی سر سے اونچا ہو چکا

ہوتا تھا کہ والدین اور سرپرستوں کو زندگی کے دوسرے بہت سے مسائل ہی فرصت نہ دیتے تھے۔ یہ بھی تسلیم کہ بڑوں

کو بچوں پر اعتماد ہونا چاہیے مگر یہ بھی تو حقیقت تھی کہ زمانہ پہلے جیسا معصوم، سادہ اور بے ضرر نہیں رہا حالات بدل گئے۔

لوگوں کی سوچ بدل گئی۔ اخلاقی قدریں وہ نہیں رہیں۔ معاشرے میں مرد و زن کا بے جابانہ میل جول ترقی کی

علامت اور بڑوں کا بچوں کو ان کی غلطیوں پر ٹوکنا دیکھنا تو سیت گردانا جاتا ہے۔ تیزی سے بے حجاب ہوتے میڈیا اور ہر

ہاتھ میں موبائل فون کے عفریت نے زندگی کے نقش و نگار ہی بگاڑ دیے۔ ایسے میں والدین کی ذمہ داری بڑھ گئی

ہے۔ نوجوانوں کے تعاقب میں لگے شیطان کی سرکوبی کے لیے بڑوں کا اپنے بچوں پر نظر رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔

بالخصوص حالات کے مارے ہوئے بڑوں کا۔ جو حالات کے مارے نہیں انہیں شیطان سے ساز باز کرنے کے گمراہ

ہیں۔

می جو مدثر کے ساتھ بہت خوش خوش اپنے گھر سے نکلی تھیں گھر واپس جانے کو انہیں تو بہت سی فکریں ہم رکاب

تھیں۔ مدثر پر انہیں غصہ بھی آ رہا تھا رجم بھی۔ باپ نے اپنی رنگ رلیوں کو چھوڑ کر بچوں کی تربیت پر توجہ دی ہوتی۔

انہیں اچھا برا سمجھایا ہوتا تو شاید دونوں بیٹے ان لغزشوں کا شکار نہ ہوئے ہوتے۔

☆☆☆

امی ان دنوں خاندان سے باہر عباد کے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش میں تھیں۔ زیتون گھر گھر کر رشتے ناتے

کرانے والی عورت تھی۔ عباد پر اس کی ایک عرصے سے نظریں تھیں، کئی مرتبہ امی کو ٹٹول چکی تھی اور انہوں نے یہی

جواب دیا تھا کہ اُن کے اپنے رشتے داروں میں عباد کے جوڑ کی کئی لڑکیاں بیٹھی ہیں مگر خاندان کی لڑکیوں کے بارے

میں عباد کے صاف انکار کے بعد امی نے جہاں اپنی سٹنے جلنے والیوں سے کہا زیتون سے بھی عباد کے لیے کوئی اچھی سی

لڑکی دیکھنے کو کہا۔ زیتون تو جیسے تیار ہی بیٹھی تھی۔

”لڑکیوں کی کوئی کمی ہے آیا جو پتھر اٹھاؤ اس کے تلے ایک لڑکی۔“

”عباد کے لیے مجھے بہت اچھی سی لڑکی چاہیے۔ میرے کون سے کوئی دو چار بیٹے ہیں۔ مجھ کا کافی کی بس ایک ہی

آنکھ۔ ایسی آئے جو عباد کا بھی خیال رکھے اور مجھے بھی بوجھ نہ سمجھے۔“

”مگر تم تو کہہ رہی تھیں عباد کے لیے خاندان میں کئی لڑکیاں بیٹھی ہیں۔“

”منع کر دیا ہے اُس نے..... کہتا ہے خاندان میں نہیں کروں گا۔“

”آپا! لڑکی تو ایک ایسی ہے میری نظر میں کہ جیسے ہیرا اور ہیرا بھی کوہ نور۔“

”اچھا.....!“ امی مجسم اشتیاق بن گئیں۔

”بشرطیکہ بات بن جائے۔“

”میرے عباد میں کس بات کی کمی ہے زیتون۔“

”وہ بات نہیں۔“

”تو پھر.....؟“

”لڑکی سے بڑی ایک اور بہن بھی بیٹھی ہے گھر میں۔ ماں باپ چاہتے ہیں کہ پہلے اُس کی ہو۔ ہے وہ بھی بہت

سیلئے مند اور خدمت گزار مگر صورت شکل میں دیتی ہوئی۔ یہ جو دوسرے نمبر کی ہے یہ تو ایسی بچے کی تمہارے عباد کے

ساتھ جیسے چاند سورج کی جوڑی۔“

”کتنی بڑھی لکھی ہے؟“

”میرا خیال ہے کم سے کم بھی نہیں تو چودہ جماعتیں..... بھی نوکری کرتی ہے۔ سنا ہے افسر ہے مگر بہت

تیز دار، بہت اخلاق والی۔ جب جاؤ آنٹی، آنٹی کہتے منہ سوکتا ہے اس کا۔“

”تم بات کرو۔ ماشاء اللہ میرا بیٹا انجینئر ہے۔ پکی نوکری ہے، یہ گھر اپنا ہے، گاڑی بھی اللہ نے چاہا تو لے لی

لیں گے۔“

”میں بات کرتی ہوں۔ کسی روز چلے چلیں گے اپنی تینوں اُن کے گھر۔“

”جب جانا ہو تو ایک دن پہلے بتا دینا مجھے۔“

”ہاں، ہاں ایک کیوں دو تین دن پہلے بتاؤں گی۔“

”باپ کیا کرتے ہیں لڑکی کے؟“ امی نے عباد سے بات کی تو وہ بولا۔

”یہ نہیں پوچھا میں نے۔“

”یہ بات تو سب سے پہلے پوچھنی چاہیے تھی۔“ عباد دھیرے سے ہنسا۔

”اب پوچھ لوں گی۔“

”اور بھائی؟“

”بھائی ایک ہی ہے، زیتون بتا رہی تھی فوج میں ٹریننگ کر رہا ہے۔“

”ایک بھائی اور وہ بھی انڈر ٹریٹنگ.....“ عباد دوبارہ ہنسا۔ ”کیا فیملی پلوائیں گی مجھ سے۔“
 ”کیا مطلب؟“
 ”کچھ نہیں۔“

”میں نے زیتون سے کہہ دیا ہے کسی روز ملوائے ہمیں ان لوگوں سے..... چلو گے نا؟“
 ”آپ میری شادی کرنے کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں تو دو، چار، دس جگہوں پر جانا ہی پڑے گا۔“ عباد نے خوش دلی سے کہا۔

”میں تو کہتی ہوں دو، چار، دس جگہوں پر جانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ پہلے ہی گھر میں ایسی لڑکی مل جائے جسے دیکھنے کے بعد کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے۔“
 ”صرف لڑکی نہیں سب کچھ اچھا ہونا چاہیے ای۔“
 ”انشاء اللہ..... انشاء اللہ..... سب کچھ اچھا ہوگا۔“ ای نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اماں کے پاس زیتون کا آنا جانا رہتا تھا۔ لڑکیوں کے لیے کئی رشتے لاجپتی تھی وہ۔ اماں، ابا کا کہنا یہ تھا کہ پہلے بڑی کی کریں گے مگر آنے والوں نے تمہید کے بجائے تقدیم یا تسنیم کو پسند کیا تھا۔ تقدیم کے لیے اماں، ابا کے فیصلے میں پھر بھی لچک کا امکان تھا مگر تسنیم کے لیے تو کسی قیمت پر بھی نہیں۔ بڑی دو بہنوں کے ہوتے اس کی شادی کا بھلا کیونکر سوچا جاسکتا تھا۔ اس بار زیتون نے تمہید نہ تسنیم، صرف تقدیم کے لیے رشتہ لے کر آئی۔
 ”تقدیم کی اماں ایسا بھلا رشتہ ہے کہ بات ہو گئی تو دعائیں دو گی تم مجھے۔ صرف تقدیم کو دکھانا تسنیم کو سامنے نہ آنے دیتا۔“ زیتون نے عباد کے بارے میں ضروری تفصیل اماں کو بتانے کے بعد کہا۔
 تسنیم کا ذکر کر کے زیتون نے اماں کی دھمکی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ناخلف اب اس گھر میں کہاں تھی۔ وہ تو ایسی عاقبت نااندیش ثابت ہوئی تھی کہ عزت سے ماں باپ کے گھر سے اٹھائے جانے کا انتظار کیے بغیر گھر سے نکل گئی تھی۔

”تو پھر کب لے آؤں ان لوگوں کو؟“ زیتون نے پوچھا۔

”میں ان کے ابا سے مشورہ کر کے بتاؤں گی تمہیں۔“ اور کوئی وقت ہوتا تو اماں کہتیں کل کی لاتی آج ہی لے آؤ مگر گھر میں ان دنوں تسنیم کے مسئلے کے باعث ماتم کی سی کیفیت تھی سو اماں نے بہانہ کیا۔
 ”بھئی مشورہ بعد میں ہوتا رہے گا، میرا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ لڑکی کو ایک بار آ کر دیکھ تو لیں۔“
 ”میں کون سا کوئی انکار کر رہی ہوں مگر کسی کو گھر بلانے کے لیے تھوڑی بہت تیاری تو کرنی ہی پڑتی ہے۔“
 ”ہاں یہ تو ٹھیک کہتی ہو۔ چائے، پانی کا بندوبست ذرا ٹھیک ہو جائے۔“
 ”انشاء اللہ۔“

زیتون کے جاتے ہی اماں وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے اپنا سر گھٹنوں پر لے لگیں اور انتہائی خشوع سے گڑ گڑانے لگیں۔ ”بارا اٹھا! اس گھر کا پردہ رکھنا تیرے ہاتھ ہے۔ رپ کریم تو سب کی سنتا ہے۔ مجھ مصیبت کی ماری دکھائی کی بھی سن لے مولا! اس مصیبت اس بدنامی سے نکال ہمیں ورنہ اپنے پرانے بہت ہنسیں گے۔ کہاں ٹھکانے لگاؤں گی میں اپنی باقی بچیوں کو۔ الٹی ہمارے لیے راستے آسان کر دے۔“

اماں سر بہ بخود ہی تھیں کہ تقدیم کمرے میں داخل ہوئی۔ اماں کو اس حالت میں دیکھا تو ٹھک گئی۔ ”اماں!“ اس نے دھیرے سے پکارا۔

اماں نے سر اٹھانے سے پہلے اپنی آنسوؤں سے تر آنکھیں دوپٹے سے پونچھ لینے کی کوشش کی۔ سر اٹھایا تو تقدیم ان کی آنکھیں دیکھ کر ماجرا سمجھ گئی۔

”مڈر کا بیج آیا ہے اماں؟“

”کیا کہتا ہے؟“ اماں کے لہجے سے بے تاب بی چھلک رہی تھی۔

”تسلیم کو یہاں لانے سے پہلے وہ اس کی حفاظت کی ضمانت کے لیے ابا سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”کیا ضمانت چاہیے اسے؟“

”کہ تسلیم کو کچھ کھانا نہیں جائے گا۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔“

”جو نقصان اس نے ہمیں پہنچایا اس سے بڑا بھی کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں ہم اسے۔“ اماں کرب سے بولیں پھر بڑبڑائیں۔ ”بڑا آیا تسلیم کا ہمدرد۔“

”اماں! بحث کون کر سکتا ہے۔ ہمیں تو مسئلے کا حل نکالنا ہے۔“

”میری بات کر اداؤں سے۔“

”نرمی سے اماں۔“

”مجھے سمجھا رہی ہو۔“

تقدیم خفیف ہو گئی۔

فون کرنے سے پہلے تقدیم نے اسے بیج کرنا ضروری سمجھا۔ ”اماں بات کرنا چاہتی ہیں تم سے۔“ کچھ دیر بعد اس کا نمبر ملاتے ہوئے وہ متذبذب تھی کہ مڈر کال ریسیو بھی کرتا ہے یا نہیں مگر اس نے کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو!“ اس کے لہجے میں بلا کی حزم و احتیاط تھی۔

”مڈر! والدہ بات کریں گی تم سے۔“ تقدیم نے اپنا موبائل اماں کو تھما دیا۔

”ان سے کیا بات کروں گا۔“ اماں نے اسے کہتے سنا۔

”جو بات تم ان کے ابا سے کرنا چاہتے ہو مجھ سے بھی کر سکتے ہو۔“ اماں تحمل سے بولیں۔ مڈر نے آئیں بائیں شاخیں کرنے کی کوشش کی مگر اماں نے اسے گھیر لیا۔ اماں کو اس سے بات کرتے دیکھنا اور سننا تقدیم کے لیے ایک ایسا تجربہ تھا جس نے اس پر آشکار کیا کہ دشمن سے دوست بن کر بات کرنا کیسی اذیت ناک صورت حال ہوتی ہے۔ مڈر سے بات کرتے ہوئے اماں کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے ہی لاشے پر بین کرتی گزر رہی ہوں۔ عزت بچانے کے لیے یہ سودا اماں کو کتنا گراں پڑ رہا تھا مگر سودا کرنا تو تھا۔ اماں سے بات چیت کرنے کے بعد رات کی تاریکی میں مڈر، تسلیم کو گھر پہنچا گیا۔

☆☆☆

اسکول سے گھر واپسی پر وہ کچھ دیر کرسی می کرنے کو لیٹ گئی تھی۔ دن انتہائی مصروفیت میں گزرا تھا۔ تین دن سے جاری آڈٹ خدا خدا کر کے مکمل ہو گیا تھا۔ یہ رجسٹر لاؤ، وہ لیجر نکالو۔ فلاں رسید دکھائیں۔ اس کا داؤ چر نکالیں۔ پڑتال شدہ دستاویزات کی دوبارہ اور سہ بارہ پڑتال میں کافی وقت ضائع ہوا، آفس سپرنٹنڈنٹ اور کلرک کے ساتھ وہ

بھی زچ ہوئی۔ آڈٹ ٹیم کے سربراہ نے تیسرے دن اپنا مدعا بیان کیا۔ پانچ مضامین میں فیل شدہ اپنی کسی عزیز کی بیٹی کو اس کے اسکول میں اگلی جماعت میں داخل کروانے کے لیے وہ اسے دباؤ میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

”میڈم! میرے ساتھیوں نے آبزرویشنز تو کئی لی ہیں مگر آپ کی ریپوٹیشن کے پیش نظر سیری یہ کوشش ہوگی کہ ہم ان آبزرویشنز کو ہاتھ کے ہاتھ سیٹل کر کے جانیں۔“

”تھینک یو۔“ اس نے انکساری سے کہا۔

جب موصوف نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ بولی۔ ”آپ خود سوچیں اپنے ہی ایک سسٹر انسٹی ٹیوشن میں پانچ مضامین فیل کرنے والی بیٹی کو میں اپنے اسکول میں اگلی جماعت میں کیسے داخل کر سکتی ہوں۔“

”سوچنا آپ کو ہے میڈم! ایک دو آبزرویشنز خاصی سیریس ہیں۔ ہم نے تو بس رپورٹ آگے بڑھانی ہوگی۔“ اپنی مقصد برآری کے لیے آڈیٹرز کی جانب سے اس قسم کی بلیک میلنگ عام تھی اور خواتین سربراہان مدارس اکثر دباؤ میں آ جاتی تھیں۔

”ٹھیک ہے آپ آبزیکشنز لے لیں۔“ اس نے بے دھڑک کہا۔

آڈٹ اور اسکول کی دیگر مصروفیات کے دوران دعویٰ سے الطاف کی فون کال بھی بیس پچیس منٹ لے گئی۔ نینا تعلق تھا وہ مردوتا اس سے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ مصروف ہوں۔ اس کی فون کال سننے کے لیے اس نے پرائیویسی کی خاطر دفتر سے اٹھ کر گراؤنڈ میں جانا بہتر سمجھا۔

تھکی ماندی گھر واپس لوٹی تو ای نے کہا۔ ”تم جب تک چیخ کرتی ہو میں نماز ادا کر لوں پھر اکٹھے کھانا کھائیں گے۔“

”رہا اب؟“ اس نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

”اس کی آج یونیورسٹی میں پریزنٹیشن ہے دیر سے آنے کا کہہ گئی ہے۔“

ای نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں اور وہ چیخ کرنے کے بجائے ذرا دیر سنانے کو لیٹ گئی۔ دو منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر دھرے اس کے ہینڈ بیگ میں موبائل فون بجا۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے ہاتھ بڑھا کر بیگ اٹھایا اور زپ کھینچ کر موبائل نکال لیا۔ ڈسپلے پر الطاف کا نمبر تھا۔

”جی!“ وہ اٹھ بیٹھی۔

”ہاں..... کیا ہو رہا ہے؟“ الطاف نے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... بس ابھی گھر پہنچی ہوں اسکول سے۔“

”ریزائن کریں سرکار۔“

وہ کچھ نہیں بولی۔

”تمہارے لیے بلیک بیری خرید رہے ہیں..... بھجوا دوں؟“

”کیا ضرورت تھی؟“

”ضرورت تھی نا..... تمہارے ہاتھ میں چار پانچ ہزار والا موبائل نہیں ہونا چاہیے اب۔“

”فون ہی تو سننا ہوتا ہے چاہے سیٹ سستا ہو یا مہنگا۔“

”دنیا پاگل تو نہیں ہے جو قیمتی موبائل پر مرتی ہے۔“

”ابو میرے لیے گڑیا آج بھی نہیں لائے“ زینبی نے باپ کے قدموں میں لیٹتے ہوئے کہا تو رسول بخش سے رہا نہیں گیا اس نے بڑھ کر اپنی بیٹی کو اپنی گود میں اٹھالیا۔

”بیٹا آج ابو بہت تھک گئے ہیں نا، کل ضرور تمہارے لیے گڑیا لے کر آئیں گے بس اللہ میاں سے دعا کرو ابو کو کوئی ایسا کام مل جائے جس کو کرنے سے ابو کو بہت سارا پیسہ ملے پھر ابو اپنی منہی منی پھول

گڑیا

صائمہ حیدر



”دنیا کا کیا ہے۔“

دو دروازے پر کوئی آیا ہے بیل بجی ہے۔ میں ذرا دیکھ لوں۔“

”کوئی اور دیکھ لے گا بھی۔“

”ای نماز پڑھ رہی ہیں اور رباب یونیورسٹی گئی ہوئی ہے۔“

”او کے دیکھ لو، میں ہولڈ کرتا ہوں بلکہ دوبارہ کرتا ہوں۔“

پاؤں میں جوتے پہن کر اس نے گھر کے مرکزی دروازے کا رخ کیا۔ دروازے تک اس کے پہنچتے پہنچتے بیل دوبارہ بجائی جا چکی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو تیز خوشبو کے جھونکے نے اس کے مشام جاں کو معطر کر دیا۔ دروازے پر دو خوش پوش اجنبی خواتین کھڑی تھیں۔ ایک جوان اور خوب صورت دوسری ادھیڑ عمر اور پُر وقار۔ دروازے کے باہر سیاہ رنگ کی ایک چمکیلی کار کھڑی تھی اور ایک مرد گاڑی کے پاس کھڑا دونوں عورتوں کی سمت دیکھ رہا تھا۔ ادھیڑ عمر عورت کی گود میں چھوٹے سے خوش رنگ اور ملائم کبل میں لپٹا ایک بچہ تھا جسے اس نے اپنے دونوں بازوؤں کی مچان پر لے رکھا تھا۔ دروازہ کھولنے پر دو اجنبی عورتوں کو اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ کر حجاب تجسم سوال بن گئی۔ نو جوان عورت کی نظریں اس نے اپنے حنائی نقش و نگار والے ہاتھوں پر مرکوز دیکھیں۔

”جی فرمائیے۔“ حجاب کا قیاس تھا کہ وہ آس پاس کسی ہمسائے کے گھر کا ہوا پوچھیں گی۔

”تم حجاب ہو؟“ نو جوان عورت نے یہ سوال کر کے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

”جی..... جی ہاں..... آپ؟“ اس نے کہا۔

”شرم نہ آئی تمہیں نکاح کرتے۔“ اس نے حجاب کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

حجاب نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

”جس شخص سے تمہارا نکاح ہوا ہے وہ میرا شوہر ہے۔“ اس نے حجاب کو گھورتے ہوئے کہا۔ حجاب کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔ یہ کیا کہہ رہی تھی وہ۔

حجاب ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ نو جوان عورت نے دوسری عورت کے ہاتھوں سے بچہ لیا اور اسے حجاب کے قدموں میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”اس کے باپ کی بیوی بنی ہو تو اسے بھی سنبھالو، یہ الطاف کا بیٹا ہے۔ اسی دن پیدا ہوا جس دن اس کے باپ نے تم سے نکاح کیا۔ اس کے باپ کی دولت پر رنجھی ہو تو اسے بھی سنبھالو۔“

حجاب کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسے لگا وہ بچے گر جائے گی۔ شاید گر ہی جاتی اگر ای کے مہربان ہاتھوں نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا۔ وہ سلام پھیر کر دروازے پر آگئی تھیں اور انہوں نے بھی اس عورت کے آخری جملے سن لیے تھے۔

نو مولود بچہ کبل میں لپٹا دروازے کی دہلیز پر پڑا تھا۔ دہلیز کے باہر نو جوان عورت اپنی ادھیڑ عمر ساتھی کے کندھے پر سر رکھ کر رہی تھی اور اس کی نظریں دہلیز پر پڑے بچے پر مرکوز تھیں۔ دہلیز کے دوسری طرف حجاب کو ای نے سہارا دے رکھا تھا اور حجاب سکتے کی کیفیت میں کھڑی اپنے گھر کی دہلیز پر پڑی ایک نئی زندگی کو یوں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی۔

(باقی آئندہ)

ی بیٹی کے لیے ضرور گڑیا لائیں گے۔“

رسول بخش کی بیوی رضیہ باورچی خانے میں کھڑی باپ اور بیٹی کے درمیان ہونے والی باتوں کو بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اپنی بیٹی کی روز کی اس فرمائش سے وہ گھبرا جاتی تھی۔ بچی کی تڑپ اور اپنی اور رسول بخش کی بے بسی کے بارے میں سوچ، سوچ کر اس کو اپنا دل کوئی ٹٹھی میں بھینچتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ قلبی اور روحانی دونوں طور پر اپنے آپ کو کرب و اذیت میں مبتلا محسوس کرتی تھی۔ اس سے بیٹی کا درد دیکھا نہیں جاتا تھا اس نے اپنے اور رسول بخش کے لیے پیالیوں میں چائے انڈیلی اور محن میں بجھے تخت پر بیٹھ گئی جس پر رسول بخش بیٹھا اپنی بیٹی کو کہانیاں سنا رہا تھا۔

”ای، بتائیے ناں ابو کو محلے میں سب ہی کے پاس پیاری پیاری گڑیاں ہیں بس میرے ہی پاس نہیں ہے۔ زیبو، رانی، گڑیا سب ہی گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔“ ماں کو دیکھ کر بچی ماں کے سر ہو جاتی تھی، یہ اس کا روز کا ہی معمول تھا وہ ایسے ہی ضد کرتی اور ماں باپ اس کی ضد کو کل کے بھروسے تھپک تھپک کر سلا دیتے اور وہ کل آ ہی نہیں پاتی تھی۔ جب اس معصوم کی یہ بچکانہ خواہش لاچار ماں باپ پوری کر پاتے۔ رضیہ کا اپنی بے چارگی اور کم مائیگی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہتا مگر وہ چپ کا آنچل اوڑھ کر چپکے سے اپنی غمگین آنکھوں سے بیٹی کو دیکھ کر پھینکی سی مسکراہٹ بکھیر دیتی جیسے سب کچھ نارمل ہو۔

☆☆☆

رسول بخش کو بیٹی کی فرمائش آج بھی پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی، وہ ناامیدی اور مایوسی کی صلیب پر ٹکٹا جا رہا تھا۔ وہ شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا اس کا دماغ

اس کی بیٹی میں ہی الجھا ہوا تھا وہ کیسا بے بس اور مجبور باپ تھا کہ اپنی بیٹی کی اتنی سی خواہش نہیں پوری کر سکتا تھا۔

بہت دن پہلے اس نے اپنی بیٹی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے لیے خوب صورت سی گڑیا خرید کر لائے گا جو اس کی طرح خوب صورت ہوگی۔

”ابو میں خوب صورت ہوں؟“ معصوم زینی نے پوچھا تھا۔

”ہاں بیٹے، میری جان، میری لاڈلی تم بہت خوب صورت ہو۔“ بچی سرشار ہو کر باہر گلی میں شور مچاتے بچوں کے ساتھ کھیلنے چلی گئی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ زینی خاصی بد صورت تھی۔ آنکھیں بہت چھوٹی، ناک بہت پھیلی ہوئی، کان بڑے اور ہونٹ موٹے اور ٹیڑھے، ٹھوڑی نیچے کو جھکی ہوئی، ہاتھ پاؤں بھی واجبی سے تھے رنگ بھی گہرا سانولا تھا۔ ان دونوں کے ذہن میں کئی بار یہ خیال آتا تھا کہ وقت کے ساتھ اس کی بد صورتی میں کمی ہو جائے گی مگر معاملہ اس کے الٹ ہوا اور وہ جوں جوں بڑی ہوئی اس کی بد صورتی نمایاں ہوتی چلی گئی وہ بیوی کو سمجھاتا۔

”دیکھو رضیہ، زینی کو کبھی بھی اس بات کا احساس نہ ہونے دینا کہ وہ بد صورت، کالی، بھدی اور نامناسب ہے بلکہ ہمیں اس کی پرورش اس انداز میں کرنی چاہیے کہ اس کے ذہن میں کبھی یہ خیال پیدا نہ ہو کہ وہ کسی سے کم تر ہے۔“ رضیہ اپنی ذمہ داری اپنا فرض سمجھ کر بہ خوبی بھاری تھی۔

برے دن آتے ہیں تو پوچھ کر نہیں آتے، ان کا دورانیہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ کہتے ہیں برے وقتوں میں تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ وہ جس فیکٹری میں کام کرتا تھا ایک تو وہ پہلے ہی خسارے میں جا رہی تھی پھر اسے آگ لگ گئی مگر زیادہ تر لوگوں

کر دیا ہے۔ اس کا دماغ ایسی ہی تصویروں سے بھر جاتا۔ آخر یہ قابلِ نفرت تصویریں ہی اس کے ذہن میں کیوں ابھرتی ہیں؟ خود زندگی کتنی حسین اور روشن ہے مگر وہ اس کے چہرے پر لگی ہوئی گندگی اور کچھڑ کو بھول نہ پاتا۔ زندگی کی یہ بد صورتی اور بدبختی بھوکے لوگ، تنگے لوگ، لنگڑے اور اپاہج لوگ، بد بخت انسانوں کا نہ ختم ہونے والا یہ جلوس وہ صبح شام دیکھتا۔ وہ انہیں بھولنا چاہتا مگر کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کا دماغ ہر وقت چکر کھاتا رہتا۔ دل ہر وقت زور زور سے دھڑکتا رہتا۔ اسے اپنی بیٹی کی بد صورتی ہر وقت یاد آ جاتی کہ اس کی بیٹی کو ہٹا چلا گیا ہے کہ وہ بد صورت ہے پھر وہ ایک ہلکی سی پھریری لیتا اور کسی اور طرف سوچ کا رخ موڑ دیتا۔

جب وہ رضیہ کے بارے میں سوچتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ رضیہ بالکل بدل گئی تھی۔ اندر گھسے ہوئے گال، انگلیوں کے جوڑ سو جے ہوئے، ناخن بے رونق اور بالکل ہلدی کے رنگ کے، بالوں میں چھپے ہوئے کانوں میں لٹکے کالے دھاگے، آنکھوں میں سیاہ حلقے، بھٹے ہوئے پڑی زدہ ہونٹ وہ اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔ اس نے اپنی تمام خواہشیں، حسرتیں، امیدیں اور آرزوئیں کسی نا معلوم صندوق میں رکھ کر دفن کر دی تھیں۔

بیٹی کی ضد میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی وہ روتی، تھکتی اور کہتی۔ ”مجھے گڑیا چاہیے۔ مجھے گڑیا لا کر دو۔“ وہ دونوں میاں بیوی ہر روز جھوٹا وعدہ کر کے خود کو بھی خاصا پریشان کر رہے تھے۔

”تم اسے بتا کیوں نہیں دیتیں کہ میں ابھی اس کے لیے گڑیا نہیں خرید سکتا۔“ وہ رضیہ سے کہتا۔

”کیا کروں زینی کے ابو مجھ میں جرأت نہیں ہے بچی کی اتنی سی خواہش کو رد کرنے کی، تم کوشش کرو

کا خیال تھا کہ مالک نے فیکٹری کو جان بوجھ کر آگ لگوائی ہے تاکہ انشورنس کی بھاری رقم وصول کی جاسکے اور وہ خسارے کا کام چھوڑ کر کوئی نیا کام کر سکے۔ جس سے زیادہ منافع کمایا جاسکے اور مزدوروں کی آئے دن کی جھک جھک سے بھی جان چھوٹ جائے۔

کتنے ہی مہینے گزر گئے تھے وہ بیکار تھا۔ سڑکوں پر جوتیاں چٹانا اس کی ضرورت بن گیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کا واحد کفیل تھا، اسے لگتا مہنگائی کا عذاب کہیں ان سے ان کی زندگیاں ہی نہ چھین لے۔ اس دور میں جبکہ زندگی کی ضروریات پوری کرنا مشکل تھا تو خواہشات پوری کرنا ایک خواب بن گیا تھا۔ جو چار پیسے برے وقتوں کے لیے انہوں نے بچا کر رکھے تھے وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ مفلسی نے گھر میں ڈیرے جما لیے تھے۔ اب حالات ایسے رخ پر آگئے تھے کہ وہ کوشش کرتا کہ اسے روزانہ کوئی کام ضرور مل جائے تاکہ جب شام کو وہ گھر آئے تو اس کی جیب میں کچھ پیسے ہوں اور ہاتھ میں کھانے پینے اور روزمرہ کی ضرورتوں سے بھرا ہوا تھیلہ۔ اکثر اسے کوئی کام نہ ملتا۔۔۔۔۔ پورے شہر میں ہی بے روزگاری عام ہو چکی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ حالات کب تبدیل ہوں گے۔ غربت کی یہ کھرا لوڈ شام کب ختم ہوگی۔ وہ ہر وقت گہری سوچ میں رہتا پھر سوچتا، ہر بات اللہ کی مرضی سے ہوتی ہے وہ رازق العباد ہے ہمیں بھوکا نہیں سلاتا۔

رسول بخش کے دماغ میں یادیں اس طرح گھومتیں جیسے آسمان پر بادل کے ٹکڑے اڑتے ہیں۔ الاس ایک خوفناک بیماری ہے، یہ بیماری آدمی کے ہمم کو، دماغ کو بلکہ روح تک کو تباہ کر دیتی ہے۔ سماج کے ہر طبقے کے ہزاروں لاکھوں مردوں اور عورتوں کے جسموں، دماغوں اور روحوں کو اسی بیماری نے تباہ

کوئی نہ کوئی کام ضرور تمہیں مل جائے گا تم میری فکر نہ کرو حالانکہ میری یہ اوڑھنی دیکھو اس میں جا بجا پوند لگ گئے ہیں مگر تم اس کی پروا مت کرو، تم زین کی گڑیا کے بارے میں سوچو۔" وہ بیوی کے صبر شکر پر خون کے آنسو پی کر رہ جاتا۔ وہ زیادہ تر کوشش کرتا کہ بیٹی کے جاننے سے پہلے ہی روزی روزگار کی تلاش میں گھر سے نکل جائے اور جب وہ سو جائے تو گھر لوٹے تاکہ بیٹی سے اسے جھوٹ بولنا نہ پڑے۔

☆☆☆

پھر اس دن اس کی دعا قبول ہو گئی اسے کئی روز کے بعد کام مل گیا ایک دکان دار اپنی دکان کی توسیع اور مرمت کے بعد اسے نئے سرے سے ترتیب دے رہا تھا۔ اسے کچھ مزدوروں کی ضرورت تھی دو دن اس نے وہاں کام کیا جب دو دن کام ختم ہونے کے بعد اسے اچھی خاصی رقم ادا کی گئی تو اس نے سوچا آج میں گڑیا ضرور خریدوں گا۔

وہ مارکیٹ گیا اور کئی دکانوں پر اس نے سستی، مہنگی، چائیز، جاپانی، پاکستانی، انگریزی ہر طرح کی گڑیاں نکلا کر دیکھیں اور ہر گڑیا کی بار بار قیمت معلوم کرتا گیا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا تھا گڑیاں جو اس کو پسند آ رہی تھیں وہ بہت زیادہ مہنگی تھیں اس کی پہنچ سے باہر..... کچھ تو اتنی مہنگی تھیں جو وہ اپنی پوری کمائی ادا کر کے بھی نہیں خرید سکتا تھا۔ کئی دکانوں پر جانچ پڑتال کرنے کے بعد وہ ایک دکان پر کھڑا ہو گیا۔

اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اب کتنے دنوں کے بعد کام ملے گا۔ ان پیسوں سے وہ چند دنوں کے لیے گھر کا راشن بھی ڈال لینا چاہتا تھا تاکہ گھر میں فاتے کی نوبت نہ آئے۔ بہت حساب کر کے اس نے آخری فیصلہ کر لیا کہ 50 یا 100 روپے سے زیادہ قیمت کی وہ گڑیا نہیں خریدے گا۔ ابھی وہ دکان پر گڑیا نکلا کر دیکھ ہی رہا تھا کہ گاڑی میں سوار ایک امیر

عورت اپنی بیٹی کے ساتھ اتری اس کی بیٹی نے دکان میں رکھی مہنگی ترین گڑیا پسند کی اس کے علاوہ بھی اس نے اور نہ جانے کتنے مہنگے مہنگے کھلونے نکلائے اور بغیر چوں چوں رقم ادا کر کے چلی گئی۔

معاشرے کی ناہمواری اور نا انصافی پر وہ جل بھن کر رہ گیا مگر اس نے کچھ نہیں کیا شکست خوردہ سا وہیں کھڑا رہا۔ پھر اس نے ہمت جمع کر کے ایک گڑیا خرید لی۔ دکان دار کے تو مزاج ہی نہیں مل رہے تھے بڑی مشکل سے اس نے کچھ پس و پیش کے بعد گڑیا لفافے میں رکھی اور چل پڑا۔ گھر جانے سے پہلے اس نے ضروری سامان خرید ایک بڑا تھیلا اس سامان سے تقریباً آدھا بھر لیا اس کے بعد وہ بس میں سوار ہو کر جلدی سے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ بس میں رش بہت زیادہ تھا کسی نے اسے پیچھے سے زور کا دھکا دیا تو اس کا تھیلا اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ بس رکی اور لوگ اس کا تھیلا روندتے اترتے چڑھتے گئے جب بس چلی تو وہ مشکل سے اپنا تھیلا اٹھانے میں کامیاب ہوا۔ وہ گھر پہنچا سامان کا تھیلا دیکھ کر رضیہ کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ اس کو مسکراتا دیکھ کر مسکرا اٹھا اس کے سارے دن کی تھکان رضیہ کو مسکراتا دیکھ کر دور ہو گئی۔ ایک ایک کر کے وہ چیزیں نکالنے لگی، بیٹی بھی پاس بیٹھی تھی وہ اپنی بیٹی کو اچانک گڑیا دے کر خوش کرنا چاہتا تھا، تھیلے کے اندر... سامان کے آخر میں وہ گڑیا والا لفافہ تھا۔

"بوجھو تو جانیں، میں کیا لایا ہوں اپنی زین کے لیے؟"

"گڑیا، گڑیا۔" وہ خوشی سے چیخنے لگی۔ اس نے لفافے سے گڑیا نکالی۔ وہ چونکہ سستی سی پلاسٹک کی گڑیا تھی جو کہ سامان کے بوجھ اور لوگوں کے قدموں کے نیچے روندے جانے سے بالکل پچک گئی تھی اس کے ہونٹ ٹیڑے میڑھے اور

شاید کسی روز

غم کے بادلوں نے گھیرا ہے
دلہا پر لگا دکھوں کا پہرا ہے
آنکھ غم
زیست خالی ہے
انہیں ہوئے ہیں ہاتھ
اک عمر سے بن کے سوالی
دعا روٹھ گئی ہے
یا
گناہ ہی کچھ ایسے سرزد
ہو چکے ہیں
جن کی نہ معافی ہے
نہ تلافی
پھر بھی امید کا درہکتے ہیں
پھر بھی
آس کے چراغ جلاتے ہیں

کہ
شاید کسی روز
وعا کی شدت
اس نا امیدی کو شکست فاش دے دے
شاید کسی روز
گناہ کی معافی مل جائے
کوئی عمل ایسا ہو زندگانی میں
اور تلافی ہو جائے
اور یہ غم کے بوجھ ڈھوئے لوگ
گولیوں کے زخم سے نڈھال لوگ
خوف کی فضاؤں سے
نجات پا جائیں
غم کے بادل ٹل جائیں
دکھ کے پہرے ہٹ جائیں
شاعرہ: نسیم نیازی، لاہور

"بالکل میرے جیسی ہے۔" وہ بولی۔ "ابو شکریہ آپ میرے جیسی خوب صورت گڑیا لائے ہیں۔"

اس نے اپنی بیوی رضیہ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا، وہ کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ وہ چپکے سے اٹھی اور باورچی خانے میں جا کر اپنے پٹھے ہوئے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

□

موٹے ہو گئے تھے، آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں ناک بوجھ سے پھیلی ہوئی تھی، گڑیا کا وجود دُہرا گیا تھا وہ حیرت اور قدرے تاسف سے گڑیا کو دیکھنے لگا۔

اس کی بیٹی نے جلدی سے بڑھ کر گڑیا اس کے ہاتھوں سے چھین لی۔ اس کی آنکھیں خوشی اور حیرت سے چمک رہی تھیں اور اس کی معصوم مسکراہٹوں سے شیریں کھنٹی جیسے مدھر آواز گھر میں گونج رہی تھی۔ اس نے گڑیا کو گلے سے لگایا اسے دیکھا پھر ہنسی اس کی ہنسی بے ریا اور معصوم تھی۔



اے دلِ نادان

میمون خورشید

نارہ بیگم قل خوانی سے فارغ ہو کر گھر آئیں تو چادر اتارتے ہی ان کا پارا ہاکی ہو گیا۔

سارا گھر ایسے ہی الٹا پلٹا پڑا تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھیں۔ کچن میں رات کے اور صبح کے جھوٹے برتن ایسے ہی پڑے تھے۔ دودھ والا دودھ دے کر گیا تھا وہ بھی کچا ہی رکھا تھا۔ بستر بھی ابھی تک بکھرے پڑے تھے۔

”نصیباً نہیں آئی تو اس کا مطلب ہے کہ گھر والے بھی گھر کو نہ دیکھیں۔ جس کی دو، دو بیٹیاں ہوں وہ بھی جوان جہان..... اس کے گھر کا یہ حال ہو..... کچھ خوفِ خدا ہی نہیں ان لڑکیوں میں۔ بارہ بج رہے ہیں۔ اچانک کوئی اس گھر میں آجائے تو لعنت ہی دے گا میری تربیت پر۔“ عمارہ بیگم غصے سے بڑبڑاتے ہوئے گھر کو سمیٹ رہی تھیں۔ تنزیل میاں باہر سے آئے تو تھکے ماندے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے۔

”عمارہ بیگم ایک کپ چائے کا ہی پلا دو۔ سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ ایک تو سمجھ نہیں آتا لوگوں کے پاس وقت کتنا قاتلو ہے۔ ارے بھی قل خوانی تھی کر کے

لارغ ہوں۔ بس سیاست چمکانے کا لوگوں کو موقع ملے۔ جسے موقع ملتا ہے مائیک سنبھال کر بیٹھ جاتا ہے۔ سر دکھ گیا میرا تو تقریریں سن کر۔“

عمارہ بیگم کچن میں برتن سمیٹ رہی تھیں۔ تنزیل، عمارہ کو ڈھونڈتے ہوئے کچن میں ہی آگئے۔

”کہاں ہو عمارہ بیگم؟“

”مر گئی عمارہ اور کہاں گئی۔“ عمارہ بیگم نے چولہے پر دودھ پکنے کے لیے رکھا ساتھ میں چائے کا پانی بھی۔ پھر غصے سے شوہر سے کہا۔

”دنیا پر تنقید کرنے کی عادت ہے آپ کو، کچھ اپنی اولاد کے بھی ڈھنگ دیکھ لیں۔ میں گھر پر نہیں تو گھر کا یہ حشر کر رکھا ہے۔ ملازمہ نہیں آئی تو اس کا مطلب ہے گھر والے گھر بھی نہ دیکھیں۔“

”ایہا اور عمیر کالج گئے ہوں گے۔ عمار دکان پر..... گھر میں باقی کون رہ جاتا ہے۔ ایک افق..... ایک بات بتاؤ عمارہ بیگم ہم نے اپنی بیٹی کا نام افق رکھا ہی کیوں تھا کہ وہ آسمان ہی بن گئی۔ زمین کی طرف آنا ہی نہیں چاہتی۔“ تنزیل بے بسی سے مسکرائے۔

”ایک صرف اس کے نام کو وجہ خرابی بنا کر آپ ہا میں بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔ بیٹی کی ذات ہے کب تک احتجاج کرے گی وہ..... آخر وہ چاہتی کیا ہے، آپ پوچھتے کیوں نہیں اس سے۔ پلٹھی کی اولاد ہے وہ ہماری۔ اس کی وجہ سے دوسرے بچوں پر بھی کتنا برا اثر پڑ رہا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے ایہا کس قدر زبان کاٹنے لگی ہے۔“

”شکرا ادا کرو عمارہ بیگم ابھی کسی پر اس کا اثر نہیں پڑا، بہت سمجھدار ہے۔ تمہاری چھوٹی اولاد۔“

”اور بڑی..... بڑی کس پر چلی گئی؟“ عمارہ بیگم نے چڑ کر کہا۔

”چھوڑو تم ان باتوں کو چائے لے کر باہر آؤ۔“

”پورے پانچ سال ہو گئے ہیں اس بات کو

چھوڑتے چھوڑتے۔ چھوڑنے کا ہی نتیجہ ہے جو وہ ہمارے سر پر چڑھ گئی ہے۔“

”تو کیا کروں، ڈنڈوں سے ماروں اسے، کیا خود اسے احساس نہیں، اپنا مستقبل خود داؤ پر لگا رہی ہے وہ۔“ تنزیل زچ ہو کر بولے۔

”کتنے دن کی زندگی رہ گئی ہے ہماری۔ پھر کون دیکھے گا اسے..... نہ بھائی نہ بہن..... پانچ سال ہو گئے ہیں اسے۔ ابھی تک اس کا غصہ اس کا احتجاج ختم نہیں ہوا۔“

”اسے یہ احساس نہیں کہ ہم کن پریشانیوں میں ہیں بس اپنی ہی ایک رفتار ہے۔“ اچانک ڈور تیل بجی۔ تنزیل اور عمارہ دونوں ہی چوٹے۔

”خدا خیر کرے، کون آ گیا اس وقت، میرا تو سارا گھر الٹا پڑا ہے۔“ عمارہ بیگم نے پریشانی سے گھر کا حلیہ دیکھ کر کہا۔

☆☆☆

”ارے آپا، آپ ہمیں کم سے کم بتا دو دیتیں اتر پورٹ پر آپ کو لینے ہی آ جاتے۔“

”دونوں سے حسنین کے ہاں ٹھہری ہوئی ہوں اور آنے سے پہلے بتا بھی دیا تھا اسے۔ اس نے تمہیں اطلاع نہیں کی۔“

”کون بتاتا ہے آپا..... امیر غریب دو الگ ذات ہو گئی ہیں..... سگا بھائی ہے..... مگر فون تک سے اطلاع نہیں کی اس نے آپ کے آنے کی۔“ تنزیل نے شکوہ کیا۔ جواباً ماہ پارہ ہنس دیں۔



”ٹھیک کہہ رہے ہو تنزیل بھائی..... آج کل سگا تو صرف پیسہ ہی رہ گیا ہے۔ یہ سناؤ کیا ہو رہا ہے آج کل..... بچے کیا کر رہے ہیں، افق اور عمار کے کہیں رشتے وغیرہ ہوئے ہیں یا نہیں۔“ تنزیل اور عمار نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”عمارہ تم آپا سے حال احوال لو..... باتیں کرو، میں بازار سے کچھ سامان لے آؤں۔“ تنزیل بیوی سے کہتے باہر نکل گئے۔

”کیا بات ہے عمارہ، مجھے لگ رہا ہے تم دونوں کچھ پریشان ہو؟“ ماہ پارہ نے تنزیل کے رویے کو محسوس کیا اور عمارہ سے پوچھا۔

”آپ کو تو معلوم ہی ہے آپا سارے حالات کا۔ تنزیل کا سارا کاروبار ہی ختم ہو گیا تھا، نئے سرے سے عمار نے سنبھالا ہے۔ سارا زور بیچنا پڑا مجھے اپنا۔ اب اللہ کا شکر ہے۔ عمار، تنزیل کے قرض سے نکل پایا ہے تو کچھ راس بھی بنالے گا۔“ عمارہ دکھ اور پریشانی سے بولیں۔

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ کیوں نہیں۔“ ماہ پارہ نے جیسے بہن کو تسلی دی۔ ”تم دیکھنا تمہارا عمار بہت ترقی کرے گا۔ تمہاری ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ بس اب تو تم اس کے سر پر سہرا سجانے کی سوچو۔“

”کیسے سوچوں آپا..... عمار سے بڑی تو افق ہے۔ رشتے آتے ہیں کسی کے سامنے نہیں آتی۔ نہ ہی گھر میں دلچسپی لیتی ہے۔ نہ ہی ہمارے دکھ سکھ کو سنتی اور سمجھتی ہے۔ بس جب سے تعلیم چھوٹی ہے خود کو کرے میں ہی بند کر کے رکھ لیا ہے اس نے۔ دن بھر سوتی ہے رات کو جب ہم سو جاتے ہیں تب جاگتی ہے۔ ساری رات نی وی دیکھتی ہے۔ جب ہم لوگ صبح اٹھتے ہیں تب سو جاتی ہے۔ آپ بتائیں آپا کیا کروں اس لڑکی کا میں۔“

”ایسا کرنے سے کیا صحت ٹھیک ہے اس کی؟“ عمارہ کی باتوں سے ماہ پارہ کو تشویش ہوئی۔

”کیا صحت اچھی رہتی ہے۔ نہ ڈھنگ سے کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ ذرا دیکھیں تو جا کر اسے۔ سارا رنگ جلایا اپنا..... سوکھ کر کاٹنا ہوگئی ہے۔ بات کرتی ہوں اس سے تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ سیدھے منہ بات تک نہیں کرتی۔ کوثر بھابی کی نیٹاں اس کے ساتھ کی ہے، شادی ہوگئی ہے اس کی ایک بچہ بھی ہے۔ ساس کا گھر اس طرح سنبھال رکھا ہے کہ فکر ہی نہیں انہیں۔ یہاں یہ حال ہے کہ اس عمر میں بھی سارے کام خود کرنے پڑتے ہیں مجھے۔ سوچتی ہوں ایسا پرواؤ نہ پڑے، پڑھتی رہے۔ میں تو اپنی طرف سے کسی بھی اولاد کی حق تلفی نہیں کرنا چاہتی۔ یہ اور بات ہے اس وقت کاروباری حالات بہت اچھے نہیں تھے۔ ہمارا گھر تک بکنے کی نوبت آگئی تھی، آپ تو جانتی ہیں سب کچھ۔“

”ارے بھئی، اسے پڑھنا ہے تو اب پڑھ لے۔ کیوں آزمائش میں ڈال رکھا ہے اس نے تمہیں، میں بات کروں گی اس سے، سمجھاؤں گی اسے۔ تم فکر نہیں کرو۔ دیکھو تو کیا حال کر لیا ہے تم نے اپنا۔“ ماہ پارہ نے بہن سے ہمدردی کی۔

”ہاں، آپا..... یہی چاہتی ہوں میں بھی۔ کم سے کم آپ ہی اسے سمجھا کر دیکھ لیں۔“

”ہاں، ہاں، تم فکر نہیں کرو۔ میں سمجھاؤں گی اسے۔ اچھا، یہ تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں کہ میں حسنین کے گھر کیوں ٹھہری ہوئی ہوں۔“

”آپا آپ کے بھائی کا گھر ہے، کیوں نہیں ٹھہر سکتیں آپ؟ ظاہر ہے آپ پردیس سے آئی ہیں تو بھائی کے گھر ہی ٹھہریں گی۔“

”ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن ایک خاص وجہ اور بھی ہے۔ حسنین بھائی کی عینا مجھے بہت پسند ہے۔ میں

اپنے حادث کارشتہ دے آئی ہوں عینا کے لیے۔“ ماہ پارہ کی بات سے عمارہ کے دل کو دھچکا لگا۔

”امی آپ مجھ سے بار بار شادی کا تذکرہ نہ کیا کریں۔ مجھے کمانے دیں، کچھ بنانے دیں۔ جب میں اس قابل ہو جاؤں گا تو آپ کو خود ہی کہہ دوں گا کہ حسنین ماموں کے ہاں چلی جائیں عینا کا رشتہ لے کر۔“ کل شام ہی تو عمار نے کہا تھا۔

”کیا ہوا عمارہ، تمہیں خوشی نہیں ہوئی اس رشتے کی؟“

”مجھے تو بہت خوشی ہوئی ہے آپا۔ حادث جیسا لڑکا تو بھائی جان چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں گے تو نہیں ملے گا۔“ عمارہ کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ماہ پارہ نے پوچھا تو عمارہ نے یکدم خود کو سنبھال لیا اور گرجوٹی سے ماہ پارہ کا ہاتھ پکڑ کر یقین دلایا۔ ماہ پارہ کی آنکھوں میں غرور سا چمکنے لگا۔

”بس دعا کرو تم اور ہاں اگر حسنین یا خالدہ تم سے مشورہ کریں تو یہی کہنا کہ چراغ لے کر بھی احوال میں گے وہ لوگ تو ایسا داماد نہیں ملے گا۔ اتنا پڑھا لکھا، کاروباری، خاندان میں ہے ہی کون۔“

”جی آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“ عمارہ نے ہنسے مایوس ہی ہو کر کہا۔

”اتنا سعادت مند، اتنا ذہین، فرمانبردار، بدگمانہ نمازی، میں تو خدا کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ میرا بچہ اپنے ننھیال اور دھیمال دونوں کی ہی اہلیت سے نکل گیا۔ ورنہ یہاں کے لڑکوں کا حشر تو تم لے دیکھا ہی ہے۔ ذرا سی مسیں بھیگیں اور لوفر پتا فرار۔ گھر اور تعلیم دونوں سے ہی بھاگ جاتے ہیں۔ جن کے پاس پیسہ ہے وہ تو اپنے بچوں کے عیب پیسے سے دبا لیتے ہیں لیکن جن کے پاس نہیں ان کے گھر سب کو نظر آ جاتے ہیں۔ اچھا کیا تم نے عمار کو ان کرادی۔ بھی نہیں پڑھ لکھ سکا کوئی بات نہیں۔“

کاروبار تو کر رہا ہے ناں..... باپ کا سارا دھون دھودیا۔ برامت ماننا عمارہ، تنزیل میاں کے بھی جوانی میں لچھن ٹھیک نہیں تھے۔ ایسی ویسی جگہوں پر آنا جانا تھا۔ یہ تو تم پر خدا کی خاص رحمت ہوئی ہے کہ بچہ نیک اور سعادت مند نکل گیا۔“ ماہ پارہ نے اور زیادہ اترا کر کہا۔

”جی آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔“ عمارہ نے دکھ اور شرمندگی سے کہا۔

☆☆☆

”السلام علیکم خالہ!“ افق مغرب کے وقت آکر ماہ پارہ سے ملی۔ ماہ پارہ نے مسکرا کر افق کو دیکھا جو پہلے کی نسبت بہت کمزور اور زروسی دکھائی دے رہی تھی۔

”تم روزانہ ہی مغرب کے وقت سو کر اٹھتی ہو؟ کیا نیند آ جاتی ہے تمہیں؟“

”نیند کے کوئی بستر پہ دن بھر پڑا نہیں رہ سکتا۔ ظاہر ہے نیند آتی ہے تو سوتی ہوں۔“ افق نے نروٹھے پن سے کہا۔

”تو کیا تم ساری رات جاگتی ہو؟“

”ظاہر ہے۔“ افق کی طرف سے لٹھ مار سا جواب ملا۔ عمارہ تنگم بیٹی کے رویے پر جڑ بڑھ رہی تھیں۔

”کیا کرتی ہو تم رات بھر جاگ کے۔“ ماہ پارہ نے بھانجی کی طرف دیکھ کر شکفتگی سے پوچھا۔

”حیرت کی بات ہے خالہ..... آپ کو امی نے میرے بارے میں نہیں بتایا..... میں کیا کرتی ہوں، کیسے رہتی ہوں، کب اٹھتی ہوں، کب سوتی ہوں۔“ افق نے بدگمان سے انداز میں عمارہ کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا افق؟“ ماہ پارہ نے حیرانی سے پوچھا۔

”کوئی خاص نہیں خالہ..... بس یہی بتانا چاہ

رہی تھی میں آپ کو۔ ہمارے گھر کے سامنے سے پھیری والا بھی گزرتا ہے ناں تو امی کا بس نہیں چلتا اسے بھی بتادیں کہ ان کی بڑی بیٹی نے جینے کا کون سا ڈھنگ اپنا رکھا ہے۔“ افق نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”بری بات ہے افق..... ساری صحت تباہ کر لی ہے تم نے۔ کیوں خود کو برباد کر رہی ہو۔“ ماہ پارہ نے نرمی سے کہا۔

”دیکھیں خالہ..... یہ میرا اور امی ابو کا معاملہ ہے۔ آپ درمیان میں نہ ہی بولیں تو بہتر ہے۔“

”ارے بھئی واہ کیسے نہ بولیں، بیٹی ہونم ہماری، تباہ و برباد کر رہی ہو اپنی زندگی اور ہم بیٹھے دیکھتے رہیں۔ نہیں پڑھ سکیں تو کوئی بات نہیں، اب اس بات کا کیا مطلب ہے، کیا تم باقی زندگی اس طرح برباد کرو گی؟“

”اگر تم اب اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتی ہو تو اب کر لو۔ کم سے کم اس آسیب زدہ ماحول سے تو باہر نکل آؤ۔“ عمارہ بولیں تو افق نے غصے اور ناراضی سے ماں کو دیکھا۔

”آپ کے خیال میں میرے چھ سال جو ضائع ہوئے وہ واپس پلٹ سکتے ہیں، آسکتا ہے وہ وقت واپس پڑے افق سے پوچھا۔

”ہاں، ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں۔ نہیں پڑھا تو نہیں پڑھا۔ اور ہمارے خاندان میں کون سا لڑکیاں ڈاکڑ یا انجینئر بن رہی ہیں جو تم خواہش پوری نہ ہونے پر لڑ جھگڑ رہی ہو۔ جو وقت گیا وہ چلا گیا، اب آئندہ کی زندگی خوشی خوشی گزارو..... اپنے ماں باپ کے بارے میں سوچو، اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں سوچو۔“

”دیکھیں خالہ، آپ امی، ابو سے بڑی ہیں، بے شک یہ لوگ آپ سے مشورے لے لیتے ہیں۔ لیکن مجھے آپ کے مشورے کی قطعاً ضرورت نہیں

ہے۔“

”افق یہ تم کس طرح سے آپا سے بات کر رہی ہو۔ اس طرح تو میں نے بھی کبھی آپا سے بات نہیں کی۔“ عمارہ کو بیٹی کا رویہ بہت برا لگا۔ غصے سے بولیں۔

”رہنے دو عمارہ، بیٹی ہے یہ میری بھی۔ ناراض ہے تم لوگوں سے تو مجھ سے بھی شکوہ کر بیٹھی۔ تم شکوے شکایتیں دور کرو اس کی۔“

”میں تو اب صرف اس کے فرض سے سبک دوش ہونا چاہتی ہوں۔ جان چھوڑے یہ میری۔ دن رات اس کے طعنے سہنے کی اور ہمت نہیں ہے مجھ میں۔“

”کون سے طعنے دیے ہیں میں نے آپ کو اور کیا، کیا ہے آپ لوگوں نے میرے لیے اگر میں کچھ کہتی ہوں تو وہ سچ ہی ہے طعنے نہیں۔ میں اگر پہلے پیدا ہو گئی تھی تو یہ میرا قصور تھا۔ میں بہن بھائیوں کو، گھر کو سنبھالوں اور آپ کو اپنے آنے جانے میں تنگی نہ ہو۔ گھر سنبھلا رہے آپ کا، بچے سنبھلے رہیں آپ کے۔ یہ حق ادا کرنی میں پلوٹھی کی اولاد ہونے کا۔ آپ اچھی طرح سے جانتی تھیں مجھے ایم بی اے کرنے کا کتنا شوق تھا۔ خواب تھا میرا یہ کہ میں بزنس کی اعلیٰ ترین ڈگری لوں، ایک مقام بناؤں اپنا، آپ سب کے لیے کچھ کروں لیکن آپ نے کیا کیا۔ مجھے یہ کہہ دیا کہ ہمارے پاس پیسے نہیں تمہیں آگے پڑھانے کے لیے، ٹیوشن کے لیے..... پھر کیا ہوا، آپ نے عمار کو بزنس کرایا اپنا سارا زیور بیچ کر..... میرے لیے کیوں نہیں بیچا آپ نے..... صرف دو کٹکن بھی بیچ دیتیں تو میری فیس جمع ہو جاتی..... لیکن نہیں آپ کو میں نہیں بیٹا

بیمار تھا اور پھر اب کیا کر رہی ہیں آپ، کیا ایسا نہیں پڑھ رہی۔ عمیر پڑھ رہا ہے۔ صرف میری تعلیم کے لیے پیسہ نہیں تھا آپ لوگوں کے پاس۔“ افق نے

”بددکھا۔“

”عمار بیٹا ہے میرا۔ کما کر لا رہا ہے تو اسی گھر میں آ رہا ہے۔ ہمارا بوجھ اٹھا رہا ہے وہ۔ تم سے یہ سب میں کیسے کرا لیتی۔ لوگ مجھی پر لعنت بھیجتے، مجھے کہتے کہ میں بیٹی کی کمائی کھا رہی ہوں۔“ عمارہ بیگم نے غصے سے کہا۔

”مت بہانے گھڑیں امی۔ لوگ تو ہمیشہ بولتے ہیں۔ عادت ہے لوگوں کو بولنے کی۔ اپنے وقت پر سبھی نے سب کچھ کیا ہے۔ ابو نے جوانی میں نسرین آنٹی سے عشق بھی لڑا یا ہے، جیسا کپڑا وہ آپ کو لا کر دیتے تھے ویسا ہی نسرین آنٹی کے لیے بھی لاتے تھے۔ کیا یہ عیاشیاں نہیں تھیں۔ کیوں نہیں مان لیتیں آپ یہ..... اپنے وقت پر سبھی نے عیاشیاں کی ہیں۔ ہر وقت آیا ہے تو صرف مجھ پر..... ارمان میرے گھرے ہیں، خواب میرے ٹوٹے ہیں۔“

”منہ بند کرو افق اپنا..... تمہیں کوئی حق نہیں اپنے باپ تک جانے کا۔ تنزیل نے اپنے ہاتھوں سے کمایا تھا اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیا۔ تمہیں کوئی حق نہیں ان پر انگلی اٹھانے کا۔“

”بات سنیں امی..... کسی اور کو بھی کوئی حق نہیں ہر بار آ کر میری عزت نفس کو چھیڑنے کا۔ یہ میری زندگی ہے، میں کیسے گزاروں گی یہ میں خود طے کروں گی۔ میری صحت برباد ہو رہی ہے، میرا نقصان ہے آپ لوگوں کا نہیں۔“ افق جذباتی پن سے کہتی باہر اٹھ گئی۔ عمارہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ رانے لگیں تو ماہ پارہ کے چہرے پر بھی افسوس اور ہمتانی جھلکنے لگی۔

☆☆☆

”دیکھیں امی، میں آپ سے صاف صاف کہہ چاہتی ہوں میں حارث کو بالکل پسند نہیں کرتی تو اس کا طلب یہ نہیں ہے کہ میں اس کی خامیاں بھی آپ کو

اپنے دل نادان

بتاؤں۔ ایک ہزار خوبیاں ہیں اس میں لیکن نہیں پسند کرتی میں اسے۔ میں عمار کو پسند کرتی ہوں اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ اس کے باوجود آپ مجھے حارث کے لیے قائل کیے جا رہی ہیں۔“

”اپنا فیوچر دیکھو عینا! محبت وقتی اور جذباتی باتیں ہوتی ہیں۔ حارث عمار کے مقابلے میں بہت آگے ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، اچھا بزنس ہے اس کا۔ تمہارا فیوچر برائٹ ہے جبکہ عمار ایک جھوٹی سی دکان پر کام کر رہا ہے، پچھلے چار سال سے وہیں کا وہیں کھڑا ہے۔ وہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ عینا یہ بات تم کیوں نہیں سمجھتیں اور پھر تنزیل نے جوانی میں جو کچھ بھی کیا اس کی وجہ سے تمہارے ابو تو عمار کے بارے میں سوچیں گے بھی نہیں۔“ خالدہ نے نرمی اور محبت سے بیٹی کو سمجھایا۔

”تو ٹھیک ہے، میں بھی شادی نہیں کروں گی، کہہ دیجیے ابو سے اور رہ گئی بات تنزیل انکل کے کیریئر کی تو بات سنیں امی بڑوں کی کہاوت مشہور ہے۔ نیکوں کے بد اور بدوں کے نیک ہو ہی جاتے ہیں۔ عمار، تنزیل انکل سے ہزار گنا بہتر ہے اور سب سے بڑھ کر وہ مجھے پسند ہے۔“

”کہاوت تو یہ بھی مشہور ہے۔ پتا یہ پوت اور نسل یہ گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ مگر یہ بات تمہیں سمجھ نہیں آئے گی مگر پھر بھی میں تمہیں سوچنے کا وقت دے رہی ہوں۔ اچھی طرح سے سوچ لو۔ سمجھ لو، یہ فیصلے ایسے نہیں ہوتے جنہیں کرنے کے بعد سدھار لیا جائے۔“ خالدہ نے غصے سے بیٹی کو دیکھا۔

”میں نے سوچ لیا ہے امی، اب سوچنا اور سمجھنا آپ نے اور ابو نے ہے۔“ عینا ماں سے کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

ماہ پارہ، حسنین اور خالدہ کے گھر آئی ہوئی تھیں حسنین سے جواب لینے کے لیے۔

”تم نے تو حد ہی کر دی، اس بات کے لیے اتنا سوچنے والی بات کون سی تھی۔ حادثہ تمہارا دیکھا بھالا، میرا ہیرے جیسا بیٹا ہے۔ اس کے باوجود تم لوگ مجھے چکر پر چکر لگوائے جا رہے ہو۔ ادر میری دونوں بیٹیاں آنے کے لیے بے چین ہیں۔ پر میں نے بھی کہہ دیا ہے جب تک ہاں نہیں کہلوالتی یہاں سے ہلوں گی بھی نہیں۔“

”یہ تو ٹھیک ہے آپا..... لیکن ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔“ حسنین نے بہت دیر کے بعد سنجیدگی سے کہا۔

”ارے بھئی کیسی مجبوریاں؟“

”میں بتا نہیں سکتا۔ کچھ ایسی مجبوریاں ہیں میری۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ رشتہ ہو پائے گا۔ آپ حادثہ کا رشتہ کہیں اور کر لیں۔“

”کیا..... کیا کہہ رہے ہو تم میرے چاند جیسے حادثہ کو ٹھکرا رہے ہو۔ حسنین، بہن ہوں میں تمہاری۔ ہاں مگر..... سوتلی۔ کیا تم سوتیلے پن کی وجہ سے مجھے ٹھکرا رہے ہو۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ..... میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا۔“

”مگر اب سامنے تو آگیا جو سوچ تم میرے متعلق رکھا کرتے تھے۔ مگر یاد رکھو حسنین..... ہماری مائیں دو ضرور تھیں لیکن باپ ایک ہی تھا۔ اور نسل باپ سے چلتی ہے۔“

”آپا آپ خوا خواہ بدگمان ہو رہی ہیں۔ ابھی عینا پڑھ رہی ہے۔ میں ابھی اس کی شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔“

”تو کتنے سال انتظار کروانا چاہتے ہو۔ کرلوں گی پانچ سال، دس سال مگر اس طرح سے انکار تو نہ کرو

حسین۔“ ماہ پارہ نے جذباتی پن سے اپنا دوپٹا بھائی کے قدموں میں ڈال دیا۔

”خدا کے واسطے آپا شرمندہ نہ کریں مجھے۔ میں بے حد مجبور ہوں۔“ حسنین شرمندگی سے دوپٹا اٹھ کر ماہ پارہ کے سر پر ڈالتے ہوئے بولے۔

”آخر ایسی بھی کیا مجبوری ہے حسنین؟ میں اپنے سسرال کے سامنے سارے رشتے داروں کے سامنے یہاں تک کہ حادثہ کے دوستوں میں بھی بات کہہ چکی ہوں کہ میں عینا یعنی اپنی بیٹی کو بہو بنا کر لا رہی ہوں۔“ ماہ پارہ نے روتے ہوئے کہا۔ حسنین اور خالدہ دنگ رہ گئے۔

”میری عزت کا سوال ہے حسنین..... خدا کے واسطے کچھ سوچو، کچھ سوچو میرے لیے۔ میں تو لوگوں کے سامنے نظریں بھی اٹھا نہیں پاؤں گی۔“

”یہ کیا کیا آپا آپ نے..... کم سے کم مجھے بتا تو سکتی تھیں آپ۔ میں کیا بتاؤں آپ کو۔ مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے آپ نے۔“ حسنین سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

☆☆☆

”مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ لوگ کیوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ پھوپھی غلطی ہے، راستہ وہ نکالیں واپسی کا۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔“ عینا نے حسنین اور خالدہ سے کہا۔

”عینا ٹھیک کہہ رہی ہے ای۔ پھوپھی نے یہ ناجائز کیا ہے ہمارے ساتھ۔ اس طرح وہ کیسے ہماری بہن کا نام کسی بھی شخص کے ساتھ جوڑ سکتی ہیں۔ جب تک عینا کی رضامندی نہیں ہوگی اس کے گھر والوں کی رضامندی نہیں ہوگی۔ صاف صاف نظر آ رہا ہے وہ ہمیں بلیک میل کر رہی ہیں، نفسیاتی وباؤ ڈال رہی ہیں ہم پر۔“

”تم بکواس بند کرو اپنی۔“ حسنین نے غصے

”آپا نے تو رو رو کر دوہائیاں دے رکھی ہیں کہ میں جا کر حسنین بھائی اور خالدہ بھائی کو راضی کر دوں اس رشتے کے لیے۔ وہ اتنی جذباتی ہو رہی ہیں کہ انکار کے بارے میں تو منٹا ہی نہیں چاہتیں۔ میں تو آپا کا جذباتی پن دیکھ کر یہ بات بھی منہ میں دبا کر بیٹھ گئی کہ میرا عمار، عینا کو پسند کرتا ہے۔ جب سے یہ سلسلہ چلا ہے اس کی تو بھوک پیاس ہی اڑ گئی ہے۔ رات کو گھر..... بھی دیر سے آتا ہے۔ ہنسا، بولنا تو جیسے بھول ہی گیا ہے۔“

”اور تم نے یہ بات مجھے اب بتائی ہے عمارہ بیگم، کتنی خالم، کتنی سفاک ہو تم۔ بیٹے کے جذبات کو جانتے ہوئے بھی اس کی خوشیوں پر قہقہے چلا رہی ہو۔“

”تو کیا کروں تنزیل، میری ایسی پوزیشن کہاں جو بھائی بھائی اپنے والدین بھائی کے گھر جاؤں اور سوال ڈال دوں اپنے بیٹے کا۔ ڈر لگتا ہے اگر انہوں نے انکار کر دیا تو اور یہی ڈر شاید عمار کو بھی ہے جی خاموشی اختیار کر لی ہے اس نے۔“

”پھر بھی تمہیں چاہیے تھا تم ایک بار کوشش تو کر دیکھتیں۔“

”کوشش سے کچھ نہیں ہوتا، جو نصیب میں ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ آپ کی وجہ سے بہت عزت افزائی ہوئی میری۔ اب مزید اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی میں۔ عمار سمجھ رہا ہے، مجھے اچھی طرح پتا ہے سمجھوتا کر لے گا پھر انشاء اللہ اپنے بیٹے کو کسی اچھی جگہ ہی بیاہوں گی میں۔“

☆☆☆

حسین اور خالدہ، عمارہ اور تنزیل کے گھر آئے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے، ایسا چائے وغیرہ ان کے سامنے رکھ رہی تھی۔

”ماشاء اللہ عمارہ ایسا نے تو خوب قد نکالا ہے اور ماشاء اللہ کتنی خوب صورت ہو رہی ہے۔ کیا کر رہی

سے بیٹے کو ڈانٹا۔“ تم سب تو باری باری اپنی دلیلیں، مضامین پیش کر لو گے۔ میں کہاں جاؤں، میں کیا کروں۔“

”آپ کیوں دباؤ میں آ رہے ہیں۔ ہم نے تو ایک بار بھی ہاں نہیں کہی تھی پھر کیسے انہوں نے ہماری بیٹی کے متعلق ایسی بات کہی۔“

”جو ہونا تھا ہو گیا، اب کیا کرتا ہے۔ چند روز کے بعد ماہ پارہ آپا پھر آئیں گی اور اکیلے نہیں اپنی بیٹیوں اور دامادوں کے ساتھ۔“

”میں نے اس بات کا حل اچھی طرح سے تلاش کر لیا ہے ابو۔ ہم عینا کا رشتہ عمار کے ساتھ طے کر دیتے ہیں۔ پھر پھوپھی کو نہیں کر سکیں گی۔“ قاتر درمیان میں بولا۔

”کیا..... تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اپنی اکلوتی بیٹی، تنزیل کے بیٹے کو دوں گا۔“

”عمار میں اور تنزیل انکل میں بہت فرق ہے ابو اور ویسے بھی جو کچھ تنزیل انکل نے کیا اب انہیں نو دہی بہت پچھتاوا ہے اپنے کیسے پر۔“

”پھر..... ان پچھتاؤں سے کیا ہو سکتا ہے۔ صب کچھ اڑا دیا، برباد کر دیا۔ میری بہن نے جوانی میں جوازیتیں کیں وہ علیحدہ۔“

”وہ سب کچھ وہ سارا وقت گزر گیا ہے ابو، وہ طویل انکل اور عمارہ پھوپھی کا معاملہ تھا۔ عمار بہت اچھا لاکا ہے۔ مجھے خود بھی پسند ہے اگر عینا اس میں انٹرسٹڈ نہ تو آپ پلیز وقت ضائع کیے بغیر یہ رشتہ کر ڈالیں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو عینا کو من پسند ہر کا ساتھ ملے گا اور دوسرے آپ دونوں بہن بھائیوں میں جو دو دریاں تنزیل انکل کی وجہ سے ہو چکی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی۔“ حسنین بیٹے کی طرف اٹھ کر جیسے کچھ سوچے لگے۔

☆☆☆

ہے آج کل یہ۔“ خالدہ نے ایسا کو دیکھ کر کہا۔
”ایم اے فائن آرٹس کر رہی ہوں مماتی جان میں۔“ ایسا نے خود ہی بتایا۔

”ایسا ذرا جا کر دیکھو ہنڈیا چولہے پر رکھی جل تو نہیں گئی۔“ عمارہ نے ایسا سے کہا۔ ایسا چلی گئی۔
”در اصل ہم لوگ آج ایک خاص مقصد کے تحت تمہارے ہاں آئے ہیں۔ ماہ پارہ آپا کی ساری باتیں خالدہ نے تمہیں بتا دی ہیں اب تم ہی بتاؤ..... ایسی صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“ حسنین عمارہ سے بولے۔

”مجھے تو بہت افسوس ہو رہا ہے، ماہ پارہ آپا کی سوچ پر..... بھی رشتے زبردستی تھوڑی ہی ہوتے ہیں۔“ عمارہ کے بجائے تنزیل جذباتی پن سے بولے۔ ”اب ہمیں ہی دیکھ لو..... ہماری خواہش تھی عمار کے لیے آپ کے ہاں آنے کی، آپا کے بارے میں جان کر ہم چپ ہو گئے۔ ورنہ زبردستی ہم بھی کر سکتے تھے۔“ حسنین اور خالدہ دونوں چونکے۔
”تنزیل بھائی آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ ہم لوگ تو آج یہاں آئے ہی اسی سلسلے میں تھے اور اب یہ سلسلہ..... مجھے ایسا لگتا ہے ڈبل ہوگا۔ یعنی وٹس.....“ پھر خالدہ مسکرا کر بولیں۔

”میں سمجھی نہیں خالدہ بھابی، بھائی جان اور آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں بڑے عمارہ الجھ کر بولیں تو حسنین مسکرائے۔

”بھئی صاف سی بات ہے عمارہ، میں چاہتا ہوں اپنی عینا حارث کے بجائے عمار کو دوں اور فائز کے لیے ہمیں آپ ایسا دے دیں۔“ حسنین نے کہا تو تنزیل اور عمارہ دونوں دنگ رہ گئے۔ خوشی دونوں کے چہروں پر تھی۔ عمارہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

☆☆☆

”آگیا گئے، سوتیلے کا فرق سامنے۔ آپ ہی کہتی تھیں کبھی فرق نہیں رکھا آپ کے بہن بھائیوں نے لیکن اب خود ہی دیکھ لیں۔ آپ کو خالہ اور ماموں نے دودھ میں سے کبھی کی طرح نکال پھینکا۔“ ماہ پارہ بستر پر لیٹی رو رہی تھیں۔ حارث، عاصمہ اور ساجدہ تینوں ماں کے ارد گرد بیٹھے تھے۔ عاصمہ غصے سے بولے جارہی تھی۔

”ایک نہیں دو دور رشتے داریاں کی ہیں انہوں نے اور آپ کو ایک کے قابل بھی نہیں سمجھا۔ کیا کی تھی ہمارے بھائی میں۔ سچ کہتے ہیں ہیرے کی قدر جو ہری ہی جانتا ہے مگر ان ناقدروں کو کیا قدر ہونا تھی آپ کی یا بھائی کی۔“

”عاصمہ ٹھیک کہہ رہی ہے امی، آپ خواہ مخواہ ہلکان کر رہی ہیں خود کو..... ایک عینا ہی تو سب کچھ نہیں تھی۔ آپ جہاں چاہیں میری شادی کر دیں۔ مجھے بالکل اعتراض نہیں ہوگا مگر خدا کے واسطے اس طرح دل پر مت لیجیے، بیمار پڑ جائیں گی آپ۔“

”میرا ہیرے جیسا بیٹا، کیسے انکار کر دیا حسنین نے، یہ بھی نہیں سوچا کس مان سے کس دل سے میں عینا کو مانگنے گئی تھی۔ میں نے اپنا دد پٹا تک حسنین کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اس کی بھی لاج نہ رکھی۔ اگر حسنین میرا سگا بھائی ہوتا تو ہرگز ایسا نہ کرتا۔ میری چاہت کو یوں قدموں میں نہ روندتا۔“ ماہ پارہ،

حارث کو دیکھ کر پیار کرتے ہوئے بولیں۔

”خدا کے واسطے امی سنبھالیں خود کو۔ کی نہیں ہے ہمارے بھائی کو لڑکیوں کی اور ویسے بھی اس کم تعلیم یافتہ عینا میں تھا ہی کیا نہ جانے کیوں آپ بھائی کی محبت میں چلی گئیں۔ دیکھیے گا میں اپنی بھابی کتنے اونچے خاندان اور کتنے بڑے گھر سے بیاہ کر لاؤں گی۔“ عاصمہ نے دعویٰ کیا۔

ایسی خوبی نہیں جو میرے بیٹے کے من پر چڑھ سکے۔ میرا حارث ہمیشہ میرا ہی رہے گا۔“

☆☆☆

”مجھے تو یہ سوچ سوچ کر پریشانی ہو رہی ہے اب ایک ماہ کے بعد آیا میرے پاس کیا کرنے آرہی ہیں۔ کیسے نظریں ملاؤں گی میں اُن سے؟“
”بات سنو عمارہ بیگم، ہم نے کوئی چوری نہیں کی ہے ڈاکا نہیں ڈالا ہے اور وہ کچھ چرا کر لے نہیں جائیں گی ہمارا۔ اب وہ آرہی ہیں تو آنے دو۔ کچھ الٹا سیدھا بولا انہوں نے تو خود منٹ لوں گا میں ان سے۔ تمہیں فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔“ تنزیل نے عمارہ کو یقین دہانی کرائی۔ عمارہ بھی خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

”کیا کہہ رہی ہیں امی آپ..... آپ نے ایسا سوچ بھی کیسے کیا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ ہمارے خوبرو بھائی کا سوال اس افق پر ڈالیں جو شروع سے ہی نفسیاتی کیس ہے۔“ عاصمہ اور ساجدہ، ماہ پارہ سے بحث کر رہی تھیں۔ حارث بھی کمرے میں موجود تھا۔

”بات سنو تم دونوں میری۔ اس گھر میں میرا ہی فیصلہ چلتا ہے۔ جب حارث کو کوئی اعتراض نہیں تو تم دونوں کیوں الٹا سیدھا بولے جارہی ہو۔“ ماہ پارہ غصے سے بولیں۔

”بے فکر رہیں، منہ کی کھا کر آئیں گی آپ۔“ عاصمہ غصے سے کہہ چلی گئی۔ ساجدہ البتہ خاموش تھی۔ حارث سر جھکا کر بیٹھا رہا۔

”تم بھی تو کچھ بولو۔ آخر تمہاری بھی تو کوئی سوچ، کوئی رائے ہوگی۔“ ساجدہ نے بھائی سے کہا۔

”میں امی کو کہہ چکا ہوں، ایک نہیں سو بار۔ امی جہاں چاہیں میری شادی کر دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس امی کی خوشی مقصود ہے مجھے۔“ حارث یہ

”میں اپنے بہن، بھائیوں سے جڑی رہنا چاہتی تھی۔ اس لیے حسنین کے گھر گئی ورنہ دولت کی لپٹ میں تھی میرے پاس۔“ ماہ پارہ نے چونک کر عاصمہ کو دیکھا پھر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

”تو پھر کیوں سوچ رہی ہیں آپ اپنے بہن، بھائیوں کے بارے میں۔ مت سوچیں اور بے فکر رہیں کہ عینا سے پہلے اب حارث ہی بیاہا جائے گا۔ دیکھیں گے آپ کے بہن، بھائی کہ یہ ہوا کیا۔“
ماہ پارہ نے ماں کو تسلی دی۔ ماہ پارہ بیگم کم صم سے انداز میں لیٹی ہوئی تھیں۔ تینوں بہن بھائی ماں کی دلجوئی کر رہے تھے۔

☆☆☆

ماہ پارہ سو رہی تھیں کہ اچانک ان کی آنکھ کھلی، بے چین ہو کر اٹھ بیٹھیں..... اور اپنا سر پکڑ کر دھنسنے لگیں۔

”بچے تو کہہ رہے ہیں کہ اس بات کو ذہن سے، دل سے نکال دوں لیکن سوتے جاگتے ایک لمحہ بھی دل امان خالی نہیں ہوتا میرا۔ کیسے برداشت کر لوں میں کہ حسنین نے میرے لائق فائق حارث کے سامنے مار کو ترجیح دی۔ پورے خاندان میں حارث کی جگہ کا ڈنکا تھا اور بازی لے کر جا رہا ہے عمار۔ ل ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا سمجھتے ہیں حسنین اور عمارہ..... بہت خوشی کے ساتھ بچے بیاہ لیں گے، خوشی ملی ماہ بھی لیں گے۔ دونوں کے بچے ایسے بچ بوؤں کی کہ ایک دوسرے کو مرتے وقت بھی نہیں دیکھیں گے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں حارث کا سوال افق اداں گی۔ افق..... ناکارہ لڑکی ہے۔ ماں باپ و گمان رہتی ہے۔ وہ میرا مہرہ آسانی سے بن جائے گی، اسی کے ذریعے میں حسنین کے گھر میں بھی اگاؤں گی اور اپنی اور اپنے بیٹے کی بے عزتی کا ٹھکانہ بن جائے گی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ افق میں کوئی بھی

کہہ کر باہر چلا گیا۔

کہہ سکتی ہوں آپا۔“

”جانتی ہوں، اچھی طرح سے جانتی ہو

میں..... تم کیا منوا سکتی ہو اس سے، بس ماننا ہی آتا

ہے تمہیں تو..... وہ رشتہ لے کر تمہارے گھر آیا اور تم

نے فوراً ہائی بھر لی، ذرا نخرہ نہ دکھایا یہ نہ سوچا اس کے

گھر سے بڑی بہن خالی ہاتھ گئی ہے..... میں بہن کا

ساتھ دوں اسے خالی ہاتھ لوٹا دوں۔“

”کیسے کرتی ایسا میرے بچے کی خوشی کا سوال

تھا..... سر آنکھوں پر ہٹھانا پڑا مجھے تو۔“ عمارہ نے دل

عی دل میں سوچا۔

”خیر چھوڑا ان باتوں کو، مجھے تو یہ سوچ سوچ کر

حیا آرہی ہے کہ حسنین اور خالدہ کی کیا مت ماری گئی

تھی جو بڑی بیٹی کو چھوڑ کر چھوٹی پر سوال ڈال دیا اور تم

نے بھی خوشی خوشی ہائی بھر لی۔“

”تو کیا کرتی آپا..... آپ کو تو پتا ہی ہے افق

کے سارے حالات کا، اپنے پرانے کسی سے نہ بولتی

ہے نہ کسی کے سامنے جاتی ہے، کوئی کس طرح اسے

قبول کر سکتا ہے۔“

”خوب کہی بی بی تم نے تو، ارے اپنوں میں ایسا

نہیں ہوتا، گھروں کی بیٹیاں تو بن دیکھے بن پرکھے

لے لی جاتی ہیں۔ جیسے میں نے عینا کے لیے سوال

ڈال دیا تھا، تھا ہی کیا اس میں..... اتنا سادہ اور کم تعلیم

یافتہ اور حسنین اور خالدہ کے نخرے دیکھو۔“

”لگتا ہے آپ کے دل کو بہت برا لگا ہے اور لگتا

بھی چاہیے اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں آپا، میں نے

تو بہت جی جان سے چاہا تھا ایسا ہو جائے لیکن جو رب

کی مرضی۔“

”ارے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں، بھلا اس

میں تمہارا کیا قصور ہے..... یہ بتاؤ افق کا کیا حال ہے،

اس نے لیہا کے رشتے کو دل پر تو نہیں لیا کہ پھر اس

حق تلفی ہو گئی۔“

”کیوں کر رہی ہیں آپ ایسا..... تاکہ اپنوں سے

جڑی رہیں۔ پھر بھی نہیں لاسکتیں آپ۔ افق اتنی

زہریلی لڑکی ہے، وہ اپنے ماں باپ کی عزت نہیں

کرتی، آپ کی کیسے کرے گی۔ یہ سوچا ہے آپ

نے۔“ ساجدہ بے بسی سے ماں سے بولی۔

”میں نے سب سوچ لیا ہے، تم بے فکر رہو ایسا

کچھ نہیں ہوگا۔ تم لوگوں نے اگر میرے ساتھ چلنا ہے

تو کل کی تیاری کر لو ورنہ فضول کی بحث مت کرو۔“

☆☆☆

”میرے گھر میں صرف میری ہی چلتی ہے اور

کسی کی نہیں۔ غفار مرحوم کی اللہ مغفرت کرے، وہ بھی

میرا کہا کرتی نہیں ٹالتے تھے۔ جو بات میں نے کہہ دی

پتھر پر لکیر ثابت ہوئی۔“ ماہ پارہ کی بات پر عمارہ

مسکرائی۔

”اچھی طرح سے جانتے ہیں ہم لوگ، یہ بھی

کوئی بتانے کی بات ہے۔ اماں جی کہا کرتی تھیں

مجھے..... عمارہ! جتنی محبت عبدالغفار کرتا ہے ناں

میری ماہ پارہ سے اتنی تنزیل میاں نہیں کرتے تم

سے۔“

”آہ ٹھیک ہی کہا کرتی تھیں اماں جی..... کتنی

پرکھ لینے والی آنکھ تھی اماں جی کی۔“ ماہ پارہ نے گہری

سانس لے کر کہا۔

”بہت تھوڑا سا تھا تھا آپ کا اور بھائی میاں

کا۔ اسی لیے اتنی محبت دی انہوں نے اور چل بسے۔

اللہ آپ کے حادث کی لمبی عمر کرے۔ حادث کی شکل

میں خدا نے آپ کو بڑا ہی اچھا تحفہ دیا ہے آپا۔“

”اور دیکھ لو..... کیا قدر کی میرے بھائی نے

اس ہیرے کی۔“ ماہ پارہ کو جیسے عمارہ کی بات چھبی تھی

فوراً بولیں۔ عمارہ جیسے چوری ہو گئیں۔

”اب یہ تو بھائی صاحب کی مرضی تھی، میں کیا

114 ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

سے اکٹری گئی۔

”کیا..... آپ لوگوں نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا کہ آپ لوگ..... یا آپ میں سے کوئی بھی میری زندگی کا فیصلہ کرے گا اور میں بخوشی ہاتھ باندھ کر چل پڑوں گی۔ میں نے کہہ دیا ہے میں ہرگز شادی نہیں کروں گی حارث سے اور نہ ہی کسی اور سے۔ سمجھا کیا تھا خالہ نے..... ماموں حسنین کے گھر سے انکار ہو گیا تو وہ یہاں آگئیں جیسے افق انہیں پلیٹ میں رکھی ہوئی مل جائے گی۔“

”آہستہ بولو، افق..... خالہ ابھی گھر پر ہی ہیں۔ تمہاری آواز جاری ہوگی باہر، کتا دکھ پہنچے گا انہیں۔“

”تو کیوں آئی ہو تم میرے پاس یہ پروپوزل لے کر۔“ لیہا نے عمار کی طرف دیکھا جو چپ چاپ ایک طرف کونے میں کھڑا تھا۔ عمارہ بے بس اور پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ماہ پارہ کمرے میں آگئیں۔ عمار، لیہا اور عمارہ تینوں ہی چوکنے جبکہ افق نے عصبیلی نگاہوں سے ماہ پارہ کو دیکھا۔

”کیا ڈراما ہے یہ خالہ..... کیوں کرنے آئی ہیں آپ میری ذات پر یہ احسان، میں ناکارہ، غصیل، جھگڑالو، میں نہیں بیا سکتی آپ کے بیٹے کا گھر۔ یہ دیکھیں، میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، جائیں آپ یہاں سے، کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو مجھ پر کوئی بھی احسان کرنے کی..... نہیں کرنی مجھے کوئی شادی وادی، کیوں وقت برباد کرنے چلی آئیں آپ یہاں۔“ عمارہ نے خفت اور شرمندگی سے ماہ پارہ کی طرف دیکھا۔ عمارہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”پورے شہر میں آپ کو کوئی لڑکی نہیں ملی جو آپ مجھ پر احسان کرنے چلی آئیں۔“ افق غصے سے بولی۔

”چپ کر جاؤ افق، خدا کے واسطے چپ“

ماہنامہ پاکیزہ — منی 2012ء (119)

”کہاں آپا..... اسے تو جیسے احساس ہی نہیں اس کے ارد گرد گھر میں ہو کیا رہا ہے۔“

”اچھا سنو! میں اس لیے آئی ہوں کہ جو کچھ حسنین نے کیا ہے کچھ ٹھیک نہیں کیا ہے۔ بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔ کتا برا اثر پڑے گا اس کی زندگی پر، رشتے بھی آنا بند ہو جائیں گے۔ آخر ساری مر تو نہیں بٹھائے رکھنا تم نے اسے۔“ عمارہ خاموش رہی۔

”اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے..... تم حارث کے لیے افق کو دے دو۔“ عمارہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ماہ پارہ یہ بات کہنے والی ہیں یا خاص اسی مقصد کے لیے آئی ہیں۔ عمارہ کو گہرا دھچکا لگا۔ خوشی اور تشکر کے آنسو آنکھوں سے نکل پڑے۔ ماہ پارہ نے عمارہ کے احساسات کو جانتے ہوئے انہیں گلے سے لگایا۔

”اتنا بڑا احسان کر رہی ہیں آپ مجھ پر، میں کیسے اس احسان کو اتار پاؤں گی۔“ عمارہ روتے ہوئے بولیں۔

”ارے بھئی کوئی احسان نہیں ہے یہ..... بیٹی ہے وہ میری..... اور دیکھو میں تو انگلی بھی ساتھ لاتی ہوں۔“

”آپا..... آپا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی..... مہری ناکارہ، غیر ذمے دار، جھگڑالو بیٹی کے لیے اتنا ہمارا رشتہ آئے گا۔ حارث جیسا لڑکا اس کا جیون ساتھی بنے گا۔ کتنی بڑی خوش نصیبی ہے افق کی۔“

”ہاں تو جلدی کرناں، یہ خوش خبری سب کو ملنا چاہتی ہوں۔“ اور اس بچی کو بھی بلاؤ، ملنا چاہتی ہوں میں اس سے۔“ عمارہ کی خوشی سے حالت ناگفتہ بہ تھی۔

☆☆☆

افق کو یہ سب کچھ لیہا نے جب بتایا تو وہ ہتھے

کر جاؤ۔“ عمارہ غصے سے چلا کر رونے لگیں۔ لیہا، عمارہ کو لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”خالہ آپ بھی باہر آ جائیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہے اس سے بات کرنے کا۔“ عمارہ نے ماہ پارہ سے کہا۔

”تم جاؤ عمار میں آرہی ہوں۔“

”فضول مجھے فورس کرنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔ آپ نے سنا نہیں یہ کیا کہہ رہا تھا۔ کوئی فائدہ نہیں مجھ سے بات کرنے کا۔ امی، ابو کا لاڈلا، چہیتا، سمجھدار اور عقلمند تو یہ ہے..... اس سے بات کریں آپ۔ میرے منہ لگنے کیوں آرہی ہیں آپ۔“ افق نے غصے سے کہا۔

”منہ بند کرو افق اپنا۔“ عمار غصے سے بولا۔

”شٹ اپ..... اینڈ گیٹ لاسٹ! افق اس سے زیادہ غصے سے چلائی۔ عمار کمرے سے نکل گیا۔

ماہ پارہ بھی باہر نکلیں تو افق نے غصے سے دروازہ بند کر لیا۔

☆☆☆

”مجھے معاف کر دیں آپا..... دراصل میں ہی اس لائق نہیں... کہ آپ کے معیار پر پوری اتر سکوں۔ افق نے جو کچھ بھی آپ کے ساتھ کیا میں بہت شرمندہ ہوں، معافی مانگتی ہوں آپ سے۔“ عمارہ، ماہ پارہ کے سامنے شرمندہ تھیں، خفت اور شرمندگی سے بولیں۔

”نہیں، نہیں عمارہ اس طرح کر کے تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔ کیا میں نہیں جانتی افق کے حالات..... سب کچھ جانتی ہوں میں۔ تم یہ سب باتیں دل پر مت لو۔“

”کیا کروں آپا..... نہ لوناتی آپ کو اپنے گھر سے کبھی بھی خالی ہاتھ اگر لیہا کو فائز سے منسوب نہ کیا ہوتا تو اسے آپ کی جھولی میں ڈال دیتی میں۔“ ماہ

ماہنامہ پاکیزہ — منی 2012ء (120)

پارہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”مجھے تو تمہارے گھر سے بیٹی چاہیے۔ چاہے افق چاہے لیہا۔“

”ہاں تو رشتہ ہی تو طے ہوا ہے کون سا ممکن ہو گیا یا شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ ایک رشتہ بھائی کی طرف کرلو..... اور ایک میری طرف۔“ عمارہ اپنے من لفظوں میں خود پھنس گئیں۔

”اب تو زبان دے دی ہے انہیں۔ اب پلٹنا مشکل ہوگا آپا..... دوسرے رشتے پر بھی اثر پڑے گا۔ آپ تو بڑی ہیں جانتی ہیں سب کچھ۔“

”تو یوں کہو ناں، دونوں ہاتھوں میں لڈو رکھنا چاہتی ہو تم۔“

”اس میں کوئی شک نہیں آپا..... میں آپ دونوں سے ہی جڑی رہنا چاہتی ہوں۔“ ماہ پارہ کے دل کو بہت برا لگا لیکن خاموش رہیں اور دل ہی دل میں کہا کہ وہ افق کو اس رشتے کے لیے رضامند کر لیں گی۔

☆☆☆

سارا گھر سو رہا تھا اور ماہ پارہ بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھیں۔ رات کا نہ جانے کون سا، تھا۔ کچن سے کھڑ پٹر کی آوازیں آرہی تھیں۔

”ضرور افق ہی ہوگی۔“ ماہ پارہ نے سوچا اور بستر سے نکلیں، دبے پاؤں باہر آئیں، کچن کی لائٹ جل رہی تھی۔ افق اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔ ماہ پارہ سائڈ میں ہو گئیں اور افق کو نوٹ کرتی رہیں۔ افق نے فریج سے ڈبل روٹی نکالی اور چائے کا بگ ساڑز کپ لے کر ڈائننگ روم میں آئی۔ ٹی وی آن کیا اور سلاکس چائے سے کھانے لگی۔ ماہ پارہ ڈائننگ روم میں آگئیں۔ افق نے ایک نگاہ ماہ پارہ کو دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ ماہ پارہ کو عجیب سا لگا۔ افق انہیں دیکھ کر چونکی نہیں، چڑی نہیں جوں کی توں بیٹھی چائے اور سلاکس کھاتی رہی۔ ماہ پارہ نے جیسے

افق سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈا۔
”سلاکس ایسے ہی کھار ہی ہوا افق۔ کم سے کم کھی لگا کر سینک تو لیتیں۔“

”مجھے ایسے ہی کھانے کی عادت ہے اور ویسے بھی ای کا کھی خرچ ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اس لیے میں ان لوگوں کا راشن پانی زیادہ استعمال نہیں کرتی۔“ افق زود سے لہجے میں بولی۔

”یہ تمہارا ہی گھر ہے افق۔“ ماہ پارہ کو حیرانی ہوئی۔

”آدمی رات کو اپنے بستر سے نکل کر آپ صرف مجھے یہی بتانے کے لیے آئی ہیں۔“ ماہ پارہ کنفیووزی ہو گئیں۔ دل ہی دل میں سوچا۔

”اس سے ہمدردی یا محبت کرنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ اسے اپنے والدین سے بہن، بھائیوں سے نفرت ہے۔ بدگمان ہے یہ ان لوگوں سے۔ مجھے چاہیے کہ اسے مزید بدگمان کروں۔ بھڑکاؤں ان کے خلاف شاید کوئی رزلٹ نکل آئے۔“ ماہ پارہ صونے پر بیٹھ گئیں۔ افق کو ماہ پارہ کی موجودگی کا جیسے کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ افق نے بھدے سے پرانے کپڑے بہن رکھے تھے۔ اس کا دوپٹا بھی جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ وہ اکثر ایسے ہی حلیے میں نظر آتی تھی۔

”تو تم اچھے اور صاف سترے کپڑے بھی اس لیے نہیں پہنتیں کہ تم ان لوگوں کا خرچہ نہیں کرانا چاہتیں۔“ ماہ پارہ نے بڑی ہوشیاری سے کہا۔ افق نے کوئی جواب نہیں دیا چپ رہی۔

”لیہا تو اتنے اچھے کپڑے پہنتی ہے، خود تمہاری ماں کا پہناوا بھی اچھا ہی ہوتا ہے۔ حالات کا اثر ان لوگوں پر تو کبھی نظر نہیں آیا اور تمہیں جب دیکھو ایسے ہی گھسے پٹے کپڑے پہنے رہتی ہو۔“

”اسی لیے میں کسی کے سامنے نہیں آتی جاتی کہ لوگ مجھے نہیں میرے پہناوے کو دیکھیں گے، باتیں

بنائیں گے جس طرح آپ بنا رہی ہیں۔ کیا حق پہنچتا ہے آپ کو میرے کپڑوں پر تنقید کرنے کا، میں نے کہہ دیا تا نہیں کرنا چاہتی میں ان لوگوں کا پیسہ خود پر خرچ۔۔۔۔۔ پھر کیوں کر بید رہی ہیں آپ میرے زخموں کو بار بار۔“ افق چڑ کر بولی۔

”آہستہ بولو افق سب سو رہے ہیں۔ جاگ جائیں گے۔“

”پھر کیا ہوگا مجھے ہی برا کہیں گے سب، آپ کو تو نہیں ناں۔۔۔۔۔ مجھے اپنی برائیاں سننے اور سہنے کی اچھی طرح سے عادت پڑ چکی ہے۔“

”یہی تو چاہتی ہے تمہاری ماں کہ تمہیں لوگوں کے سامنے ذلیل و خوار کر دے۔۔۔۔۔ اور تم مزے سے اس کا ہتھیار بن رہی ہو۔ سو بیلا سمجھتی ہیں وہ تمہیں۔ حد ہے حق تلفی کی، بچپن سے اب تک تمہارے ساتھ ہی حق تلفی کیے جا رہے ہیں دونوں میاں بیوی اور احساس ہی نہیں انہیں۔“ افق چونکی، حیران ہوئی۔

”تم سے چھوٹی لیہا کو تمہارے ماموں، ممانی نے کیوں لیا۔ یہ سوچا کبھی تم نے۔۔۔۔۔ تم سے زیادہ خوب صورت تو نہیں لیہا لیکن وجہ کیا تھی۔ صرف یہ کہ لیہا کی تعریفیں اس کی خوبیاں ہر وقت بیان کرتی نظر آتی ہے تمہاری ماں۔۔۔۔۔ گھر گھر ستن ہے سلیقہ شعار ہے وغیرہ وغیرہ۔ خود ہی تو تمہاری جزیں کاٹ رہی ہے تمہاری ماں اور الزام تمہیں دیتی ہے کہ تم میں صلاحیتیں نہیں ہیں۔ ارے کم عقل لڑکی ذرا سوچو کس طرح کنویں میں مل کر دھکیل رہے ہیں یہ لوگ تمہیں، قسمت تمہیں موقع دے رہی ہے ان سب کو نیچا دکھانے کا، خود کو منوانے کا اور تم اپنے ہی ہاتھوں سے ضائع کر رہی ہو۔“

”کیا کہنا چاہتی ہیں آپ بے افق نے حیرانی سے پوچھا۔

”یہی کہنا چاہتی ہوں کہ حارث پڑھا لکھا لڑکا

چوٹ بھی برابر لگ رہی تھی۔
”تم ایک بار ہاں کرو افق، میں تمہیں پڑھاؤں گی۔ تم ایم بی اے کرنا چاہتی تھیں نا، میں تمہیں کراؤں گی۔ میں اور حارث تمہارے خواب پورے کریں گے اور ایک دن تم دیکھنا یہی سب لوگ تمہارے قد کے سامنے کتنے چھوٹے لگیں گے۔ اتنی عقلم اور کامیاب ہستی بنا دوں گی میں تمہیں۔ تم سن رہی ہونا افق۔“ افق رو رہی تھی۔

”آپ سچ کہہ رہی ہیں خالہ۔“ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے وہ بولی تو ماہ پارہ کے دل میں تو شہنائیاں بجنے لگیں۔

”ارے سو فیصد سچ کہہ رہی ہوں میری جان، دل کڑھتا ہے میرا تمہارا یہ حال دیکھ کر، بہت پیاری ہو تم مجھے۔“

”اگر میں اتنی ہی پیاری تھی آپ کو تو آپ نے پہلے ہی کیوں نہیں سوچا میرے بارے میں؟ کیوں عینا کے لیے گئیں آپ؟“ افق نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ماہ پارہ ہنستا ہنستا۔

”تمہاری ماں کی وجہ سے۔۔۔۔۔ تھوڑی برائیاں کرتی ہے وہ تمہاری۔ نزدیک بھی ہونے نہیں دیتی وہ تمہارے کسی کو۔۔۔۔۔ اور پھر میری جان سچ بتاؤں تمہیں، میں تو بہن، بھائیوں سے جڑی رہنا چاہتی ہوں، اب چاہے میرے گھر میں کسی کی بھی بیٹی آجاتی۔۔۔۔۔ تمہیں تو پتا ہی ہے عاصمہ اور ساجدہ بڑی تھیں سب کزنز سے اسی لیے انہیں باہر بیاہنا پڑا، حارث بھی تم لوگوں کے ساتھ کا ہے تو سوچا اسی بہانے سہی مگر قدر نہیں کی حسنین نے میری۔ ٹھیک نہیں کیا ہے تمہاری ماں نے وٹہ سٹہ وہاں۔ خالہ بڑی ہوشیار ہے، نہیں سنبھال سکے گی عمارہ یہ بوجھ۔“

”امی کو بڑا یقین ہے، بڑے سمجھ دار ہیں ای

ماحولہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

کے دونوں بچے..... آنچ نہیں آنے دیں گے ایک دوسرے پر۔“ افق طنزیہ ہنستے ہوئے بولی۔ ماہ پارہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”اے تم دیکھتی جاؤ، ان کا تو ایسا طبلہ بچے گا کہ دنیا جہاں دیکھے گا۔“

”دیکھو افق، قسمت تمہیں ابھرنے کا اوپر آنے کا پورا موقع دے رہی ہے۔ تم اسے گنوا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاؤ گی۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے، تم اپنا آپ منوانا چاہتی ہو یا دنیا کے رحم و کرم پر خود کو چھوڑنا۔ یاد رکھنا افق! ابھی تو یہ لوگ تمہیں برداشت بھی کر رہے ہیں۔ ایک دن آئے گا تمہیں پوچھنا تو ایک طرف تمہارا مذاق اڑایا کریں گے یہ۔ ختم ہو جاؤ گی تم بالکل۔ ابھی بھی وقت ہے مت موقع ضائع ہونے دو۔“

”مجھے کچھ وقت چاہیے خالہ۔“ افق، ماہ پارہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ماہ پارہ کی تو باجھیں کھل اٹھیں۔

”کیوں نہیں بلکہ اچھی طرح سے سوچ لو۔ ہر لحاظ سے تمہیں اپنا ہی فائدہ نظر آئے گا۔ میں اگلے ہفتے آؤں تو تمہارے اندر تبدیلی ملے مجھے اور ہاں جواب بھی ہاں میں ہی ہونا چاہیے، سنا تم نے۔“ ماہ پارہ نے لاڈ سے کہا تو افق مسکرائی۔ ماہ پارہ نے افق کو گلے سے لگالیا۔

☆☆☆

”بھئی ہمیں تو ماہ پارہ آپا کے اس اقدام نے واقعی حیران کر دیا۔ ہمارا تو خیال تھا کہ ماہ پارہ آپا ناراض ہو کر ایک سائنڈ پر بیٹھ جائیں گی لیکن ابھی اور مثبت سوچ آئی ہے ان کی ہمارے سامنے۔“ خالہ، عمارہ سے بولیں تو حسنین بھی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

”تو پھر کیا فیصلہ کیا تم نے....؟“ حسنین نے عمارہ سے پوچھا۔

”کیا فیصلہ کروں جب بیٹی ہی قابو میں نہیں بالکل انکار کر دیا ہے افق نے۔ الٹا زبان درازی ہو کی آپا کے ساتھ۔ میں اتنی شرمندہ ہوئی کہ بتا نہیں سکتی۔“ عمارہ بیگم دکھ اور بے بسی سے بولیں۔ افق نے کمرے میں آرہی تھی باہر ہی رک گئی۔ افق کو ماں کے الفاظ تیر کی طرح لگے۔ افق کا سارا موڈ خراب ہو گیا۔ عمارہ نے افق کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ افق ماں کی باتوں سے خائف نظر آرہی ہے۔ عمارہ نے فوراً موضوع بدلا۔ افق کمرے میں نہیں آئی واپس چلی گئی۔

☆☆☆

”کیا ضرورت ہے آپ کو ہر ایک کے سامنے افق کی برائیاں کرنے کی۔ آج آپ ماموں ممانی کے سامنے بھی اس کے کیڑے چنے بیٹھ گئیں۔ کیا سوچیں گے وہ لوگ۔ کیا یہ تاثر نہیں پڑے گا ان پر کہ ایسا بھی اسی گھر کی بیٹی ہے کہیں نہ کہیں وہ بھی ایسی ہی ہوگی۔“

”ہرگز ایسی نہیں ہے میری ایسا۔ وہ ہی نہیں پوہا نکھیاں جانتا ہے۔ سلام کی توفیق تک تو ہوتی نہیں اسے اور تم کہہ رہے ہو کہ میں اس کا ذکر کسی سے نہ کروں۔ وہ لوگ یہاں آ جا رہے ہیں اپنی آنکھوں سے سارا حال دیکھ رہے ہیں۔ افق نہ گھریلو امور میں دلچسپی لیتی ہے اور نہ ہی کسی آنے والے سے بول رہے۔ منہ کا بول تک نہیں دیتی وہ کسی کو۔ گئے مامو ممانی ہیں وہ اس کے۔ مجھے ہی پتا ہے کتنی سکی محسوس ہوتی ہے مجھے حسنین بھائی اور خالہ بھابی کے سامنے۔“

”ای اب افق کچھ تبدیل ہو رہی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں اب وہ رات کو نہیں دن میں سو کر اٹھتی ہے۔“

”ہاں بس یہی تبدیلی آئی ہے اس میں کہ اب رات کو نہیں دوپہر میں سو کر اٹھتی ہے۔ تھوڑا بہت کھا بھی کھا لیتی ہے مگر مجھے ایک بات بتاؤ تم..... کیا کروں

ہو تو یہ تو مت بھولو کہ شادی سے پہلے تم لوگ بھی اسماٹ ہوا کرتی تھیں۔“ ماہ پارہ نے ڈپٹ کر کہا۔

”خیر امی اتنا مبالغہ تو نہ کریں۔ اب اتنے بھی کمزور نہیں تھے ہم لوگ۔ کھاتے پیتے گھر کے بچے کبھی بھی اتنے کمزور نہیں ہوتے۔“ ماہ پارہ نے غصے سے بیٹی کو دیکھا۔

”کتنی باتیں بنانی آگئی ہیں تمہیں بالکل اپنے سرال والوں کی طرح..... یہ مت بھولو، یہ میری بہن کا گھر ہے اور بھانجی ہے افق میری، ایک لفظ برداشت نہیں کروں گی میں اس کے خلاف..... حارث کی امانت ہے اب وہ اس گھر میں اور میں اپنے حارث کی ہر چیز کو بہت سنبھال کر بڑی حفاظت سے رکھتی ہوں۔“ عمارہ کو جیسے تقویت ملی اور وہ دل ہی دل میں سوچنے لگیں۔ ”سکہ تو گھر میں آپا کا ہی چلتا ہے۔ بیٹیوں کا نہیں۔ آپا اتنی پنچھاور ہیں میری بیٹی پر، مجھے بالکل پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“

”میں تو شادی بہت جلد کرنے کے موڈ میں ہوں بلکہ اگلے مہینے کی تاریخ طے کر لیتے ہیں۔“ ماہ پارہ نے عمارہ سے کہا۔ عمارہ بیگم اس اچانک افتاد کے لیے بالکل تیار نہیں تھیں۔

”آپا اتنی جلدی، میں نے اور تنزیل نے سوچا ہوا ہے کہ ہم اپنے تینوں بچوں کی شادی ایک ساتھ ہی کریں گے۔“

”بالکل بھی نہیں، بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے تین تیرہ بڑا بکھیڑا۔ تین بچوں کی شادی ہرگز ایک ساتھ نہیں کرنی چاہیے۔ تم پہلے افق کی شادی کرو پھر بھلے سے عمار اور ایسا کی کر لینا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے آپا..... لیکن آپ سے تو میرا کچھ بھی پوشیدہ نہیں، ابھی عمار، تنزیل کے قرعے سے نکلا ہے وقت لگے گا تیاری کرنے میں۔ میں نے تو ابھی سوئی بھی نہیں خریدی، آپ شادی کی بات کر رہی

میں اس تبدیلی کا۔ جو کچھ بھی اس نے ماہ پارہ آپا کے ہاتھ کیا ہے تمہیں لگتا ہے وہ دوبارہ اس گھر میں آئیں گی۔ آخر مجبوری کیا ہے ان کی جو وہ آئیں میری کارہ، بد مزاج اور جھگڑالو بیٹی کے لیے جسے آج تک امک کی چائے تک بنانی نہیں آتی، ہانڈی روٹی تو ایک طرف۔ مہمانوں سے سلام دعا تک نہیں کر سکتی وہ مہمان نوازی تو ایک طرف۔“

”نہ آئیں بے شک خالہ..... لیکن افق میں تبدیلی آرہی ہے امی اور پلیز آپ اس کی اس تبدیلی کا فائدہ مقدم کریں تاکہ وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے، مارل ہو جائے سب کچھ۔ پلیز! پلیز امی۔“ عمار ماں کو سمجھانے لگا۔ عمارہ بیگم خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

ماہ پارہ، عاصمہ اور ساجدہ ڈرائنگ روم میں ایلی تھیں۔ افق نے میز پر چائے اور سامان رکھا۔

”میں سے ملی اور باہر چلی گئی۔“ عمارہ بیگم بیٹی کی اس تبدیلی پر بہت خوش اور مدد داری تھیں لیکن جب عمارہ بیگم نے عاصمہ اور ساجدہ کی طرف دیکھا تو چونک گئیں۔ دونوں کے منہ کھڑے ہوئے تھے جبکہ ماہ پارہ بہت خوش تھیں۔

”آپ کے قدم میرے گھر میں اتنے بھاگوان آئے کہ میری بیٹی کے مزاج میں تبدیلی آگئی۔“ عمارہ نے بہن سے کہا۔

”دیکھنا اب اور بھی بدل جائے گی۔“ ماہ پارہ نے یقین دہانی کرائی۔

”کیا بات ہے خالہ آپ افق کو کچھ کھلاتی پلاتی ہیں کیا۔ دیکھیں تو کتنی کمزور دکھائی دے رہی ہے۔ پچھلے جیسے برسوں سے فاقہ زدہ ہو۔“ عاصمہ فوراً بولی۔

”ارے لڑکیاں تو ایسی ہی ہوتی ہیں، دھان ان ہانڈی سی۔ اب تم لوگ دو دوسن کی دھوبن ہو گئی

”دیکھو عمارہ، ہم دونوں بہنیں ہیں، غیر نہیں۔ مجھے بالکل بھی جہیز کا لاچ نہیں ہے۔ سب کچھ ہے میرے پاس اور میرے بیٹے ہی کتنے ہیں۔ سبھی کچھ حارث کا ہی تو ہے۔ حارث کے پاس سب کچھ ہے۔ بس گھر والی کی ضرورت ہے اسے۔ میں تو کہوں گی تم ان چکروں میں نہ پڑو۔ شرع کے مطابق نکاح پڑھو اور ہماری امانت ہمارے حوالے کرو۔ اللہ اللہ خیر سلا۔“ عمارہ بیگم حیران اور پریشان سی تھیں۔

☆☆☆

”نہ اتنی ہٹ دھری پر اترتیں تم تو آج میں یوں صولی پر نہ لٹک رہی ہوئی۔ کھانا پکانا تک نہیں آتا تمہیں، میں کیسے ایک مہینے کے اندر اندر تمہیں ان کے ساتھ چلتا کروں۔“

”یہ بات آپ مجھ سے کیوں کر رہی ہیں خالہ سے کریں۔ جلدی انہیں ہے مجھے تو نہیں۔ یہ کیا کم احسان کی بات ہے کہ میں نے آپ لوگوں کی ہاں میں ہاں ملا دی۔“ افتخار ہٹ دھری سے بولی۔ عمارہ بیگم گہری سانس کھینچ کر رہ گئیں۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے افتخار، یہ بات آپ خالہ سے کریں کہ کم از کم چھ ماہ تو دیں وہ ہمیں۔ اتنے شارٹ نوٹس پر شادیاں نہیں ہوتیں۔ شادی ہے کوئی مذاق تو نہیں۔“ عمارہ ماں سے بولا۔

”مگر آپ انہیں مان رہیں۔ بہت کہہ لیا میں نے انہیں۔ مجھے ڈر ہے زیادہ کہوں گی تو رشتے سے بھاگ جائیں گی۔“

”تو بھاگ جانے دیں، میں کون سا مری جارہی ہوں اس رشتے کے لیے۔“ عمارہ بیگم نے غصے سے افتخار کی طرف دیکھا۔

”اپنا لہجہ بدلوا افتخار۔ سسرال میں ساس، نندوں سے تم اس لہجے میں بات نہیں کر سکتیں۔ کچھ اصول کچھ

طور طریقے ہوتے ہیں زندگی گزارنے کے۔“

”دیکھیں ای! خالہ اچھی طرح جانتی ہیں میں کیسی ہوں۔ اگر انہیں میرے کسی رویے پر، طر طریقے پر اعتراض ہوتا تو وہ ہرگز مجھ پر اپنے بیٹے سوال نہ ڈالتیں۔“

”مگر یہ بھی مت بھولو افتخار، کچے اور پکے نانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ساس بننے کے بعد خالہ ہو چاچی یا مامی..... ساس ہی بن جاتی ہے۔ کوئی بھی تمہارا یہ ہٹیلاپن برداشت نہیں کرے گا۔ جس قدر مجھ سے زبان درازی کرتی ہو کوئی بھی برداشت نہیں کرے گا۔ میں ہی تھی جو کرتی آرہی ہوں۔“

”آپ نے میرے ساتھ جتنی حق تلفیاں کی ہیں اتنی اور کسی نے بھی نہیں کیں اور اگر کوئی کرے گا تو میں اسے بھی ایسے ہی جواب دوں گی، برداشت نہیں کروں گی، سن لیں آپ۔“ عمارہ نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا جیسے مزید بحث سے روک رہا ہو۔ عمارہ بیگم چپ ہو گئیں۔

☆☆☆

”حسین بھائی سے بھی مشورہ کیا ہے میں نے۔ وہ لوگ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ آپ جیسا چاہتی ہیں مجھے دیا ہی کرنا چاہیے۔“

”تو پھر لے لو اپنے بھائی سے قرض اور بیاہ لو بیٹی۔ لوگوں سے مشورے کرنے چلی ہو تم عمارہ بیگم، اپنے پیٹ کا اپنے حالات کا تمہیں پتا ہے۔ اچھی طرح سے پتا ہے، کیا ضرورت ہے مشورہ کرنے کی۔“

”تو کیا کروں تنزیل..... عمارہ کے کاروبار کی فی الحال پوزیشن ایسی نہیں ہے کہ میں لمبا چوڑا اہتمام کر سکوں۔“

”تو کہا کس نے ہے تمہیں کہ لمبا چوڑا کرو فر کرو۔ جب اگلے بھی سادگی سے ہی شادی پر دہاؤ دے رہے ہیں کر دیتے ہیں سادگی سے شادی۔“

”یہ دیکھیں..... خدا کے واسطے آپ تو بس چپ رہیں۔ پہلے ہی افتخار پچھلے پانچ سال سے ہم سے نالاں ہے کہ ہم نے اس کا کیریئر تباہ کر دیا۔ پیسہ خرچ نہیں کیا اس پر..... اب شادی بھی سادگی سے کروں گی تو اور بدظن ہو جائے گی۔ بد دل ہو جائے گی ہم سے۔ زندگی بھر کی شکایتیں اور بڑھ جائیں گی اس کی۔ دیے بھی جہیز لڑکی کا مان ہوتا ہے، اعتماد ہوتا ہے۔ تین کپڑوں میں رخصت کر دوں گی تو کس طرح اپنا اعتماد بحال کر پائے گی وہ۔ پہلے ہی ساری دنیا سے ناتا توڑ رکھا ہے اس نے اپنا، ملتی ملاتی نہیں کسی سے، اب اس کی اس حیثیت کو بھی ختم کر دوں تاکہ سراٹھا کر جی ہی نہ سکے وہ وہاں۔ ایسا ہرگز نہیں کروں گی میں۔ چاہے مجھے حسین بھائی سے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے، میں افتخار کی شادی دھوم دھام سے ہی کروں گی۔“ عمارہ بیگم نے غصے سے تنزیل کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولیں۔

☆☆☆

”کتنی آسانی سے تمہاری بہن نے تین لاکھ روپے مانگ لیے۔ ذرا شرم نہیں آئی اسے، آخر وہ ہمیں بھی بیٹی دے گی۔ کم سے کم یہی سوچ لیتی۔“

”وہ بیٹی دے نہیں رہی لے بھی رہی ہے..... اور یہ تمہاری ہی خواہش تھی۔ اب کیوں بحث کر رہی ہو تم مجھ سے۔“ حسین چڑ کر بولے۔

”بڑی ہمدردی کر آئی تھیں ماہ پارہ آپا..... اور دیکھو تو یہ ہمدردی کر رہی ہیں۔ قرض میں ڈبو کر جارہی ہیں بہن کو۔“

”یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے خالہ..... عمارہ کو قرض دوں گا تو لے بھی لوں گا۔ اور کون سی زیادہ رقم ہے صرف تین لاکھ ہی تو ہیں۔ لوٹا دے گا عمارہ، وعدہ کیا ہے اس نے..... تم اس بات کو بحث میں مت لاؤ۔“

☆☆☆

ایک ماہ شادی کی تیاریوں میں کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا..... اور وہ دن بھی آگیا جب افتخار دہن بنی بیٹھی تھی اور نکاح کے بعد سب ایک دوسرے کا منہ میٹھا کر رہے تھے۔ بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے عمارہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

”آپا! میری بیٹی افتخار بہت نادان ہے۔ کم عقل ہے، ذرا سی ضدی ہے۔ خدا کے واسطے اس کے ساتھ درگزر کا معاملہ رکھیے گا اور ہاں کچن داری کے معاملات میں بھی کمزور ہے البتہ جو کچھ بھی آپ سکھائیں گی سیکھ جائے گی۔“

”تم بالکل فکر مت کرو۔ افتخار اب تمہاری نہیں میری بیٹی ہے۔ سب کچھ سکھاؤں گی میں اسے۔ یہاں تک کہ اسے پڑھاؤں گی بھی۔ سارے ارمان پورے کروں گی اس کے۔“ ماہ پارہ بہن کو خود سے لگا کر بولیں۔

”آپا! میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھول سکتی۔ خدا میری بیٹی کو سدا خوش اور آباد رکھے۔“

”افتخار کے ساتھ رحمہاں کا برتاؤ رکھنا حارث تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہو۔ وقت لگے گا تمہیں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے۔“ عمارہ بیگم رخصت کرتے وقت داماد سے ملتے ہوئے بولیں۔

”آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں آنٹی، افتخار اب آپ کی نہیں میری عزت ہے اور کوئی مرد نہیں چاہتا اس کی عزت معاشرے کی نظروں میں گرے۔“ عمارہ بیگم کا دل بھر آیا۔ انہوں نے حارث کی پیشانی چوم لی۔

☆☆☆

”بھئی کمال ہے، جو کام تمہیں کرنا چاہیے تھا میں کر رہی ہوں میں سمجھی تم لوگ چل گئی ہو اور تم تو یہاں بیٹھی

ہو اور یہ کیا..... تمہارے تیور کیوں بگڑ رہے ہیں؟“
عاصمہ اور ساجدہ دونوں منہ بنا نے ڈرائنگ
روم میں بیٹھی تھیں۔ ماہ پارہ، افق کو اس کے کمرے
میں بٹھا کر باہر آئیں تو حیرانی سے بولیں۔

”یہ عزت افزائی ہوئی ہے ہماری اور ہمارے
شوہروں کی۔ وہاں ڈھنگ کا کھانا تک نہیں تھا۔ سلیقے
کے برتن نہیں تھے، ریسپشن نہیں تھا اور تو اور جس نے
بھی افق کو دیکھا ہی کہا، ارے یہ کیا..... بس یہی رہ
گئی تھی حارث کے لیے، آخر دیکھا کیا تھا آپ نے
ای۔ حارث کا دل ٹوٹ جائے گا اسے دیکھ کر۔ رنگ
اتنا سانا لا اور اتنی کمزور کچھ بھی نہیں ہے آگے سے بولتی
ایسے ہے جیسے سپاہی۔ عمارہ خالہ اتنی ہی پسند تھیں آپ
کو تو آپ ایسا پرسوال ڈال دیتیں۔ ہزاروں نگاہیں
ایسا کی طرف اٹھی ہوئی تھیں آج۔ ایک آپ کی ہی
نگاہ نہ گئی اس پر۔“

”افق کمرے میں بیٹھی ہے۔ سب آوازیں افق
تک جا رہی ہیں۔“ ماہ پارہ بیگم نے غصے سے بیٹی سے
کہا۔ ”عاصمہ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا تم اس
طرح کی فضول باتیں کرنا بند کرو ورنہ ٹھک نہیں ہوگا
تمہارے لیے۔ کیوں تم حارث کی زندگی کو خراب
کرنے پر تلی ہو۔“

”میں کیا خراب کروں گی امی۔ آپ خراب
کر چکی ہیں۔ نہ ڈھنگ کا جہیز، نہ شکل صورت آگے
سے ہماری پذیرائی ایسی ہوئی ہے کہ دیکھنے سے
قابل۔ اتنے ارمان تھے ہمیں حارث کی شادی کے۔
سیکڑوں لڑکیاں اس کے لیے پسند کیں میں نے۔“

”بس! چپ کرو عاصمہ اپنا سامان اٹھاؤ اور
اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو اور اگر اپنے گھر جانا
ہے تم دونوں نے تو چلی جاؤ۔ شاید یہ بہتر ہوگا ہم سب
کے لیے۔“ ماہ پارہ بیگم غصے سے بولیں اور افق کے
کمرے میں چلی آئیں۔ افق کمرے میں کچھ پریشان

ی بیٹھی تھی۔

”تم ان کی باتوں کو دل پر مت لگانا۔ یہ گھر میرا
ہے، تمہیں اس گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ کوئی
کچھ نہیں کہے گا تم میرے حارث کی دلہن ہو۔ اور میرا
حارث میرے لیے سب سے قیمتی سب سے اہم ہے۔
حارث سے وابستہ ہر چیز کی قدر ہے میرے گھر میں۔
تمہیں گھبرانے اور پریشان ہونے کی بالکل ضرورت
نہیں آرام کرو تم، میں حارث کو دیکھتی ہوں کہاں رہ
گیا۔“ ماہ پارہ بیگم کمرے سے نکلیں اور افق اپنے بیڈ
پر بیٹھی دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

”خالہ میری سوچ، میری توقع سے بھی بڑھ کر
مخلص ہیں میرے لیے۔ اتنی سپورٹ تو کبھی امی نے
بھی میری نہیں کی تھی جتنا پہلے ہی دن خالہ نے کی۔ میں
کوشش کروں گی خالہ کہ آپ کا مان قائم رکھوں۔ جتنی
چاہت سے آپ مجھے لے کر آئی ہیں آپ کی چاہت کم
نہ ہونے پائے۔ آپ مجھے ایسے ہی سپورٹ کرتی
رہیں۔ مجھے واقعی آپ کی سپورٹ کی ضرورت ہے۔
اتنے عرصے کے بعد مجھے اتنی گید رنگ کا سامنا کرنا
پڑا۔ میں بے حد کنفوز ہو رہی تھی۔ سب لوگ مجھے دیکھ
رہے تھے اور مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ میں تو گھر میں ہی
رہتی تھی بلکہ صرف اپنے کمرے میں ہی رہتی تھی۔

آئے مہمانوں سے بھی نہیں ملتی تھی۔ پورے پانچ
سال نہ جانے میں نے خود کو سزا دی یا اپنے گھر والوں
کو۔ پتا نہیں میری رخصتی کے بعد کیسا ماحول ہو رہا ہوگا
اس گھر کا۔ امی ابو کے سر سے تو جیسے بہت بڑا بوجھ
ہٹ گیا ہے۔ عمار اور ایسا بھی خوش ہوں گے۔ مجھے
نہیں لگتا کسی کو میری کمی محسوس ہوئی ہوگی۔ میں گھر
والوں کے درمیان بیٹھتی ہی کہاں تھی۔“ اچانک
کمرے میں آہٹ ہوئی تو افق جو اپنی سوچوں میں گم
تھی چونک گئی۔ حارث آہستہ آہستہ چل کر قریب آیا۔
افق کنفوز سی دکھائی دے رہی تھی۔ حارث کی ہنسی نکل

گئی۔ افق حیرانی سے حارث کو دیکھنے لگی۔ حارث
ہنسا۔ افق کو لگا جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔
”کیا واقعی میں دلہن بن کر خوب صورت نہیں
لگ رہی.....“ افق نے دل ہی دل میں سوچا معا
حارث، افق سے ایک سکیزو کرنے لگا۔

”آئی ایم سوری.....! دراصل مجھے اس لیے
ہنسی آگئی تھی کہ یہاں سب نے تمہارا عجیب سا نقشہ
کھینچ رکھا تھا۔ لڑاکا ہے، جھگڑالو ہے، میں تو سمجھا تھا
کوئی چنگیز خان کی پوتی آرہی ہے میری زندگی میں۔
اندر آیا ہوں تو معلوم ہوا کہ یہ تو کوئی چڑیا جیسی لڑکی
بیٹھی ہے جو شاید مجھ سے خوفزدہ ہے۔“ افق حیران
حیران حارث کو دیکھ رہی تھی۔ حارث کے خوب
صورت اور ہینڈسم سراپا کو دیکھ کر افق کے دل کی
دھڑکن تیز ہوگئی۔

”رات بہت ہوگئی ہے تم کپڑے وغیرہ چینج
کرلو۔ میں بھی فریش ہو جاتا ہوں۔“ حارث نے کہا
اور واش روم میں چلا گیا۔ افق دل میں سوچنے لگی۔
”میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ میری
زندگی میں یہ لمحے بھی آئیں گے۔“ افق چینج کرنے کی
غرض سے اٹھ کر اپنے میں خود کو دیکھنے لگی۔ افق کو اپنا
آپ بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں سب لوگ بالکل بھی
اچھی نہیں لگ رہی میں۔ آنکھوں کا میک اپ تو دیکھو
ذرا کیسا کر رکھا ہے میرا۔ ساری آنکھیں دھنسی پڑی
ہیں اور لپ اسٹک اتنی پھیلا کر لگا دی۔ بیس کا کلر بھی
بالکل اچھا نہیں ہے۔ اب اتنا بھی رنگ کالا نہیں ہے
میرا۔ پتا نہیں کیا سوچ کر تین گھنٹے تک میں اپنی شکل پر
یہ رنگ چڑھوائی رہی ہوں۔ اُف تو بہ ہے! اتنی بد
صورت تو میں زندگی میں کبھی نہیں لگی جتنی آج لگ
رہی ہوں۔ تبھی حارث نے میری پذیرائی میں کوئی لفظ
نہیں کہا..... بلکہ حارث کو میری شکل دیکھ کر ہی ہنسی آئی

ایسے دل نادان

ہوگی۔“ افق شرمندہ ہوتے ہوئے زیورات اتارنے
لگی۔

☆☆☆

ماہ پارہ بیگم اور حارث دونوں ناشتا کر رہے
تھے۔ ماہ پارہ نے حارث سے پوچھا۔ ”کیسی لگی تمہیں
اپنی دلہن.....“ افق کمرے سے نکلتے نکلتے واپس
پردے کی اوٹ میں ہوگئی۔

”آپ کی پسند ہے۔ برائی تو نہیں کر سکتا
میں۔“ افق پردے کی اوٹ میں کھڑی رہی۔
”اس کا مطلب ہے تمہیں افق پسند نہیں آئی۔“
ماہ پارہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”نہیں، نہیں، ایسی بات نہیں۔ افق اچھی
ہے۔“ اسی وقت افق کمرے سے باہر آگئی۔ ماہ پارہ،
افق کو دیکھ کر مسکرائیں۔

”آؤ، آؤ، افق ابھی تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے
ہم لوگ۔“ افق خاموشی سے آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تم نے امی کو سلام نہیں کیا۔“ حارث نے افق
سے کہا۔ افق جیسے کنفوز سی ہوگئی۔ فوراً سلام کیا۔

”یہ بے چاری کہاں صبح اٹھا کرتی تھی جو اسے
معلوم ہو کہ صبح کا سلام کتنا بڑا انعام ہوتا ہے۔“ ماہ پارہ
نے ہنستے ہوئے مذاق اڑانے والے انداز میں حارث
سے کہا۔ افق اور بھی کنفوز ہوگئی۔ حارث کے چہرے
پر عجیب سی مسکراہٹ تھی جسے افق سمجھ نہیں پائی۔

”تم ناشتا کرو افق کیا سوچنے لگیں۔“ افق کو گم
صم پا کر ماہ پارہ نے ٹوکا تو افق اپنے لیے چائے
نکالنے لگی۔

”افق یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہے
سب حارث کا ہے، میرا ہے، اس لیے تمہارا بھی اتنا
ہی حق ہے ان سب چیزوں پر جتنا ہمارا، کیوں تکلف
کر رہی ہو تم، کھل کر کھاؤ اور پلیز، چائے تو مت ہی بیو
تم، یہ فریش جوس لو اور یہ پراٹھا کھاؤ آلیٹ کے

ساتھ، چائے بعد میں پی لیتا۔“ افق، ماہ پارہ کے کہے ہوئے پر عمل کرنے لگی۔ افق ناشتا کرتے ہوئے محسوس کر رہی تھی کہ ماہ پارہ اور حارث باتوں میں اس قدر محو اور گمن ہیں کہ انہیں افق کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔ حارث ماں کی تعریفیں کر رہا تھا اور ماہ پارہ بیگم حارث کی۔

”اتنے پیارے لگ رہے تھے تم حارث، میرا دل کر رہا تھا کہ تمہیں اپنے دل میں چھپا لوں۔ کہیں نظر نہ لگ جائے تمہیں۔“

”سبھی نے تعریف کی میری سوائے آپ کی بہو کے۔“ حارث مغرور انداز میں بولا۔

”ارے افق، تم نے حارث کو دیکھا تھا کل، کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔“ افق نے شرمناک رنگاں جھکا لیں۔

”شرمارہی ہے بے چاری۔“

”خالہ آپ بھی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔“

”خالہ.....“ حارث چونکا۔ ”اب یہ بات بھی تمہیں بتانا پڑے گی..... ای کہو گی تم ای کو۔“

”جان جائے گی آہستہ آہستہ۔ اتنی جلد بازی مت کرو۔ دیکھا نہیں عمارہ کیسے کہہ رہی تھی۔ یہ بھی خیال نہیں کیا عمارہ نے کہ سارے لوگ کھڑے ہیں۔ تمہیں سمجھا رہی تھی کہ جلد بازی مت کرنا۔ میں عمارہ کی طرح نا سمجھ نہیں ہوں۔ اپنے بچوں کے میں نے پورے حقوق ادا کیے ہیں۔ کسی کے ساتھ کوئی حق تلفی نہیں کی۔ میرے تینوں بچوں کی شخصیت بھرپور اور مکمل ہے۔“

”خالہ کیا طنز کر رہی ہیں مجھ پر یا کچھ اور جتلاتا چاہتی ہیں۔ کتنا عجیب سا لگ رہا ہے خالہ کا اس طرح کہنا۔“ افق نے دل ہی دل میں سوچا اور سر جھکا کر ناشتا کرنے لگی۔

☆☆☆

ماہ پارہ بیگم کمرے میں آئیں تو افق سو رہی تھی۔

ماہ پارہ بیگم نے لائٹ جلائی۔

”افق اٹھو ابھی تمہیں پارلر بھی جانا ہے۔ رات کو لیمرہ بھی ہے بھئی۔“ ماہ پارہ نے افق کو آواز دی تو وہ کسمندی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماہ پارہ افق کے کپڑے اور زیور نکال چکی تھیں۔

”جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ عاصمہ آرہی ہے تمہیں پارلر لے جائے گی۔“

”عاصمہ آپا.....!“ افق حیران ہو کر بولی۔ ”وہ تو کل آپ سے لڑ جھگڑ کر چلی گئی تھیں۔ اب وہ کیسے آسکتی ہیں۔“ افق کے بے ساختہ پن پر ماہ پارہ چونکیں۔

”تم سے کس نے کہا کہ وہ لڑ جھگڑ کر گئی تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ وہاں ہوا اسی کا غصہ اتار رہی تھی وہ مجھ پر۔ ورنہ ہم ماں بیٹی کا نہ کوئی جھگڑا ہے اور نہ ہی تنازعہ۔“ ماہ پارہ غصے سے بولیں۔

”آئی ایم سوری خالہ..... میرا مطلب ہے ای۔“ افق نے سبجیل کر کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے جاؤ تم اور ہاں سنو، یہ جو تم جھٹ سے جواب دینے کی عادت ڈال کر آئی ہو ناں حارث کو بالکل پسند نہیں بحث، بہت کم گو اور صلح پسند ہے میرا بیٹا، تم بھی کوشش کرنا کبھی نہ اس سے بحث کرنا اور نہ ہی اس کی کسی بات پر انکار..... من رہی ہو میری بات۔“

”جی ای.....“ افق اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔

☆☆☆

ویسے کے فنکشن میں افق دلہن بنی بیٹھی تھی۔ عمارہ نے بیٹی کو دیکھا تو آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

”تم خوش ہو افق؟“ آہستہ سے افق سے پوچھا۔

افق ماں کے سوال پر حیران ہوئی۔ کل سے اب

نک اسے یہی پتا نہیں چلا کہ وہ کتنی دیر خوش رہی اور کتنی دیر اداس۔

”ارے عمارہ اکیلی آئی ہو تم، لیہا کو نہیں لائیں ساتھ۔“

”لیہا کے پیچھے ہیں آپا اس لیے نہیں لاسکی۔ عمار اور تنزیل آئے ہیں۔“

”اچھا کیا خالہ آپ لیہا کو نہیں لائیں۔ اس معاملے میں واقعی آپ نے سمجھداری کی ورنہ سب لوگ لیہا کو یہاں دیکھ کر ہم سے یہی کہتے بڑی کے بجائے چھوٹی کو بھی تو لے سکتے تھے آپ لوگ۔“

”عاصمہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ بھلا ایسی باتیں کرنے کی ہوتی ہیں۔“

”آئی ایم سوری خالہ، کرنے کی نہیں صرف سننے کی ہوتی ہیں۔ کل شاید آپ نے سنا نہیں۔ کیا کیا کمٹس ادا ہو رہے تھے آپ کی افق کے متعلق۔ آج تو پھر بھی کل سے کچھ بہتر لگ رہی ہے۔ پورے چار گھنٹے میں تیار کیا ہے پارلر والی نے۔ کہہ رہی تھی اتنی رف جلد ہو رہی ہے لگتا ہی نہیں کبھی فیشل بھی کرایا ہوگا۔ آج کل کی لڑکیاں تو ہر مہینے فیشل کراتی ہیں۔ اس نے تو اپنی ساری اسکن کا ہی بیڑا غرق کر رکھا تھا۔ ویسے آج بتائیں کل کی نسبت اچھی لگ رہی ہے ناں افق!“

”مجھے تو کل بھی اچھی لگ رہی تھی اور آج بھی اچھی لگ رہی ہے۔ خدا اس کو خوش رکھے، آباد رکھے۔“ عمارہ بیگم کو برا تو بہت لگا مگر ضبط کر کے بولیں اور افق کے نزدیک ہو کر آہستہ سے بولیں۔

”بڑی تیز ہیں عاصمہ اور ساجدہ، تم ان دونوں کے منہ کبھی نہ لگنا..... بس آپا کا دل جیتنے کی کوشش کرو۔

آپا کا دل جیت لیا سمجھ لو حارث کو جیت لیا تم نے۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کا دل جیتنے کی اور نہ ہی میں یہاں دل جیتنے آئی ہوں۔ میں جس

مقصد کے لیے آئی ہوں، دعا کریں میرا مقصد کامیاب ہو جائے۔ مجھے پڑھنا ہے ای اور خالہ نے یہی وعدہ کیا تھا مجھ سے۔“ افق ماں کی طرف دیکھ کر روکھے لہجے میں بولی۔

”اب کون پڑھنے دے گا تمہیں، شادی ہو گئی ہے۔ آپا کو پوتے پوتیوں کی پڑ جائے گی۔ ساری زندگی سے اتنی ہی جلد باز رہی ہیں آپا۔“ عمارہ بیگم مسکراتے ہوئے بولیں۔ افق نے حیرانی سے ماں کو دیکھا۔

”اچھا یہ بتاؤ حارث کو کیسی لگیں تم؟“ افق کے دماغ میں جیسے آنندھیاں سی چل رہی تھیں۔ معا عمارہ کی نگاہ خالدہ اور حسنین پر پڑی تو اُن سے ملنے کی غرض سے افق کے پاس سے اٹھ گئیں۔

افق کم صم سی بیٹھی ہوئی تھی۔ خالدہ نے نزدیک آ کر افق کو سلامی دی۔ ماہ پارہ کی دیوار نیاں اور تندیں بھی آگئیں اور باری باری سب دلہن کو سلامی دینے لگیں۔

”بھابی کم سے کم جوڑی تو دیکھ کر بیٹا لیتیں آپ۔ کہاں ہمارا گہرو جوان حارث اور کہاں یہ۔“ تند نے کہا تو ماہ پارہ ہلکا سا مسکرائیں۔ افق کیفوڑی بیٹھی تھی شاید اس بات کی خنجر کہ خالہ اس کا دفاع کریں گی، اس کی پرسنالٹی کو سپورٹ کریں گی لیکن ماہ پارہ دفاع کیوں کرتیں۔ دوسری جانب تو اُن کے بیٹے کے قصیدے گائے جا رہے تھے۔

”بہت بڑا دل ہے آپ کا آپا، آج کے دن تو ساس تندیں دلہن کی سلامی کے ساتھ تعریفیں بھی وصولی ہیں اور یہاں آپ کو عجیب سی ذلت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔“ ماہ پارہ کی دیوار نیاں اور تندیں چلی گئیں تو خالدہ نے ماہ پارہ سے کہا۔

”تو کیا کرتی۔۔۔ ترس کھا کر بیاہ کر لائی ہوں اسے تم نے تو سوچا نہیں، بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی پر ہاتھ

رکھ دیا۔ اگر میں بھی منہ پھیر لیتی تو کون بیاہنے آتا اسے۔“ ماہ پارہ چڑ کر بولیں۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، آپ جیسا بڑا دل کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔“ خالدہ معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔ عمارہ دونوں کو دور سے دیکھ رہی تھیں نزدیک آئیں تو دونوں ادھر ادھر ہو گئیں۔

”کیا باتیں کر رہی تھیں دونوں؟“ عمارہ بیگم نے افق سے پوچھا۔ افق نے عمارہ بیگم کو دیکھا۔ ”مجھے نہیں معلوم کیا باتیں کر رہی تھیں اور آپ کیوں نوٹس لے رہی ہیں لوگوں کی باتوں کا۔“ افق جل کر بولی۔

”اچھا آہستہ بولو، مووی بن رہی ہے تمہاری۔ اپنے ایکسپریشن بھی ٹھیک کرو ورنہ ایسا ٹیڑھا سا چہرہ آئے گا تمہارا اور دیکھو لوگوں کی باتوں کا نوٹس لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ سب جل رہے ہیں کہ حارث جیسے لڑکے سے تم بیاہی گئی ہو۔“ عمارہ جیسے بیٹی کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”ہاں..... جلنا بھی چاہیے سب کو۔ سب نے ریجیکٹ کر دیا تھا اور میں نے اپنا لیا۔“ افق چڑ چڑے انداز میں بولی۔ عمارہ بیگم نے چونک کر بیٹی کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

”مجھے فنکشن میں ایسا لگ رہا تھا جیسے تمہاری بہن کچھ تبدیل ہو گئی ہے اور نہیں تو میری ویسکوٹ کی ہی برائی کر ڈالی۔“ تنزیل نے جل کر ماہ پارہ کی نقل اتاری۔

”آئے تنزیل میاں، یہ تم نے کس زمانے کی ویسکوٹ پہن لی۔ مجھے تو لگتا ہے عمارہ کے جہیز میں دی تھی اماں نے یہ تمہیں۔“

”لو بھلا بتاؤ۔ میں چوبیس سال پرانی چیز پہنوں گا۔ وہ بھی اپنی بیٹی کی شادی پر اور داماد صاحب کو

دیکھو شادی سے پہلے تو بڑھ بڑھ کر سلام کیا کرتا تھا۔ انکل، انکل کرتے منہ نہیں سوکتا تھا اس کا اور اب صوفے پر بیٹھا رہا، میں خود جا کر ملا ہوں اس سے۔“ عمارہ بیگم نے فکر اور پریشانی سے شوہر کی طرف دیکھا۔

”لگتا ہے خوش تم بھی نہیں آئی ہو وہاں سے۔“ ”ہاں نہیں مجھے ایسا کیوں لگا افق ڈسٹر ب سی ہے، خوش نہیں ہے، اوپر سے آپا کی بیٹیوں کا رویہ..... اللہ کرے سنبھال لے ان سارے حالات کو ہماری بیٹی۔“ عمارہ پُرسوج لہجے میں بولیں۔

”امی آپ ایسے ہی پریشان ہو رہی ہیں۔ وقت لگتا ہے ایڈجسٹ ہونے میں... اور ویسے بھی افق کہاں کسی سے ملتی جلتی تھی، کب کہیں آتی جاتی تھی۔ اتنی گید رنگ میں ڈسٹر ب تو ہو گئی ہی وہ۔“ عمارہ بیگم نے بیٹے کی طرف دیکھا اور گہری سانس کھینچ کر رہ گئیں۔

”دو چار روز کے بعد اسے بلا لینا یہاں..... تسلی ہو جائے گی تمہاری۔“ تنزیل نے عمارہ کی پریشانی کو سمجھتے ہوئے مشورہ دیا۔ عمارہ سر ہلا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

”تم ابھی تک سوئی نہیں۔“ حارث کمرے میں آیا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ افق ابھی تک جاگ رہی تھی۔

”نہیں، نیند نہیں آرہی تھی۔ سوچا آپ سے باتیں کروں گی۔“ افق ہلکا سا مسکرا کر بولی۔

”دیکھو بھئی مجھے تو سخت نیند آرہی ہے۔ صبح مجھے آفس بھی جانا ہوتا ہے تو آئی ایم سوری، میں تو نہیں جاگ سکتا۔ پلیز لائٹ اور ٹی وی آف کر دو۔“ حارث بستر پر لیٹتے ہوئے بولا تو افق چڑ گئی۔

”آدھی رات تک تو آپ باہر امی کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ میرے پاس آتے ہیں تو آپ کو نیند

آ جاتی ہے۔“

”امی ہیں وہ میری..... کس طرح بات کر رہی ہو تم ان کے متعلق۔“ حارث نے چونک کر افق کو دیکھا اور بولا۔

”میں امی کے متعلق کوئی بات نہیں کر رہی، بات آپ کی اور میری ہے۔ زندگی آپ کی اور میری ہے، آپ کے پاس دو منٹ نہیں مجھ سے بات کرنے کے لیے۔“

”کون سی باتیں کرنی ہیں تمہیں مجھ سے۔ یہی کہ جب ایڈمیشن اوپن ہوں گے تو میں تمہیں یونیورسٹی میں داخلہ دلوا دوں۔ کیا میں نے تم سے شادی اس لیے کی تھی کہ تمہیں سختی اور بستہ دے کر اسکول، کالج بھیجا کروں گا۔ امی گھر میں اکیلی ہوتی ہیں۔ تمہیں ان کا ذرا بھی خیال نہیں، وہ سارا کام خود کرتی ہیں۔ تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ ناشتا ہی بنا دو، ان کا نہیں تو میرا ہی بنا دو۔ دن کے بارہ ایک بجے تم سو کر اٹھتی ہو۔ دو پل نہیں تمہارے پاس امی کے لیے، امی کے پاس بیٹھنے کے لیے۔“ حارث چڑ کر بولا۔

”میں سارا دن امی کے پاس ہی تو ہوتی ہوں حارث، کون سا کوئی اتنا بڑا گھر ہے جو میں کہیں اور جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔“

”جانتا ہوں، سوائے بحث کرنے کے تمہیں کچھ نہیں آتا۔ کتنے دن ہو گئے تمہیں یہاں آئے ہوئے۔ کتنا کچن سنبھالا تم نے؟“ حارث غصے سے بولا۔

”مجھے کھانا پکانا نہیں آتا حارث، یہ بات خالہ اچھی طرح جانتی تھیں۔“

”تو کیا تم ساری عمر اسی طرح رہو گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا تمہیں کہ وہ تمہیں سکھا دیں گی۔ مگر وہ کیا یہاں کمرے میں آ کر تمہیں سکھائیں؟“

”مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ خالہ آپ سے یہ سب باتیں کہتی ہیں مجھے کیوں نہیں کہتیں۔“ افق چڑ کر

بولی۔

”اس لیے کہ تم کرنا نہیں چاہتیں..... بس اس کمرے کو، جہیز کی چند چیزوں کو اپنی ملکیت سمجھتی ہو تم، اس کے علاوہ تمہیں کچھ نہیں پتا۔ لائٹ بند کرو، میں سونا چاہتا ہوں۔“ حارث کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ افق غصے اور پریشانی سے حارث کو دیکھتی رہی پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ حارث نے غصے سے افق کو کمرے سے لکھتا دیکھا اور تکیہ زمین پر مار کر کروٹ بدل لی جیسے حارث کو افق کا یوں اس کے پاس سے چلے جانا بہت برا لگا ہو۔

☆☆☆

”میں آفس جا رہا ہوں امی۔“ ”حارث ناشتا تو کرتے جاؤ۔“ افق کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ حارث کو دیکھا اور دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے غصے سے چائے کا چولہا بند کر دیا۔ ”ابھی تک تم سے چائے نہیں بنی..... حارث بنا ناشتے کے ہی چلا گیا ہے۔“ ماہ پارہ بیگم کچن میں آ کر بولیں۔

”دیکھ لیا ہے میں نے! افق روٹھے سے لہجے میں بولی۔

”میں نے تم سے کہا تھا میرے بیٹے کو کبھی مایوس نہ کرنا۔ تم رات کو اسے اکیلا چھوڑ کر باہر ڈرائنگ روم میں آ کر سو گئیں، یہ ویلو ہے تمہاری نظر میں اس کی۔“ ماہ پارہ بیگم غصے سے بولیں۔

”امی آپ کو نہیں معلوم وہ مجھ سے جھگڑا کر رہے تھے۔ میں نے سوچا ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تب چلی جاؤں گی اور پھر میری بہنیں آنکھ لگ گئی۔“ ”شاید تم نے یہ سوچا ہو کہ وہ تمہیں منانے آئے گا، بڑی انا ہے اس میں، وہ کیونکر آتا۔“

”انا اس میں ہے تو مجھ میں بھی ہے امی، کیا ظلم ہو گیا تھا جو میں نے یہ بات کر لی کہ ایڈمیشن اسٹارٹ

ہوتے ہی میرا داخلہ کرادیجئے گا۔“

”یہ باتیں کرتی ہو تم اس سے، ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے تمہاری۔“ ماہ پارہ بیگم نے ہتھیلی اپنے ماتھے پر ماری۔

”مکرمی آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں میں شادی پر رضامند ہی اس لیے ہوئی تھی، مجھے لگا تھا حارث ویل ایجوکیٹڈ مرد ہے مجھے سمجھے گا اور آپ نے بھی وعدہ کیا تھا مجھ سے۔“

”وعدہ میں نے کیا تھا حارث نے نہیں۔۔۔۔۔ تم خواجہ اس کے گلے میں فٹ ہو رہی ہو۔ اور جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ قبل از وقت تو تمہارا یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہیں کرا سکتی میں۔ حد ہوتی ہے ہٹ دھرمی کی بھی۔“ ماہ پارہ غصے سے بولیں تو افق خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

افق کمرے میں آئی تو حارث لیٹا ہوا تھا۔ افق نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”کسی سے معافی مانگنا اپنی انا کو کوڑے مارنے کے مترادف ہے۔ دنیا میں پہلا شخص ہے حارث جس سے میں معافی مانگنے جا رہی ہوں، درپردہ میرا اپنا بھی مفاد پنہاں ہے اس جھگڑنے کے پیچھے۔ کہتے ہیں شوہر عورت کا سب کچھ ہوتا ہے لیکن عورت کیا ہے مرد کے لیے یہ میں نہیں جان پائی۔ آج حارث سے معافی مانگ کر میں جان لوں گی میں کیا ہوں حارث کے لیے۔“

”آئی ایم سوری حارث۔۔۔۔۔ کل رات میں نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک نہیں کیا۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔“ افق حارث کے نزدیک آ کر بولی۔ حارث نے ناراضی سے افق کی طرف دیکھا۔

”وقت لگتا ہے ایک دوسرے کو سمجھنے میں۔ آپ کو مجھے اور مجھے آپ کو سمجھنے میں وقت تو لگے گا۔ بس میں یہی چاہتی ہوں حارث پہلے ہم دونوں ایک

دوسرے کو جان لیں، سمجھ لیں۔ پھر سارے تعلق بنالیں گے۔“ افق حارث کے نزدیک بیٹھ کر بولی۔

”شادی ازودواجی خوشی کا نام ہے اور میاں بیوی کو ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ ساتھ رہتے رہتے وہ ایک دوسرے کو سمجھ ہی لیتے ہیں، جان ہی لیتے ہیں۔ یہ بھلا کیا لاجک ہے کہ پہلے ایک دوسرے کو سمجھیں گے پھر تعلق بنائیں گے۔“ حارث طنزیہ انداز میں بولا۔ ”افق بیگم یہ سب باتیں رومانوی ناولوں میں تو اچھی لگتی ہیں لیکن ریکل لائف سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عورت ہوتی ہی اسی لیے ہے کہ وہ ہر دم مرد کی پذیرائی کرے۔“

”اور عورت۔۔۔۔۔ عورت کا کوئی دل نہیں ہوتا، کوئی احساسات نہیں ہوتے اس کے۔ بس وہ مرد کی پذیرائی کے لیے ہی بنی ہے۔“ افق چڑ کر بولی۔

”کہنا کیا چاہتی ہو تم؟“ حارث غصے سے بولا۔

”مجھے آگے پڑھنا ہے حارث، میں نہیں چاہتی میں کسی جھنجٹ کو پالوں۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا آپ۔۔۔۔۔ میں فی الحال بچہ نہیں چاہتی، اپنا خواب پورا کرنا چاہتی ہوں۔ ایم بی اے کرنا چاہتی ہوں میں۔ بزنس ایسپلائز بننا چاہتی ہوں، میں آپ کی پذیرائی نہیں کر سکتی حارث۔“ افق نرمی سے بولی تو حارث نے غصے سے افق کو دیکھا اور تکیہ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم نے۔۔۔۔۔ کیوں حارث کی ناک میں دم کر دیا ہے تم نے، آدمی رات کو میرا بچہ کمرے سے باہر جا کر سو رہا ہے آخر چاہتی کیا ہو تم؟“

”ایسی کون سی قیامت آگئی ای، ذرا سی بات نہیں سن سکتے حارث میری، آخر بیوی ہوں میں ان

ہو جائیں گی۔“

”بی بی دیکھو مجھے عمارہ مت سمجھ لینا۔ میں تو تمہارے اٹنے ہاتھ کا ایک لگاؤں گی۔ زبان بند کرو اپنی اور اپنے کام سے کام رکھو۔۔۔۔۔“ ماہ پارہ غصے سے کمرے سے نکلتی تو افق حیران پریشان سی کیفیت میں دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

”شاید میرا ہی طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے بدلنا چاہیے خود کو۔ خالہ اگر خد میں آگئیں تو کچھ بھی نہیں منواسکوں گی ان سے۔ میں ساری کشتیاں جلا کر آئی ہوں۔ مجھے یہیں رہنا ہے، حارث کے ساتھ ہی بے رہنا ہے۔ مجھے بدلنا ہوگا خود کو۔۔۔۔۔ چاہے اپنے مفاد کے لیے ہی سہی، مجھے بدلنا پڑے گا۔“

☆☆☆

افق نے ماہ پارہ بیگم کے کپڑے استری کیے پھر لے جا کر ماہ پارہ بیگم کو دیے۔

”میں نے تم سے کب کہا تھا مجھے کپڑے پر پس کر کے دو۔“ ماہ پارہ نے ناراضی سے افق کو دیکھ کر کہا۔

”آپ نہانے جا رہی تھیں ای، میں نے سوچا آپ کے کپڑے پر پس کر دوں۔“

”بہت شکریہ تمہارا۔۔۔۔۔ یہ خد میں تم اپنے میاں کی کرو۔ مجھے اپنے کام کرنے کی خود عادت ہے۔“ ماہ پارہ خشک سے لہجے میں بولیں پھر حارث کو آواز دی۔

”حارث، حارث بیٹا۔۔۔۔۔ کھانا کھاؤ آ کر۔۔۔۔۔

میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم صبح بھی بنانا شتے کے چلے گئے تھے۔“ حارث کمرے سے باہر آیا اور دونوں ماں بیٹا کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ افق کو محسوس ہوا جیسے وہ دونوں ماں بیٹا کے بیچ کوئی قاتلوسی چھ رہے، وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”بہت بڑی بھول ہو گئی مجھ سے، مجھے معاف کر دو حارث بیٹا۔“ کھانا کھاتے ہوئے ماہ پارہ نے

کی۔“ افق غصے اور ناراضی سے ماہ پارہ کو دیکھ کر بولی۔

”جانتی ہوں، بیوی ہی بنا کر لائی ہوں میں تمہیں اس کی، اس کا باپ نہیں جو تم ہر وقت اس سے باز پرس کرو۔ اسے حکم جاری کرو۔ کیا کرتا ہے، کب کرتا ہے، یہ طے کر دو تم اس کے لیے۔ جانتی ہوں میں تم اس سے تین برس بڑی ہو لیکن رتبے میں عزت میں ہر لحاظ سے وہ تم سے بڑا ہے۔“

”آپ طعنے دے رہی ہیں مجھے؟“

”تو کیا دوں۔۔۔۔۔ لعنت۔ ارے، میاں گھر میں تھکا ہارا آتا ہے، بیوی اس کی دلجوئی کرے، اس کے تازہ خرے اٹھائے، اس کے کھانے پینے کا خیال رکھے۔ یہ کرنے کے بجائے نہ جانے تم کیا کیا باتیں لے کر بیٹھ جاتی ہو اس کے ساتھ۔ چند ہی دن میں زندگی اجیرن کر دی تم نے اس کی۔“

”آپ کو اس کی خوشی کی پروا ہے اور میرا کوئی احساس نہیں، کیا کہہ کر لائی تھیں آپ مجھے کہ آپ مجھے پڑھائیں گی۔ اگلے ہفتے ایڈمیشن شروع ہو رہے ہیں، مجھے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہے۔ میں نہیں چاہتی قبل از وقت بچے پیدا کر دوں۔ سن لیا آپ نے۔“

”شرم کرو، چند دن تمہاری شادی کو ہوئے ہیں اور تم یہ باتیں کر رہی ہو تو اس لیے میرا بیٹا پہلے دن سے خوش نہیں ہے تم سے۔ یہ پابندی لگا رکھی ہے تم نے اس معصوم پر اور اسے تو دیکھو مجھے بتایا تک نہیں۔

ارے میں تو پوتے کھلانے کی خواہش میں دنوں میں تمہیں پیادہ کر لائی تھی، یہاں تو یہ پابندیاں لگ رہی ہیں۔ میں کیا کروں گی تم طباق جیسی لڑکی کا جب تم میرے بیٹے کی خوشی کو ہی پورا نہیں کر سکتیں۔“ ماہ پارہ بیگم حیرانی اور غصے سے بولیں۔

”خالہ پلیز جذباتی باتیں مت کریں۔ تھوڑے مہرے کی تو بات ہے پھر آپ کی ساری خواہشیں پوری

حادث کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے غزدہ سا چہرہ بنا کر کہا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں امی، آپ میرے لیے کبھی برا سوچ ہی نہیں سکتیں۔ آپ افق کو سمجھائیں بیکار کی ضدیں چھوڑ کر اپنا گھر صحیح معنوں میں بسانے کی کوشش کرے۔ اگر وہ مجھے خوش رکھتی ہے آپ کو خوش رکھتی ہے تو مجھے بھلا کیوں شکایت ہوگی اس سے۔“ حادث کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔

”لیکن اسے تو سب سے زیادہ اپنی خوشی کا احساس ہے۔“ ماہ پارہ بیگم چڑ کر بولیں۔

”دیکھیں امی وہ جو یہ ضدیں کر رہی ہے کہ وہ آگے پڑھنا چاہتی ہے اس کے دماغ سے اس بات کو بالکل مٹا دیں، میں اسے ہرگز بھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن کی اجازت نہیں دوں گا۔“

”ہاں تو میں کب ایسا چاہتی ہوں اور ویسے بھی شادی کے بعد لڑکیوں کا کیا پڑھنا۔“

”شادی سے پہلے پڑھ کر لڑکیاں کون سا تیر مار لیتی ہیں۔“ حادث طنزیہ انداز میں بولا۔ افق نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے حادث کے الفاظ سنے۔ ماہ پارہ نے افق کو دیکھا تو حادث کو اشاریہ چپ کر دیا۔ افق کے چہرے پر الجھن اور پریشانی سی تھی۔

حادث کھانا کھا کر کمرے میں آیا تو افق نے حادث کے کپڑے نکال کر دیے۔

”عورت کو مرد کے دل میں جگہ بنانے کے لیے یا تو ساری عمر لگ جاتی ہے یا وہ ایک رات میں ہی اس کے دل پر قبضہ کر لیتی ہے۔ تم نے پہلی رات سے ہی مجھے بے حد مایوس کیا ہے۔ نہ صرف مجھے بلکہ امی کو بھی۔ معمولی سی شکل صورت کی لڑکی ہو تم اور خیرے ایسے دکھاتی ہو جیسے کہیں کی مہارانی ہو۔“ حادث نے افق کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے کہا اور داش روم میں چلا گیا۔

”میں افق تنزیل جس نے کسی کی بات برداشت نہیں کی۔ آج یہ وقت آگیا، میں ان لوگوں کے طعنے سہہ رہی ہوں لیکن خیر زندگی give and take کا ہی نام ہے۔ میں ان لوگوں کے لیے کچھ کروں گی تو یہ لوگ میرے لیے کچھ کریں گے نا۔“ افق جیسے خود پر ہنس۔

افق کی سوچ کیا بدلی حادث کی زندگی کے حالات ہی بدل گئے۔ ایک ہفتہ بڑی خوش اسلوبی سے گزرا۔ گو افق گھر کے کام کاج میں طاق نہیں تھی لیکن ماہ پارہ بیگم کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ ماہ پارہ کو بھی آرام کا موقع مل گیا۔ اگلے ہفتے ہی عمارہ اور عمار، افق کو لینے کے لیے آگئے۔ افق پہلے کی نسبت اور بھی کمزور لگ رہی تھی۔ عمارہ نے افق کو دیکھا تو مایوسی ہوئی۔ نہ ہاتھوں میں چوڑیاں نہ کانوں میں آویزے، افق سر جھاڑ منہ پہاڑ گھر کے کاموں میں مصروف تھی۔ ماہ پارہ بستر پر بیٹھی رہیں اور افق کو کام کے بارے میں بتاتی رہیں۔ عمارہ بیگم کے آنے پر ماہ پارہ نے سب سے پہلے یہی شوشہ چھوڑا۔

”بھئی عمارہ بہت ہی سست ہے افق، ایک کام کرنے لگتی ہے تو دن اسی میں گزار دیتی ہے۔ اب مای نہیں آئی تھی میرے دو جوڑے تھے اور دو شریں اور دو سوٹ حادث کے تھے۔ میں نے افق کو مشین لگانے کا کہہ دیا۔ پورا دن لگا دیا اس نے اسی ذرا سے کام میں۔ نہ ہانڈی نہ روٹی۔“

”آپا کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، میں باہر سے آئی ہوں، باہر صحن میں تو بستروں کی چادریں، پردے، وغیرہ بھی سوکھ رہے ہیں۔“ عمارہ بیگم ہنستے ہوئے بولیں۔

”لو اپنے کمرے کے دھوئے ہوں گے اس نے۔ میری چادریں تو پچھلے ہفتے ہی ملازمہ دھو کر گنی ہے۔“

”ہاں، ہاں تو میں کیا کہہ رہی ہوں۔ بس یہی کہ کام تو کام ہی ہوتا ہے چاہے اپنے کمرے کا ہوا گھر کا۔ مجھے تو یہ خوشی ہوئی ہے کہ افق سب کچھ کرنے لگی ہے۔ ورنہ آپ نے دیکھا ہی تھا گھر میں کرتی ہی کیا تھی۔ یہاں تک کہ اپنے تن کے کپڑے بھی نہیں دھوتی تھی اور یہاں پورا آنگن بھر رکھا ہے کپڑوں سے۔“ ماہ پارہ بیگم کو عمارہ کا انداز بہت برا لگا۔

”کام کرنے کی عادت نہیں تھی اسے تو تم ایسا کرتیں ملازمہ اس کے ساتھ بھیج دیتیں تاکہ یہ دن رات آرام کرتی رہتی اور ملازمہ کام۔“ ماہ پارہ چمک کر بولیں۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپا آپ..... میرے کہنے کا مقصد یہ تھوڑی تھا۔“

”تمہارے کہنے کا مقصد کچھ بھی تھا۔ عمارہ دیکھو، بیٹیوں کی ماؤں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔ مجھے پتا ہے میں کیسے تمہاری بیٹی کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”راہ راست..... کیا مطلب آپا، خدا نخواستہ میری بیٹی غلط راستے پر تو نہیں تھی۔“

”تو کون سے صحیح راستے پر تھی تمہاری بیٹی، ایک وقت کا سجدہ نہیں کرتے دیکھا میں نے اسے آج تک۔ نہ جانے نماز بھی صحیح طرح سے آتی ہے اسے یا نہیں۔“

”بے شک میری بیٹی شرعی صوم صلوٰۃ کی پابند نہیں ہے آپا لیکن ایسی بھی نہیں کہ نماز ہی نہیں آتی ہو اسے۔ الحمد للہ قرآن پاک بھی بہت چھوٹی عمر میں پڑھ لیا تھا اس نے۔“

”پڑھا ہوگا، میں نے تو نہیں دیکھا کبھی اسے قرآن کھول کر پڑھتے ہوئے۔ ماں باپ بیٹیوں کو قرآن پاک صرف جہیز میں اس لیے دیتے ہیں کہ اس کے سائے میں اپنی بیٹی کو گزاریں اور بس۔ میرا

ماہنامہ سنی فاؤنڈیشن



مئی 2012ء کی کتاب
نئے شمار کی کتاب
سنی فاؤنڈیشن

ایک وسنگ

پروہ سیمین تھسرتی، مگلی اور رنگ کھیرتی پستیوں کے پیچھے کا خوف و ہشت سین پچی سلاشبد کی ایونگ داستان

مغرب کے نرالی انداز

مغربی دنیا کی تہذیب و تمدن کی عکاس اور عورت کی پروردہ ناقلہ فریوش کبانی

مگر طالب

پروہ چاہت کل کے ایک منزل کی جانب گزرنے لگا قلداری کی سلسلے دار کہانی

الکاح

طاہر جلوبند مغل کے جلوبند کی ایک جھلک، نند و لان لاہور کے سنگ

سرورق کی کھائیاں

حزبات احساسات میں پھیل چکے والی مڑو کی سنسی خیر کہانیاں جو لوہور آپ کو حصار سینیں کریں گی

چلی
نکھ
چلی

آپ کے تھرے...
مشورے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتنا کتنا

حارث پانچ وقت نماز کا پابند ہے۔ باقاعدگی سے صبح گھر میں قرآن بھی پڑھتا ہے اور یہ پڑی سوتی رہتی ہے۔“ عمارہ صبر کا گھونٹ بھر کر رہ گئیں۔

☆☆☆

”کیا ضرورت ہے آپ کو خالہ سے اتنی بحث کرنے کی۔“

”وہ تمہاری برائیاں کر رہی تھیں افق، ناجائز تم میں جو کوتاہی ہے میں مانتی ہوں لیکن پہلے دن سے ہی میں دیکھ رہی ہوں آپا اور ان کی بیٹیاں تمہاری برائی کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔“

”چھوڑیں ای، اب مجھے اسی گھر میں رہنا ہے اور ویسے بھی برائیاں سننے کی تو میری پرانی عادت ہے۔“

”پاگل مت بنو افق، اس طرح تو وہ تم پر حاوی ہوتے چلے جائیں گے۔ کیا کی ہے تمہاری شکل میں، اچھی بھاری تو ہو تم لیکن ویسے والے روز آپا نے خالہ بھابی سے کہا میں تو ترس کھا کر بیاہ کر لائی ہوں اسے، بے چاری سے کون شادی کرتا۔“

”آپ کو کس نے بتایا؟“ افق حیرانی سے عمارہ کو دیکھتی رہی پھر غصے سے بولی۔

”خود خالہ بھابی نے اور نہ جانے کیا کیا بتا رہی تھیں وہ..... اتنا مایوس ہو کر گئے ہیں ہم لوگ تمہارے ویسے سے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ کسی نے ہماری آؤ بھگت نہیں کی۔ آپا کی بیٹیوں نے منہ کا بول تک نہیں دیا۔“

”بد قسمتی سے یہی شکایتیں ان لوگوں کو آپ سے بھی ہیں۔“ افق طنز پر بولی۔

”کیا کسر چھوڑی ہے میں نے تمہاری شادی میں، تمہی بتاؤ مجھے۔ سبھی کچھ کیا..... اگر ان کی ناک کے نیچے نہیں آیا تو کیا کروں میں..... آدھے بول پر میں نے بیٹی آپا کی جھولی میں ڈال دی اور اب یہ صلہ دے رہی ہیں وہ مجھے۔“

”دیکھیں امی، اب مجھے اسی گھر میں بسنا ہے، وہیں رہنا ہے، اس لیے اچھا ہے کہ آپ ان کی باتوں کا ٹوٹ نہ لیں۔“

”مکرا فاق وہ لوگ تمہاری برائیاں ہر جگہ کر رہے ہیں، تمہیں معلوم نہیں، سب سے زیادہ حسنین بھائی کے گھر میں تمہاری ساری داستان پہنچی ہوئی ہے۔ اسی لیے تو لے کر آئی ہوں تمہیں تاکہ تم سے معلوم ہو کہ آخر معاملات کیا ہیں۔“

”دیکھیں ای آپ کو ہو گا اپنے بھائی بھادج کی باتوں پر یقین، مجھے تو قطعاً نہیں..... اور کیسے وہ لوگ اب خالہ سے رشتہ بنا رہے ہیں۔ خالہ تو خود ان کی اتنی برائیاں کرتی ہیں۔ عینا میں سو کیزے نکالتی ہیں۔“

”بات سنو افق، عینا اب ماموں ممانی کی ہی عزت نہیں ہماری بھی عزت ہے، کوئی حق نہیں پہنچتا کسی کو عینا کے متعلق کوئی بھی بات کرنے کا، میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔“ عمارہ جو قریب بیٹھا ساری باتیں سن رہا تھا درمیان میں بولا۔

”کیا تم لوگ فضول باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو، افق اتنے دن میں آئی ہے، کوئی اچھی بات کرو۔ یہ بتاؤ افق کتنے دن ٹھہرو گی یہاں؟“ لہیا درمیان میں بولی۔

”کتنے دن کیا مطلب..... یہی ایک دو دن میں چلی جاؤں گی۔ ایڈمیشن اسٹارٹ ہو رہے ہیں، مجھے داخلہ لینا ہے۔“ افق سنجیدگی سے بولی۔

”بڑی بچی ہو افق۔ جو تم نے خواب دیکھے تھے سب پورے ہونے والے ہیں۔“ لہیا حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”مجھے نہیں لگتا کہ آپا یا ان کا بیٹا میری بیٹی کی یہ خواہش پوری کریں گے، اگر افق کو یقین ہے تو خدا کرے اس کا مان قائم رہے۔“ عمارہ نیگم نے سوچا۔ (باقی آئندہ)



جدت تراش

نگہت یاسین

تھی اور اسی حیرت نے ان کی زبان گنگ کر دی تھی۔ ”شکر ہے کسی نے سنا نہیں ورنہ اب تک تو شارق کی درگت بن چکی ہوتی۔“ پانی کا گلاس رکھتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

”کیا..... کف..... کف“ سدرہ کو تو نوالہ منہ میں ڈالتے ہی اُچھو لگا، کھانٹے کھانٹے سرخ پڑ گئیں مگر تکلیف سے زیادہ تو وہ ناقابل یقین صورت حال سے دو چار تھیں۔ ان کی آنکھوں میں حیرت موجزن

”غضب خدا کا..... کس قدر مزے سے بہن کے لیے کف..... کف۔“ وہ پھر انگ گئیں۔ لفظ ہی ایسا تھا کہ زبان لڑکھڑاتی تھی۔ ”وہ بھی زندہ سلامت، جوان جہان بہن کے لیے۔ کہیں میرے کانوں کو دھوکا تو نہیں ہوا؟“ سدرہ نے دونوں کانوں کو باری باری جھٹکا۔

”مگر وضاحت کس سے طلب کروں؟ ساس، تندوں اور ان کے بچوں کے بارے میں اس قسم کی تشبیہات کا استعمال بہوؤں کی زندگی کے لیے سم قاتل سے کم نہیں ہوتا۔“ ندانے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ”ارے بھی کل یہیں سے کالج چلی جاتی تھی برائے سیلاب زدگان میں ہاتھ بٹانے..... سامنے ہی ہینگر میں تولیہ لٹکا تھا۔ اب میں روز ایک ہی کپڑے پہننے سے رہی۔ شاید کوئی چینل والے چکر لائیں۔“

”ہوں تو یہ کہو ناں! خدمت کی آڑ میں خود نمائی کا سنہرا موقع ہاتھ آیا ہے۔“ شارق نے چھیڑا۔ ”اور وہ بھی کفن پہن کر۔“

سدرہ کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا مگر وہ اب بھی نہ کچھ کہہ سکتی تھیں، نہ پوچھ سکتی تھیں۔ بس ایک حق سماعت تفویض ہوا تھا بحیثیت بہو کے مگر شارق کی دیدہ دلیری سے زیادہ اپنی تھجلی تند شیریں پر حیرت ہو رہی تھی جو سامنے بالکل لا تعلق سی بیٹھی تھیں۔ شاید اپنے گھر میں بارش کے پانی سے ہونے والے نقصانات کا سوچ کر آرزو تھیں کہ اچانک ان کی نگاہ بھائی سدرہ پر پڑ گئی۔ جو ہٹکا بٹکا کبھی شارق اور کبھی ندا کو دیکھتیں۔ ان کی صورت دیکھ کر ہنسی کا فوارہ ان کے منہ سے پھوٹ پڑا۔

”ارے بھابی! میری بھولی بھالی بھابی..... یہ جدید فیشن کے کپڑے کا نام ہے۔“

”یعنی کاف..... ف..... ن.....“ اب بھی سدرہ کے لبوں سے جدیدیت کے شاہکار لباس کا نام

یکمشت ادا نہ ہو سکا۔

”اوہو! کف..... کان مای.....“ طوبی بھی بحث میں کود پڑی۔

”ویسے کچھ کچھ ملتا جلتا ہے۔ نام کے علاوہ اشاکل میں بھی..... بس چھ گز یا زائد کپڑے میں سرکا سوراخ کر کے دونوں طرف برائے نام سلائی کر دی جاتی ہے۔“ مای کے چہرے پر الجھن کے آثار بدستور موجود پا کر اس نے مزید وضاحت کی۔

”لیکن شاید کفن زیادہ اسماٹ ہوتا ہے۔“ شرارت بھرے لہجے میں شارق کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ شارق نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اماں جان کی قہرناک ڈانٹ نے سر جھکا کر مسکرانے کا موقع فراہم کر دیا۔

”آگ لگے ایسے فیشن کو..... اور کوئی نام نہ ملا۔ پہناوے تو ہمارے ہیں جن کے ناموں سے عالی شان تہذیب کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ غرارہ.....“ ”طلق اور جڑوں کے لیے بہترین ورزش..... غرغر.....“ شارق کے منہ سے ابھرتی آواز نانی کے گھورنے پر مدہم ہوتی چلی گئی۔

”شرارہ.....“ ”سلٹی ستارہ..... دریا کا کنارہ.....“ اب کے طوبی نے جملہ اچک کر قافیے جوڑ دیے۔

”آڑا پا جامہ.....“ ”نام ہی کافی ہے۔“

”چوڑی دار..... گریہ شلوار۔“ ”سلائی تھوڑی ہوتی..... کلیاں تنے

میں جڑتیں..... گویا آرائش باغ کے مشابہ شغل، آہ مغلیہ سلطنت اجڑے صدیاں بیت گئیں مگر مرثیہ خوانی آج تک ہو رہی ہے۔“ شارق نے پھر چوٹ کی۔

”گویا انگریز ہم پر آج بھی حملہ کر رہے ہیں، ہمیں پہننا اوڑھنا سکھارہے ہیں۔“

و ماسک، تاکہ کشتے میں لالہ ملک بھر میں

جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ

ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

ماہی شریا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں، ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

ممبرانوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

دبئی: (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 111، پکیشنز وٹنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فکس: 35802551

کانچ سنی لڑکی

انجم انصار

اور

ہر لڑکی خوب صورت ہوتی ہے
ہر لڑکی نازک ہوتی ہے
ہر لڑکی کانچ سنی ہوتی ہے
ہر لڑکی حساس ہوتی ہے

دوسروں کی بیٹیوں کے لیے نہیں؟



جب اس نے ان تصویروں کو بغور دیکھا تو اسے سب یاد آ گیا۔ ریسٹوران کا ماحول تھا اور اس کی شرٹ وہی تھی جو نرسین بیگم نے بلیں لگا کر سی کر دی تھی۔ اس کے ساتھ تو نواز بیٹھا تھا مگر ہر تصویر میں

نہاں کی حالت بے حد تشویشناک تھی۔ جب اس کی سہیلیوں نے موبائل پر اس کی تصویریں اس کو بھیجیں تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ یہ تصویریں کس کی ہیں اور اس کو کیوں بھیجی گئی ہیں۔

ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء — 143

لیے ہاتھ اٹھائیں۔“ شارق نے ہاتھ چہرے پر پھیرے۔ ندانے چٹکی بجاتے لقمہ دیا۔

”نانی اماں، یہ فراکیں غالباً نجی تانا نے اپنی بیگم کے لیے منگوائی ہیں۔ فیشن میں جو ہیں۔“

”ارے تو اس عمر میں فراکیں پہنیں گی۔ مانا کہ لڑکے ہیں مگر شوق اور ارمان کی بھی تو کوئی عمر ہوتی ہے۔ بہویں لے آئیں فراکیں ان پر بھیں گی۔“ شیریں نے چچی کی غائبانہ خبر لے ڈالی۔

”سب کا یہی حال ہے، سامنے والے بیگ صاحب کی بیگم اور بیٹی دونوں نے صبح کا آغاز ایوننگ گاؤن میں سبزی لے کر کیا ہے۔“ طوبی ہنسی کے مارے دوہری ہو گئی اور اماں تو خواجواہ تمللا گئیں۔

”اماں بیٹی کی شادی تو نہیں ہوئی؟“ شیریں نے ٹھنک کر پوچھا۔

”تو جناب کپڑوں کا شادی سے کیا تعلق؟“ طوبی نے ہاتھ نہچایا۔

”جی ہاں، ہماری 8 سے 80 سالہ صنفِ نازک فخر سے ہالی ووڈ کی اداکارہ کی تقلید کر رہی ہے جو اس نے اپنی مخصوص حالت کے باعث پہنا تھا۔ میسرنٹی گاؤن۔“ ندانے مسکرا کر وضاحت کی۔

”ہالی ووڈ کی تقلید! چچ چچ.....“ شارق نے رخسار پیٹتے ہوئے کہا۔ ”لباس کے نام پر کیا، کیا پہنا جا رہا ہے۔“

سدرہ، شیریں، اماں، ندا اور طوبی کی نظریں آپس میں ملیں اور ایک ہی خیال ذہن سے ٹکرایا۔

”آخر ہم پہنیں تو کیا.....؟“ اور جواب کی تلاش میں نظریں جھک گئیں۔



انگلیاں فکار ہو جاتی ہیں۔ سلائی تو دگنی خود بخود ہو جاتی ہے۔ کپڑا بے شک آپ کا ہے جتنا ضائع کریں، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔“

”خیر ان کے طرز سہتے اور پیسوں کی چوٹ سہلاتے باہر آئے تو ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ باتیں تو ان کی غلط نہ تھیں۔“

”اے ہے مومے درزیوں کے دماغ تو ہمیشہ ساتویں آسمان پر رہے ہیں۔ جدی پشتی پیشہ لپیٹ کر کریں گے کیا؟ مہمند اتنا کہ ہم جو نہ سیں تو لوگ پتے ہی باندھے پھریں۔“ اماں نے خیال آرائی کی۔

”اماں، لوگ نہیں صرف ”عورتیں۔“ شارق نے صبح کی۔

”لڑکے ہٹ، شوخی نہ کر۔ سیما (ند) بتا رہی تھی کہ لندن سے نجی بھیا (دیور) کا کمپیوٹر پر پیغام آیا ہے کہ آدمی درجن فراکیں سلوا کر بھجوا دو۔“

”ارے بھی نجی چچا کے تینوں لڑکے ہیں..... کب کے جوان ہوئے تو کیا اب بیٹی ہوئی ہے؟ ذرا پتا تو کر۔“ شیریں مارے استعجاب کے گچھ ہی پڑیں۔

اماں کی تشویش نما اطلاع کسی کو کب بیٹھنے دیتی، انہوں نے ندا اور طوبی کو ہلا ڈالا مگر کمپیوٹر پر mail چیک کرنا بجلی کے آنے سے مشروط تھا لہذا خیال کے گھوڑے ہر سمت دوڑ رہے تھے۔

”یہاں کون سا درزی بچوں کی فراک سیجے گا؟ عورتیں تو کب کی سوئی دھاگے سے فارغ، شیزیں تک سلوائی ہیں۔ ذرا، فریئر روڈ والے آزاد ٹیلر کو فون ملا کر پوچھ لے۔“

”افوہ، اماں وہ آزاد ٹیلر جس نے آپ کے ساتھ v.s bombay میں ہجرت کا سفر کیا تھا۔ اس دنیا سے کب کا آزاد ہو چکا ہے۔ فاتحہ کے

فون ملا کر پوچھ لے۔“

142 — ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء

نئے لڑکے کا چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نواز نے یہ تصویریں بنوائی تھیں اور یہ سارا ٹیم اسے بے عزت کرنے کے لیے کھیلا گیا تھا۔

”ای..... یہ تصویریں دیکھیں کس نے بنوا کر مجھے بھیجی ہیں؟“ وہ اپنا موبائل لے کر بھاگتے ہوئے ماں کے پاس آئی اور انہیں موبائل تھا کرو ہیں چکر کر گر پڑی۔ اس وقت بھی وہ آئی سی یو میں تھی اسے کسی صورت ہوش ہی نہیں آ رہا تھا۔

نسرین بیگم اور ریاض احمد اسپتال کی راہداری میں کھڑے تھے اور اس کی زندگی کے لیے دعا گو تھے۔ ریاض صاحب کی بہن اپنے دوسرے بھائیوں سے راز درانہ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”اللہ نہاں کا پردہ ڈھک لے تو کتنا اچھا ہو، ہمارے بھائی ریاض کو بھی صبر کے ساتھ ساتھ سکون بھی مل جائے گا۔ اس لڑکی کی وجہ سے ان کو بے حد بے عزتی اٹھانا پڑی ہے۔“

”آپا ہمیں کیا..... جب وہ ہماری بات سمجھتے ہی نہیں ہیں تو کیا کریں..... ان کو تو ان کے حال ہی پر چھوڑ دیں۔ آج کل اپنی اولاد سے کوئی دکھ یا تکلیف ملتی ہے تو اس کے والدین اپنی سگی اولاد کو عاقبت تک کر دیا کرتے ہیں اور یہ جھوٹے سے لی ہوئی لڑکی کو ابھی تک نگلے لگائے ہوئے ہیں جبکہ وہ کانٹوں بھر ہار بنی ہوئی ہے۔“

نسرین بیگم اور ریاض احمد اپنی بیٹی کی صحت اور زندگی کے لیے دعا گو تھے اور انہیں ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ ان کے عزیز واقارب کیا کہہ رہے ہیں اور کیا محسوس کر رہے ہیں۔ ان کا تو رواں رواں نہاں کے لیے دعا گو تھا جو ایک سٹریم ڈپریشن کے تحت بے ہوش ہو گئی تھی۔ پھر وہ ہوش میں آئی۔

”کاش میں مر گئی ہوتی..... میری وجہ سے آپ کو یہ دن تو نہ دیکھنے پڑتے۔“ ماں باپ کی متورم آنکھوں

اور کچکپاتے ہونٹوں کو دیکھا اور شرمندہ ہو کر کہا۔

”نہاں بیٹا ہمارے لیے تم سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں ہے اور تم ہی ہمارے لیے زندگی کی علامت ہو اور چاند پر تھو کے سے کوئی تھوک چاند پر نہیں آیا کرتا۔ جس نے تمہیں اور ہمیں یہ دکھ دیے ہیں وہ ضرور دکھی ہو گا اور یہ سب ہم بھی دیکھیں گے کہ بددعا کبھی رانگاں نہیں جاتی۔ اگر دعا قبول ہوتی ہے اور اس کے طفیل خوشیاں ملتی ہیں تو بددعا کس بھی قبول ہوتی ہیں اور ہماری بددعا اسے ضرور لگے گی جس نے ہماری ہنستی بستی زندگی میں زہر گھولا ہے۔ اللہ اسے کبھی سکھ اور چین سے نہیں رہنے دے گا۔“

”آمین ثم آمین۔“ نہاں نے دھیمے سے کہا اور اس کے آنسو اس کے رخساروں پر پھیل گئے۔

☆☆☆

”ہاتھ اٹھا اٹھا کر صبح شام ریاض بھائی اور بھابی بددعا کیں دے رہے ہیں جیسے بہت بڑے بابا ہوں۔“ ریاض صاحب کی بڑی بھانج اپنے میکے میں آ کر یہ ساری روداد ہنس ہنس کر سنار ہی تھیں جیسے کوئی فلمی کہانی ہو۔

”ارے اب زبان میں تاثیر ہی کہاں رہ گئی ہے ہماری تو دعائیں پوری نہیں ہوتیں تمہارے جیٹھ کی بددعا کیں کیسے پوری ہو جائیں گی۔“ ان کی اماں نے ہنس کر بیٹی سے کہا۔

”پتا نہیں کیا بات ہے، کیا کہانی ہے، اب وہ کوئی اصل بات تھوڑی ناں ہمیں بتائیں گے۔ ان کی بیٹی کے کروتوت دیکھ کر خود ان کا ہونے والا داماد بھاگ گیا ہے مگر کہہ رہے ہیں کہ وہ بھی ان کے دشمنوں سے ملا ہوا تھا۔ اپنے دشمن کا نام تک تو جانتے نہیں اور نہ ہی اس کی کبھی شکل دیکھی ہے بس جو منہ میں آ رہا ہے بکے چلے جا رہے ہیں جیسے کہ سامنے والا ان کی باتوں کا فوراً یقین کر لے گا۔“ بھانج کی ہنسی ہی کسی طرح

گئے میں نہیں آ رہی تھی۔

”عائیکہ اپنے جیٹھ سے محتاط ہو کر ملو اور تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے اپنی بیٹی کو لے کر نہاں کے اس جانے کی۔“ ماں نے رازداری سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں امی..... میں اچھی طرح ہانتی ہوں کہ مجھے ان سے ایک فاصلے سے رہنا چاہیے۔“

☆☆☆

اور پھر واقعی رب نے ان کی سن لی۔ دانش کلب سے گھر کی طرف آ رہا تھا ٹریفک بھی سڑک پر زیادہ تیز نہیں تھا۔ سی این جی کی ہڑتال کے باعث مصروف شاہراہوں پر ہلکا ٹریفک تھا۔ دانش مین شاہراہ سے بائیں جانب سڑک پر مڑنے والا ہی تھا کہ سامنے سے آنے والا ٹرک اسپید بریکر پر تیزی سے اچھلا اور اس پر رکھی ہوئی ہیوی مشینری میں سے کچھ چیزیں دانش کی گاڑی پر ایسے آ کر گریں کہ ساعتوں میں وہ قیمتی اور ٹوب صورت گاڑی پچک کر رہ گئی۔

دیکھنے والے حیران تھے کہ یہ ہوا کیا ہے یوں لگ رہا تھا جیسے ملک الموت نے اچھل کر دانش کی ہان لے لی ہو۔ گاڑی کاٹ کر دانش کی مسخ شدہ باڈی نکالی گئی تو سرفراز ہاؤس میں ایک کھرام ساچ گیا۔

”میری بیٹا..... اکیلی تھی ناں وہ ڈر رہی تھی اس لیے اپنے لاڈلے بھیا کو اپنے پاس بلا لیا۔“ وہ یہ بات تعزیت کرنے والوں کو ایسی رازداری سے بتا رہے تھے جیسے ان کو ہی یہ راز معلوم ہو۔

جوان موت کا سن کر سب کو ہی دکھ ہو رہا تھا مگر سرفراز احمد کا شیطانی دماغ ابھی بھی نہاں کی تصویریں کالج کی ایک ایک لڑکی کے گھر پہنچانے کی سعی کر رہا تھا۔ اپنے بیٹے کے سوئم والے دن بھی وہ اپنے نیجر سے پوچھ رہے تھے۔

”کالج کے کلرک سے تمام طالبات کے

ایڈریس مل گئے تھے ناں۔“

نیجر نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے انہیں حیرت سے دیکھا جو ان بیٹے کی موت نے کہیں انہیں بالکل ہی پاگل تو نہیں کر دیا۔

”صرف نہاں کے خاندان کی وجہ سے میرے دو بچے موت کے منہ میں جا چکے ہیں۔ وہ قاتل ہیں میرے بچوں کے..... انہیں سزا تو ملنی چاہیے ناں۔“ سرفراز صاحب کے لہجے میں یقین رچا ہوا تھا اور نیجر ان کی ہر بات کے جواب میں اپنا سر ہلا رہا تھا۔

☆☆☆

ریحانہ شاہ کا گھر اسی گلی میں تھا جس میں ریحان کا مکان تھا ڈاکے نے اس کا لفافہ ریحان کا سمجھ کر ان کے ہاں ڈال دیا۔

آفس سے آ کر وہ اپنی ڈاک شام کی چائے پیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ریحانہ شاہ کا جب لفافہ کھولا تو اس میں نہاں کی ڈرنٹی پکچرزدیکھ کر وہ سکتے کی سی صورت میں آ گیا۔ یہ لڑکی کتنی بار اس سے ٹکرائی تھی۔ اس نے ہر بار اس سے بات کرنی چاہی تھی مگر اس لڑکی نے تو بات تک کرنا اس سے مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”کیا اس کی یہ تصویریں کسی نے بنوائی ہیں؟“ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا تھا ماں کو سامنے سے آتا دیکھ کر اس نے وہ تصویریں جلدی سے لفافے میں ڈال دیں۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے وہ تصویریں بغور دیکھیں تو یوں لگا جیسے کسی لڑکی نے ہنسی خوشی یہ تصویریں بنوائی ہوں۔

”غلط، بالکل غلط ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“ اس کے دل نے اسے یہی تاویل دی۔ لفافہ اس نے ٹیبل پر پٹخ کر رکھا تو تصویروں کے ساتھ رکھا ہوا خط جو ٹاپ کیا ہوا تھا، اس کے سامنے آ گیا۔

”آپ کے کالج کی طالبہ نہاں احمد ایک انتہائی بدکردار لڑکی ہے اسے ان ہی وجوہ کی بنا پر کالج سے بھی نکالا جا چکا ہے براہ کرم اس لڑکی سے دور رہیں ورنہ آپ خود نقصان اٹھائیں گی۔“ خط کی عبارت پڑھ کر ریحان الجھ سا گیا۔

”یہ یقیناً کوئی گینگ کام کر رہا ہے کسی کی بھی نیک اور شریف لڑکی کو بدنام کرنے کے لیے اور یہ لڑکی نہاں بے حد شریف ہے، اس کی گواہی تو میں بھی دے سکتا ہوں۔“

اکثر بدکردار لڑکیاں مختلف بہروپ بھرا بھی تو کرتی ہیں کیا پتا یہ بھی ایسی ہی ہو جب ہی تو کالج کی پرنسپل نے اپنی طالبہ کا نام کالج سے خارج کیا ہوگا۔“ دماغ نے اسے راہ دکھائی۔ ”اس کا مطلب یہی ہے کہ کالج کی پرنسپل کے پاس اس ضمن میں زیادہ معلومات ہوں گئی۔“

ریحان اگلے دن ہی پرنسپل کے کمرے میں موجود تھا۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے اس نے کہا۔ ”میری کزن اس کالج میں پڑھتی ہے اور اس کے گھر میں نہاں احمد کی تصاویر کے ساتھ ایک خط بھی بھیجا گیا ہے اور اس میں آپ کا حوالہ دیا گیا ہے کہ آپ نے اسے بدکردار ثابت ہونے پر کالج سے نکالا ہے تو کیا میں اس بارے میں آپ سے معلومات کر سکتا ہوں کہ کیا واقعی ایسا کچھ ہے؟“

”نہیں جناب..... ایسا کچھ نہیں ہے۔ نہاں ہمارے کالج کی ذہین ترین طالبہ ہونے کے ساتھ بے حد نیک اور شریف تھی۔ اس کو پڑھانے والی تمام اساتذہ ابھی تک پریشان ہیں کہ اس پر یہ قیامت کیسے ٹوٹ گئی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ نے نہاں احمد کا نام کالج سے خارج نہیں کیا؟“

”جی نہیں، خارج تو نہیں کیا مگر اس کے گھر

جا کر یہ ضرور کہا ہے کہ نہاں کو کالج مت آنے دیں۔“ ”جب آپ یہ کہتی ہیں کہ نہاں ایک شریف اور نیک لڑکی ہے تو کیا آپ بھی کسی کے دباؤ میں آگئی ہیں؟“ ریحان کی جرح جاری تھی اور پرنسپل اس قدر بوکھلا رہی تھیں کہ اپنی بات کرتے ہوئے انہیں بار بار پانی پینا پڑ رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید محکمہ تعلیم کا کوئی اعلیٰ افسر اس معاملے کی چھان بین کرنے آگیا ہے۔ ”سر مجھے اس بارے میں یقیناً انجکشن آفس میں اطلاع دینی چاہیے تھی جو میری غلطی ہے مگر جب نہاں احمد کی ڈرنی کچھ کے ساتھ ساتھ مجھے دھمکیاں دی گئیں اور دو بار میری گاڑی کے شیشے بھی توڑ دیے گئے تو مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا کہ اسے گھرنیک ہی محدود کر دوں۔“

”اگر کوئی بھی بدخواہ آپ کی دیگر طالبات کے ساتھ ساتھ آپ کی پروفیسر کے بارے میں کوئی نازیبا بات کہے تو آپ فوراً یقین کر لیں گی یا اپنے طور پر اس کی تحقیقات بھی کریں گی۔“

”نہاں کے بارے میں تحقیقات کیا کرتی، وہ تو ہماری ساری نیچرز کی پسندیدہ اسٹوڈنٹ تھی۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی ہمیشہ آگے آگے اور یہ بات تو شاید اسے معلوم بھی نہیں ہے کہ اس نے اپنی نظم کالج کی لڑکی کے نام سے لکھی تھی، اسے ایشین کالجز کمپینشن میں پہلا ایوارڈ ملا ہے اور یہ ایوارڈ ہمارے کالج کے لیے بہت بڑا آثر ہے۔“ پرنسپل کے لہجے میں ایک فخر سا تھا۔

”کتنی حیرت کی بات ہے، ایک طالبہ کی اعلیٰ کارکردگی پر آپ فخر کر رہی ہیں اور دوسری جانب اس کی ذات پر کچھ اچھالا جاتا ہے تو آپ اس کا ساتھ دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔“

”میں کیا کرتی سر..... میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ میری پاس ہی نہیں کالج کے بیون تک کو نازیبا تصاویر

ارسال کی گئی ہیں۔“

”کیا آپ مجھے یہ بتا سکتی ہیں کہ یہ تصاویر کس نے آپ کو ارسال کیں، بھیجنے والے نے اپنا نام تو لکھا ہوگا اور اپنا ایڈریس بھی جب کوئی شکایت درج کروائی جاتی ہے تو متعلقہ تھانے کا چھوٹے سے چھوٹا افسر بھی رپورٹ درج کروانے والے کا نام، پتا اور فون نمبر ضرور پوچھا کرتا ہے۔“ ریحان کی جرح جاری تھی۔

”آپ کی بات صحیح ہے مگر ہمیں یہ سب بذریعہ ڈاک ملا ہے جس پر نہ بھیجنے والے کا نام اور ایڈریس ہے نہ ہی فون نمبر بس اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ یہ سب کراچی شہر سے ہی کسی نے ہمیں بھیجا ہے۔“

”حیرت ہے کہ ایک نامعلوم شخص کے چھوٹے پلندے نے آپ کو کس قدر خوف زدہ کر دیا کہ آپ اپنی ڈیوٹی بھی بھول بیٹھیں۔“ ریحان نے تلخ سے لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پرنسپل سے تفصیلی بات چیت کے بعد اسے یہ دلی اطمینان ہو گیا تھا کہ نہاں ایسی ہی ہے جیسی وہ سمجھتا ہے۔ پاک باز، نیک، حیادار اور معصوم سی لڑکی اور یہ جان کر اس کے ذہن سے ایک انجانا سا بوجھ خود ہی ہٹ گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو بے ہلکا سا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں نہاں کے سوا اب کچھ اور تھا ہی نہیں۔ گھر آیا تو اسی کے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ ماں نے کھانا سامنے رکھا اس کی لیورٹ ڈش فرائی بھنڈی موجود تھی۔ جسے وہ چپ چاپ کھا رہا تھا۔

”کیسی ہے؟“ ماں نے پوچھا۔

”بے حد معصوم سی۔“ وہ بولا۔

”بیٹا میں بھنڈی کی میزی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“

”میں تو اس بچی کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔“ ریحان نے سامنے اخبار میں بچی کی تصویر پر اگلی رکھتے ہوئے پورا اخبار ہی اپنے منہ کے سامنے

کر لیا۔

”شکر ہے امی نے اخبار کی معصوم بچی کی تصویر دیکھنے کی خواہش نہیں کی۔“ ریحان کے سامنے اخبار تو ضرور دھرا تھا مگر اس پر کوئی ایسی تصویر نہیں تھی۔

”یا اللہ یہ لڑکی میرے حواسوں پر پھر کیوں چھانے لگی ہے۔“ امی کی باتیں اس کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں اور وہ انہیں ہاں میں جواب دے رہا تھا پھر وہ اپنے کمرے میں چلا آیا تو اسے یوں لگا نہاں تو ہر جگہ کھڑی ہے۔ اس کی الماری میں، اس کی ڈرائنگ ٹیبل پر اس کی کتاب پر، اس کا ٹاول پکڑے اس کا گلاس اور کپ اسے دیتے ہوئے۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بستر پر لیٹ گیا اور نہاں کی ہنسی اس کے کانوں میں جلتی رہنے لگی۔ وہ آنکھیں بند کیے کیے مسکراتا رہا جیسے کہ وہ حقیقت میں اس کے پاس ہو بے حد پاس اور پھر اس نے مندمی مندمی آنکھوں سے دیکھا تو اسے لگا وہ اس کے بستر میں اس کے پہلو میں موجود تھی گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھا سا نڈلیپ روشن کیا تو اپنے آپ کو تنہا پا کر اس نے ایک گہری سانس لی، مسکرایا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

☆☆☆

”دیکھا اماں کیسے دھوکے باز ہیں آج کے لوگ، نہ ان میں سروت رہی اور نہ ہی خوف خدا..... کراچی کی میری تین فیکٹریوں پر جنرل منجر نے قبضہ کر لیا ہے۔ کسی سالے کو میں نہیں چھوڑوں گا۔“ سرفراز احمد غصے سے دھاڑ رہے تھے۔

”تمہاری چیزوں پر کوئی غیر کیسے قبضہ کر سکتا ہے؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہی تھیں۔

”میرا شیر جیسا بیٹا جو چلا گیا ہے اسی بات سے فائدہ اٹھایا ہے انہوں نے۔“

”مگر بیٹا ایسی تو کہیں اندھیر نہیں مچی کہ کوئی دوسرے کی فیکٹریاں ہی ہضم کر جائے۔“

”پاپا جب آنکھ بند کر کے ہر پہر پر سائن کر دیں گے تو ایسا ہی ہوگا۔“ چھوٹا بیٹا شاہد کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”تم جب آفس کی شکل ہی نہیں دیکھو گے تو لالچی اور مکار لوگ ایسے ہی سب چیزیں ہضم کر جائیں گے۔“

”میری طبیعت کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں ہے، آپ دیکھ نہیں رہے کہ میں کہیں بھی نہیں جا رہا۔“

”بیٹا تمہیں جا کر دیکھنا تو پڑے گا۔ اکیلا باپ کیا کیا کرے گا۔ ورنہ یہ ڈاکو سے لوگ سب ہڑپ کر جائیں گے۔“ وادی نے پوتے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”کر جائیں ہڑپ، میری بلا سے۔ میری اپنی طبیعت خراب ہے میں آرام کرنے جا رہا ہوں۔“ شاہد نے جاتے ہوئے کہا۔

”دیکھ رہی ہیں اماں آپ۔ دانش کے جانے کے بعد شاہد نے کیسے بہانوں کے ساتھ اپنی جان چھڑا رکھی ہے۔ کام تو یہ کرنا ہی نہیں چاہتا ہے۔ اپنی عیاشیوں کے لیے انہیں پیسہ درکار ہے مگر باپ کے ساتھ محنت کرنے پر تیار نہیں۔ یہ نہیں جانتا کہ ساری زندگی باپ نے محنت کی تھی تب نام اور پیسہ کمایا تھا۔ لٹیرے میری آنکھوں کے سامنے آج میری تین فیکٹریاں لے اڑے ہیں کل کو میری آنکھوں میں مزید دھول جھونک سکتے ہیں۔“ سرفراز صاحب غصے سے بڑبڑا رہے تھے اور ان کی بیگم اپنے کمرے میں اندھیرا کیے مینا اور دانش کی تصویروں سے باتیں کرتے ہوئے انہیں اپنے پہلو میں یوں سلارہی تھیں جیسے وہ ان کے چھوٹے بچے ہوں اور جو ذرا سے شور سے بھی اٹھ جائیں گے۔

☆☆☆

ریاض صاحب کی بھتیجی کی منگنی تھی ان کے ہاں

148 ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء

آئیڈی: 1095

سب بہن بھائی جمع تھے۔ ریاض کے ہاں بھی بلاوا آیا تھا مگر ان کے ہاں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ آج کی اس تقریب میں بھی منگنی سے متعلقہ بات چیت کے بجائے نہاں اور اس کی ڈرنٹی پچرز موضوع گفتگو تھیں۔

”ہمیں تو شروع سے ہی پتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا ورنہ کون اپنے کلچے کے ٹکڑے کو اٹھا کر باہر پھینکا کرتا ہے۔“ بڑی بہن نے گفتگو کی ابتدا کی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ..... نسکی کے دس بیٹیاں بھی ہو جائیں تو وہ باہر کسی کے جھولے میں ڈال کر نہیں آیا کرتا۔“ چھوٹی بہن نے کہا۔

”مجھے تو اپنے بھائی پر غصہ آتا ہے اتنا سب ہو جانے پر بھی اس بے غیرت لڑکی کو اپنے گھر سے نکال باہر کیوں نہیں کرتے تاکہ انہیں بھی سکون مل سکے۔“

”جس کی قسمت میں جتنی تکلیفیں ہیں وہ اس کو ضرور ملا کرتی ہیں اور ایسا ان لوگوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے جو ہمیشہ سے اپنی چلانے کے عادی ہوتے ہیں اور کسی دوسرے کی بات سے اتفاق نہیں کرتے۔“

ریاض کے چھوٹے بھائی شہباز غصے سے بولے۔

”حد ہو گئی ہے..... خاندان، برادری، دوست احباب سب نہاں پر قہقہو کر رہے ہیں اور ریاض بھائی اپنی ایک ہی بات پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ یہ جعلی تصویریں ہیں۔ ہر تصویر میں نہاں کا چہرہ ہے، اس کے بال اس کی گردن، اس کے کانوں کے ٹاپس جو وہ ہمیشہ پہنے رہتی ہے۔ اس کا لاکٹ جس پر نہاں لکھا ہوا ہے جو اس وقت نظر آتا ہے جب وہ اپنا عبا یا اتارتی ہے۔ اتنی واضح نشانیاں دیکھ کر بھی ہم یہ کہہ دیں کہ یہ نہاں کی تصویریں نہیں بلکہ کسی دوسرے کی ہیں تو ہم سے بڑا کوئی اندھا تو شاید ہوگا ہی نہیں۔“ شہباز کا لہجہ شکایتی سا تھا۔

”چلو اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ان کی بات صحیح

ہے جو کہ غلط ہی ہے تو انہیں اپنے گھر میں یوں منہ چھپا کر تو نہیں بیٹھ جانا چاہیے کہ اپنی سگی بیٹی کی منگنی تک میں نہیں آئے ہیں۔“

”منہ تو اس لیے چھپا کر بیٹھ گئے ہیں کہ عزیزد اقارب کی پوچھ گچھ سے جو ڈرتے ہوں گے۔“ بہنوں نے ہم آواز ہو کر کہا تو بھائیوں کے ساتھ ساتھ ہما وجوں نے بھی تائید میں اپنے سر ہلا دیے۔

☆☆☆

سرفراز صاحب کی والدہ نے نہاں کی گندی تصاویر پر تو ایک نظر ضرور ڈالی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ سب کیا دھرا ان کے اپنے بیٹے کا ہے، نہ صرف انہوں نے ایک شریف لڑکی کی اس طرح کی تصویریں بنوائی ہیں بلکہ ان کو ہر جگہ بھیجوا یا بھی گیا ہے۔

سرفراز صاحب کی فون پر کسی سے بات سن کر وہ پسینے پسینے ہو گئیں۔

بے شک وہ اپنے بیٹے کے گھر کے ماحول میں رگی ہوئی تھیں مگر سرفراز کے مرحوم باپ ایک نیک انسان تھے، نہ وہ بددیانت تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی کا برا چاہا تھا اور ایسا تو وہ کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ کسی کی بیٹی کو سرعام رسوا کیا جائے اور اب وہ اپنے سرفراز کو بے حد تاسف سے دیکھ رہی تھیں جو فون پر قہقہے لگاتے ہوئے کسی کو شاباش دے رہے تھے۔ فون کا ریسور کرڈل پر رکھتے ہوئے وہ خود ہی بڑبڑائے۔

”یہی تو میں چاہتا تھا، ریاض کا گھرانہ زندہ اور گور ہو جائے اور ایسا ہی ہوا ہے۔ وہ لوگ اب کسی کو بھی اپنی شکل دکھانے کے قابل ہی نہیں رہے ہیں۔“

”بیٹا ایسا کیوں کیا ہے تو نے.....؟“ وہ بیٹے کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھیں۔ ”کیوں کسی کی زندگی میں ہر گھولا۔“

”اماں میں نے پہلی اینٹ کسی کو نہیں ماری،

میں نے صرف اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ہے۔“

”ریاض کے گھرانے نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا جو تم نے ان کے گھر پر پہاڑ توڑ دیے۔“

”اماں میری مینا بھی تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے، اس میں بھی تو ان کا ہی ہاتھ تھا۔“ لہجہ شکایتی سا تھا۔

”جھوٹ سونی صد جھوٹ..... تم یہ بات شروع سے ہی جانتے تھے مینا سائیکس تھی کتنے عرصے سے تو اس کا علاج ہو رہا تھا اور اس نے اس سے قبل بھی تین مرتبہ خودکشی کی کوششیں... کی تھیں جس میں اس کو بچالیا گیا تھا۔“

”نہیں اماں، وہ تو اس نے دو چار گولیاں ہی کھائی تھیں مگر اس مرتبہ تو ضرور رساں گولیوں کی پوری بوتل ہی کھا گئی تھی۔“ سرفراز صاحب اپنی منٹھیاں بند کرتے ہوئے بولے۔ ”ہاں وہ ضدی تھی، اس میں برداشت کی کمی تھی، اس کا ذہن کسی قسم کی بھی پریشانی برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا جب ہی تو اس نے خودکشی کر لی۔“

”مگر اس کی خودکشی کا الزام کسی دوسرے پر لگانے اور اسے یوں رسوا کرنے سے تمہیں کیا مل گیا ہے؟“

”ایک گہرا سکون، ایک عجیب سی خوشی، ایک طمانیت۔“ وہ آنکھیں بند کر کے مسکرائے۔

”واقعی تم اپنے آپ کو پرسکون سمجھ رہے ہو؟“ اماں کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

”ہاں..... دانش کے فوت ہو جانے پر میرا ذہن ابتر سا ضرور ہے مگر مینا کی موت کا بدلہ میں نے اس کے قاتلوں سے لے لیا ہے۔“

”سرفراز بیٹا..... تم نے بے حد غلط کیا ہے ہر لڑکی ہمارے لیے مینا ہے تو پھر مسلمان ہو کر کسی کی بھی بیٹی کے ساتھ ایسا روح فرسا سلوک کیسے کر سکتے ہیں، پیارے بیٹے یہ سلوک تو ہم کسی غیر مسلم کے ساتھ بھی

میں نے تو صرف اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ہے۔“

”ریاض کے گھرانے نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا جو تم نے ان کے گھر پر پہاڑ توڑ دیے۔“

”اماں میری مینا بھی تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے، اس میں بھی تو ان کا ہی ہاتھ تھا۔“ لہجہ شکایتی سا تھا۔

”جھوٹ سونی صد جھوٹ..... تم یہ بات شروع سے ہی جانتے تھے مینا سائیکس تھی کتنے عرصے سے تو اس کا علاج ہو رہا تھا اور اس نے اس سے قبل بھی تین مرتبہ خودکشی کی کوششیں... کی تھیں جس میں اس کو بچالیا گیا تھا۔“

”نہیں اماں، وہ تو اس نے دو چار گولیاں ہی کھائی تھیں مگر اس مرتبہ تو ضرور رساں گولیوں کی پوری بوتل ہی کھا گئی تھی۔“ سرفراز صاحب اپنی منٹھیاں بند کرتے ہوئے بولے۔

”ہاں وہ ضدی تھی، اس میں برداشت کی کمی تھی، اس کا ذہن کسی قسم کی بھی پریشانی برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا جب ہی تو اس نے خودکشی کر لی۔“

”مگر اس کی خودکشی کا الزام کسی دوسرے پر لگانے اور اسے یوں رسوا کرنے سے تمہیں کیا مل گیا ہے؟“

”ایک گہرا سکون، ایک عجیب سی خوشی، ایک طمانیت۔“ وہ آنکھیں بند کر کے مسکرائے۔

”واقعی تم اپنے آپ کو پرسکون سمجھ رہے ہو؟“ اماں کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

”ہاں..... دانش کے فوت ہو جانے پر میرا ذہن ابتر سا ضرور ہے مگر مینا کی موت کا بدلہ میں نے اس کے قاتلوں سے لے لیا ہے۔“

”سرفراز بیٹا..... تم نے بے حد غلط کیا ہے ہر لڑکی ہمارے لیے مینا ہے تو پھر مسلمان ہو کر کسی کی بھی بیٹی کے ساتھ ایسا روح فرسا سلوک کیسے کر سکتے ہیں، پیارے بیٹے یہ سلوک تو ہم کسی غیر مسلم کے ساتھ بھی

ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء 149

نہیں کر سکتے۔ بیٹیاں سب کی پھول ہوتی ہیں اور ان کی عزت کا بچہ جیسی ہوتی ہے اور کالج سی لڑکی کی تو حفاظت کی جاتی ہے تاکہ اسے توڑا جائے۔“

”جب ظلم کا بدلہ لیا جاتا ہے تو کچھ نہیں دیکھا جاتا۔ میں نے تو ان کی بیٹی کو زندہ رہنے دیا۔“ وہ احسان جتلانے والے انداز میں ہنسے۔

”بیٹا تم نے تو ریاض کے گھرانے پر ایسا ظلم کیا ہے کہ ایسی بے رحمی تو چور اور ڈاکو بھی نہیں کیا کرتے، وہ لوٹ مار تو ضرور کرتے ہیں مگر کبھی کسی لٹیرے نے کسی عورت یا بیٹی کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے کہ وہ جاہل گنوار بھی عورت کے تقدس اور اس کی حرمت کو سمجھا کرتے ہیں اور تم شاید ان لوگوں سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔ تم نے تو اس خاندان کو زندہ درگور کر دیا ہے بیٹا۔“ اب اماں رو رہی تھیں۔

”میری بد نصیبی یہی تو ہے کہ میرا ساتھ میری ماں تک نہیں دے رہی ہے۔ آپ کو تو مجھے شاباش دینی چاہیے تھی کہ آپ کی پوتی کے قاتلوں کو میں سزا دینے میں کامیاب ہو گیا مگر آپ تو مجھے الٹا قصور وار قرار دے رہی ہیں۔ کیوں کر رہی ہیں آپ میرے ساتھ ایسا کیوں.....“ سرفراز صاحب انہیں دیکھتے ہوئے برا سامنہ بنا کر دوھاڑے۔

”وہ اس لیے بیٹا کہ تم اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگے ہو۔ عزت، ذلت دینے والی ذات پاک پروردگار کی ہے تمہاری نہیں۔ وہ رحمان اور رحیم ہے۔ وہ ستار اور غفار ہے۔ ہم سب اسی کے محتاج ہیں تو ہم ہوتے کون ہیں جو لوگوں کو سزائیں دیں اور ایسی سزا جو کسی کو بھی دکھوں کے سمندر میں غرق کر دے..... تم نے بہت غلط کیا ہے بے حد غلط۔ یہ سب تو میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ میرا بیٹا یہ کرے گا۔“ اماں کہہ رہی تھیں اور ان کے آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔

”ہاں میں نے غرق کر دیا انہیں اور میں اپنے سب دشمنوں کو جن جن کو غرق کر دوں گا تاکہ پتا چلے سب کو کہ سرفراز احمد کوئی معمولی نہیں اپنی چیز ہے مجھ سے جو ٹکرائے گا وہ خود ہی پاش پاش ہو جائے گا اور جب کوئی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے تو اگر وہ خود بھی ڈھونڈنے کی کوشش کرے تو ڈھونڈ نہیں پاتا۔“

☆☆☆

اماں کو جب سے یہ روح فرسا حقیقت معلوم ہوئی تھی ان کو کسی بل قرار نہیں آ رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک، ایک فرد جس کے ہاں یہ تصویریں پہنچی تھیں کو جا کر بتائیں ریاض صاحب کی بیٹی بے حد نیک اور پارسا ہے وہ ایسی نہیں ہے جیسی تصویروں میں نظر آ رہی ہے۔ اس عفت مآب بچی پر ظلم ہوا ہے اور سرفراز صاحب ماں کی یہ باتیں سن کر انہیں پاگل قرار دے رہے تھے۔

”آپ میری ماں ہیں یا ریاض کی جو اس کے لیے رو رہی ہیں۔“ وہ ناشتے کی ٹیبل پر ماں کو آنسو بہاتے دیکھ کر جرجرا غ پائی تو ہو گئے۔

”ماں صرف ماں ہوتی ہے اگر میں تمہیں دکھی نہیں دیکھنا چاہتی تو کسی کو بھی دکھی کرنا نہیں چاہتی۔“

”اماں اب آپ میری خوشیوں سے جلتے لگی ہیں۔“ وہ ماں سے بولے۔

”بیٹا یہ خوشی نہیں ہے جسے تم خوشی سمجھ رہے ہو، وہ ایسا اعدا انتقام ہے جو گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ تم نے جانے بوجھے بغیر کسی تحقیق کے معمولی سی بات کی ان لوگوں کو ایسی سزا دے دی ہے جس کے طفیل وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل تک نہیں رہے۔“

”میں یہی تو چاہتا تھا۔“ وہ چٹکھاڑے اور اماں کے آنسو پھر بھل بھل بہنے لگے۔

☆☆☆

مینا کی سالگرہ کے دن سرفراز صاحب نے اس

لے یونیورسٹی کے دوستوں اور کالج کی تمام سہیلیوں کو اپنے گھر مدعو کیا۔ سب ہی مینا کو بے حد یاد کر رہے تھے اور اماں بھی ان سے باتیں کر رہی تھیں۔ شائستہ بیگم کا اپریشن اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ مینا کی سب سہیلیوں سے مل کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ وہیں پر کسی لڑکی کی زبانی انہیں کا نام سن کر اماں چونک سی گئیں۔ مینا کی کوئی پرانی سہیلی کسی دوسرے کو یہ بتا رہی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن کی کلاس فیلو جو بڑی باپردہ تھی مگر بڑی غلط لڑکی تھی اس کی تصویریں دیکھ کر تو اس کے منہ پر تھوکنے کو دل چاہتا تھا۔ اماں قصداً اس لڑکی کے پاس پہنچیں اور بولیں۔

”تم لوگ نہاں کے بارے میں باتیں کر رہی اوں؟“

”ہاں اماں، ہم نہاں ریاض کے بارے میں گہرے ہیں کہ اب جو جیسا دکھائی دیتا ہے ویسا ہوتا نہیں ہے۔“

”مگر نہاں واقعی ایک نیک اور باعصمت لڑکی ہے اور کسی نے یہ سب جان بوجھ کر اسے بدنام کرنے کے لیے کیا ہے مجھے بھی معلوم ہوا ہے۔“ اماں نے ادھون لہجے میں بتایا۔

”نہیں اماں، کسی کو کیا ضرورت ہے جو کسی کو ہاں بدنام کرے گا اس شریف زادی کا تو کئی کئی لڑکوں کے ساتھ چکر تھا۔ اسی وجہ سے تو اسے کالج تک سے لال دیا گیا۔“

”نہیں، بیٹا میں اس گھرانے کو جانتی ہوں یہ سب کسی نے اپنے جنونی انتقام کے لیے کیا ہے“ اماں نے راز درانہ لہجے میں بتایا۔

”اگر ایسا تھا تو ان کو مار دیا جاتا..... یہ تو اس لڑکی کی رنگیلی کہانیاں تھیں جو لوگوں سے چھپی ہوئی تھیں اور کسی نے ان کو اس لیے ظاہر کیا ہے کہ دیگر لڑکیاں ایسی لڑکی سے بچ کر رہیں۔“ اماں اپنے

ہونٹ کاٹ کر رہ گئیں۔ ان کی کسی بھی بات سے کوئی بھی لڑکی اتفاق ہی نہیں کر رہی تھی۔

”سرفراز تم نے بالکل اچھا نہیں کیا۔ اپنی لڑکی کا صدمہ تم نے یوں سہا کہ کسی دوسرے کی بیٹی کو جیتے جی مار دیا۔ تم نے اچھا نہیں کیا، بیٹے۔ بالکل اچھا نہیں کیا۔“

☆☆☆

”شاید کہاں ہے۔ کب سے آفس نہیں جا رہا ہے وہ؟“ سرفراز صاحب دھاڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ”آج دس کروڑ کی مالیت کے سامان کی پے منٹ اس منجر نے دئی میں لے لی جس کو ہم نے نکال دیا تھا۔“

”اس منجر کے بارے میں اخبارات میں اشتہار کیوں نہیں دیا گیا تھا اور کمپنیز کو آگاہ کیوں نہیں کیا گیا۔ شاید کا بخار ہی اس کی جان نہیں چھوڑ رہا۔ وہ بے چارہ کیا کیا دیکھے گا۔“ شائستہ بیگم نے کمزور سا احتجاج کیا۔

”ہاں اگر وہ گھر میں سونے میں وقت گزارے گا تو ایک دن سب بزنس ٹھپ ہو جائے گا اب تو جس کو منہ دیکھو وہ کام کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ اٹھاؤ شاید کو اور اس سے کہو کہ فوراً دئی جائے اور اس عزیز کو جا کر پکڑے جو صرف اپنے نام کا عزیز ہے اور دوسروں کے لیے دشمن بنا ہوا ہے۔“ شائستہ بیگم جس تیزی سے بیٹے کے کمرے میں گئی تھیں اس سے کہیں زیادہ سرعت سے واپس آ کر وہ بولیں۔

”وہ کہہ رہا ہے کہ اس سے اٹھا ہی نہیں جا رہا۔“

”کیا اب بھی اسے بخار ہے؟“ اماں نے پوچھا۔

”نہیں، بخار تو نہیں ہے مگر اس کی ایسی ہمت نہیں ہو رہی ہے کہ وہ آج ہی دئی جائے۔ آپ اپنے آفس کے کسی با اختیار ڈائریکٹر کو کیوں نہیں بھیج دیتے۔“

اتنا پھنسا ہوا ہے اسے کسی دوسرے کی طرف دیکھنے کی فرصت تک نہیں ہے۔ ایسے میں کون ہوگا ایسا جوان کو نقصان پہنچانے کے لیے ایسے عمل کروائے گا، میں نہیں مانتی۔“ مسز حارث کا لہجہ حتیٰ ساتھ۔

”تم واقعی نہیں جانتیں۔ ایسے کام آج کل کچھ زیادہ ہی ہو رہے ہیں۔“ حارث صاحب کا لہجہ ملال آمیز تھا۔

”مگر فائدہ۔“

”فائدہ، اور نقصان کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا معاشرتی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے لوگوں کے مزاج تبدیل ہو گئے ہیں۔ اب دوسرے کام اپنی خوشی لگتی ہے۔ اب وہ وقت نہیں رہا کہ کسی دوسرے کو روٹا دیکر اپنے آنسو بھی نکل پڑتے تھے۔ اب کسی دوسرے کے آنسو دیکھ کر لوگوں کے چہرے پر مسکراہٹ طلوع ہوتی ہے۔“

”بھاڑ میں جائیں ایسے لوگ ہم تو ایسے نہیں ہیں۔“ مسز حارث نے میاں کی بات سن کر برا سامنہ بنا کر کہا۔

”میں سب لوگوں کی بات نہیں کر رہا۔ میں زیادہ تر لوگوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں کہ جب دوسرے کا غم اپنی خوشی لگنے لگے تو لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے کرنے کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔“

☆☆☆

”یہ بھی اتفاق ہی تھا..... سرفراز صاحب کو آج ریحان دو دفعہ دکھائی دیا تھا۔ پہلی مرتبہ شاپنگ مال میں وہ اپنے لیے شاید کچھ خریداری کر رہا تھا۔ دوسری مرتبہ اسپتال کی راہداری میں شاپنگ مال میں تو انہوں نے اسے دیکھ کر قصداً نظر انداز کر دیا تھا مگر جب اسے اسپتال میں دیکھا تو بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔“

”خیریت تو ہے ناں؟“

”اس کا دل، دماغ ٹھکانے آئے گا تو وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔“ اماں نے کہا تو سرفراز احمد ماں کی بات سن کر تائید میں سر ہلانے لگے۔

☆☆☆

”ہونہہ..... بہت بڑے صنعت کار سمجھتے تھے اپنے آپ کو۔ اب دیکھو..... اسی سال چار فیکٹریاں تو ان کی بند ہو گئی ہیں۔“ مسز حارث نے اخبار پڑھ کر اپنے میاں کے سامنے سرفراز صاحب کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”یہ سب ان کے تکبر کی وجہ سے ہوا ہے۔“ حارث صاحب نے اخبار میں فیکٹریز بند کی خبر پڑھ کر تاسف سے کہا۔

”ان کے گھروالوں کی شوبازی کی عادتیں بھی بہت زیادہ تھیں، اپنے سے کم درجے کے لوگوں کے گھر تک نہیں جایا کرتے تھے کہ کہیں ان کی بے عزتی نہ ہو جائے۔ دیکھ لو ایسی باتوں کا انجام ہالہ خرکیا ہوا کرتا ہے۔ رسی جل گئی ہے مگر بل نہیں گیا ہے۔ میں نے مرینہ کی شادی میں بلانے کے لیے ان کے گھر فون کیا تو ان کی بیگم بولیں میں ان دنوں کسی کی شادی میں شرکت نہیں کر رہی ہوں۔ اب کوئی یوں منہ در منہ تھوڑی ناں منع کیا کرتا ہے۔“

”ان دنوں وہ لوگ واقعی کہیں نہیں جا رہے کہ پریشانیاں ایک کے بعد ایک ان کے گھر آرہی ہیں۔“ کسی نے کچھ کر دیا تو نہیں دیا۔“

”ہاں، ایسا بھی ہو سکتا ہے بلکہ سرفراز صاحب کے چھوٹے بھائی تو بر ملا یہی کہہ رہے ہیں کہ ان کے گھرانے پر اور ان کے کاروبار پر کسی نے کوئی سٹفل عمل کروادیا ہے۔“

”ارے چھوڑیں بھی سب بیکار کی باتیں ہیں۔ اس نفسانسی کے دور میں ہر شخص کو صرف اپنی ہی پڑی ہوتی ہے۔ آج کل ہر کوئی اپنے اپنے مسائل میں

”مگر کیوں؟“

”بینک کے منجر نے کہا ہے کہ شاہد کے دستخط اس کے دستخط سے نہیں مل رہے ہیں۔“

”مگر یہ بات منجر نے کیوں کہی؟“ شائستہ بیگم کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ سرفراز صاحب آخر کیا کیا چاہتے ہیں۔

”آپ کا لاڈلا سپوت حد سے زیادہ بے پروا ہوتا جا رہا ہے چیک بکس پر سائن بھی اس طرح کر رہا ہے کہ وہ اس کے اپنے دستخطوں سے نہیں مل رہے ہیں۔“

”اس ہفتے بخار بھی تو کتنا رہا ہے اس کو پھر بھی وہ آفس چلا گیا تھا۔ یہ بینک والے تو فضول میں رائی کا پہاڑ بنالیا کرتے ہیں۔“ شائستہ بیگم نے شوہر کا جلال کم کرنے کی سعی کی۔

”ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا ہے۔“ وہ چلائے۔

”تو پھر.....؟“ شائستہ بیگم نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”پچھلے دو مہینوں میں یہ پانچویں مرتبہ ایسا ہوا ہے۔ تین مرتبہ تو موصوف نے مجھے پتا چلنے ہی نہیں دیا مگر اس ماہ دو دفعہ مجھے پتا چلا اور آج بینک منجر نے خود بتایا کہ شاہد صاحب کو آخر ہوا کیا ہے ہر مرتبہ نئے انداز میں دستخط کر رہے ہیں۔“

”غم کچھ کم پڑے ہیں سر پر سب کا ہی دماغ پھٹا جا رہا ہے۔“ داوی نے آکر اپنے چہیتے پوتے کی طرف داری کی۔

”ہاں اماں، یہ بات تو آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں کہ ہمارے اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ مینا گئی اور پھر دانش بھی چلا گیا اب یہ شاہد ہے تو وہ عجیب لاابالی انداز میں رہ رہا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے تو آفس جاتا ہے ورنہ وہ پلٹ کر یہ تک نہیں دیکھتا کہ ہو کیا رہا ہے۔“

”وہ تو میں بھیج ہی دوں گا مگر شاہد پر جو کاہلی سوار ہے اس سے کہو کہ باز آجائے ورنہ میں اس سے بھی سختی سے پیش آؤں گا۔“ سرفراز صاحب اپنے موبائل کے نمبر پلش کرتے ہوئے بولے اور شائستہ بیگم چپ چاپ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ سرفراز صاحب کے چیخنے چلانے سے نہ صرف انہیں گھبراہٹ ہوئی بلکہ ان کا بلڈ پریشر بھی بڑھ جایا کرتا تھا۔

☆☆☆

ریاض صاحب، ان کی بیگم اور نہاں اپنے گھر میں مقید ہو کر رہ گئے تھے۔ رات ہوتی تب بھی ان کے کمرے میں لائٹ روشن نہیں ہوتی تھی کہ نہ وہ کہیں جا رہے تھے اور نہ ہی ان کے ہاں کوئی آ رہا تھا۔ اگر کوئی بھولے بھٹکے ان کے ہاں آ جاتا تو وہ اسے دروازے سے ہی فارغ کر دیتے۔

پاس پڑوس سے بھی انہوں نے اپنا نانا جیسے منقطع کر لیا تھا۔ دن ہو یا رات وہ تینوں جائے نماز پر بیٹھے ہاتھ پھیلائے روتے رہتے بعض دفعہ تو ان کے لبوں سے بھی کوئی لفظ ادا نہیں ہوتا اور پھیلے ہوئے ہاتھوں پر آنسو گرتے رہتے۔

☆☆☆

”کہاں ہے شاہد؟“ سرفراز صاحب آفس سے آکر چیخ رہے تھے۔

”ابھی باہر گیا ہے بلکہ اس کے دوست آئے تھے وہی اس کو لے کر باہر گئے ہیں۔“ شائستہ بیگم نے دھیمے سے لہجے میں بتایا۔

”بے حد بے پروا ہے ہو رہا ہے وہ، ذرا خیال نہیں رہا ہے اسے کسی بات کا بھی۔“ ان کی ناراضی ان کے چہرے پر جیسے تحریر تھی۔

”ہوا کیا ہے آخر؟“ انہوں نے حیرت سے شوہر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا دستخط کیا ہوا چیک واپس آ گیا ہے۔“

”میرا ایک دوست ایڈمٹ ہے، اس کو دیکھنے آیا تھا۔“ وہ ہوں کہہ کر آگے بڑھ گئے مگر ان کا دل چاہا کہ اس سے کم سے کم یہ تو ضرور ہی پوچھ لیں کہ تم کب یہاں ایڈمٹ ہو گئے..... یا میں ایسا کون سا طریقہ اپناؤں کہ تم اس اسپتال میں ہمیشہ نظر آؤ..... مگر وہ کچھ بھی تو نہیں کہہ سکے۔ مگر ان کے چہرے کا جغرافیہ ریحان کو دیکھ کر بگڑا تھا۔ ریحان کو یہ احساس تو ضرور ہو گیا تھا کہ ان کے دل میں اس کے لیے سوائے نفرت کے کچھ بھی نہیں اور ظاہر ہے کہ وہ بھی کیسے سکتا تھا..... وہ اپنی مینا کی خودکشی کی وجہ صرف اس کو ہی جان رہے تھے۔ کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں ہیں۔ سرفراز صاحب جیسے..... جو اپنے دل میں خواہ مخواہ ریحان کے لیے نہ صرف نفرت اور غصہ دبائے بیٹھے تھے بلکہ اسے پال پوس بھی رہے تھے۔ اور ایسے بھی لوگ تھے..... جنہوں نے نہاں کو نہ جانے کس بات کی سزا دی تھی..... کہ اسے ہر طرف عریاں کر دیا تھا..... یہی وجہ تھی کہ وہ جب بھی انٹرنیٹ استعمال کرتا..... تو اس کے ذہن میں یوٹیوب میں ڈالی گئیں نہاں کی ڈرنٹی کچر ز گھوم جاتیں اور اس کا سر چکرا سا جاتا۔

نہاں کے کالج کی پرنسپل سے ملنے کے بعد وہ اپنی فیس بک پر خواتین کے احترام کے لیے مستند احادیث کوٹ کر لگا تھا کہ سچی بات یہی تھی کہ اسے بے حد دکھ پہنچا تھا۔ ایسا کیوں ہوا تھا..... ایسا کس نے کہا تھا..... اور کیوں کہا تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ ایک اجنبی لڑکی، جس نے نظر اٹھا کر کبھی اسے دیکھا تک نہیں تھا..... کبھی اس سے بات جی بھر کر نہیں کی تھی..... بلکہ اس نے تو اس کی بات توجہ سے سنی تک نہیں تھی۔ اس کے لیے وہ اپنے دل میں کیوں ایک کسک سی محسوس کر رہا تھا۔ کس ناتے اسے یہ سب بے حد برا لگ رہا تھا؟ اور کس لیے؟ اس کا دل یوں بے

جھن ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے پر لگی کچر ز کو وہ کسی طرح بھی صاف کر دے۔

اپنا تجزیہ..... بارہا اس نے خود بھی کیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ چونکہ وہ کسی کے لیے بھی منفی احساسات نہیں رکھتا تھا اس لیے یہ سب اسے بالکل اچھا نہیں لگا تھا بلکہ اسے ایک تکلیف سی پہنچی تھی..... نہاں کے بجائے اگر کوئی دوسری لڑکی بھی ہوتی تو شاید اس کے احساسات یہی ہوتے۔

☆☆☆

ایسا ڈاکا جس کی نظیر بھی کہیں نہیں ملتی تھی۔ مگر میں مقیم چوکیدار اور گارڈز کو کوئی نشہ آور دوا کسی مشروب میں دے کر بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ سرونٹ کو ارٹرز کے بیرونی دروازے پر تالے ڈال دیے گئے تھے..... اور اسلحے کے زور پر ڈاکو دنگنا تے ہوئے ان کے گھر میں گھسے اور تمام نقدی، زیورات..... ٹرک میں بھر کر لے گئے تھے۔ سرفراز صاحب نے اپنا گھر لٹا دیکھ کر جلی کٹی سنائیں تو انہوں نے اتنے ڈنڈے برسائے کہ ان کی ٹانگوں کی تو کیا گھٹنے تک کی ہڈیاں سرمہ بن گئیں۔

ڈاکے کا نقصان جو ہوا تھا تو سو ہوا تھا مگر سرفراز احمد تکلیف وہ آپریشن سے گزر کے بھی وہیل چیئر پر آگئے تھے۔ ٹانگ کی ہڈیاں اتنی زیادہ ٹوٹ گئی تھیں کہ اس میں راڈ تک نہیں ڈالی جاسکتی تھی۔ شائستہ بیگم یہ سب دیکھ کر بولا سی گئیں۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے..... ہر آنے والا دن گھر کے لیے ایک نئی پریشانی لے کر آ رہا ہے؟“ انہوں نے اپنی ساس سے کہا۔

”مجھے تو لگتا ہے کسی نے ہمارے گھر انے ہر یقیناً کچھ ایسا کروا دیا ہے جس سے مال اور جان دونوں کو ہی نقصان پہنچ رہا ہے۔“ سرفراز صاحب جب سے وہیل چیئر کے ہو کر رہ گئے تھے ان کے جلال میں

مزید اضافہ ہی ہوا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے گالیاں دیتے رہتے تھے یا ان ڈاکوؤں کو کوٹنے دیا کرتے تھے جن کی ہمت سے وہ ٹانگوں سے مفلوج ہو گئے تھے۔ ان کا اشتعال گھر کے نوکروں پر بھی بڑھ گیا تھا۔

شاید..... بیمار تھا یا آرام طلب زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ کھانا کھانے کے لیے بھی ڈانٹنگ روم میں نہیں آ رہا تھا۔ ناشتے سے کھانا تک وہ اپنے کمرے میں ہی لٹکوا لیا کرتا تھا۔

”ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے، کسی دشمن نے اپنا کچھ ایسا کروا دیا ہے..... جس سے پریشانیوں نے پیچھا لے لیا ہے۔“ ساس نے بہو کی بات سن کر تائید کی۔

”یقیناً ان کے بزنس کے حریف ہی ہوں گے۔“

”وہ بھی ہو سکتے ہیں، اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہو سکتے ہیں۔“

”کیوں ہو سکتے ہیں ہم نے کسی کا بھلا کیا بگاڑا ہے؟“ بڑے لوگوں کے دشمن تو ان کی جان کے ساتھ ملے ہوتے ہیں اور یقیناً ایسا ہی کسی نے کچھ کر دیا ہے..... جو میرا یہ گھر تباہ و برباد ہو رہا ہے۔“ دادی نے لگو گیر سے لہجے میں کہا۔ ”میں کل ہی کسی اچھے سے آگے کے پاس جاتی ہوں، وہ مجھے بتائے گا کہ ہوا کیا ہے.....؟“

”بابے..... اچھے کہاں ہیں.....؟“ بہو نے کہا۔

”کیوں نہیں ہیں..... بالکل ہیں، اکثر لوگوں کے کام جو اٹکے ہوئے ہوتے ہیں وہ کیسے ہو جاتے ہیں؟“

”ایسے لوگ اگر کسی کے پاس نہ بھی جائیں تب بھی ان کے کام ہو جائیں گے۔ خواہ مخواہ..... بے مال لوگ..... بابوں کو کرڈٹ دے دیا کرتے

ہیں۔“

”میں تو ضرور ڈھونڈوں گی..... کسی نیک بزرگ کو جو مجھے یہ بتا دے کہ میرے گھر پر یہ پریشانیوں کی برسات کیوں ہو رہی ہے۔“

☆☆☆

دادی کا پروگرام ہی ٹپٹ سا ہو گیا کہ شاید کی طبیعت ایسی تیزی سے بگڑی کہ سمجھ ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے..... اس کے ہاتھوں نے یکدم کام کرنا..... چھوڑ دیا۔ پہلے تو ہاتھوں کی حرکت متاثر ہوئی تھی، دستخطوں میں فرق آیا تھا پھر ڈرائیونگ کرنا مشکل لگا۔ وہ تو گھر میں ڈرائیوروں کی فوج تھی یہ پریشانی کبھی پریشانی ہی نہیں لگی مگر جب ایک ساتھ دونوں ہاتھ..... جیسے پتھر کے ہو گئے تو شائستہ بیگم تڑپ ہی اٹھیں۔

”تین بچوں میں ایک بچہ ہی تو بچا تھا..... تو وہ بھی معذور ہو گیا۔“ ان کا تو خیال تھا کہ شاید اس کو فالج ہوا ہے مگر جب ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے اس کا معائنہ کیا..... تو انہوں نے بتایا کہ یہ ایسی بیماری ہے جس میں رفتہ رفتہ تمام اعضا اپنا کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

”اُف ہرا بھرا..... گلستان جیسا گھر..... کسی صحرا میں تبدیل ہو گیا تھا۔“ وہ شخص..... جس نے بدلے کی آگ میں ایک بے گناہ خاندان کو عذاب میں ڈالا تھا وہ خود اس سے دس گنا عذاب میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ان کے گھر کھانا پکنا تو ضرور تھا مگر اسے کوئی کھانا نہیں تھا۔

”اب کس اعضا نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔“ شائستہ بیگم تو سانس کی سی ہو گئی تھیں..... اور دن میں پچاس مرتبہ جا کر شاید کو دیکھ کر پوچھا کرتی تھیں۔ سرفراز صاحب نوکروں پر رحم و کرم پر تھے۔ یا تو وہیل چیئر پر بیٹھے گالیاں دیتے رہتے یا پھر اپنے بیڈ پر لیٹے سوتے رہتے مسکن ادویات کے زیر اثر..... نیند کا غلبہ حاوی رہتا تھا۔ بچی کبھی صرف ایک فیکٹری رہ گئی تھی..... جسے ملازم دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے

☆☆☆

ریحان اپنے دوست کو دیکھ کر اسپتال وارڈ سے باہر نکلا..... وہ اسپتال کی راہداری نیچی نظریں کیے طے کر رہا تھا کہ اچانک وہ کسی خاتون سے ٹکرایا۔ اس سے قبل کہ وہ نیچے گر جاتیں، اس نے سرعت سے انہیں اپنے بازوؤں سے سنبھال لیا۔

”سوری آنٹی، غلطی میری تھی۔“ ریحان نادم سے لہجے میں بولا۔

”نہیں بیٹا..... غلطیاں شاید ہم نے ہی کی ہیں جس کی سزا ہمیں مل رہی ہے۔“ وہ دھیمے سے لہجے میں بولی تھیں۔ انداز..... خود کلامی جیسا تھا..... مگر ریحان نے ان کا ایک ایک لفظ بخوبی سن لیا تھا۔ ریحان نے پہلی مرتبہ انہیں چونک کر دیکھا۔ شکل جانی پہچانی سی لگی مگر اسے یہ یاد نہیں آیا کہ انہیں دیکھا کہاں ہے اس اثنا میں وہ تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔ ریحان نے نہ چاہتے ہوئے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا کہ وہ کہاں گئی ہیں تو اسے وہ نظر ہی نہیں آئیں۔

”پتا نہیں کون تھیں اور کدھر مڑ گئیں۔“ اسے حیرت سی تھی۔ ”مگر مجھے ایسا ضرور لگ رہا ہے کہ اس سے پہلے میں نے انہیں کہیں دیکھا ضرور ہے۔“ کہاں دیکھا ہے یہ وہ جان ہی نہیں پار رہا تھا۔

”ہوں گی کوئی۔“ اس نے اپنے سر کو جھٹکا۔ ایک جیسی شکل صورت کے بہت سے لوگ ہوتے ہیں مگر ان کی آواز اور آواز میں چھپا درد اس کے دل کو ہلا سا گیا تھا مگر یہ چند لمحوں کی بات تھی مگر جا کر وہ ان کو بھول گیا۔

دو چار روز کے بعد اس کا پھر اسپتال جانا ہوا اس کا دوست نہ صرف اس کا پڑوسی تھا بلکہ وہ اس کے بچپن کا ساتھی بھی تھا دونوں نے ایک ساتھ ہی اسکول کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان دنوں وہ ڈیٹنگی

ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء

وائر کا شکار تھا جسے دیکھنے وہ ہر دوسرے دن اسپتال جا رہا تھا۔ ان ہی خاتون کو برابر کے کمرے سے لے کر دیکھ کر اسے تعجب سا ہوا۔ دوست کی والدہ سے کہا کہ پڑوس کے کمرے کی خاتون پتا نہیں کیوں جانی پہچانی سی لگی ہیں۔

”یہ اپنی بیٹی کے ساتھ ہیں، ان کی جوانی ڈیپریشن کی مریضہ ہے۔ ایسی کم عمر اور خوب صورت لڑکی کو اس مرض میں گرفتار دیکھ کر مجھے تو صدمہ ہوا۔“ دوست کی والدہ نے بتایا۔

”سنیں..... ڈیوٹی ڈاکٹر کو جلد بلائیں نہاں! پھر دورہ سا پڑا ہے۔“ خاتون کی آواز سنائی دی تو وہ بے اختیار بھاگتا ہوا ڈاکٹر کے روم تک چلا گیا۔ جب ان کے ساتھ وہ اپنے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوا تو وہ دشمن جاں بستر پر یوں ساکت لیٹی نظر آئی جیسے اس کے جسم کا سار خون نکال لیا گیا ہو۔ اس کے چہرے پر دکھ اور تکلیف کے تاثرات تھے مائے کے ساتھ ڈاکٹر کھڑی اسے چیک کر رہی تھی وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس سے اس کے دل کی یہ حالت بھی جیسے دکھ اور کرب نے اسے جیسے جکڑ سا لیا ہو۔

”نہاں ایسی حالت تک پہنچ گئی ہے۔“ اس نے اپنا سر جیسے تمام سا لیا۔ ”ایک ناکردہ گناہ کی سزا ایک معصوم لڑکی سے اس کی زندگی تک چھین رہی ہے۔“ ڈیوٹی ڈاکٹر سے وہ نہاں کی خیریت دریافت کر رہی تھی تو وہ اسے ان کا فیملی ممبر جان کر بتاتے ہوئے بولیں۔

”یہ لڑکی اب تک زندہ ہے ہمیں اس پر ہی حیرت ہے ورنہ اس نے جتنی ڈینی اذیتیں سہی ہیں اس میں اس کا برین ہمیرج ہونا یقینی تھا اور تو ان لوگوں کے مالی حالات بھی ایسے ہیں کہ وہ اسے گھر لے جانے پر تیار ہیں۔“

”اگر میں اس کے علاج کا خرچہ آپ کو پیشگی اے دوں تو کیا آپ انہیں اپنے اسپتال میں روک لیں گی؟“

”بے حد خوددار لوگ ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ آپ کا احسان لینا پسند بھی کریں گے یا نہیں.....“

”آپ انہیں ہرگز یہ نہیں بتائیں گی کہ ان کے ہڈیکل کابینے میں ادا کروں گا۔“ ریحان نے دل گزرتے سے لہجے میں کہا۔

”آپ کا تعلق یقیناً ان کے عزیز واقارب میں سے ہوگا۔“ ڈاکٹر ریحان پر ستائش بھری نگاہ ڈال کر بولی۔

”جی۔“ اس سے مختصر جواب شاید ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

”آج کل تو لوگ اپنے نام کی خاطر لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور جہاں نام غائب ہو جائے وہاں وہ مدد سے بھی ہاتھ کھینچ لیا کرتے ہیں۔“

”مجھے اس قسم کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ وہ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

”تو کیا میں ریاض صاحب کو یہ بات بتا دوں کہ اب ان کو مریضہ کو اسپتال سے لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ان کی بیٹی کا علاج مفت ہو جائے گا۔“

”جی آپ کہہ دیجیے اور مجھے بتادیں کہ میں آپ کو فی الفور کتنے پیسے ادا کروں۔“ جیب سے اپنی چیک نکالتے ہوئے ریحان نے پوچھا۔

”نی الوقت آپ ایک لاکھ روپے جمع کروادیں گے کی بیشی کی صورت میں آپ سے رابطہ کر لیا جائے گا۔“

”میں روزانہ اسپتال آؤں گا تاوقتیکہ مریضہ یہاں سے رخصت نہ ہو جائے۔“

”ایسے لوگ کم ہوتے ہیں مگر ہوتے ضرور ہیں۔“ ڈاکٹر شاہ جو اس اسپتال کی آنر بھی تھیں نے

ریحان سے کہا مگر ریحان کو تو ان کی کوئی بات سنائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کمرے کے باہر وزیر روم کے صوفے پر بیٹھ گیا، یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے کمرے پر پوری پوری نظر رکھی جاسکتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہو سکتا تھا کہ کون اس کو دیکھنے کے لیے آ رہا ہے اور کس وقت ڈاکٹر اس کے چیک اپ کے لیے جائیں گی۔

دوسرا دن تھا جب وہ اپنے آفس کے وقت سے یہاں آ کر بیٹھ گیا تھا اور گھر جانے کے ٹائم پر وہاں سے روانہ ہو گیا تھا وہ ایسا کیوں کر رہا تھا یہ نہ اسے معلوم تھا اور نہ ہی اس بارے میں وہ کچھ جانتا تھا۔ وہ تو کسی معمول کی طرح آ رہا تھا اور وقت مقررہ پر جا رہا تھا۔ دماغ کیا کہہ رہا تھا اس سے وہ قطعی لاعلم ہو چکا تھا یا دماغ کی کوئی بات اسے سنائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ ان دنوں صرف اپنے دل کا کہا مان رہا تھا۔ اس کا دل جو کہہ رہا تھا وہ وہی کر رہا تھا اور اس کے لب نہاں کی صحت اور زندگی کے لیے دعا گو تھے۔

”نہاں کی والدہ کا گھر سے فون آیا ہے، ریاض صاحب کے اچانک ہمد میں چوٹ لگ جانے کے باعث آج وہ اسپتال نہیں آ پائیں گی آپ چونکہ ان کے عزیز ہیں تو پلیز آپ ہی جا کر انہیں کھانا کھلا دیں۔ انہوں نے تو ایسا کرنے کے لیے کسی نرس کو کہا ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ عزیز واقارب کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔“ تیسرے دن ڈاکٹر شاہ نے اس سے کہا۔

”جی ضرور۔“ ریحان نے سنبھل کر کہا۔ ”نہاں کو کھانے میں کسی پرہیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔“ ریحان نے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”نہاں ہر چیز کھا سکتی ہے، خدا نخواستہ اسے کوئی جسمانی بیماری تھوڑی لاحق ہے۔“ ریحان جب کھانا لے کر اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ پیٹھ سوڑے دیوار کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ

کوئی اس کے کمرے میں کھانے کی ٹرے لیے کھڑا ہے۔

”بس، مجھے ڈاکٹر شاہ نے آپ کا کھانا دے کر بھیجا ہے۔“ ریحان نے دھیمے سے لہجے میں کہا مگر لہجے میں محبت کی شیرینی کھلی ہوئی تھی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے، واپس لے جاؤ۔“ پیٹھ موڑے موڑے کہا گیا۔

”سوری، یہ نہیں ہو سکتا۔“ ریحان کا لہجہ وٹوق بھرا تھا۔

”میں نے کہا ہے ناں، مجھے نہیں کھانا۔“ نہاں نے اس کی جانب کروٹ بدلی اسے دیکھا اور قدرے حیرانی سے بولی۔ ”آپ کون ہیں؟“

”مجھے ڈاکٹر شاہ نے بھیجا ہے، آپ کو کھانا کھلانے کے لیے۔“

”اوہ..... اس اسپتال میں کام کرتے ہیں؟“ ”میرا کام یہ ہے کہ آپ کھانا ضرور کھائیں گی ورنہ انجکشن اور ٹیبلٹس کوئی اثر نہیں کریں گی۔“

”میں گولیاں کھا کر تھک چکی ہوں اب کچھ کھایا نہیں جاتا۔“ وہ شکوے بھرے لہجے میں بولی۔

”اگر مریض باقاعدگی سے کھانا لینا شروع ہو جائے تو اس کی ادویات رفتہ رفتہ ختم کر دی جاتی ہیں۔“ ریحان کی پیشہ ور ڈاکٹر کی طرح بولا۔

”جب میں جینا ہی نہیں چاہتی تو مجھے کیوں پچالیا گیا، مرجانے دیا ہوتا مجھے۔“ وہ اتنے دھیمے لہجے میں بول رہی تھی جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔

”اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو، اللہ آپ کے والدین کی خوشیوں کو سلامت رکھے جن کی واحد خوشی صرف آپ ہیں۔“

”ڈاکٹر صاحب، آپ میرے ای ابو سے ملے

ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں جب میری ڈیوٹی ہوتی ہے تو ان ملاقات ہو جاتی ہے۔ آپ کے ای ابو بہت اچھے ہیں بلکہ اتنے اچھے ہیں کہ ایسے والدین تو خوش قسمت اولاد کو ملا کرتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، ڈاکٹر شاہ بھی یہی کہتی ہیں۔“

”آپ یہی چاہیں گی کہ آپ کے طفیل ان خوشیاں ملیں۔“

”ہاں۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”تو آپ یہ کھانا کھا لیجے آپ کی ذات سے ہر بات ان کے لیے خوشی کا درجہ رکھتی ہے۔“ نہاں نے ایک لقمہ توڑ کر اپنے منہ میں رکھا۔ دوسرا نوالہ منہ میں لیا۔

”شاباش، آپ تو بہت اچھی ہیں۔“ ریحان نے کہا۔ تیسرا لقمہ جو وہ اپنے منہ میں لے جانے والی تھی اس کے منہ میں جانے سے پہلے ہی اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ ڈبڈبا کر آنکھوں سے ریحان کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں، میں تو بالکل بھی اچھی نہیں ہوں۔ میں تو بہت بری لڑکی ہوں اتنی بری جس کو کالج سے نکال دیا گیا۔ ایسی خراب جس اپنے والدین کے چہرے پر کالک مل دی.....“ ہر اس کی سانس تیزی سے چلنا شروع ہو گئی، ہاتھ ہل مڑنے لگے۔ اس سے قبل ریحان اسے دیکھتا یا اسے کچھ کہتا نہ تھا پر دورہ پڑ چکا تھا اور وہ ہوش کی دنیا سے دور بے ہوشی کی چادر اوڑھ چکی تھی۔

”ڈاکٹر شاہ جلدی سے آئیں۔“ ریحان چلا ہوا باہر بھاگا اور ڈاکٹر شاہ کے ساتھ ان کی نرس بھی بھاگتے ہوئے نہاں کے روم میں داخل ہو گئیں۔

وہ ساتواں دن تھا ریحان نہاں کے کمرے کے باہر صوفے پر بیٹھا تھا۔ نہاں کی والدہ اس کے کمرے میں تھیں۔ نہاں کی طبیعت میں خاصا افاقہ تھا آج وہ چہل قدمی کے لیے بھی کمرے سے باہر نکلی تھی اور ریحان اس کو دیکھ کر سرشار سا ہو گیا تھا۔ اس دقت وہ اپنے صوفے پر بیٹھا سوچوں میں گمن تھا۔ جب ڈاکٹر شاہ اس کے برابر آ کر بیٹھیں اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”مسٹر ریحان احمد، کیا آپ مجھے بتانا پسند کریں گے نہاں سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“ اس اچانک حملے کے لیے ریحان تیار نہیں تھا، وہ گڑبڑا کر مسز شاہ کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

”میری بات کا جواب تو دے دو۔“

”کیا دوں؟“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”نہاں تمہیں پسند ہے؟“ مسز شاہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”جی۔“ وہ دھیمے سے بولا۔

”کب سے؟“

”جب اسے پہلی مرتبہ آج سے تین سال پہلے دیکھا تھا جب سے ہی..... مگر مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا۔“

”بہت محبت کرتے ہو اس سے؟“

”ہاں بے حد..... اور چاہت بھی اتنی کہ جتنا کہ میرے جسم میں خون رواں ہے۔ اس جتنی اہم ہے میرے لیے وہ۔“

”یہ بھی جانتے ہو کہ اس کے ساتھ کیا کیا ہوا ہے؟“

”ہاں، یہ سب بہتان ہے اس پر بیتی ہوئی ہر تکلیف سے آگاہ ہوں۔ میں اس کی سچائی کا گواہ ہوں۔“

”ریاض صاحب کی مالی حالت بہت ناگفتہ بہ

”کیا بات ہے بیٹا، طبیعت تو تمہاری ٹھیک ہے بائیں؟ صبح برائے نام ناشتا کر کے جو جاتے ہو تو دن میں ایک بار بھی فون نہیں کرتے۔ اگر مجھے کسی کام سے تم سے رابطہ کرنا پڑ جائے تو تمہارا موبائل مستقل بند ہوتا ہے۔ رات کو جب گھر آتے ہو تو چند نوالے کھا کر اپنے کمرے میں گھس جاتے ہو؟“ ریحان کی ای ای اس سے شکایت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”ای ان دنوں آفس میں کام زیادہ ہے اس میں لگا ہوا ہوں، گھر آ کر بھی لپ ناپ پر کام کرتا رہتا ہوں۔ آفس کے کام سے فراغت ہو تو کسی دوسری جانب دیکھوں۔“ ریحان نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔

”بیٹا اتنا کام کرو گے تو بیمار ہو جاؤ گے۔ اپنے آپ کو بھی تو دیکھو، اپنے لیے بھی کچھ وقت نکالو آفس کی مصروفیات میں گئے رہو گے تو ہر طرف سے کٹ کر رہ جاؤ گے۔“ ساجدہ بیگم بیٹے سے پیار بھری ڈانٹ سے بولیں تو ریحان نے اپنا سر جھکا لیا اور دل میں سوچنے لگا ان دنوں وہ صرف اپنا ہی تو خیال رکھ رہا تھا وہ تو پہلے نہاں سے کٹا ہوا تھا کہ جانتے ہوئے بھی اسے جان نہ پایا تھا اور جب سے وہ اسپتال جانا شروع ہوا تھا تو اسے معلوم ہوا تھا کہ یہ نہاں ہی تھی جو پہلے دن سے اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔

جب اس نے پہلی مرتبہ اسے لفٹ دی تھی اس کا وہ رومال جو وہ گاڑی میں چھوڑ گئی تھی آج تک اس کی سیف میں موجود تھا۔ کتنی ہی بار غیر ضروری چیزوں کو اس نے اپنی الماری سے نکال باہر کیا تھا مگر ہر مرتبہ وہ رومال وہ دوبارہ اپنے سیف میں رکھ لیا کرتا تھا اور اس کیوں کا مطلب بھی وہ نہیں جانتا تھا یا پھر وہ اس کا راف جو وہ لیتے لیتے رہ گئی تھی اور شاپ سے باہر چلی تھی، وہ بھی تو اس کی الماری میں یوں محفوظ تھے جیسے اس کو استعمال کرنے والی نے وہیں آنا ہو۔

ہے، کیا تمہارے گھروالے ایسے گھرانے کی لڑکی کو بطور بھوتبول کر سکتے ہیں؟“

”بالکل کر سکتے ہیں۔“ ریحان کا لہجہ آہنی سا تھا۔

”تو پھر تم ہی وہ شخص ہو گے جو نہاں کو زندگی کی جانب دوبارہ لاؤ گے۔ اس کا اعتبار بالکل ختم ہو گیا ہے، تمہیں اس کا ریزہ ریزہ ہوتا ہوا بھروسا جوڑنا ہوگا۔“

”ڈاکٹر صاحب، میں ایسا ضرور کروں گا۔“

”بیٹا میرا یہ تجربہ ہے کہ ہر مریض کی صحت یا بل میں ففٹی پرسنٹ اس کی امید کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جن مریضوں کی امیدیں دم توڑ دیتی ہیں ان کو ادویات بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا پاتیں اس لیے تم نے نہاں میں دل باور کو پیدا کرنا ہوگا۔“

”مگر میں ایسا کیوں کر کر سکوں گا۔ آپ جانتی ہیں کہ نہاں اور اس کا گھرانہ کتنا محتاط گھرانہ ہے اور ایسے میں بھی کہ ان کا اعتبار پارہ پارہ کیا گیا ہے۔“

”یہ میں تمہیں خود بتاؤں گی کہ تمہیں کرنا کیا ہوگا۔“

مسز شاہ نے اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری آنکھوں اور تمہارے محبت بھرے رویے نے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ تم نہاں کے لیے اپنے دل میں کیا محسوس کر رہے ہو اور تم کیسے ہو اللہ تمہیں سلامت رکھے۔“

☆☆☆

”پہلے والا بابا تو پچاس ہزار نقد، چار بکرے اور ڈھیر ساری چیزیں نکل گیا اور کہہ دیا ہے کہ سارے رشتے دار آپ کے دشمن ہیں۔ انہوں نے ہی یہ جادو ٹوٹا کیا ہے کہ آپ لوگ تباہ و برباد ہو جاؤ۔ وہ اس جادو کے توڑ کے لیے پانچ لاکھ مانگ رہا ہے تاکہ ہماری فیملی پر آئی ہوئی یہ نحوست اور پریشانی ختم

ہو سکے۔“ دادی نے اپنی بھوگو اپنی یہ ساری روداد سنا لی۔

”نہیں اماں، میں نہیں مانتی اور نہ ہی ان بابوں پر یقین رکھتی ہوں اور نہ ہی مزید پانچ لاکھ خرچ کرنے کی خواہش مند ہوں۔“

”اگر پیسے نہیں خرچ کرو گی تو بیٹے کی طبیعت کیسے ٹھیک ہو گی تمہارے۔“ دادی جان نے کہا تو وہ ان کے سامنے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ ڈاکٹر اس کی زندگی سے مایوس تھے۔ ایک ہنستا کھیلنا لڑکا کس طرح ایک معذور وجود میں ان کے سامنے پڑا تھا۔ اب وہ جو بول رہا تھا وہ ان کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ ہاں اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تکلیف اور بے چینی سے وہ ایسی اذیت کا شکار ہو گئی تھیں جس کی تشریح بیان نہیں کی جاسکتی۔

ہر ماں صرف ماں ہی ہوتی ہے وہ کسی کو بھی یہ بتا ہی نہیں سکتی کہ اسے اپنی اولاد سے کتنی اور کس قدر محبت ہے اور اولاد کی تکلیف کوئی بھی ماں نہیں جھیل سکتی۔ بیٹے کی تکلیف اور اذیت کا ہر احساس وہ اپنے جسم میں محسوس کیا کرتیں۔ انہیں ایسا لگتا نہ جانے کتنے نشتر جو آگ پر دھکے ہوئے ہوں وہ ان کے جسم میں بار بار پوست کیے جا رہے ہوں۔ ایسے میں آنکھوں سے آنسو نہیں ایک برسات جاری ہو جاتی ہے ایسی برسات جو رکنے میں ہی نہیں آتی۔

☆☆☆

ساجدہ بیگم خاندان کی کسی تقریب سے ہو کر آئی تھیں اور سخت پریشان ہی تھیں آنکھوں میں آنسو لٹا لٹا کر آ رہے تھے۔ ان کے میاں جو کسی وجہ سے ان کے ساتھ نہیں گئے تھے وہ انہیں اس طرح دیکھ کر گھبراے گئے۔

”کیا طبیعت خراب ہو رہی ہے تمہاری؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ہاں، آج ایسی باتیں سن گئی ہوں کہ دماغ پھٹا سا جا رہا ہے۔“

”ہوا کیا ہے آخر جو تمہاری حالت اتنی ناگفتہ بہ سی ہو رہی ہے؟“ تب انہوں نے نہاں کی ممکنہ ختم ہونے، ڈرنٹی پیچرز کی وجہ سے اس کے بیمار ہونے کی روداد سنا ڈالی۔

”بے چارے ریاض بھائی کتنی پریشانیاں جھیلے رہے اور ہمیں پتا تک نہیں چلا۔“

”ان دنوں بھی ان کی بیٹی اسپتال میں ایڈمٹ ہے اور نسرین بھابی کا ایک بچہ گھراور دوسرا اسپتال میں ہے۔“

”آخر ان سے رشتے داری ہے، تم ریحان کے ساتھ جا کر اسے دیکھ آؤ۔“

”ٹھیک ہے، میں جاؤں گی۔“

☆☆☆

”یہ ریحان احمد ہیں جب تو یہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کرتے ہیں مگر اچھے نفسیات دان ہیں میں نے ان سے ریکورسٹ کی ہے کہ نہاں سے بات کر کے اس کے ذہن کے وہ جالے ضرور صاف کریں جو خوف اور ہراس نے اس کے دل و دماغ پر باندھ دیے ہیں۔“ ڈاکٹر شاہ نے ریاض صاحب اور ان کی بیگم سے ریحان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر صاحب آپ کے اسپتال میں ایسی کوئی خاتون معالج نہیں ہیں کیا، آپ تو جانتی ہیں کہ نہاں پردہ کرتی ہے۔“ ریاض صاحب نے کہا۔

”آپ بے فکر رہیے یہ نرس کی موجودگی میں یا آپ کی بیگم کے سامنے ہی انہیں پیکچر دیں گے اور بس کہ امید افزا باتیں بھی ہر مریض کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہیں اور نہاں کے لیے تو ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ وہ کہیں سائیگی نہ ہو جائے۔“ ریاض صاحب پس و پیش میں پڑ گئے تھے مگر نسرین بیگم نے حای

بھری۔

ریحان جب نہاں کے کمرے میں جاتا تو نسرین بیگم بظاہر تو ہاتھ میں کتاب لیے پڑھتی نظر آتیں مگر ان کے کان اسی کی باتوں کی جانب ہوتے۔

”نہاں صاحبہ کبھی آپ نے سورج نکلنے دیکھا ہے کہ رات کی تمام سیاہی کو نگل کر سورج کس طرح نمودار ہوا کرتا ہے۔ ایسی اندھیری راتیں جس میں ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیا کرتے، صبح ہوتے ہی وہ غائب ہو جاتی ہیں اور ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے اندھیرا کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ یہی مثال زندگی کے زخموں کی ہے ان پر جب کھرٹا آ جائیں تو ان کو نوج کر ہمیں ان زخموں کو کبھی تازہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ بھول جانا چاہیے۔ ہر بری بات بھلا دینا ہی عافیت کی نشانی ہوا کرتی ہے۔“

”کیا بھول جانا بہت آسان ہوتا ہے؟“ نہاں نے پوچھا۔ ”کیا ہر شخص خود پر ہونے والے ظلم فراموش کر سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں کر سکتا..... خزاں آنے پر جب درختوں کے سارے پتے جھڑ جاتے ہیں اور بہار کا موسم نئے شگوفے لاتا ہے تو آپ کے خیال میں اس درخت کو اس بات کے لیے افسردہ ہونا چاہیے کہ اس کے سارے پتے جھڑ گئے تھے یا اس بات کے لیے خوش کہ اس پر نئی کوئلیں پھوٹ رہی ہیں، نئے شگوفے آئیں گے۔“ ریحان نے مسکرا کر نہاں سے پوچھا۔

”خوش ہونا چاہیے۔“ وہ پھٹکی سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر بولی۔

”بالکل ٹھیک کہا ہے آپ نے۔“ ریحان نے کہا۔ ”اور یہی نظریہ ہمارا زندگی کے ساتھ ہونا چاہیے کہ بری باتوں کو بھول جائیں برے لوگوں کو بھول جائیں اور اچھی باتوں کو یاد رکھیں۔“

”بیٹا تم تو بہت اچھی باتیں کرتے ہو۔“ ایک

دن نسرین بیگم نے اس کی باتیں سنتے ہوئے کہا۔
”آئی اچھی باتیں پھولوں کی طرح ہوتی ہیں جو ہمیں خوش اور مسرور رکھتی ہیں اور بری باتیں کانٹوں کی طرح ہوتی ہیں جو ہمیں دل گرفتہ اور ڈپریشنڈ رکھتی ہیں۔ اس لیے ہم سب کو نہ ایسی باتیں کرنی چاہیے اور نہ ہی سنتی چاہیے۔“
”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ نہاں نے سنجیدگی سے کہا۔

”جب ہی تو ایسی محفلوں میں جانا برا سمجھا جاتا ہے جہاں دل آزاری کی باتیں کی جائیں یا خلاف شرع، یہ میں نہیں ہمارا دین کہتا ہے۔“ نہاں کا اعتماد دھیرے دھیرے بحال ہو رہا تھا اور مسز شاہ اس کی ذہنی صحت کی جانب سے بھی مطمئن ہو رہی تھیں مگر ایک شام بڑی عجیب سی پھوٹیشن ہو گئی جب ساجدہ بیگم بڑا سا بوکے لے کر نہاں کو دیکھنے اسپتال پہنچیں تو انہیں نرس نے کمرے میں جانے سے روکتے ہوئے کہا۔
”پلیز، آپ کو تھوڑی دیر ٹھہرنا ہوگا۔“
”مگر کیوں؟“ انہوں نے حیرت سے نرس سے کہا۔

”مریضہ کی تھراپی کی جارہی ہے۔“ ساجدہ بیگم باہر ہی بیٹھ گئیں اور جب تھوڑی دیر بعد ریحان سر جھکائے اس کے کمرے سے باہر نکلا تو وہ حیرت سے اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔ اس نے تو انہیں منع کر دیا تھا کہ وہ آفس کی مصروفیات کے باعث ان کے ساتھ کہیں جائیں سکے گا اور وہ خود نہاں کے پاس موجود تھا مگر وہ اپنی حیرت کو چھپا کر جب اندر کمرے میں گئیں تو نسرین بیگم، نہاں کو جوس پلا رہی تھیں۔
”ابھی شاید کوئی ڈاکٹر صاحب چیک کر رہے تھے؟“ ساجدہ بیگم نے ہوا میں تیر چلایا۔
”نہیں، ریحان احمد ڈاکٹر نہیں ہیں مگر ڈاکٹر شاہ نے انہیں ریکمنڈ اس لیے کیا ہے کہ وہ ایک اچھے

166 ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء

نفسیات داں بھی ہیں۔“
”اوہ.....“ انہیں ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ نہاں کو دیکھ کر اور اس سے باتیں کر کے ساجدہ بیگم کا ذہن اسی لمحے میں الجھار ہا کہ ریحان اس فیملی سے متعارف کس انداز میں ہوا ہے اور کب سے جانتا ہے اور یہ بات اس نے ان کو اب تک کیوں نہیں بتائی اور اس بات کو چھپانے سے اس کا مقصد کیا ہے۔

ساجدہ بیگم ایک تعلیم یافتہ ماں تھیں اور انہوں نے کبھی اپنی مرضی اور پسند اس پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی تھی، یہ خیر قطعی دوسری بات تھی کہ مینا سے ریحان کی منگنی کے بعد وہ ضرور یہ خواہش مند تھیں کہ مینا سے یہ ناتا کسی طرح بھی ختم ہو جائے تو اس میں ریحان کی کوئی ایسی پسند انہیں نظر نہیں آئی تھی کہ وہ مینا کے لیے دیوانہ ہو رہا ہو اور نہ ہی منگنی ٹوٹنے کے بعد وہ کوئی دل گرفتہ سا ہوا تھا مگر آج نہاں کے کمرے سے نکلتے وقت ریحان کا چہرہ جیسے روشن اور مدہوش سا انہوں نے دیکھا تھا۔ ایسا روپ تو اپنے بیٹے کا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ رات کو جب ریحان گھر آیا تو انہوں نے بیٹے سے پوچھا۔

”یہ آفس کی تمہاری مصروفیات کب ختم ہوں گی اب تو تمہاری شکل ہی گھر میں نظر نہیں آتی۔“
”امی یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔“ اس کا لہجہ انہیں کھویا کھویا سا لگا۔

”تمہاری خالہ کی طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی ہے، تم ان کے پاس چکر لگا لیتا وہ تمہیں یاد بھی کر رہی ہیں۔“ ساجدہ بیگم نے بیٹے سے کہا کہ وہ اپنی خالہ کے گھر بہت شوق سے اس وجہ سے بھی جاتا تھا ان کے بچے نہیں تھے اور وہ ریحان سے بہت محبت کرتی تھیں۔

”خالہ بی کو کیا ہوا ہے؟“ وہ چوہکتے ہوئے بولا۔

”ہوا تو کچھ نہیں مگر آج کل انہیں ہر وقت کی صفائی کا مراقبہ سا ہو گیا ہے، ہاتھ دھوئیں گی تو دھوئی ہی رہیں گی، ڈسٹنگ کریں گی تو کرتی ہی رہیں گی۔“
”یہ تو اچھی بات ہے۔ صفائی کی عادت تو ہر ایک میں ہونی چاہیے۔“ وہ مسکرایا۔ ”اس میں پریشان ہونے کی کون سی بات ہے۔“
”نہیں بیٹا، ہر چیز میانہ روی میں صحیح لگتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شاہانہ کچھ سائیکی سی ہو گئی ہے۔“
”اگر ایسی کوئی بات ہے تو انہیں نفسیات کے کسی ڈاکٹر کو دکھائیں۔“

”تمہاری نظر میں ہے کوئی ایسا؟“ ساجدہ بیگم نے کریدادیکھوں موصوف کیا فرماتے ہیں کہ خود بھی تو باہر نفسیات کا روپ دھارے ہوئے ہیں۔
”امی نہ تو میں ڈاکٹر ہوں اور نہ ہی کوئی نفسیات داں مجھے کیا معلوم۔ میں اپنے آفس میں ضیا صاحب سے پوچھ لوں گا ان کی دائف ڈاکٹر ہیں شاید وہ کسی اچھے ڈاکٹر کا نام بتادیں اور وہ آپ سے خود ہی رابطہ بھی کر لیں گی۔“

”وہ تو میں بھی کسی اچھے اسپتال سے پوچھ سکتی ہوں، میں نے سوچا شاید تمہارے حلقہ احباب میں کوئی ہو۔“
”امی مجھے فرصت کہاں ہے ان دنوں صبح آفس جاتا ہوں تو اس وقت گھر آتا ہوں۔“ ریحان نے کہا تو ساجدہ بیگم کچھ کہتے کہتے رک سی گئیں۔

☆☆☆
شائستہ بیگم، وحید صاحب کی بیگم کو اس وجہ سے پسند نہیں کرتی تھیں کہ وہ بزنس کنٹری میں ان سے کم ہونے کے باوجود اپنی خوش خلقی کی وجہ سے بے حد معروف تھیں۔ وہ تعلیم کے لحاظ سے بھی ان سے بہت آگے تھیں اور شائستگی کے حساب سے بھی۔ حلقہ احباب میں وہ سب کی پسندیدہ ہستی سمجھی جاتی تھیں اور

یہی بات شائستہ کو نا پسند تھی اس لیے وہ ان سے قصداً دور رہا کرتی تھیں مگر اب حالات ایسے تھے کہ ان سے رابطہ ضروری تھا سو انہوں نے ان کو ہی فون کیا۔

”کسی نام نہاد بابا کے بجائے کسی ایسے اللہ والے کو آپ ہمارے ہاں لے کر آئیں جو آکر ہمیں یہ توتما دے کہ ہمارے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ پریشانوں اور آفات نے ہمارا گھر ہی کیوں دیکھ لیا ہے۔“ مسز وحید نے اسی وقت حامی بھر لی تھی کہ وہ گھیں ہی ایسی ہر ایک سے محبت کرنے والی اور ان کے کام آنے والی۔

صرف دو دن بعد ہی وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دین دار شخصیت کو لے کر ان کے ہاں موجود تھیں۔ ڈاکٹر حسین نے نہ صرف ان سے باتیں کیں بلکہ ان کے گھر کے ملازموں سے بھی۔ اگلے دن وہ ان کے فیکٹری گئے اور وہاں موجود لوگوں سے ملے اور انہوں نے ان کے گھر پر ہونے والے پے در پے ہونے والے حادثات اور سانحات کی وجہ بیان کرتے ہوئے نہایت واضح لفظوں میں شائستہ بیگم کو بتا دیا کہ آپ کے گھر پر کسی کی بددعا کا اثر ہے اور بس۔

”نہیں، نہیں یہ جادو ٹوٹا ہے، سفلی کا علم ہے۔ کسی دشمن نے کالا علم بھی کروایا ہے ہم لوگوں پر۔“ داوی جان نے ان کی بات اچک کر بولنا شروع کر دیا۔

”ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے، کسی نے کچھ نہیں کرایا ہے۔ صرف اور صرف بددعائیں ہیں جو آپ لوگوں کو کھاتی چلی جارہی ہیں۔“

”کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔ آج کل تو کسی کی دعا قبول نہیں ہوا کرتی ہے بددعاؤں کی بھلا اوقات ہی کیا ہے اور یوں بھی کوؤں کے کوسوں سے کوئی ڈھور تھوڑی مرا کرتے ہیں۔“ شائستہ بیگم نے تمسخرانہ لہجہ میں کہا۔

”بہن صاحبہ میں آپ کے خیال سے بالکل ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء 167

متفق نہیں ہوں۔ وہ دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں جو صدق دل سے مانگی جائیں اور دعا قبول کرنے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے کہ وہی قادر مطلق ہے جو ہم سب کی دعائیں قبول کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مظلوم کی بددعا بھی تیرے زیادہ تیزی سے جاتی ہے اور عرش کا پردہ ہلا دیتی ہے اور اس سے زیادہ مہلک دنیا کا کوئی ہتھیار نہیں ہو سکتا ہے اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ ہمیشہ مظلوم کی بددعا سے بچو۔“ ذاکر حسین نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اس وقت تو ہم خود ہی مظلوم بنے ہوئے ہیں اور ہماری بددعا تو کیا دعا تک قبول نہیں ہو رہی ہے۔“ شائستہ بیگم کا لہجہ پریشانی سے مزین تھا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ مظلوم کا چولا پہننے سے پہلے آپ کے گھرانے نے ظالم کا کردار بھی ادا کیا ہو؟“

”نہیں جناب ہماری فیکٹریز کی وجہ سے تو لوگوں کو روزگار مل رہے تھے مگر پھر بھی لوگوں نے ہمیں ہی نقصان پہنچائے۔ میری بیٹی لوگوں کے غلط رویوں کی وجہ سے اپنی جان سے گئی۔“

”ایک منٹ۔“ علامہ ذاکر نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ”میں صرف یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کی فیملی کی جانب سے کسی کے اوپر کوئی ایسا ظلم ہوا جس کی جتنی ہزیمت کی جائے وہ کم ہے؟“

”نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوا ہے، ہم تو لاکھوں روپوں کی تو صرف زکوٰۃ دیتے ہیں۔ بھوکے نگوں کو ڈھیروں سامان پہنچاتے ہیں کتنے ہی لوگوں کا ہم نے ماہنامہ وظیفہ مقرر کر رکھا ہے۔“

”یہ سب درست سہمی مگر آپ کی فیملی کی جانب سے واقعی کسی کو کوئی ایسی ایذا نہیں پہنچی جس سے انسانیت بھی کانپ گئی ہو۔“

”نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا۔“ شائستہ بیگم کا لہجہ

اپنی ساتھ۔

”پھر تو مجھے واقعی حیرت ہو رہی ہے۔“

”ہو ہے ایک واقعہ ایسا۔“ دادی جان نے ذہن پر زور دینے کے بعد کہا اور پھر وہ ریاض احمد کو بتا دینے سے لے کر ان کی بیٹی کی ڈرنٹی پکچرز بنوا کر اسے یوٹیوب پر ڈالنے تک کی روداد بتاتی چلی گئیں۔

”جب انسان اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگے تو اس کا کیا حال ہوتا چاہیے۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

”سرفراز کے پلان میں نہ میں شامل تھی اور نہ ہی میرے بیٹے۔۔۔۔۔ تو پھر یہ سزا میرے بچوں کو کیوں بھگتنی پڑی؟“

”جس طرح نیک اعمال کی جزا بے حساب ہوتی ہے اسی طرح برے اعمال کی سزا بھی اندوہناک ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کا دوسرا نام عزت ہے اور سرفراز صاحب نے اس نام کو ہی بدل دیا۔ آپ کیا یہ تصور بھی کر سکتی ہیں کہ کوئی ایسا ظلم آپ کی بیٹی پر کرے۔۔۔۔۔ ایک معصوم اور دین دار بچی پر ایسا ظلم۔۔۔۔۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔“ کسی پر جھوٹا بہتان لگانا گناہ کبیرہ میں شامل ہے۔ یہاں تو انسانیت کے پرچے اڑا دیے گئے اور اس پر یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم نے کیا ہی کیا ہے۔ ہم تو نیک لوگ ہیں بڑے نیک کام کیا کرتے ہیں اور اپنے اس فعل پر شرمندہ تک نہیں ہیں۔“

”غلطی تو ہوئی ہے اب کیا کریں ہم؟“ دادی جان کا لہجہ گلوگیر سا تھا۔ ”میرے پوتے کی حالت کیسی اتر ہے، نہ وہ زندہ میں ہے نہ مردوں میں۔ اس کی ماں اب یہ دعا مانگ رہی ہے کہ اللہ اسے اٹھالے مگر اس کی یہ دعا تک پوری نہیں ہو رہی ہے۔ کیا دنیا کی کوئی ماں ایسی ہوگی جو یہ دعا مانگے کہ اللہ میرے بچے کو موت دے دے اور موت بھی روٹھ کر بھاگ

جائے۔“

”مجھ سے اپنے بچے کی تکلیفیں نہیں دیکھی جاتیں۔“ شائستہ بیگم اب روتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ مسز وحید کے ساتھ ساتھ دیگر لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا جھرنا بہہ رہا تھا۔

”آپ لوگ ریاض صاحب کے گھر جائیں اور ان سے معافی مانگیں اور انہیں جا کر بتائیں کہ ان کو ہر نقصان پہنچانے والے آپ ہی کے گھر کے محترم سرفراز صاحب ہیں جنہوں نے اپنے نام تک کی لاج نہیں رکھی۔ ان سے معافی مانگنے کے بعد آپ سب اللہ سے توبہ کریں کہ وہ رحیم ہے، کریم ہے توبہ پسند کرتا ہے اور توبہ قبول کرتا ہے۔“

☆☆☆

ریحان، نہاں کے پاس موجود تھا۔ آج نہاں کا اسپتال میں آخری دن تھا اس لحاظ سے آج ریحان کی آخری سیٹنگ تھی۔ وہ خوش تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک ہے مگر اس بھی کہ اب ملنا مشکل تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

”ہاتھ کی انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ اگر سب انگلیاں برابر ہوتیں تب بھی شاید کوئی زیادہ فرق نہ ہوتا مگر چھوٹی بڑی انگلیاں بنانے میں یقیناً اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی حکمت ضرور ہوگی جن سے ہم آشنا تک نہیں ہیں۔ اسی طرح انسان بھی ایک جیسے نہیں ہوتے جس طرح اللہ کے نزدیک انسان کی برتری اس کے تقویٰ پر منحصر ہے۔ اسی طرح ہم انسان بھی اچھے اخلاق اور اچھی عادات اور کردار کے حامل افراد کی عزت زیادہ کیا کرتے ہیں۔“ ریحان ایک جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا اور نہاں پر ایک سحر سا طاری ہو رہا تھا۔

”بڑے لوگ بڑی حرکتیں کرتے ہیں اور اکثر ظالموں کی رسی دراز بھی ہو جایا کرتی ہے مگر وہ اللہ کی پکڑ سے کبھی بچ نہیں سکتے۔ برے لوگوں کی مثال ایک سیاہ رات کی طرح ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں

دیتا مگر وہ رات ہمیشہ ختم ہو جاتی ہے، صبح کی کرن رات کی سیاہی کو نگل جاتی ہے تو دن میں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ چند گھنٹے پہلے آسمان پر سیاہ چادر تھی ہوئی تھی۔“

”سر آپ بہت اچھا بولنا جانتے ہیں۔“ نہاں نے تعظیم بھرے لہجے میں کہا۔

”میں جو کہہ رہا ہوں، وہ سچ کہہ رہا ہوں اور سچ ہمیشہ دل کو اور دماغ کو دونوں کو اچھا لگا کرتا ہے۔“

”آج میں اپنے گھر جا رہی ہوں، مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اسپتال میں میرا بہت وقت گزرا ہے شاید کئی سال۔“ وہ دھیمے سے بولی۔

”اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کے ساتھ ہمیشہ خوشیاں بھی عطا فرمائے۔“ ریحان کے لبوں سے نکلنے والے جملے اس کی دل کی آواز بھی تھے۔

”آپ اسی اسپتال میں کام کرتے ہیں؟“ اس نے مصومیت سے پوچھا۔

”نہیں، میرا بھی یہاں آخری دن ہے۔ میں اپنی جاب پر چلا جاؤں گا۔“

”آپ کو بھی اسپتال سے جا کر خوشی ہو رہی ہوگی۔“ بھولپن سے وہ بولی۔

”ہاں بہت۔“ ریحان مسکرایا۔

”اب مجھے اجازت دیں شاید کبھی آپ سے ملاقات ہو یا شاید نہ ہو۔۔۔۔۔ اس لیے اب مجھے اجازت دیں۔“ ریحان اس پر ایک بھرپور نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

”سر میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ نہاں نے سلام کرتے ہوئے کہا اور ریحان مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے اس کے کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

نہاں اسپتال سے گھر آ گئی تھی اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سالوں کی مسافت طے کر کے کہیں سے

آئی ہو۔ اپنے گھر میں آکر وہ اس کے چہرے پر یوں گھوم رہی تھی جیسے وہاں پہلی مرتبہ آئی ہو۔ کسی کام سے وہ اسٹور روم میں گئی تو چچان پر رکھی مہندی کی تھالیاں اسے نظر آئیں۔ جب اس کی مہندی والے دن لڑکے والے انکار کر گئے تھے تو ای نے وہ تھالیاں کسی شاپر میں باندھ کر چچان پر ڈال دی ہوں گی اور اب شاپر کے پھٹ جانے کے باعث وہ بھی سجا کی تھالیاں نہ صرف جھانک رہی تھیں بلکہ اس کی یادوں کی کھڑکی کو بھی کھول رہی تھیں۔

”کیسا آیا تھا طوفان جو میری سیدی سادی زندگی کو تہس نہس کر گیا۔ شادی کیسے اچانک ہی ختم ہو گئی تھی۔“ نواز کا خیال ہی اس کے ذہن میں بیسیں پیدا کر رہا تھا اور اسے ریحان کے یہ جملے یاد آرہے تھے۔

”زندگی کے اس چلن پر اگر ہم کار بند ہو جائیں کہ ہمیں اچھی باتیں یاد رکھنی ہیں اور بری باتوں کو بھول جانا ہے تو زندگی میں ملنے والے دکھ خود ختم ہو جائیں گے۔“

”ٹھیک کہا تھا آپ نے اگر میں زندگی سے نواز کا چپٹر پھاڑ کر بھی پھینک دوں تب بھی مجھے خوشیوں کے مقابلے میں دکھ اتنے زیادہ ملے ہیں کہ میں انہیں کتنا ہی بھولوں مگر پھر بھی انہیں بھول نہیں سکتی۔“ وہ اپنے کمرے میں آئی ٹی وی کھولا تو کوئی مغنیہ گار ہی تھی اور اس سے اسے یوں لگا جیسے وہ اس پر جیتی کہانی سنارہی ہو۔

یادوں کے چراغ آج روشن ہیں
ماضی کی گزرگاہوں میں
کہاں تک مجھ کو جانا ہوگا
ابھی دھندلی راہوں میں
ملن کی خوش رنگ ساعت تک
یا جدائی کی ظالم گھڑیوں میں

جھومر سجا تھا ماتھے پر
مہندی لگی تھی ہاتھوں میں
جذبوں کی مدھم مدھم تھی
خوشبو کچی تھی سانسوں میں
خجک بنا تھا جیون کا
کچھ خواب سجے تھے آنکھوں میں
شبم سے موتی بھرتے ہیں
اب ہجر کی لمبی راتوں میں
جدائی کا موسم آٹھرا
نکھلی مکھی میری آنکھوں میں
مانگ جوا جڑی سوا جڑی
کالج جیسے تھے بانہوں میں
توس قزح کے رنگ نہ ٹھہریں
بادل بھری اب آنکھوں میں

شاعرہ: خالدہ نسیم
”کیا لوگوں کے دکھوں میں مماثلت ہوا کرتی ہے۔“ یکبارگی اس نے سوچا۔ ”نہیں، مجھ جیسی کہانی تو شاید کسی کی بھی نہ ہوگی بلاوجہ میں دکھوں کے سمندر میں دھکیلی جاتی رہی ہوں۔ پیدائش سے لے کر اب تک کسی کا برانہ چاہ کر بھی ہمیشہ برائی ہی ملی ہے۔ اے پاک پروردگار اب کوئی دکھ اور غم نہ دینا، میں سہار نہ سکوں گی اور میرے والدین جی نہ سکیں گے۔ یارب العالمین اگر میرے حوالے سے انہیں کوئی خوشی نہ ملی تو لوگ کسی کے جائز بچے کو بھی گود لینا چھوڑ دیں گے۔“ نہاں اپنے کمرے میں رو رہی تھی اور آنسو اس کے چہرے پر یوں پھسل رہے تھے جیسے گلابی سائٹ پر موتی پھسل رہے ہوں۔

☆☆☆

گیٹ ریحان نے ہی کھولا تھا مگر دروازے پر اپنے دوست کے بجائے سرفراز صاحب کی بیگم اور ان کی والدہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس طرح تو وہ

لوگ کبھی ان کے گھر نہیں آئے تھے۔ حدی کہ مکتبی سے پہلے اور بعد میں بھی یوں بنا اطلاع کے ان کا آنا نہیں ہوا تھا۔

”آئی خیریت تو ہے ناں؟“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
”تمہارے امی ابو سے ملنا تھا۔“ سرفراز نے کہا تو وہ ان کو لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ ساجدہ بیگم اور ان کے شوہر بھی حیران سے ان کے پاس آئے۔

”آج میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں، امید ہے کہ آپ ہم سب لوگوں کو دل سے معاف کر دیں گی۔“ سرفراز نے رندھے ہوئے لہجے میں بات کا آغاز کیا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، معافی کس بات کی بھلا اور پھر آپ نے کیا ہی کیا ہے؟“ ساجدہ بیگم کا لہجہ محبت بھرا تھا۔

”آپ کے گھر سے ہم نے معافی مانگنے کی ابتدا کی ہے پلیز معاف کر دیجیے۔“ سرفراز نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور دادی جان کے آنسو بھل بھل بہنے لگے۔ ریحان متوحش سا ہو کر پانی کا گلاس لے آیا اور انہیں دلا سا دیتے ہوئے بولا۔

”آئی جب آپ سے کوئی ناراض ہی نہیں ہے تو معافی کیسی؟“

”سرفراز صاحب نے ریحان پر چار مرتبہ قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اللہ کا شکر ہے ریحان ہر بار بچ گئیں۔“ سرفراز نے نادم سے لہجے میں کہا۔

”مگر کیوں..... میرے بیٹے نے آپ کیا کیا بگاڑا تھا؟“ ساجدہ بیگم نے رو ہانسی ہو کر پوچھا۔

”میرے شوہر مینا کی موت کا دوسرا فٹے دار ریحان کو بھی سمجھ رہے تھے۔“

”دوسرا فٹے دار؟“ اب ریحان انہیں حیرت



اس اولوالمر شخصیت کی داستانِ حیات جو آنے والے وقت کو قبل از وقت دیکھنے کی قوت کا مال تھا

استقبال کا عاشق

اس شخصیت کی رودادِ حیات جس نے نوبل پرائز حاصل کر کے مسلمان ادیبوں میں نمایاں مقام پایا

عقوبت خانہ

انسان درندگی پر اتر آئے تو کس قدر ظالم بن جاتا ہے۔ لاکھوں لوگوں کے قتل کی روح فرساروداد

مقدون کی بات

بالی ووڈ کے ایک بہت بڑے کہانی کار کا زندگی نامہ

انتقام

اس نے منگیترا کا دل توڑا تھا مگر اسے امید نہ تھی کہ وہ ایسے عجیب حالات پیدا کر دے گا

ان کے علاوہ بھی بہت سی آپ بیتیاں جگ بیتیاں اور سچے واقعات

”اس کی پہلی ذمہ داری نہاں ہے۔ ریاض صاحب کی بیٹی جس نے تمہاری ماں سے کہا تھا کہ یہ لڑکی نی وی کی اداکارہ ہے اور ان کے کالج میں ڈانس کرنے آئی تھی اور بھی بہت کچھ جس کی وجہ سے تمہاری ماں نے مینا سے منگنی ختم کرنے کی ٹھان لی تھی۔“

”نہاں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا جس کی وجہ سے میں منگنی ختم کرتی۔ ہاں، یہ بات ضرور ہوئی تھی کہ وہ اسے شو بیز کی فنکارہ کے طور پر پہچان گئی تھی اور یہ ایسی کوئی بری بات بھی نہیں تھی مگر ہمارے گھر کا ماحول مختلف ہے۔“

”بات کچھ بھی ہوئی ہو مگر سرفراز کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ریاض صاحب کی فیملی ان کی بیٹی کی قاتل ہے تو اسے تباہ و برباد کیا جائے۔“

”اچھا تو وہ آپ لوگ تھے جن کی وجہ سے ایک لڑکی کو زندہ درگور کر دیا گیا۔“ ریحان نے کہا۔

”میں ان سے بھی جا کر معافی مانگوں گی مگر پہلے آپ کے ہاں آئی ہوں۔“

”ہمارا بیٹا تو بفضلِ خدا سرفراز کے کسی حملے کا شکار نہیں ہو سکا اس لیے آپ ہم سے نہیں بلکہ ریاض صاحب سے جا کر معافی مانگیں جن کو آپ نے ہر لحاظ سے تباہ و برباد کیا ہے۔“ ریحان کے والد نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

”پلیز آپ معاف تو کر دیں، میں ہر لحاظ سے پریشان ہوں کسی گل مجھے چین نہیں مل رہا ہے۔“

”ہم نے آپ کو معاف کیا، اللہ تعالیٰ بھی آپ کو معاف فرمائے۔“ ریحان کے والد کہہ رہے تھے

ساجدہ بیگم کو یہ سب باتیں سن کر اختلاج سا ہونے لگا تھا۔ ریحان کے والد ان کو دوسرے کمرے میں لے گئے اور گلو کوڑ پانی میں ڈال کر پینے کے لیے ویاتب کہیں جا کر ان کی طبیعت بحال ہوئی۔

”ریحان بیٹا کیا تم ہمارے ساتھ ریاض صاحب کے ہاں چلو گے؟“ سز سرفراز نے پوچھا۔

”مگر کیوں؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

”ہماری حقیقت جان کر وہ ہمیں معاف کیے بغیر اپنے گھر سے کہیں دھکے نہ دے دیں۔“ دادی جان نے کہا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ان سے کہے کہ ہونا تو آپ سب کے ساتھ اس سے بھی کہیں زیادہ ہونا چاہیے مگر گھر کی تربیت کے اثرات تھے اپنے بڑوں سے بھی بدتمیزی سے بات نہیں کی جاتی اور نہ ہی اس لہجے میں گفتگو کی جاتی ہے جس سے کسی دوسرے کو سبکی کا احساس ہو اس لیے وہ سنبھل کر بولا۔

”میں آپ کے ساتھ چلوں گا ضرور مگر میں یہ نہیں جانتا کہ آپ کی بات سن لینے کے بعد وہاں کس قسم کا ردِ عمل ہو گا۔“

”بیٹا ہم گالی تو کیا گولی کھا لینے کے لیے بھی تیار ہیں مگر وہ ہمیں معاف کر دیں کہ ہمیں اس سے قبل یہ واقعی نہیں معلوم تھا کہ کسی بندے سے کی گئی زیادتی کی معافی اس بندے سے ہی مانگنی چاہیے۔ ہم ان کا ہر واسطہ کے لیے تیار ہیں کہ ان کے ساتھ واقعی ایسا برا ہوا ہے کہ شاید کسی مسلمان نے کسی دوسرے مسلمان کے بارے میں ایسا سوچا تک نہ ہو۔“

☆☆☆

ریاض صاحب عشا کی نماز پڑھ کر آئے تھے۔ نہاں نے لاؤنج میں دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا تھا کہ کال بیل ہوئی۔

”یہ اس وقت کون آ گیا؟“ ریاض صاحب کھانا شروع کرنے سے پہلے باہر کی جانب لپکے۔

ریحان کو اپنے دروازے پر دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی۔

”معاف کیجیے گا آپ سے ملنے دو خواتین آئی ہیں۔“ ریحان نے قدرے اٹک اٹک کر کہا۔

”کس سلسلے میں؟“

”یہ بات وہ آپ کو خود ہی بتائیں گی۔“

”کیا یہ خواتین تمہاری رشتے دار ہیں؟“

”جی نہیں..... مگر مجھے یہ بات آج ہی معلوم ہوئی ہے کہ میری امی کی رشتے داری نسرین آنٹی سے ہے۔“

”بیٹا مگر میں تمہیں پہچان نہیں پائی ہوں۔“ نسرین بیگم بھی خواتین کا نام سن کر باہر آ گئیں۔

”میں ساجدہ بیگم کا بیٹا ہوں۔“

”اچھا اچھا۔“ ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

”کیا آپ ہمیں اپنے گھر میں اندر آنے کی اجازت دیں گے؟“ سز سرفراز نے ریاض صاحب سے پوچھا۔

اب وہ سب ایک چھوٹے سے مگر بے حد صاف ستھرے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”ریاض بھائی آج میں اپنی ساس کے ساتھ آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ میرے شوہر کی چنی حالت صحیح ہوتی اور وہ معذور نہ ہوتے تو یقیناً وہ بھی ہمارے ساتھ آتے۔“

”میں تو آپ خواتین کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں میں تو آپ کو جانتا تک نہیں ہوں تو معافی کیسی؟“

”آپ کو تباہ و برباد کرنے والا شخص میرا بیٹا تھا..... سرفراز۔“ دادی نے کہا۔ ”اپنی بیٹی کی خودکشی کی وجہ وہ نہاں کو سمجھا اس لیے آپ کے ساتھ ساتھ وہ بھی اس کی زد میں آ گئی۔“

”اب آپ کیا چاہتی ہیں؟“ ان کو مزید بولنے سے روکتے ہوئے ریاض صاحب نے کہا۔ ”اگر آپ کے بیٹے کا دل ابھی بھر نہ پایا ہو تو اپنے ستم کے بچے ہوئے تیر بھی آزمائیں کہ دیکھ لیجیے ابھی تک میں بھی زندہ ہوں اور میری بیٹی بھی۔“

”ریاض بھائی آپ ہمیں معاف کر دیں پلیز!“

”ایک بات کہوں محترمہ میں آپ سے..... پلیز آپ مجھے بھائی کہہ کر لفظ بھائی کی توہین نہ کریں۔ میرے بہن بھائی بہت برے ہیں مگر ایسے برے ہرگز نہیں ہیں کہ وہ میری روح تک کو زخمی کر ڈالیں پلیز آپ نے مجھے بھائی نہیں کہنا ہے۔“ ضبطِ گریہ سے انہوں نے اپنے ہونٹوں کو پھل دیا۔

”یہ لیجیے پیسہ جو ہم نے آپ کو مالی طور پر برباد کیا ہے۔“ پیسوں کا بریف کیس انہوں نے ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو کیا آپ اس سے ہزار گناہ زیادہ پیسہ بھی مجھے دے دیتیں تو یہ میرے دکھوں کا ازالہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے آپ واپس لے جائیں۔“ ریاض صاحب نے ان کا بریف کیس ان ہی کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔

”آپ کی بددعاؤں نے ہمیں برباد کر دیا ہے، پلیز ہمیں معاف کر دیں۔“

”ہاں بددعائیں تو ہم لوگوں نے پانچوں وقت دی ہیں ہر نماز کے بعد جائے نماز پر بیٹھ کر بھی اور ہر آنسو کے ساتھ ساتھ بھی۔“

”ریاض صاحب میرا بیٹا مر رہا ہے پلیز.....“

”محترمہ میری بیٹی کو بھی آپ نے ماری دیا ہے۔ وہ چل پھر تو رہی ہے مگر زندہ لاش ہے۔“

”بیٹا یہ بوڑھی ماں تجھ سے معافی مانگ رہی ہے تو معاف کر دے تاکہ ایک جوان لڑکا جو جان کنی کی حالت میں ہے اس کی مشکل آسان ہو سکے۔“

”اماں صاحبہ میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب ہم لوگ آپ لوگوں کو بددعائیں نہیں دیں گے مگر میں معاف کیسے کر دوں۔ آپ لوگوں نے دن کے اجالے میں میرے اور میری بچی کے چہرے پر کالک

کھکشاں خپ لوں کی

رخ چوہدری



گئے تھے اور
ان کی بڑھتی عمر کے ساتھ
ماں بہنوں کے ارمان بھی زیادہ ہو گئے
تھے۔ اب تو ماں بہنوں نے ہر لڑکی کی خوبیاں
خامیاں دیکھنے کے لیے..... آنکھوں میں مانگرو
اسکوپ فٹ کر لیا اور ہر تقریب میں بلائے بن بلائے
پہنچ جاتیں اور پھر لڑکیوں کی شامت ہی آ جاتی۔ اور
کیوں نہ آتی بھیا..... ایک ہی تو سپوت تھے، ان کے
ایک ہی تو سر تھا جس پر انہوں نے سہرا باندھ کر
گانا..... گانا تھا۔

دیاں داراجا میرے باہل داپارا
اٹری دے دل دا سہارا نی دیریر اٹھوڑی چڑھیا۔

اور ڈھیروں ٹیگ وصول کرنے تھے..... اب
اگر دو چار ہوتے تو وہ کہیں نہ کہیں کپروماز کر
لیتیں..... انہوں نے سارے ارمان اکٹوتے ”سر“ پر
ہی تو پورے کرنے تھے ماں بہنوں نے بارہا پوچھا
بھی۔

”ننھے! تو بتانا تیری نظر میں کوئی لڑکی ہے؟“
”اماں! نظر کی بات نہ کریں، ہماری نظر میں تو

ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء (175)

اسد میاں نے
ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی
جہاں پہلے سے اُن کی چار بہنیں، وہ بھی
بڑی موجود تھیں۔ ماں کے ساتھ مل کر بھائی کے لیے
دعا میں مانگا کرتی تھیں..... اور جب اللہ تعالیٰ نے
اسد میاں کی صورت ان کی دعائیں قبول فرمائیں تو
جانوان کی ایک نہیں پانچ پانچ مائیں ہو گئیں۔ تو جتنی
مائیں اتنے ارمان..... گویا اتنے تو اسد میاں کے سر
پر بال نہیں تھے جتنے ماں بہنوں کے ارمان ان سے
وابستہ تھے۔ لہذا وہ پالنے میں تھے کہ اُن کی دلہن کا
انتخاب ہونے لگا۔ خاندان میں قریب قریب جس کی
بٹی ہوتی آتے ہی اسد میاں سے منسوب ہو جاتی.....
اور جیسے جیسے بچی بڑی ہوتی ماں بہنوں کی پسند کی
سیڑھی سے پھسلتی ہوئی سیدھی ماں کی گود میں
جا گرتی..... اور اب تو خیر سے اسد میاں انجینئر بن

مسز سرفراز نے کہا۔
”ایسی گھناؤنی حرکت پر آپ معافی کی حق دار تو
نہیں ہیں.....“ ریاض صاحب کے بھائی بولے۔
”چاند پر تھوک کر دیکھ ہی لیا..... وہ آپ کے
ہی منہ پر آیا.....“ یہ بہنوں کی رائے تھی۔
”جائیں..... میں نے آپ کو معاف کیا.....
جائیں.....“ نسرین بیگم نے کہا تاسف سے دیکھتے
ہوئے کہا۔
”اور پھر کبھی ہمارے سامنے مت آئیے گا کہ
آپ کو دیکھ کر ہمارے زخم پھر ہرے ہو سکتے ہیں۔“
مسز سرفراز اور داوی جان..... وہاں سے اسی وقت
ردانہ ہو گئیں۔

تب ساجدہ بیگم نے نسرین سے کہا۔
”نہ منگنی ہوگی..... نہ مہندی، مایوں..... میں
اس جمعہ کو اپنے بیٹے کی برات لے کر آ رہی ہوں،
نہاں کو اپنے گھر لے جانے کے لیے..... اب کوئی
بہانہ بنانے مت بیٹھ جانا..... کہ اس شہزادی کو تو
میرے گھر میں آنا تھا۔“ ریحان کے چہرے پر
مسکراہٹ لوٹ آئی۔

واپسی پر ریحان..... اپنے والدین کے ساتھ
جب گھر جا رہا تھا..... تو اس کے موبائل پر ایک
SMS تھا۔

”بفضل خدا..... ہمارا بیٹا جانکئی کی حالت سے
کل کر ابدی نیند سوچکا ہے۔ کل ظہر کی نماز میں نماز
جنازہ میں ضرور شریک ہوں۔“ ریحان نے ایک
گہری سانس لے کر گاڑی کی اسپڈ تیز کر دی تھی.....
کہ گھر جا کر اس نے اپنی ای کو اپنا حال دل بھی سنانا
تھا..... کہ کس طرح ایک کانچ سی لڑکی..... اس کے من
میں بہار بن کر چھا گئی تھی۔

ختم شد

تھوپی اور اب رات کے اندھیرے میں معافی مانگنے
آئی ہیں۔ میں کس کس کو بتاؤں گا یہ سب بہتان تھا۔
میں کس کس کو بتاؤں گا یہ میری بچی پر ظلم تھا میری بچی تو
پاک تھی، معصوم تھی۔“

”آپ ریاض صاحب کے پورے خاندان
کے سامنے معافی مانگیں گی.....“ ریحان نے کچھ سوچ
کر کہا۔ اور یوٹیوب میں بھی سرفراز صاحب کی تصویر،
عہدے اور حیثیت کے ساتھ یہ الزام قبول کیا جائے
گا..... کہ آپ نے ایک معصوم بچی کے ساتھ کیا
شرمناک کھیل کھیلا تھا اسے آسمان سے زمین پر گرانے
کی ناکام کوشش کی تھی۔“ شائستہ بیگم یہ بات ٹھوڑا سا
چپکپائی مگر دادی نے فوراً رضامندی دے دی۔

”اس کے ساتھ جو خطوط کالج، پروفیسرز اور
اہل محلہ کو بھیجے گئے تھے ان کو اعتراف نامہ بھیجا جائے
گا.....“ ریحان کہہ رہا تھا اور ریاض صاحب
رضامندی میں اپنا سر ہلا رہے تھے۔

”بیٹے اس کے ساتھ ساتھ ہم اخبارات میں بھی
معافی نامہ چھپوانے کے لیے تیار ہیں۔“ دادی نے
رندھے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنے ہاتھ پھر سب کے
سامنے جوڑے۔ جب وہ نہاں کی ماں کے پاس
آئیں تو وہ یہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں
اور ان کے آنسو تو اتر سے بہہ رہے تھے۔

☆☆☆

وہ ایک بہت ہی عجیب و غریب سی مجلس تھی.....
جس میں خاندان کے سارے لوگ جمع تھے..... !
نہاں، ریاض صاحب نسرین بیگم بھی موجود تھے۔ مسز
سرفراز اور داوی جان سب مہمانوں کے سامنے ریاض
صاحب کو تباہ کرنے سے لے کر ڈرٹی پیکچرز کے
بارے میں بتا رہی تھیں۔ سب لوگ انہیں خسمکین
نظروں سے دیکھ رہے تھے اور تھوٹھو کر رہے تھے۔

”اب تو پلیز آپ سب ہمیں معاف کر دیں۔“

ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء (174)

خود پسند کر لے..... اللہ سلامت رکھے ماں، بہنوں کو..... یہ حق صرف ماں بہنوں کا ہے کہ وہ اپنی پسند سے بھابی یا بہو پسند کریں..... ارے خان صاحب! بے شمار عاؤں کا شر ہے یہ میرا بیٹا۔ اور بے شمار ارمان ہیں میرے دل میں اس کی دلہن کے لیے..... میں تو اپنے سارے ارمانوں کو دلہن بناؤں گی، ہاں نہیں تو۔

”لومیاں تیار ہو جاؤ، تمہاری تو بے شمار شادیاں ہونے والی ہیں۔“

”کوئی بات نہیں ابا میرا یہ اکلوتا ”سر“ میری ماں بہنوں کی امانت ہے اس پر جس نام کا سہرا باندھنا چاہیں گی میں بندھوا لوں گا۔“ اسد میاں نے سعادت مندی سے ”سر“ ماں کی گود میں رکھا تو بے شمار عاؤں کی جیب میں بھر لیں، بہنوں نے فرمانبردار بھائی کی بلا میں لیں سب نے حسبِ پیار جب پیار کیا تو اسد میاں ہانپنے لگے۔

”پھر تو میاں تمہارا اللہ ہی حافظ ہے۔“ ابا نے طنزیہ مسکراہٹ سجا کر بیوی اور بیٹیوں کو دیکھا اور اخبار اٹھا کر گہری ٹھنڈی آہ کے ساتھ پھر بیوی کو بھڑکا گئے۔

”تو دھیان نہ دے بیٹا..... ان کی تو عادت ہے مجھے تپانے کی۔ دیکھ تو سہی تیرے لیے میں پرستان سے پری بیاہ کر لاؤں گی..... ارے ساری دنیا دیکھے گی کہ خلفتہ بیگم بہو بیاہ کر لائی ہے۔“

”اماں! پری بیاہ کر لائیں یا چڑیل کو بہو بنائیں..... میں نے یہ سر آپ کے حوالے کر دیا ہے۔“

بس بیٹے کی یہی سعادت مندی اماں اور بہنوں کو مار جاتی صدقے داری جانتے نہ تھک سکتا تھا کہ اسد میاں اتنے ہی سعادت مند رہتے اگر ان کے کوئی دوست سوڈان میں کوئی بزنس شروع نہ کرتے اور اسد میاں کو اپنا پارٹنر نہ بناتے..... سوڈان کے

کوئی کیا ڈرے گا..... ہر بار برائی کرنے سے پہلے اللہ توبہ کر لیتے ہیں پھر برائی کرتے ہیں۔“ بڑی آپا نے اپنے خوفِ خدا کی بڑی عمدہ مثال دی۔

”چلیں! آپ جانیں اور آپ کا کام بس ایک بات یاد رکھیں کہ دوسروں میں عیب نکالنے سے پہلے خود پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔“

”اماں! دیکھیں آپ کا لاڈلا پھر مجھے ہی دیکھ رہا ہے۔“

”سوری آپا! دیری سوری..... میں صرف آپ کو اور اماں کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ آپ میں جو کمی تھی قدرتی تھی ناں اور ہے بھی پھر بھی..... حسن بھائی اور ان کے گھر والوں نے انہی خوشی رشتہ کیا اور عزت سے بھرا ہے ہیں..... تو یہ ہے سمجھداری اور فراخ دلی..... اور حقیقت پسندی کہ جن ہاتھوں پر لڑکی کا یا اس کے گھر والوں کا اختیار ہی نہیں اس کی اس کو سزا کیوں دی جائے۔“

”ارے میاں صاحب زادے! بندہ شیطان کی دلیلوں کا جواب دینے لگے تو بات پھلتی جاتی ہے..... اس لیے قصہ مختصر اگر شادی کے لیے ماں بہنوں کے انتخاب پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے تو نو جوان سے جوان..... جوان سے بڑھے اور بڑھے سے بڑھے بابا بن جاؤ گے..... نہ منہ میں دانت رہیں گے اور نہ پیٹ میں آنت..... ہاتھ میں لاشی پکڑے ہاں بٹنے کا پہنہ ہر حسین کنیا کو..... بیٹی..... بیٹی کہہ کر بلاتے پھر دو گے..... اس لیے میری مانو تو خود ہی لڑکی پسند کر لو ورنہ۔“ بے چارے ابا امن کی فاختہ بنے مصلحتاً خاموش رہتے..... مگر جب بولتے چھپر چھاڑ کر ہی بولتے۔ اور ان کا ایک ہی جملہ بھس میں چنگاری ثابت ہوتا جو اماں کے تن بدن کو آگ لگا جاتا۔

”ہاں، ہاں اور پڑھاؤ بیٹے کو الٹی سیدھی پٹیاں..... خود پسند کر لو..... ارے کیوں بھی، کیوں

بیٹے کی بات تو سچ تھی مگر تھی رسوائی کی اس لیے اماں نے چاند سے بیٹے کو ڈپٹ دیا۔

”گہری شام بھی تو کہیے ناں!“ اسد میاں فل مستی موڈ میں تھے جب کبھی ماں بہنوں کے پاس ہوتے تو دل پشوری ضرور کرتے۔

”چلو مانا کہ اس کا رنگ گہرا ہے..... ہاتھ میں تو ہنر ہے ناں۔“

”پاؤں، میں لنگ بھی تو ہے ناں اماں!“

”تو..... تو کیا ہوا لڑکے میری بیٹی قابل ہے..... ذہین ہے..... سکھڑ ہے اور سلیقہ مند ہے، گھر کے سارے کام کرتی ہے۔“

”ہاں، یہ بات تو ہے کہ کام تو کرتی ہیں کیا ہوا جو ایک ٹانگ لہی اور ایک چھوٹی ہے۔“

”دیکھیں تو اماں اس لڑکے نے بھائی ہو کر میرے سارے عیب گنوا دیے جو میرے سسرال والوں نے نظر انداز کر کے مجھے اپنایا ہے۔“ اب آپا بیگم باقاعدہ آنسوؤں سے ہاتھ دھوئے لگیں تو بھیا نے وہی آنسو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لیے۔

”یہ..... یہ میری آپا جان میں کہنا چاہتا ہوں جس پر آپ لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے کہ مت نکالیں کسی بھی لڑکی میں عیب..... اور خاص طور پر کسی قدرتی کمی کا اس کو یا اس کے گھر والوں کو احساس مت دلائیں، اب دیکھیں اماں نے آپ کی نند مبا کو کبھی کہہ دیا۔“

”ہاں، جھوٹ تو نہیں کہا..... خود بتاؤ اس کی شکل شہد کی مکھی سے نہیں ملتی..... جڑواں بہن تو لگتی ہے..... شہد کی مکھی کی۔“

”اماں! پھر وہی عیب جو کی..... منع فرمایا گیا ہے عیب جو کی سے۔ آپ خواتین کیوں نہیں سمجھتیں۔ ڈر لگتا ہے مجھے اللہ تعالیٰ سے۔“

”اے، نو جتنا تو ہم ڈرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے

لڑکیوں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔ کس کو پکڑوں کس کو چھوڑوں۔“ اسد میاں نے بڑی دلبرائی سے کہا تو آپا نے ساری بلائیں اتار کر اپنے سر لیتے ہوئے کہا۔

”ہائے، میں صدقے..... اماں، دیکھا آپ نے کتنا بد معاش ہو گیا ہے یہ۔“

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ..... اللہ نظر بد سے بچائے اور یہ بد معاشی نہیں یہ تو اس کی عمر کا تقاضا ہے بیٹا۔“ اماں تو نظر لگ جانے کے اندیشے سے بیٹے کو نظر بھر کر دیکھتی ہی نہیں تھیں اور بہنوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ اب ساری بہنیں بیاہی تھیں۔ بھائی تھا ایک اور خوبرو اپنے، اپنے سسرال میں دور بین دوڑاتی رہتیں..... مگر کوئی اس لائق نظر نہ آتی۔

”تمہاری اماں نے تمہیں تو جھٹ میری بہو اور میری بیٹی کی بھال بھال دیا..... میری بیٹی بھی تمہاری بھال بھال چاہتی ہے۔“ چھوٹی آپا کی ساس نے آخر اپنے منہ سے کہہ ہی دیا۔ اور جب چھوٹی آپا نے ساس کی خواہش کو جس طرح منہ بتاتے ہوئے ”تے“ کی طرح اگلا اماں نے بھی اسی طرح بھوس سا توں آسمان پر پہنچائیں اور منہ میں موجود پان چھال لیے کو چھوٹی کی ساس سمجھ کر اتنے زور سے چبایا کہ بوڑھے دانت اس زیادتی پر بلبل اٹھے۔

”اے دفعہ دور، تیری ساس تک کٹی بندریا کو ذرا خیال نہ آیا کہ میرے شہزادے گلغام کے ساتھ اپنی اس مکھی کو کھڑا.....“

”بڑی بات ہے اماں، ایسے نہیں کہتے کسی کی بیٹی کے لیے..... انہوں نے بھی تو آپ کی مکھی میرا مطلب ہے..... آپ کی بیٹی کے ساتھ اپنے ٹھیک ٹھاک ہینڈم لڑکے کا رشتہ کیا ہے نا؟“

”ارے، لڑکے خبردار جو تو نے کوئی ہمدردی کی ہو تو..... ارے کوئی احسان نہیں کیا میری شمسہ کو بیاہ کر..... ارے ذرا سارنگ ہی تو شام جیسا ہے ناں۔“

176 ماہنامہ پاکیزہ - مئی 2012ء

علاوہ کوئی اور یورپی ملک ہوتا تو شاید ماں بہنوں کو دوسرے خدشات لاحق ہوتے اب سوڈان جیسے ملک کی دیوبند خواتین سے پاکستانی ماں بہنوں کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا لہذا سہرے کے بغیر اسد میاں کے سر کو ان کے ساتھ جانے دیا۔ لیکن اُن سے یہیں چوک ہو گئی کہ ”سر“ کے ساتھ ”دل“ بھی اسد میاں کے ساتھ جانے دیا۔ اور دل تو بھیا ”من چلے کا سودا“ کر لیتا ہے۔ نفع و نقصان کب سوچتا ہے۔۔۔۔۔ جب ”گدھی“ پر آجاتا ہے اس کے سامنے پر یاں بھی پانی بھرتی اور کھبیا نوچتی نظر آتی ہیں۔

☆☆☆

سوڈان جا کر ایک سال تو خیریت سے گزر گیا۔ اسد میاں اپنے کام سے کام رکھتے، باہر جاتے۔۔۔۔۔ وہ بھی اکیلے جانے کی جرأت نہ کرتے۔ اگر دوست کے ساتھ جاتے بھی تو ایک ہاتھ دل پر اور ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھے۔۔۔۔۔ چندی چندی آنکھوں سے دیوبند قوم کو دیکھتے اور خود کو بونا سمجھتے ہوئے دیوار سے لگ جاتے کہ کہیں کسی سوڈانی مرد یا عورت کے پاؤں تلے روندے نہ جائیں۔۔۔۔۔ حالانکہ وہ پستہ قد نہیں تھے ٹھیک ٹھاک پاکستانی مردانہ قد تھا مگر وہاں جانے کیوں وہ خود کو بونا ہی سمجھ رہے تھے۔ ایک سال تو خیریت سے گزر گیا۔ اسد میاں کی شادی کا تقاضا بھی ہوتا رہا اور ماں بہنوں کے انتخاب کی تلواریں کئی حسینائیں آتی رہیں اور زخمی ہوتی رہیں مگر پسند کی نوک پر کوئی نہ ٹک سکی۔ ابامیاں الگ خاموش احتجاج کرتے ہوئے گزر جاتے۔۔۔۔۔ اسی طرح دوسرا سال بھی اسد میاں کے سہرے کے پھول کھلائے بغیر گزر گیا۔ البتہ تیسرے سال کی پہلی جنوری کو اسد میاں نے خوشی کا جو ہم پھاڑ اس میں ماں بہنیں بے ہوش ہو گئیں۔

”ہیلو! اماں، آپا۔۔۔۔۔ آپ لوگوں کو بہت بہت

مبارک ہو۔ میں نے ایک سوڈانی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔“

”ہائے، میں مر گئی۔۔۔۔۔ میرے چاند سے بھائی کو سوڈانی ”گرہن“ لگ گیا۔“ بڑی آپا بچھاڑ کے بعد ہوش میں آنے کے بعد بولیں۔

”یا اللہ! یہ کیا ہو گیا۔۔۔۔۔ میرے گلغام جیسے بھائی کو چڑیل چٹ گئی۔“ چھوٹی آپا نے ماں کو پانی پلانے کی کوشش کی۔ پانی دائیں بائیں فرار ہو گیا۔

”ہائے۔۔۔۔۔ کسی نے کب سوچا تھا کہ اسد کا نصیب جنات کے ہاں لکھا ہے۔“ منجھلی آپا بھی جڑواں بچوں کو گود میں لیے روئے جارہی تھیں۔

”کیا۔۔۔۔۔ کیا خواب دیکھے تھے ہم نے اکلوتے بھائی اکلوتی بھابی کے لیے۔۔۔۔۔ ہونہ ماں کی پرستان کی پری۔۔۔۔۔ اور ملی کیا ویو کی کزن۔۔۔۔۔ سوڈانی۔۔۔۔۔ نہ حسینہ نہ۔۔۔۔۔ دو شیرہ۔۔۔۔۔ نہ لڑکی۔۔۔۔۔ جن کی اولاد۔“

”اب کسی کو کیا منہ دکھائیں گے۔ خاص کر اُن لوگوں کو اور رشتے داروں کو جن میں سو۔۔۔۔۔ سو عیب نکال کر ہم نے انکار کیا تھا۔۔۔۔۔ ہم کیا منہ دکھائیں گے۔“ اماں تو خیر سے بے ہوش تھیں ابھی تو بہنوں کے واویلے کا سین چل رہا تھا اور اباساڈ پر بیٹھے دھینی سی مسکراہٹ لیے۔۔۔۔۔ عینک کی ایک ٹانگ کو دانتوں میں دبائے۔۔۔۔۔ اس سین سے لطف اندوز ہو رہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اماں بے ہوش تھیں ورنہ اس وقت ان کو ”فتنہ گر“ کا خطاب دے کر سارا نزلہ ان ہی پر گر چکا ہوتا۔۔۔۔۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ بیوی اور بیٹیوں کی باتوں اور حرکتوں پر جتنا غصہ ابانے ضبط کیا تھا اب اس کو نکالنے کا موقع ضرور مل گیا تھا۔

”ارے بیٹا! جو منہ لے آئی ہو اور سسرال والوں کو ڈراتی ہو۔۔۔۔۔ مجبوری ہے وہی دکھانا پڑے گا۔۔۔۔۔ ٹیڑھا میڑھا جیسا بھی ہے، تمہارا ہے۔۔۔۔۔ رہی بات دوسروں میں عیب جوئی کی تو یہ تو تم خواتین کا

لڑا اتیار ہے۔۔۔۔۔ دوسروں میں عیب کا عیب ہی تو تم لوگوں کو جہنم کی میر کر ائے گا۔۔۔۔۔ ستم تو یہ کہ اپنے ساتھ ہار مردوں کو بھی لے کر جائیں گی جہنم میں کہ۔۔۔۔۔ ہم تو مجلسیں گے صنم تم کو بھی راکھ کر دیں گے۔۔۔۔۔ کوئی اٹائے کہ ہم بتلا میں کیا۔“ ابامیاں دل کی ساری ہراس جواب تک ضبط کیے ہوئے تھے نکال کر آگے بڑھے پھر پلٹے۔ ”اور ہاں اس بارہ من کی لاش کا کیا کرنا ہے۔۔۔۔۔ دفنانا ہے یا بیٹے، بہو کے انتظار میں ان کو کوئلہ دردم میں ڈال دیا جائے۔“

”تو یہ ہے ابا، آپ تو اماں کے لیے ہمیشہ ہی ایسی بدفعال منہ سے نکالتے ہیں۔“

”ارے ہم نکالتے ہی رہ گئے بدفعال۔۔۔۔۔ مگر مہال ہے جو قبول ہو گئی ہو ہماری بدفعال۔“ بس ابامیاں اسی بدفعالی کا کمال تھا کہ اماں غم دغصے سے دھاڑتی ہوئی انھیں۔

”ہاں مار دیں ناں۔۔۔۔۔ ارے جو کسر بیٹے نے چھوڑ دی ہے وہ آپ پوری کر دیں۔۔۔۔۔ کاش کہ آپ نے میرا گلاد بادیا ہوتا۔۔۔۔۔ یہ خبر سننے سے پہلے ہی میں مر جاتی تو اچھا تھا۔۔۔۔۔ ہائے جل گیا میرا نصیب کیا کیا ارمان تھے۔۔۔۔۔ بیٹے کی شادی کے کیا کیا خواب دیکھے تھے۔۔۔۔۔ مگر سب مٹی میں مل گئے۔ کہتا تھا اماں یہ ”سر“ ماں بہنوں کی امانت ہے۔“

”ہاں، ”سر“ امانت ہے ناں دل تو نہیں کہا تھا ناں۔۔۔۔۔ اب دل تو دل ہے وہ محاورہ تو سنا ہی ہو گا آپ نے کہ دل آیا۔۔۔۔۔“

”بس۔۔۔۔۔ بس رہنے دیں۔ کیوں زخموں پر نمک پاشی کرتے ہیں۔ ارے مجھے خبر ہوتی کہ اس کا دل کسی ”دیوٹی“ پر آتا ہے تو میں۔۔۔۔۔ اس کی شادی کر کے بھیجتی۔ ارے بیٹا کیا تیری مت ماری گئی تھی تجھے بھی جنات کی بیٹی ہی پسند آئی تھی۔۔۔۔۔ بری قسمت میری۔۔۔۔۔ کیوں اسے جنات کے ملک جانے دیا۔

آخری خواہش

میرے ساتھی!

میری یہ روح میرے جسم سے پرواز کر جائے تو لوٹ آنا

میری بے خواب راتوں کے عذابوں پر سکتے شہر میں تم بھی ذرا دیر کو رکنا

میرے بے نور ہونٹوں کی دعاؤں پر تم اپنی سر دیشانی کا پتھر رکھ کر رو دینا

بس اتنی سی بات کہہ دینا مجھے تم سے محبت ہے

شاعرہ: نوشی گیلانی

مرسلہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدرمرجان

ارے کہیں لندن امریکا چلا جاتا کسی انگریزی سے بیاہ کر لیتا مگر۔۔۔۔۔ اس سوڈانی ڈائن سے نہ کرتا۔۔۔۔۔ ارے مگر کا سارا بجٹ تو اس کی لب اسٹک پر اڑ جائے گا۔ ارے جماعا کی کسی کزن، بھانجی، بیٹی سے کر لیتا۔۔۔۔۔ کسی بھی فرنگن سے کر لیتا۔۔۔۔۔ ارے انسان تو ہوتی۔“

”استغفر اللہ۔۔۔۔۔ بیگم شکر کیجیے کہ ہمارے بیٹے نے کسی فرنگن سے شادی نہیں کی۔ کی بھی تو اہل ایمان سے کی۔ اللہ کا شکر ہے ہماری بہو مسلمان ہے۔ بھائی ہمیں تو یہ ہی خوشی اور اطمینان ہے کہ ہمارے بیٹے نے مسلمان لڑکی سے نکاح کیا چاہے، وہ ایرانی ہے تو رانی یا سوڈانی۔“

”ارے، تو پھر اپنی اس سوڈانی دیوبند کے لیے گھر کے دروازے بھی بڑے کروالیں، کہاں سے گزرے گی۔۔۔۔۔ وہ 20 فٹ کی نازک اندام سوڈانی جتنی دو شیرہ۔ ہائے میرا بچہ کس چڑیل کے چنگل میں پھنس گیا۔“ اماں کا داویلا جاری تھا۔ ابا تو جا چکے تھے اب

ماں بیٹیاں مل کر بین گوئی کر رہی تھیں۔

”بس کریں اماں جو ہونا تھا ہو گیا..... یہ ہمارے ہی اعمال کی سزا ہے، ہم نے بھی تو کسی لڑکی کو بخشا نہیں..... ہر ایک میں عیب نکالے..... کیڑے نکالے تو سزا کے طور پر ہم پر سوڈانی جن تو مسلط ہونا ہی تھا..... مبر کریں اب۔“

”ارے لڑکی کیسے مبر کروں، بس کروں، آگ لگی ہے میرے دل میں..... ارے اس دن کے لیے اسے پال پوس کر جوان کیا پڑھایا لکھایا..... انجینئر بنایا تاکہ وہ ہمیں سوڈانی ڈائن سے ڈرائے۔ ارے کہاں باندھا ہوگا اس نے میرے بچے کو..... غننے سے گھننے سے یا تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیا ہوگا میرے اسد کو..... ارے میرا ننھا تو نارٹل سائز کا مرد ہے..... اور کہاں وہ.....“

”اماں! آپ نے بھی تو ہر لڑکی میں سو سو کیڑے نکالے تھے..... کہ میں تو پرستان سے پری بیاہ کر لاؤں گی اپنے بیٹے کے لیے..... مل گئی پری آپ کو مگر جنات کے ویس کی۔“

”اور نہیں تو کیا..... بڑی پھوٹے کتنی خنثیں کیں کہ میری چھوٹی کو بہو بنالو..... مگر اماں نے جھٹ کہا..... مجھے چوبیس گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ گوارا نہیں..... اور پھر کیا ہوا اس سانولی سی سلتی کا اتنا اچھا رشتہ ہو گیا۔“

”ارے، بھیا ہم نے تو بس..... جس میں نقص نکالا اس کی بہترین جگہ شادی ہو گئی، وہ اپنے چھوٹے چچا کی ریفیہ..... مرنی تھی اسد پر چچا نے اپنے منہ سے کہا بھی..... مگر ہماری اماں نے تنقید کی بدوق اٹھائی اور داغ دیا اس کے قد کو..... ہونہہ اتنا چھوٹا قد ہے میرے اسد کے ہاں ”کوڈو“ بچے پیدا ہوں گے۔ اب ہوں گے ناں جنات سائز کے بچے تو خوب کھیلے گا ان کے ساتھ یا وہ کھیلیں گے آپ کے ساتھ۔“

”اب بین گوئی کرنے کی کیا ضرورت ہے اماں آپ کو تو پری چاہیے تھی ناں..... اور اسی شوٹل میں آپ نے اپنی بہن خالہ مہم کی سرقد بٹی کو یہ کہہ کر رد کر دیا..... ارے لڑکی ہے یا ڈانگ ہے..... مجھے لڑکی وہ چاہیے جو میرے بیٹے کے ساتھ چلے تو سب کہہ اٹھیں واہ کیا چاند سورج کی جوڑی ہے..... خنثی ضرورت سے زیادہ لمبی ہے..... اور موٹی بھی ہے اور لمبی چوڑی لڑکیاں..... بیویاں کم اور شوہر زیادہ لگتی ہیں۔ خنثی سے شادی کر کے مجھے چھتوں سے جالے تو نہیں اتروانے ناں..... کوئی ایسی ہے تو کوئی ویسی ہے..... آپ کو تو زکسی آنکھیں، پٹکڑی ہونٹ، صراحی دار گردن..... اور دودھ جیسی رنگت اور بالشت بھر کر والی آل ان دن لڑکی چاہیے تھی ناں..... ہائے..... کیسے تڑپ تڑپ کر روئی تھی میری تند جب آپ نے اسے بہو بنانے سے انکار کیا تھا۔“

ساری بیٹیاں مل پڑی تھیں ماں پر جبکہ سچ تو یہ ہے کہ سب کی سب جہاں یہ چاہتی تھیں کہ بھاوج اپنے سرال سے جن کران کی نگاہیں نیچی کر دیں..... مگر ہر لڑکی میں عیب نکالنے میں پورا پورا ساتھ دیا تھا..... اب سب بڑھ چڑھ کر ماں پر الزام لگا رہی تھیں۔

”چلو، آپا اب اماں کو ہر خوبی وافر مقدار میں ایک ہی سوڈانی بہو میں مل رہی ہے۔ سوائے دودھ جیسی رنگت کے۔“

”تم لوگوں نے وہ مثل نہیں سنی کہ سیانا کو گور پر ہی گرتا ہے۔“ سب نے مل کر اماں کو نشانے پر رکھ لیا تھا ارے بھی اکلوتے بیٹے کے لیے اچھی آل ان دن خوبیوں والی دلہن کا خواب..... دیکھنا کوئی گناہ تھا یا خطا کہ اس خواب کی اتنی بھیا تک تعبیر ملتی..... اماں تو جیسے گوسے میں چلی گئی تھیں..... سوتے جاگتے اپنی سوڈانی بہو کے بارے میں خواب دیکھا کرتیں اور

ال سے چیخ مار کر اٹھتیں۔

”اماں! اجالا کے لیے ویسے کا جوڑا آپ لوگ دالیں۔“ اسد میاں کے فون نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

”اجالا..... ہونہہ..... سوڈان کا اجالا..... ارے تو پھر اندھیرا کیسا ہوتا ہوگا..... ارے بیٹے تم نے میرے خوابوں کو تو پر باد کر دیا اب ویسے کا جوڑا ڈاؤں وہ بھی ایک جتنائی سائز دلہن کے لیے ارے شروع ہو کر ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں..... ہم یہاں ہر گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ سے پریشان..... بیٹے نے ایک آڈٹ سے نکاح کر لیا..... یا اللہ مجھے یہ سزا ملی ہے اپنی بہو کو حسین دیکھنے کی میں نے سوچا تھا میری بہو کے دراز بال ہوں گے مگر اس دیو کی بیٹی کے بال تو املی ہوئی نوڈلز کی طرح موٹے اور چپکے ہوئے ہوں گے..... جیسے گوند کے ڈبے میں سر ڈال دیا ہو..... ہائے..... کیا کیا خواب دیکھے تھے بہو کے لیے۔“

”اماں جی دوسروں کی بیٹیوں میں اتنے نقص نکالیں گی تو سزا تو ملے گی ناں۔“

☆☆☆

اماں کو دن رات سوڈانی بہو کے خواب آنے لگے۔ مثلاً اس رات انہوں نے خواب دیکھا کہ کھانا مل گیا اور بہو کے پیٹ میں درد ہونے لگا تو بہو غصے میں ساسو ماں کو ڈھونڈتے ہوئے ان کے کمرے میں آگئی تو گھر کے دروازے تو انسانی سائز کے تھے..... ہناتی نہیں اس لیے بہو کا سر جو دروازے سے ٹکرایا تو لہر دگنا ہو گیا۔

”اچھا ہوا بہت ہی اچھا ہوا..... کیلجے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔“ اماں کی ہنسی نکل گئی۔

”ساسو ماں..... کہاں ہیں آپ جلدی سے ظاہر ہو جائیں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا..... کہاں ہوں گی دنیا میں..... آگئی ہوں میں..... ساسو ماں

کہاں ہیں آپ؟“ اب کی دھاڑ میں اتنی کڑک مچی کہ دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ اماں کو مجبوراً بیڈ کے نیچے سے نکلتا ہی پڑا۔

”جج..... جج..... جج..... جی بہو رانی، کیا حکم ہے اے سوڈانی بھتنی۔“ اماں نے لرزتے ہوئے کہا تو بہو نے ان کو ٹھکی میں بھر کر میز پر کھڑا کر دیا۔

”ایک! تو آپ لوگوں کو ڈانٹنے کے لیے بھی گود میں اٹھانا پڑتا ہے..... اب سچ سچ بتائیں کھانا کیسے جلا؟“

”آپ کے حسن سے جل گیا ہو گا..... بہو بیگم۔“ پھر ٹھیک ہے، آپ نے سچ بولا ہے اس لیے آپ کو معاف کرتی ہوں۔“ بہو نے ساس کو ہوا میں اچھال دیا۔ تو جب بھاری بھر کم ساسو ماں (ٹھاہ) کر کے زمین بوس ہوئیں تو آنکھ کھل گئی۔ کر در وادار ٹانگوں کے در در نے اودھم مچا دیا۔

”ہائے! آف میری کمر..... میرے گھنٹے میرا سر اور میری بہو..... آف۔“ اب چونکہ وہ خود ڈنٹے دار تھیں ہر چیز کی اس لیے اپنے خوابوں کی ہولناکی کو خود تک ہی محدود رکھتیں۔ ہر روز وہ نیا خواب دیکھتیں خود ہی ڈرتیں اور گھر کے کونوں میں چھپ کر رو تیں اور توبہ کرتیں کہ اگر انہوں نے دوسروں کی لڑکیوں میں عیب نہ نکالے ہوتے تو آج ایک بھیا تک بہو ان کا خوابستان خوف ناک بنانے نہ آ جاتی۔ ہر رات ان کے کمرے میں..... ستم تو یہ تھا کہ وہ اپنے خواب کی ہولناکی کسی سے شیر بھی نہیں کرتی تھیں۔ یہ خواب دراصل ان کے اندر کا خوف تھے اور پچھتاوا تھے کہ انہوں نے ہر معصوم لڑکی میں کوئی نہ کوئی عیب نکال کر رد کر دیا تھا۔ جب سزا کے طور پر سوڈانی بہو مل گئی تو..... بہو کا سوڈانی پن ان کو خوف زدہ کرتا رہتا..... اس کے حوالے سے جو خدشات تھے وہ خواب بن کر

ان کو پریشان کرتے۔ جیسے اس روز انہوں نے دیکھا کہ بہو نے بڑے سے باؤل میں ڈھیر سارے اٹھ پھینٹ کر رکھے ہیں۔۔۔۔۔ اب بہو نے تو ایک ماسک لگانا تھا اس لیے درجن بھرا اٹھوں کو قربان کر دیا تھا مگر بھولی ساسو ماں نہ سمجھیں۔۔۔۔۔ انہوں نے سوچا کہ رات کھانے میں آٹھ بن جائے گا تو اسی لیے انہوں نے ڈھیر ساری نمک مرچیں اور مسالا جات اٹھوں میں ڈال کر رکھا کہ ابھی بتاتی ہیں اسی دوران بہو گئیں اور ماسک لگا لیا پھر کیا تھا۔۔۔۔۔ بہو کی جناتی اسکن مجلس گئی۔

”ساسو ماں۔۔۔۔۔ کہاں ہیں آپ۔۔۔۔۔ یہ اٹھ میں نے ماسک کے لیے پھینٹے تھے۔“ اماں نے برتنوں کی الماری کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی مگر بہو نے دھر لیا۔

”مجھے معاف کر دو بہو بیگم۔۔۔۔۔ آپ کو آپ کے حسن کا واسطہ مجھے معاف کر دو، آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔“

”ارے بھی بیگم کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ آپ کو کس بہو سے معافی مانگ رہی ہیں، یہ آپ کی بہو نہیں میز کی ٹانگ ہے جس کو آپ نے پکڑ رکھا ہے۔“ ابانے اماں کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ زمین پر لیٹی باقاعدہ میز کی ٹانگ پکڑے معافی مانگ رہی تھیں۔

”چپ رہیں جی آپ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ وہ میز صاف کر رہی تھی۔“ اب مارے کھساہٹ کے کوئی ڈھنگ کی بات بھی تو برا آمد نہیں ہو رہی تھی۔

”ارے بھی ہم سب سمجھتے ہیں، ہم سے کیا پردہ بیگم۔۔۔۔۔ آپ ہر وقت بہو کے خوابوں میں گم رہتی ہیں۔ ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن۔“

”بس۔۔۔۔۔ بس مجھے کوئی لیکچر نہیں سنتا۔“ اماں جانتی تھیں کہ ابا ہمیشہ کی طرح ان کو طعنے دیں گے اس

لیے وہ وہاں سے بھاگیں۔ اب وہ کیسے اعتراض کرتیں کہ ان کو ان کی کرنی کی سزا مل گئی ہے کہ ان کے خوابوں کا سلسلہ آگے بڑھا اور جڑواں کے حساب سے چار پوتیاں ان کو اپنی گود میں کھلانے لگیں۔ اصول طور پر تو اسد میاں کے بچوں کو ان پر یاد دہیالی رٹے داروں پر جانا چاہیے تھا مگر بد قسمتی اماں بیگم کی کہ بچے ننھیالی جنوں پر چلے گئے اب تو گھر بھر گیا تھا اماں کا جناتی پوتے پوتیوں سے۔ ہر وقت قیامت خیز شور اور ہنگامہ رہتا، عام انسانی بچے ہوتے تو کھلونوں سے کھیلتے مگر یہ تو جناتی بچے تھے۔ دادی سے کھیلتے۔۔۔۔۔ کبھی دادی کو فٹ بال بتالیا جاتا۔۔۔۔۔ کبھی کچھ کھیلا جاتا۔

”رکو بچو۔۔۔۔۔ ارے گر جاؤں گی۔۔۔۔۔ ارے میں۔۔۔۔۔ میں شوگر کی مریض ہوں دل کا عارضہ بھی ہے۔۔۔۔۔ مت اچھا لو۔“

”بھیا! دادو کو کچھ کرو۔“

”ہاں، کچھ۔۔۔۔۔ کچھ کھیلتے ہیں۔“ اور دادو کی چیخ پکار کو انور کے بچے دادو کو اچھا اچھا کر کھیلتے۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں کھیلو جن کے نواسے نو اسیوں۔۔۔۔۔ دادو کا قصور ہے، اسی کو سزا ملنی چاہیے۔ ارے کم بختوں رکو۔۔۔۔۔ چھوڑو مگر جاؤں گی۔۔۔۔۔ میری کمر ٹوٹ جائے گی۔“

”نو پرا بلیم دادو، ہم خود آپ کا آپریشن کریں گے۔۔۔۔۔ منی سچ۔“

”ارے کم بخت عالم چنا کی جڑواں بہن کو منی کہہ رہا ہے۔۔۔۔۔ مگر جاؤں گی۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور۔“

”اور دادو گر گئیں۔“ بچوں کا دادو کے گرد رقص شروع ہو گیا۔

”ہائے مر گئی۔۔۔۔۔ ارے میری کمر ٹوٹ گئی۔“

”نو پرا بلیم دادو۔۔۔۔۔ بھیا دادو کا آپریشن کریں۔“ اور پھر ریڈ اٹھین ہو۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ ہا ہوتا۔۔۔۔۔ رقص ہوتا رہا اور دادو چلائی رہیں۔

”بچاؤ، بچاؤ۔۔۔۔۔ ارے کم بختوں۔۔۔۔۔ چھوڑو۔۔۔۔۔ میں بد قسمتی سے دادی ہوں تم لوگوں کی فٹ ال نہیں۔ ارے میری ٹانگ مت کاٹو۔۔۔۔۔ اسد بیٹا، ارے اسد کے ابا بچائیں مجھے۔۔۔۔۔ وعدہ کرتی ہوں آئندہ کسی میں عیب نہیں نکالوں گی کسی کی بیٹی میں نقص نہیں نکالوں گی۔۔۔۔۔ اب تو ان بھوتوں سے بچا لو۔۔۔۔۔ ارے لوگوں محلے والوں۔۔۔۔۔ مجھے میرے پوتے پوتیوں سے بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ۔“ اماں نیند میں چلا رہی تھیں ابا اور بیٹیاں جمع ہو گئی تھیں۔

”اماں! ہوش کریں۔۔۔۔۔ کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ انھیں آپ کوئی خواب دیکھ رہی تھیں؟“ بیٹی نے جھنجھوڑا مگر وہ ابھی تک خواب کے ٹرانس میں تھیں۔

”ارے بچاؤ مجھے۔۔۔۔۔ تمہیں نظر نہیں آ رہا میرا پوتا چھری سے میری ٹانگ کاٹ رہا ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور چڑیل پوتیاں مجھے انجکشن لگا رہی ہیں بے ہوشی کا مگر میں بے ہوش ہونے والی نہیں۔۔۔۔۔ بچاؤ۔

بچاؤ۔۔۔۔۔ مجھے میرے پوتے پوتیوں سے بچاؤ۔“

”ارے! بھی لڑکیوں تم لوگوں کی ماں اپنے کیفر کردار تک پہنچ گئی ہیں یعنی کہ حد ہو گئی گاؤں بسا نہیں اور انہوں نے چور چور چلانا شروع کر دیا۔ بیٹے کا ولیمہ ہوا نہیں ان کو پوتے پوتیوں سے خطرہ لاحق ہو گیا۔“

”ابا، اماں کی حالت ٹھیک نہیں ڈاکٹر کو بلائیں۔“

”بیٹا! تمہارا ماں کی جو حالت ہے ان کو ڈاکٹر کی نہیں کسی مولانا کی ضرورت ہے، دیکھو تو کیا اول نول بک رہی ہیں۔“

”اماں! آپ کوئی خواب دیکھ رہی تھیں، انھیں ابھی کوئی پوتا پوتی نہیں ہوئی آپ کی۔۔۔۔۔ انھیں۔۔۔۔۔ اماں۔۔۔۔۔ اماں ابھی اسد اور دلہن آنے والے ہیں

آشنا

تمہیں تو سب پتا ہوگا
انتظار کیا شے ہے
عذاب جان ہوتا ہے
راہ کسی کی دیکھنا
پہروں اس کی یاد میں
دنیا سے منہ پھیرنا
اک ایک ہل صدی لگے
وقت کب گزرتا ہے
تمہیں تو سب پتا ہوگا
محبیوں کی رسوں کا
وعدے وفا کی قسموں کا
محبوب جب پھرتا ہے
خون دل نچرتا ہے
تمہیں تو سب پتا ہوگا
محبوب کی جدائی میں
ہر چیز مونی لگتی ہے
اس کی ہر آہٹ پر
دل بے وجد مڑتا ہے
ہر ہل اسی کو دیکھنے کو
ترہتا ہے جلتا ہے
تمہیں تو سب پتا ہوگا

کہ
تم بھی تو انہی راہوں کے
بے منزل مسافر ہو
تم بھی تو اسی لذت سے
ہر لمحہ آشنا بھی ہو
تمہیں تو سب پتا ہوگا
کہ تم بھی تو پیار کرتے ہو

زینب ظفر زریں، قلعہ دیدار سنگھ

ہوش میں آئیں۔“

”ارے! پہلے میرا آپریشن تو رکواؤ..... پھر بہو بیٹے سے بھی مل لوں گی..... ہائے ٹانگ الگ کر دی کم بختوں نے..... اب..... اب ہائے میرا ہاتھ کٹ گیا..... اور اب پاؤں..... ہائے یہ پوتیاں اور پوتے..... مجھے کاٹ رہے ہیں نہ شوہر کو پروانہ بیٹیوں کو چاہ۔“

”ارے، بھئی بڑے ہی احمق ہیں ہمارے پوتے، پوتیاں..... ہاتھ پاؤں کی کاٹا بیٹی سے پہلے ان کو اپنی دادی کی زبان پر ہاتھ صاف کرنا چاہیے تھا پھر آرام سے قیمہ بنانا چاہیے تھا۔“

”ہاں..... ہاں آپ تو یہی چاہتے ہیں میں آج مردوں کل دو جا دن ہو..... اور آپ دوسری لے کر آئیں۔“

”ہائے! ہائے بیگم کیوں نمک پاشی کرتی ہیں زخموں پر..... حسرت اُن غنچوں پر جو بن بکھے مرجھا گئے۔“

”ارے! زخم زخم تو میں ہو گئی ہوں۔ میری پوتی کہہ رہی تھی۔ آؤ بھیا دادو، دادو کھیلیں اور جو کم بختوں نے دادو کو فٹ بال بنا کر کھیلایا ہے تو..... سیالکوٹ فٹ بال کا ایک ایک بچہ اوھڑا لالا..... ہائے۔“

”اماں! اب جاگ جائیں..... آپ خواب دیکھ رہی تھیں۔“

”ہیں اگر خواب اتنا بھیا نک تھا تو تعبیر کیسی ہو گی..... تعبیر تو اس سے بھی بھیا نک ہو گی..... نہیں کھولوں گی میں آنکھیں۔“

”آنکھیں کھولیں ای جان! کبھی کبھی بھیا نک خوابوں کی تعبیر بہت حسین ہوتی ہے..... آنکھیں کھولیں اور اپنے بھیا نک خواب کی حسین تعبیر دیکھیں۔“ اسد میاں اپنی دلہن کے ساتھ آچکے تھے۔

”ہائیں، یہ تو میرے شہزادے کی آواز ہے۔“

”جی ای! آنکھیں کھولیں اور اپنے شہزادے کے ساتھ شہزادی کو دیکھیں۔“

”نہیں، میں آنکھیں نہیں کھولوں گی، سوڈانی ڈائن مجھے نکل جائے گی۔“

”ارے نہیں ای جان! آپ ایک بار آنکھیں کھول کے دیکھیں تو سہی..... سوڈان کے بارے میں آپ کی رائے بدل جائے گی..... جی ای! آہستہ آہستہ کھولیں آنکھیں۔“

”بیٹا! ان کے پوتے پوتیوں نے ان کی ٹانگوں کا آپریشن کیا ہے۔ آنکھوں کا نہیں..... بیگم آنکھیں کھول کر دیکھو اور پھر بے ہوش ہو جاؤ۔“

”ای جان! بس ایک بار آپ اپنی بہو اجالا کو دیکھ لیں۔ آپ کے خوابوں کا شہر روشن نہ ہو جائے تو کہیے گا۔“

”اچھا! تم سب اگر مجھے مارنے پر تلے ہی ہو باپ سمیت تو لو میں نے آنکھیں کھو..... کھولیں..... ارے یہ..... یہ پری ہے..... حور ہے۔“

کنز و رول اماں تو بھیا نک بہو کو دیکھے بغیر ہی بے ہوش ہو گئی تھیں تو اتنی حسین جمیل بہو اجالا کو دیکھ کر کیوں نہ بے ہوش ہوتیں۔

”ای جان یہ پری ہی ہے، آپ نے کہا تھا کہ تمہاری شادی پرستان کی پری سے کروں گی تو اللہ نے آپ کی خواہش پوری کر دی اور مجھے اجالا کی فیملی سے ملوا دیا۔ ان کے آباؤ اجداد سوڈان میں آباد ہیں اور سوڈانی شہری کی حیثیت سے وہاں رہتے ہیں۔ اس طرح اللہ نے آپ کی پری والی خواہش پوری کر دی۔“ اسد میاں دامتان سنارہے تھے اور اماں دل میں شرمندہ ہو کر اللہ سے توبہ کر رہی تھیں کہ انہوں نے کتنی لڑکیوں اور ان کے والدین کے دل دکھائے تھے اور پروردگار نے پھر بھی ان کو نوازا دیا تھا۔



”ارے تمثیل..... تم یہاں ہو اور وہاں میڈم خالدہ تمہیں کال کر رہی ہیں۔“ تبسم نے کہا تو اس نے بڑا کر آفس کی طرف دوڑ لگائی۔ ابھی اس کی نئی نئی نوکری تھی اور اپنی بے پروائی سے وہ یہ نوکری کھوتا نہیں چاہتی تھی۔

”مس تمثیل..... کہاں تمہیں تم.....؟“ میڈم خالدہ اس کی کرسی پر اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں اور ان کے ماتھے پر سلوٹیں تھیں۔

اسیرانِ قفس

سعدیہ نیرس



”وہ میڈم..... میں ذرا واش روم تک گئی تھی۔“ اس نے بوکھلا کر بہانہ گھڑا لیکن پھر میڈم خالدہ کی چبھتی ہوئی نظروں سے خائف ہو گئی۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

”ایک گھنٹے پہلے انٹرکام پر تم سے رابطہ کرنا چاہا مگر تم یہاں جب بھی نہ تھیں۔ اس کے چندرہ منٹ بعد عطیہ سے بلوایا مگر تم جب بھی سیٹ پر نہ تھیں اور اب آدھے گھنٹے سے میں خود یہاں بیٹھی ہوں۔“ انہوں نے اسے بتایا۔

”آتم سوری میڈم.....“ وہ اتنا ہی کہہ سکی کہ ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی جھوٹ بول کر کر دی تھی۔

”سوری.....“ انہوں نے اس لفظ کو دہرایا۔ ”یکھو تمہیں مجھے اس لفظ سے سخت چڑ ہے۔ غلطی یا کوتاہی کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہو ایک ”سوری“ سے اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کسی نقصان کو بھرا جاسکتا ہے۔ میں نے تمہیں ایک ہوشیار، ذمے دار لڑکی سمجھ کر یہاں اپائنٹ کیا تھا مگر اب مجھے اپنے انتخاب پر افسوس ہو رہا ہے۔ میں نے تمہیں ایذا سے انچارج یہاں اپائنٹ کیا تھا مگر تم تو سیریس ہی نہیں لگ رہیں۔ کیا مذاق سمجھا ہے تم نے جاب کو۔ پورے ایک گھنٹے تم سیٹ سے غائب رہیں۔ ایم آئی رائٹ؟ مجھے افسوس ہے کہ میرے بارلر اور جم میں کسی بے پروا اور غیر ذمے دار لڑکی کی کوئی گنجائش نہیں۔“ کافی سنگ دلی سے اسے لتاڑ کر انہوں نے اسے..... برطرف کرنے کا ارادہ ظاہر کر کے جھکا دیا۔

تمہیں اپنی اس پہلی غلطی پر اتنے سخت ردِ عمل کو دیکھ کر نہ صرف بہت زیادہ پریشان ہوئی بلکہ اسے میڈم خالدہ کے روتے پر بہت دکھ بھی ہوا۔ اس نے نظریں جھکا رکھی تھیں کیونکہ وہ شرمسار تھی۔ اس نے شرمسار نظروں سے میڈم خالدہ کو دیکھا۔ اس وقت دھندلے سے منظر میں میڈم خالدہ اسے انتہائی

سفاک خاتون لگیں۔ پرہیزگار پھولدار بلاؤز اور پارڈر والی ساڑی میں وہ کافی گریس فل لگ رہی تھیں۔ گردن پر پڑنے والی لکیریں ان کی عمر کی چلڑی کھارہ تھی اور سنہرے فریم کی عینک ان کی اسی ناکی پر لگی ہوئی تھی جس پر اس وقت غصہ بھی دھرا ہوا تھا۔

”میڈم آپ یقین کریں..... میں پہلے واش روم ہی گئی تھی لیکن پھر اس کے بعد اس طرف آئی رہی تھی تو تبسم سے سلمنگ کے بارے میں کچھ معلومات لینے کھڑی ہو گئی دراصل میری ایک آنٹی بھی جوائن کر چاہ رہی تھیں اسی لیے..... گز بڑ ہو گئی۔ آئندہ خیال رکھوں گی میڈم۔“ اس نے بروقت بڑا اچھا جواز پیش کیا۔ بات چونکہ میڈم کے مطلب کی تھی اس لیے اسے ذرا نرم پڑ گئیں۔

”اچھا ٹھیک ہے..... لیکن یاد رکھو کہ اس قسم کی باتیں یا تو آفس ٹائم کے بعد ہوتی ہیں یا پھر ٹیچ آؤر میں..... اب تمہاری وجہ سے تبسم کا ٹائم بھی ویسٹ ہو گا تم جانتی ہو کہ وہ میری سب سے بیسٹ انشور کٹر ہے خیر..... مجھے یہ کوتاہیاں بالکل نہیں پسند۔“ کچھ رعایت دیتے ہوئے بھی وہ بہت کچھ سنا گئیں پھر میز کی ورا کھول کر انہوں نے اسے چند ناموں کی لسٹ تھما دی۔

”اسے کمپیوٹر میں سیو کر لینا اور ہاں یہ اپائنٹل ڈس کاؤنٹ چیک کے کارڈز ہیں، جو کسٹر پارلر کی معلومات کے لیے آئے اب اسے یہی کارڈ دینا ہے..... ابھی عطیہ بھی تم کو سلمنگ سینٹر کا کچھ ریکارڈ دے گی اسے بھی کمپیوٹر میں ڈالنا ہے۔“ انہوں نے پیشہ ورانہ انداز میں اسے ہدایات دیں پھر کرسی چھوڑ کر اٹھ گئیں۔

ان کے جانے کے بعد اس نے سکون کی گہری سانس بھری ورنہ چند ہی منٹ میں انہوں نے اس کا برا حال کر دیا تھا۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو وہ اسی وقت ملازمت چھوڑ دیتی لیکن وہ جذباتی لڑکی نہ تھی کہ ایسی حماقت کر کے پھر پچھتاتی رہتی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے

وہاں مشکل سے ملی ہے اور قابلِ اطمینان بات یہ تھی کہ یہاں کا ماحول بھی صاف ستھرا اور اسی کے مطابق لاہ زیادہ اسٹاف خواتین اور لڑکیوں پر مشتمل تھا اور انے والی بھی لڑکیاں اور خواتین ہی ہوتی تھیں۔

جب وہ آفس سے باہر آئی تو اس کی اتری شکل لہم سے چھپی نہ رہ سکی۔ سلمنگ سینٹر خالی ہو چکا تھا۔ کچھ دیر قبل جہاں لڑکیوں کی چہل پہل تھی اب وہی جگہ خالی پڑی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ تبسم بھی اپنا ہایا پن کر نکلنے والی تھی۔ اس کی ڈیوٹی شام چھ بجے آج ہو جاتی تھی البتہ پارلر رات دس بجے سے پہلے بند لیں ہوتا تھا اور اسے بھی دس بجے تک لازماً یہاں اٹھنی دینی تھی کیونکہ میڈم خالدہ نے اسے انچارج کر رکھا تھا۔

”ہو گئی خاطر مدارت؟“ تبسم نے شرارت سے اس کے سستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

”کچھ زیادہ ہی اوور ہیں خاتون؟“ اس نے ٹوپیہ کہا کہ دل تو پہلے ہی جلا ہوا تھا۔

”ہاں، ذرائف خاتون ہیں، بے پردائی انہیں اہل برداشت نہیں، یہ اپنے ہر ایمپلائی کے ساتھ ایسا کر رہی ہیں۔“ تبسم نے مزید معلومات بہم پہنچائیں۔

”اف، کہاں پھنس گئی..... یہ تو جان کو آجائیں گی میری۔“ اس نے دل میں سوچا۔ آج کے واقعے نے اس کے دل میں میڈم خالدہ کے خلاف پھانس سی اٹھ دی تھی۔

جب وہ گھر لوٹی تو میلے، میلے بوسیدہ سے ماحول اُمدم کر اس کی تیوریوں پر مزید مٹی پڑ گئے۔ یہ اول، یہ جگہ اور یہ گھر اسے بہت ناگوار لگتا تھا لیکن وہ اہل رہنے پر مجبور تھی کیونکہ وہ اسی ماحول کی پیداوار تھی لیکن اس ماحول سے نکلنے اور نجات پانے کی راہ پوچھنا ہی رکھتی تھی۔ ایک تو دن بھر کی محنت پھر اور پھر تا غصہ اور اب گھر کی بد حالی دیکھ کر اس کا موڈ

اور بھی خراب ہو گیا۔ دلی پتلی سی سطوت دوپٹے سے بے نیاز بد رنگ سے کپڑوں میں ملبوس مشین پر جھکی کپڑے سی رہی تھی۔ اسی وقت سرفراز کمرے سے باہر آ گیا اور صحن میں بچھے جھلنگا سے پلنگ پر بیٹھ کر لمبی سی ڈکاری اور تنقیدی نظروں سے تمہیل کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”آگئیں تم.....؟“ اس نے دوسری نظر دیوار پر لگی گھڑی پر ڈالی تھی یعنی اسے باور کرا دیا تھا کہ وہ دیر سے گھر لوٹی ہے۔

اس نے سرفراز کو کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا کیونکہ اس جیسے بیکار اور ہڈ حرام مرد سے دینا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ ویسے بھی ایک عرصے سے وہ اپنا کھاتی کماتی آرہی تھی، میڈم خالدہ سے پہلے وہ دواؤں کی ایک کمپنی میں پیکنگ گرل کے طور پر کام کر چکی تھی۔ اس نے ترحم آمیز نظروں سے سلائی مشین پر جھکی سطوت کو دیکھا جسے شام کا اندھیرا اترنے کے بعد پورے برآمدے میں لگے واحد بلب کی ناکافی روشنی میں دیکھنے میں کافی دقت ہو رہی تھی اور وہ آنکھیں چندھیا کر بہ مشکل سوئی میں دھاگا ڈال رہی تھی۔ جب سے شادی ہو کر آئی تھی اسی طرح اپنی جان جو حکم میں ڈال کر گھر کا دال دلیا چلا رہی تھی۔ سرفراز نے اسے کبھی سکھ نہ دیا تھا۔ اسے دھان پان سی سطوت پر بڑا رحم آتا تھا جو اتنی مشقتیں جھیل کر سرفراز جیسے شوہر کو برداشت کر رہی تھی۔

”اب بند کرو اپنی کھڑ پٹر..... کھانا لگاؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ سرفراز نے نوابوں کی طرح بیٹھے بیٹھے حکم جاری کیا۔

”بس تھوڑی دیر اور..... یہ ذرا سارہ گیا ہے۔“ ارجنٹ ہے ابھی لینے کے لیے آجائیں گی اپنی قمیص.....“ اس نے مشین چلاتے ہوئے لجاجت سے جواب دیا۔

”آہ..... کیا قسمت ہے عورت کی..... کس طرح تن من بھلا کر اپنے بچوں کے لیے اور گھر بسانے کے لیے..... بھابی لگی رہتی ہیں۔“ تمثیل نے تاسف سے سوچا۔

سطوت کا حشر خراب ہو چکا تھا۔ جب وہ شادی ہو کر آئی تھی تو اس قدر پیاری اور من ہوئی تھی لیکن اب اتنی ہی عمر میں ہی ایک بڑی عمر کی عورت معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی رنگت ماند پڑ گئی تھی اور چہرے پر ہمہ وقت فکروں کی پرچھائیاں سی اتری رہتی تھیں۔ اس کے جسم پر معمولی لباس تھا۔ حالانکہ وہ بھی جذبات سے بھرا دل رکھتی تھی لیکن حالات کی بے رحم حقیقتوں نے اسے خود سے بے پروا کر دیا تھا۔ وہ بھی ایک عورت تھی لیکن اس کی کلائیاں چوڑیوں سے خالی تھیں۔ ناک، کان یا گلے میں بھی کبھی کوئی زیور نہیں ہوتا تھا۔ وہ محدود زندگی کے شکنجے میں جکڑ کر رہ گئی تھی اور تمثیل کو عورت کے اس ازلی مجبور اور شکستہ روپ سے سخت چڑھتی۔ وہ سمجھتی تھی کہ جس طرح ایک مرد کو عورت کی نظر میں جواہیت و مقام حاصل ہوتا ہے، اسی طرح ایک عورت کا بھی مرد کی نظر میں وہی مقام اور اہمیت ہونی چاہیے لیکن سرفراز تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس کی بے عزتی کر دیتا تھا باوجود اس کے کہ وہ محنت کر کے اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ دراصل جس کارخانے میں سرفراز منجبر تھا وہ ناگزیر وجوہات کی بنا پر بند ہو گیا تھا اور اس کے بعد سے سرفراز کی مستقل نوکری نہیں لگ پاری تھی سو اپنی ساری پریشانی وہ سطوت پر ہی الٹ دیتا تھا اور تمثیل کی ساری ہمدردیاں سطوت کے ساتھ تھیں۔ چونکہ وہ خود سطوت کی صنف سے تعلق رکھتی تھی اس لیے اس کے درد کو سمجھتی تھی لیکن اس نے دل میں یہی طے کر رکھا تھا کہ خود کو کبھی بھی کسی مرد کے سامنے جھکنے نہ دے گی۔

☆☆☆

رات وہ دیر سے سو پائی تھی اس لیے صبح اس آنکھ دیر سے کھلی۔ اسے میڈم خالدہ کی کل والی عزت افزائی اچھی طرح یاد تھی اس لیے وہ ہوا کے گھوڑ پر سوار ہو کر پارلر کے لیے نکلی تھی اور اسی عجلت میں، سڑک پار کرتے ہوئے مخالف طرف سے آنے والی سفید کلش کی زد میں آنے سے بال بال بچی۔ خود بچانے کے چکر میں اس کا پاؤں بری طرح مڑا اور، ڈنگا کر گر گئی۔ اس افتاد سے اس کی دھڑکن بھی غیر معمولی ہو گئی تھی اور حواس منتشر سے ہو گئے تھے اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس کی مطلوبہ بس بھی نکل گئی۔ غیر متوقع طور پر کلش لہرائی اسپید میں آگے جا کر رک گئی پھر ریورس ہو کر اس تک آگئی۔

”میرا خیال ہے زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے اور صرف ایک ہی بار ملتی ہے، اپنی زندگی کی حفاظت کرنا ہم سب کے لیے ضروری ہے لیکن محترمہ لگتا ہے کہ آپ کو اپنی زندگی عزیز نہیں اور اگر اس زندگی سے زیادہ ہی بیزار ہیں تو میرا غلطانہ مشورہ ہے کہ اس طرح بچ سڑک پر خوار ہونے کے بجائے اپنے ہی گھر کے کسی بند کمرے میں چٹکھے سے لٹک کر اپنا خاتمہ کر لیں۔ اس طرح تو آپ اپنے ساتھ ساتھ دوسرے کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال رہی ہیں۔“ اس نے بلا مروت اسے باتیں سنا ڈالیں۔ لیکن اس وقت وہ پاؤں کے درد سے بے حال ہو رہی تھی اور اوسان بھی ٹھکانے پر نہیں آئے تھے اس لیے اس کی بات کا کوئی جواب اس نے نہیں دیا اور پاؤں سیدھا کرنے کے چکر میں اس کے منہ سے کراہ نکل گئی تب اس اجنبی لڑکے کو اس کی تکلیف کا کچھ احساس ہوا ورنہ تو بس وہ جو منہ میں آ رہا تھا بولے جا رہا تھا۔

”لگتا ہے آپ کو چوٹ بھی آئی ہے..... ویسے آپ شکل صورت سے تو پڑھی لکھی سمجھ دار لگتی ہیں، کیا کسی نے آپ کو کبھی یہ نہیں بتایا کہ ہمارے مذہب میں

لودنشی حرام ہے۔“ اس کا ہمدردی کے پردے میں لپٹا طنز اسے سلگا گیا۔

”معاف کیجیے گا مسٹر، اگر آپ کا لپکچر ختم ہو گیا ہو تو آپ اسی وقت یہاں سے جاسکتے ہیں۔ ایک بات اور سن لیں کہ آپ خود بھی آنکھیں کھول کر گاڑی چلا یا کریں، مجھے بھی ابھی مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے اور آخری بات یہ کہ کم بولا کریں اور سوچ سمجھ کر بولا کریں۔“ اس نے کافی بد مزاجی اور بد لحاظی سے لٹیک ٹھاک سنا کر اس کی طبیعت صاف کر دی۔

”واؤ..... دیکھیں غلطی تو آپ ہی کی ہے، یوں آنکھیں بند کر کے اندھا دھند سڑک کر اس کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟“ وہ اپنی غلطی ماننے پر تیار نہ تھا۔ ”آپ کی وجہ سے میری بس بھی نکل گئی، اسی چکر میں اتنی عجلت میں روڈ کر اس کر رہی تھی میں..... آپ خود تو گاڑی میں بیٹھے ہیں جب دھکے کھا کر بس میں سفر کرنا پڑے تو پتا چلے گا آپ کو۔“ وہ اپنے غصے پر قابو نہ پاسکی۔

سچ تو یہ تھا کہ اس کی بے بسی پر تمثیل کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس کے درد اور تکلیف سے بے نیاز وہ اسے مسلسل باتیں سنائے جا رہا تھا بلکہ اخلاقی طور پر تو اسے گاڑی سے اتر کر اسے سہارا دینا چاہیے تھا مگر وہ کمال ڈھٹائی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی ساری باتیں کیے جا رہا تھا۔

”اوہ، سوری..... میری وجہ سے آپ کا بڑا عظیم نقصان ہو گیا۔ آئیں میں آپ کو آپ کی مطلوبہ جگہ اراپ کر دیتا ہوں۔“ اس نے پیشکش کی۔

”شکریہ، آپ کی اس ہمدردی کا..... آپ ہاں سکتے ہیں۔“ اس نے رکھائی سے کہا۔ تمثیل کا اتنا کہنا تھا کہ اس نے کچھ دبا کر گاڑی کو ریس دے دی اور ان سے لے اُڑا۔ پیچھے اڑتے دھواں آلود غبار میں اسے اپنا آپ بہت کم مایہ اور حقیر سا لگا۔ اگر اس کی

اپنی گاڑی ہوتی تو اسے اس شخص کی کڑوی کسلی باتیں نہ سننا پڑتیں۔ وہ بھی اپنی حیثیت مضبوط بنانا چاہتی تھی۔ اتنی مضبوط کہ کوئی دوسرا اس پر غالب نہ آ سکے۔ اس پر حکم نہ چلا سکے اور اسے مجبور نہ کر سکے۔

وہ آدھا گھٹنا لیٹ آفس پہنچی لیکن شکر تھا کہ میڈم خالدہ کی اب تک آمد نہ ہوئی تھی ویسے بھی وہ اکثر کچھ دیر تک سکون محسوس کیا اور پاؤں کا بخور جائزہ لیا۔ مڑنے کی وجہ سے پاؤں میں ٹخنے کے پاس سوجن سی ہو گئی تھی اور تکلیف بھی مسلسل ہو رہی تھی۔ اس بے وقت کے حادثے پر اسے خوب کوفت ہوئی۔ ابھی تو وہ اپنی سیٹ پر جی تھی اور نئی ملازمت میں مکمل طور پر رگن ہونا چاہتی تھی اگر تکلیف بڑھ جاتی تو چھٹی یعنی پڑتی اور چھٹی لینے کا خیال آتے ہی اسے میڈم خالدہ کی ڈانٹ یاد آگئی۔ پہلے ہی اس کا تاثر خراب ہو گیا تھا اب چھٹی لینا مزید تاثر خراب کر دیتا۔ اسی وقت سعید چلا آیا۔

”خیریت مس تمثیل..... آج آپ لیٹ ہو گئیں۔“ اسے سب خبر رہتی تھی اور کیوں نہ ہوتی میڈم خالدہ کا بڑا خاص منجبر تھا وہ۔ پارلر اور جم کے تمام معاملات میں وہ اسی پر بھروسہ کرتی تھیں اور تمام مسائل سے وہی نمٹتا تھا۔ اس کی بات کو میڈم بہت اہمیت دیتی تھیں۔ اسی لیے تمثیل پہلے ہی روز سے اس سے خائف تھی کہ وہ دن بھر کی ساری سرگرمیوں کی رپورٹ میڈم کو بہم پہنچاتا رہتا تھا، دوسرے لفظوں میں وہ اسے میڈم کا جاسوس کہا کرتی تھی۔ اسی لیے اسے دیکھ کر گھبرا گئی کہ اب وہ میڈم کو اس کے دیر سے آنے کی اطلاع دے دے گا۔

”وہ..... ہاں بس ایک ایکسپڈنٹ ہو گیا تھا چھوٹا سا..... ویسے تو کچھ نہیں ہوا بس پاؤں میں چوٹ آئی ہے۔“ اس نے مختصر لفظوں میں اسے ساری بات

”اوہ..... پھر تو آپ کو ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے.....“
آج آپ چھٹی کر لیتیں نا۔“ اس نے مخلصانہ انداز میں مشورہ دیا۔

”نو..... نو اُس اوکے..... آئم فائن..... کوئی مسئلہ نہیں ہے مجھے۔“ اس نے مسکرا کر صاف منع کر دیا۔

”اوکے..... ایز یوش.....“ وہ کندھے اچکا کر چلا گیا۔

”چچہ..... اسے تو موقع چاہیے ہوتا ہے میڈم کی چچہ گیری کا۔“ اس نے ناگواری سے اسے زیر لب نوازا۔

اس نے ٹیبل سیٹ کی ہی تھی کہ تبسم آگئی۔ اس نے اسے بھی حادثے کے بارے میں بتا دیا۔

”افوہ اور تم یہاں آرام سے بیٹھی ہو۔ ارے بھی اٹھو..... تھوڑا چلو پھرو، ورنہ سوجن اور بڑھ جائے گی کرسی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنے سے۔“ تبسم اسے بھد اصرار ہال کمرے میں لے آئی جہاں بھاری مشینیں رکھی تھیں۔ وہ آہستہ روی سے چہل قدمی کرتے ہوئے کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ نیچے سر سبز لان میں گھاس سورج کی روشنی سے چمک رہی تھی دراصل میڈم خالدہ کی شاندار کوٹھی کا ایک حصہ بیوٹی پارلر پر مشتمل تھا اور اسی کے اوپری حصے میں انہوں نے جم کھولا تھا۔ دوسرے حصے میں ان کی رہائش تھی۔ اس وقت بھی ان کے لان میں مالی پودوں کی کاٹ چھانٹ کر رہا تھا۔

”میڈم نے مالی بھی بڑا جن کر رکھا ہے۔ دیکھو تو کتنا ویل ڈریس ہے۔ پڑھا لکھا لگ رہا ہے۔“ اس نے ردانی میں تبصرہ کیا تھا مگر اس کی بات پر تبسم ہنس دی۔

”ارے وہ مالی تھوڑی ہے، وہ تو میڈم کے شوہر ہیں۔ اصل میں میڈم کے مزاج میں حاکمیت ہے

تو اپنے شوہر کو بھی دیو بنا رکھا ہے۔ دراصل یہ بھی ایک آرٹ ہوتا ہے کہ کس طرح سامنے والے بندے کو اپنے قابو میں کیا جائے اور میڈم کو اس فن میں کمال حاصل ہے۔ وہ ہر کسی پر حکم چلاتی ہیں۔ دیکھا نہیں؟“ سعید صاحب، کیسے میڈم کی ہاں میں ہاں ملائے پھرتے ہیں۔“ تبسم نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”لو..... یاد کیا اور وہ حاضر..... اب وہ میڈم سے ہماری شکایت لگا دیں گے۔“ سامنے سے آتے سعید کو دیکھ کر اسے فکر ہوئی۔

”کچھ نہیں ہوتا..... تم ذرا میرا سہارا لے کر تھوڑا لنگڑا کر چلو، میں کہہ دوں گی کہ تمہارے پاؤں کی وجہ سے تمہیں ایکسر سائز کر رہی ہوں۔“ تبسم ان حضرت کو خوب اچھی طرح سمجھ چکی تھی اس لیے فوراً اسے ہدایت دی۔ وہ تبسم کے ساتھ کچھ ٹیڑھی ہو کر چلنے لگی اور یہ حربہ کامیاب بھی رہا۔

”خیریت مس تمثیل..... کیا زیادہ تکلیف ہو رہی ہے؟“ اس نے پاس آ کر پوچھا۔ اس کی ہر کام اور ہر بات میں بے جا مداخلت ان سب کو کھٹکتی تھی۔

”جی ہاں..... میں اسے ذرا داک کر رہی ہوں تاکہ پاؤں کی سوجن زیادہ نہ بڑھے۔ بیٹھی رہی تو تکلیف بڑھ سکتی ہے۔“ اس کے بجائے تبسم ہی نے جواب دیا۔

ذمے داریوں میں اس کا حسن اور جوانی دونوں ہی ضائع ہو رہے تھے۔ سلطوت کا حال دیکھ کر اس پر بھی اپنے مستقبل کا خوف سوار ہونے لگتا تھا، اسے اپنی عمر اور جوانی دونوں ہی عزیز تھے وہ اسے یوں سلطوت کی طرح ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”تو آج دھوبی گھاٹ کھلا ہوا ہے؟“ سارے خیالات کو جھٹک کر وہ سلطوت سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں بھئی، اپنی تو زندگی ہی بس اسی لیے رہ گئی ہے۔ کبھی لک بن کر، کبھی صفائی والی ماسی بن کر اور کبھی دھوبن بن کر زندگی گزر رہی ہے۔“ اس کے لہجے میں بہت کچھ کھودینے اور ارزانیات کا درد پنہاں تھا۔

”اس بار میں نے سوچ لیا ہے کہ میں واشنگ مشین تو ضرور ہی خرید لوں گی۔ بس بھابی دعا کرو کہ میری نوکری چلتی رہے، میڈم خالدہ ذرا سخت مزاج کی ہیں۔ تھوڑی سی بات بھی بری لگ جاتی ہے انہیں۔“ تمثیل نے اسے مقدور بھر دلاسا دیا اس کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”تمہارے کبے بغیر..... میں تمہارے نصیبوں کے لیے بہت دعائیں مانگتی ہوں تمثیل۔ پتا ہے ہر لڑکی کے دل میں چھوٹے چھوٹے ارمان ہوتے ہیں، وہ پورے نہ ہوں تو پھر اس کی زندگی بے رنگ ہو جاتی ہے۔ ہر لڑکی کا بچ جیسی نازک ہوتی ہے ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتی ہے اور زندگی تو صرف ایک ہی بار ملتی ہے نا.....“ وہ حسرت ناک سے انداز میں اپنی کھر درری ہتھیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔

اس کا درد تمثیل نے اپنے وجود میں اترتا ہوا محسوس کیا۔ وہ یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ یوں تو زندگی بڑی انمول ہوتی ہے، ہر انسان کی جان کی اپنی الگ اہمیت اور قدر ہوتی ہے مگر ایک عورت جب رشتوں میں بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوتی ہے اور جان لیوا رویوں اور نامناسب حالات کے ہاتھوں ضائع ہوتی

لچ آرز میں میڈم نے اسے طلب کر لیا۔ اسے ہی مشفق اور دوستانہ انداز میں اس کا حال احوال دریافت کیا تب اسے ان کو بھی اس حادثے کے بارے میں تفصیل بتانی پڑی۔ حیرت انگیز طور پر میڈم نے اسے آدمی چھٹی دے دی اور مزید دودن کی مہنی بھی عنایت کر دی حالانکہ اس کی خاص ضرورت تھی کہ وہ گھر کے ماحول سے خود فرار چاہتی تھی لیکن اب مجبوراً دودن اسے خود پر جبر کر کے گھر میں ہی گزارنے تھے۔ وہ میڈم کے آفس سے باہر آئی تو سامنے کھڑے سعید کو قہر آلود نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ سب کام اسی کے ایما پر ہوا ہے۔ میڈم نے اسی کے کہنے پر اس پر یہ مہربانی کی ہے، اسی لیے وہ اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اسے ایسے لوگوں سے سخت چڑھتی تھی جو خواہ مخواہ دوسروں پر مسلط ہو جاتے ہیں اور سعید بھی روز بروز اس پر مادی ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ کسی بھی دباؤ سے آزاد زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے جینا چاہتی تھی۔ وہ حکم سنا نہیں بلکہ حکم چلانا چاہتی تھی بالکل میڈم خالدہ کی طرح۔

☆☆☆

اس روز وہ جلدی گھر پہنچی تو سلطوت اسے یوں بے وقت آتا دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ وہ خود بھی بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ صحن میں بندھی رسی پر دھلے کپڑے یہاں سے وہاں تک دکھائی دے رہے تھے لیکن اس کے باوجود تمثیل کا حال جان کر اس نے نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر اس کے متاثرہ پاؤں کی نگہور کی۔ تمثیل اسے اس حال میں دیکھ کر کڑھتی رہی لیکن ہمدردی کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا البتہ اس نے دل ہی دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ اس بار قسطوں پر واشنگ مشین ضرور لے لے گی تاکہ سلطوت کا بوجھ کچھ آگاہ۔ یونہی ان چھوٹے موٹے بکھیروں، کاموں اور

ہے تو پھر کسی کو دکھ کیوں نہیں ہوتا..... کسی کو احساس کیوں نہیں ہوتا۔ اسی وقت سرفراز بھی گھر آ گیا۔ اسے دیکھ کر سطوت ہڑ بڑا کراٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ اس سے باتوں میں لگ کر وہ روٹی پکانا بھول گئی تھی۔

”کھانا دو جلدی!“ سرفراز نے شور مچایا۔
”بس ایک منٹ.....“ وہ چولہا جلا کر جلدی جلدی روٹی بنانے لگی۔

”اتنی دیر کر دی..... باہر سے تھکے ہارے آؤ تو یہاں بھی خوار ہو۔ صبح سے تم کرکیر رہی تھیں..... کھانا دو مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ سرفراز اس پر گرجنے لگا۔ تمٹیل نے انتہائی ناگواری سے اسے دیکھا۔ ایک بے بس، کمزور عورت پر حکم چلاتا ہوا وہ اسے انتہائی برا لگا۔

☆☆☆

دو روز کی چھٹی کے بعد جب وہ آفس پہنچی تو کچھ نئی تبدیلیاں نظر آئیں۔ اس کی جگہ تبدیل کر دی گئی تھی اور اسے میڈم کے بالکل برابر والے کمرے میں جگہ دی گئی تھی۔

”کیسی لگی یہ تبدیلی مس تمٹیل؟“ سعید نے جس انداز میں اس سے پوچھا تھا وہ اسی سے سمجھ گئی تھی کہ یہ کام کس کے کہنے پر ہوا۔

”آں..... ٹھیک ہے..... لیکن اپنی جگہ کی عادت ہی ہو جاتی ہے اور پھر اس تبدیلی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔“ اس نے خاص خوشی کا اظہار نہ کیا۔

”ویسے تو یہ سب کچھ آپ کے سکون اور آسانی کے لیے کیا گیا ہے۔ دیکھیں نا یہاں سے میڈم کا آفس بھی آپ کے قریب رہے گا اور بیرونی گیٹ اور ریسپشن بھی آپ کی نظر میں رہے گا۔ دراصل میڈم ذہین اور ذہنے دار لوگوں کی بہت قدر کرتی ہیں، اب مجھے ہی دیکھ لیں کہ میڈم مجھ پر کتنا اعتماد کرتی ہیں یقیناً آپ میں بھی کوالٹیز ہوں گی۔“ اس کا انداز ہی نہیں نظریں بھی بدلی بدلی سی تھیں۔ وہ ٹھٹکنے پر مجبور ہو گئی۔

کچھ روز سے وہ محسوس تو کر رہی تھی اب بالکل سا نظر آ رہا تھا۔ یہ عنایت اس پر یونہی تو نہیں کی گئی تھی سعید، میڈم کا سر چڑھا تھا اور وہ جس پر مہربان اس کے بھی وارے بنارے ہو جاتے تھے۔ سرفراز وقت اس کی نظر کرم تمٹیل پر تھی اور تمٹیل اس کی عنایتوں اور نوازشوں کو خوب سمجھ رہی تھی۔ اس نے بھی وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھا اور اس کی آنکھوں میں بڑی انوکھی سی چمک تھی جس نے تمٹیل کو کچھ چونکا کر دیا تھا۔ اس کی چھٹی جس سے کچھ خاص ہونے لگی تھی وہ بھی تمٹیل کی لکڑیوں کے جاکھانے انداز سے ہی چڑھتی تھی۔ اس کے دل میں اس کے لیے ایک رتی بھی گنجائش نہ تھی۔ وہ غیر محسوس طور پر آفس کے معاملات میں بھی اس پر اپنی مرضی چلا رہا تھا اور ایسے مرد زہر لگتے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد پارلر اور جم کی معمول کی گہما گہما اور اپنے کاموں میں مصروف ہو کر وہ سب باتیں بھول گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی انٹرکام پر میڈم نے اسے طلب کر لیا۔ وہ آفس میں داخل ہوئی تو ٹھٹک کر رک گئی کہ میڈم کے پاس پہلے ہی کوئی بیٹھا ہوا تھا۔

”آؤ تمٹیل.....“ اسے رکتے دیکھ کر میڈم نے کہا۔ وہ خاموشی سے ان کی میز کے سامنے رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ مکمل طور پر میڈم کی طرف متوجہ تھی، اس نے برابر کی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو بھی نہیں دیکھا۔

”ان سے ملو..... یہ ہیں سہیل.....“ میڈم نے اگلے ہی پل اسے مخاطب کر کے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم سے پہلے یہی یہاں انچارج تھے لیکن کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ جاب چھوڑ رہے ہیں۔ اب تم ان سے پچھلا سارا ریکارڈ اور دیگر امور اچھی طرح ازبر کر لو کہ یہ بڑی مشکل سے میرے ہاتھ

لگاؤں دو ماہ سے غائب تھے بغیر اطلاع کے۔“ اسے تفصیل سے سب کچھ بتا رہی تھیں اور تمٹیل روکے، آنکھیں پھاڑے حیرت سے برابر اپنے اس بدتمیز شخص کو دیکھ رہی تھی جس نے بے بسی کے لہجے میں اسے سارا ریکارڈ توڑ کر اسے سخت صدمہ پہنچا دیا تھا۔ اس دوران اسے جب بھی اس کا خیال تھا ایک ناخوشگوار احساس اس کا احاطہ کر لیتا تھا۔

”تمٹیل.....“ اس کی غائب دماغی محسوس کر کے میڈم نے اسے پکارا تو وہ چونک گئی۔

”جی میڈم.....“ وہ کچھ بدحواسی سے بولی۔

”ویسے میڈم..... آپ کی نیو انچارج کافی ہنر لگ رہی ہیں۔ آپ کا ہر کام بہت پر اپر اور ہنر پر کریں گی۔“ سہیل نے ڈھکا چھپا سا طنز کیا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو سہیل؟“ میڈم خالدہ نے لہجے میں جس سے مجبور ہو کر فوراً ہی سوال کیا۔ ویسے بھی وہاں کی کھال اتارنے والی خاتون تھیں۔ ان کے دال پر ایک لمحے کو وہ گڑ بڑا گیا۔

”وہ..... اصل میں کچھ چہروں سے ذہانت نکلتی ہے جیسے کچھ چہروں سے شرانت ظاہر ہوتی ہے.....“

تمٹیل نے اس کی غیبت کی بجائے اس کی تعریف کی۔ اس نے بات بناتے ہوئے بھی تمٹیل پر چوٹ مار دی لیکن اس وقت وہ اسے کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی کہ میڈم کے سامنے دونوں ہی اجنبی بنے رہے تھے۔

”بہر حال، میں ابھی اسی وقت سارے حساب کتاب اور ڈیٹنگ ان کے پنڈ اور کر دیتا ہوں۔ آپ اگر نہ کریں یہاں سے جانے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بالکل ہی نا تا توڑ لوں گا۔ میری ایک عادت ہے کہ جس سے بھی ایک بار ملتا ہوں پھر اسے بھولتا نہیں ہوں اور میرا خیال ہے کہ رابطوں کو بحال بھی رکھنا

چاہیے۔ اگر میرے والد صاحب اپنا نیا بزنس اسٹارٹ نہ کرتے تو بھی میں کبھی آپ کو نہ چھوڑتا۔“ وہ نہ جانے کیا کچھ بول رہا تھا اور تمٹیل اس کے سارے مطلب خوب سمجھ رہی تھی۔

”اوکے..... تم تمٹیل کے آفس میں اس کا انتظار کرو۔ یہ ابھی آرہی ہے تمہارے پاس۔“ انہوں نے اسے وہاں سے چلتا کیا۔

”توبہ، بہت ہی ہولنا ہے بھی۔ بڑا فارغ وقت ہے اس کے پاس..... میرے پاس تو اس سے سرکھانے کے لیے برداشت نہیں ہے اور تم بھی ذرا ریزرور ہنا ورنہ بول بول کر بھیجا کھا جائے گا تمہارا۔“ اس کے جانے کے بعد میڈم نے اسے خاص ہدایت دی۔ وہ کرسی سے اٹھی ہی تھی کہ انہیں پھر ایک ضروری بات یاد آ گئی۔

”ہاں تمٹیل..... تمہیں اپنا نیا کیمین کیسا لگا۔ ویسے یہ سعید بڑے اچھے مشورے دیتا ہے۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا کہ سہیل کے جانے کے بعد اس کا خالی کیمین تمہیں دے دوں۔ اچھا ہے تم بھی یکسوئی سے وہاں کام کرو گی اور پھر لیڈز کے لیے جتنی بھی سہولتیں ہوں کم ہیں۔“ وہ روانی میں بولتی چلی گئیں اور اپنے اندازے کی درستگی پر اسے سعید سے پہلے سے بھی بڑھ کر بیزاری محسوس ہوئی۔

وہ اپنے کیمین میں آئی تو سہیل اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ میڈم خالدہ کی بات بالکل صحیح تھی۔ سہیل نہ صرف باتوں کا بلکہ شوخ اور زندہ دل بھی تھا۔ اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے اسے ذرا بھی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوئی۔ پہلی ملاقات کا ناگوار تاثر زائل ہو گیا۔

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں جاب کرتی ہو تو اس روز تمہیں ضرور لفٹ دیتا۔ ویسے مجھے حیرت ہے کہ میڈم نے تم جیسی غیر ذہنے دار لڑکی کو کیسے منتخب کر لیا۔

ان کا مشن صرف کام اور کام ہے۔ شاید ایک گدھے سے بھی اتنا کام نہیں لیا جاتا جتنا میڈم اپنے ورکرز سے لیتی ہیں۔ انہی کے سینٹر میں بیٹھ کر وہ ویدہ دلیری سے انہی کے خلاف بول رہا تھا۔ تمثیل نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی سن تو نہیں رہا۔ وہ تو اس کے انداز تحاطب پر ہی حیران تھی اس نے آپ جناب کا تکلف کیے بغیر اسے تم کہہ کر مخاطب کیا تھا اور پھر اس کے طنز کی کاٹ اب اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔

”جو محنت سے گھبراتا ہے اور کام سے جی جراتا ہے میڈم ایسے لوگوں کو برداشت نہیں کرتیں۔ بالکل ٹھیک وقت پر انہوں نے نئے انچارج کو مقرر کیا ہے ورنہ کامل اور کام چور لوگ ان کی ساکھ کو نقصان پہنچا رہے تھے۔“ اس نے فوراً حساب برابر کیا۔

”واؤ..... تو یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ملی کو بلا وجہ تنگ کر دو وہ ضرور پنجہ مارتی ہے۔ دراصل ابھی تم نئی ہونا..... جب میڈم تمہارا جوس نکالیں گی تب پتا چلے گا تمہیں۔“ سہیل کے دوستانہ انداز میں کچھ ایسی اپنائیت تھی کہ اس وقت اس کے سامنے اس نے خود کو بہت کمزور محسوس کیا۔ ایک خود ساختہ خول جو اس نے خود پر اور اپنے جذبات پر چڑھایا ہوا تھا چھٹا سا گیا اور اس کے جانے کے بعد اسے لگا کہ اس کا وجود خلا میں معلق ہے، وہ ہاتھ پاؤں مارنا بھی چاہتی تو اس کے ہاتھ کچھ نہ آتا۔ اس روز سینٹر میں وہ اس کا آخری دن تھا۔ وہ اس کیفیت کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی لیکن سہیل نے ہر ہر لمحے اسے چونکا یا تھا۔ اس کے ساتھ لٹچ کرتے ہوئے اس نے صرف اور صرف تمثیل کی پسند اور مرضی سے لٹچ کیا تھا اور اس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مذاق کرنے کے علاوہ اس کی صلاحیتوں کو کھلے دل سے سراہ رہا تھا۔

اس روز کے بعد سے تمثیل کو اپنی زندگی میں خالی پن کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ اسے لگتا کہ

جیسے اس کی بہت قیمتی چیز کہیں گم ہو گئی ہے۔ ایک ایسے ہی روز کہ جب وہ فارغ بیٹھی اپنی سوچ کے سفر میں بھٹکتی سہیل کو یاد کر رہی تھی کہ وہ چلا آیا۔

”ہیلو تمثیل..... کیا حال ہے؟“ پہلے کی طرح شگفتہ و شوخ سا سہیل اس کے سامنے تھا۔

”ارے..... آپ..... میرا مطلب ہے کوئی کام تھا کیا؟“ وہ اپنی بوکھلاہٹ اور خوشی پر قابو نہ رکھ پائی۔

”پھر وہی کام..... ارے تمثیل کام سے ہٹ کر کچھ دوستی کے رشتے بھی نبھالیا کرتے ہیں۔ تمہاری یاد آئی سو چلا آیا۔ خواہ تم نے یاد کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر میں جس سے ایک بار مل لیتا ہوں اسے ہمیشہ یاد رکھتا ہوں۔“ وہ بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

اور تمثیل کو پھر کچھ یاد ہی نہ رہا۔ اس کی باتیں اس قدر پُرکشش تھیں کہ وہ سب کچھ بھول گئی۔ اس دوران چائے بھی اس نے خود ہی کہہ کر منگوائی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹا چٹکیوں میں گزر گیا۔ وہ تو جب میڈم خالدہ کے خادم خاص سعید نے تیسرا چکر لگایا تو اس کا خون خشک ہو گیا۔ میڈم ابھی آئی نہیں تھیں لیکن اس کی خبری تو ہو ہی جانی تھی۔ اس پریشان کن سوچ سے وہ ہوش میں آ گئی۔ چلتے وقت سہیل نے اس سے اس کا سل نمبر لے لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بری طرح کام میں مصروف ہو گئی، میڈم کب آئیں گی۔ معلوم نہ ہوا لیکن جب ان کا بلاوا آیا تو وہ ٹھنک گئی وہ جب آفس میں داخل ہوئی تو ان کے چہرے پر برہمی کے تاثرات تھے۔

”سہیل کیوں آیا تھا تمثیل؟“ اس کے بیٹھے لی انہوں نے خشک انداز میں سوال کیا۔ وہ اس پوچھ گچھ کے لیے پہلے سے تیار تھی مگر پھر بھی ایک لمحے کو گھبرا گئی۔ ”وہ آپ سے ملنے آیا تھا مگر آپ ملیں نہیں؟“ کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ ”اس نے خود کو سنبھال کر بڑی جرات سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولا

”مگر میں نے تو سنا ہے کہ تم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر چائے بھی پی تھی۔“ ان کے خبرنے انہیں ساری خبریں فراہم کر دی تھیں۔ اسے سعید کی اس چالپوسی پر حد سے زیادہ غصہ آیا۔

”میں نے تو فارملٹی نبھائی تھی میڈم..... اگر آپ کہیں گی تو آئندہ کسی کو نہیں پوچھوں گی۔“ پہلے تو وہ شٹا گئی پھر ایسا جواب دیا کہ وہ خود کھسک گئیں۔ ظاہر ہے یہ ان کے آفس کا اصول تھا۔ تمثیل نے کچھ غلط نہیں کیا تھا لیکن وہ چاہتی تھیں کہ کچھ بھی غلط ہونے سے پہلے تمثیل کو سمجھالیں۔

”وہ مجھے فون بھی تو کر سکتا تھا..... اب اس کا یہاں کیا کام؟“ انہوں نے کھردرے لہجے میں کہا۔

”یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔“ وہ صاف دامن بچا گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ میڈم خالدہ اس حد تک گر جائیں گی۔ بہر حال وہ ہر معاملے میں تو ان کو جواب دہ نہ تھی۔ اسے سخت ناگوار گزرا تھا اور شاید انہوں نے بھی اس کی ناگواری بھانپ لی تھی۔

”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں تمثیل کہ فارغ لوگوں کے پاس فارغ وقت ہوتا ہے۔ اسے سوائے باتیں بنانے اور چائے کی پیالیاں چڑھانے کے کچھ نہیں آتا۔ ابھی تمہاری عمر کم ہے، تجربہ محدود ہے اس لیے بہتر ہے کہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاؤ اور دیکھو آئندہ سہیل کبھی بھی کسی بھی وقت یہاں آئے تو مجھے فوراً مطلع کرنا۔ وہ ایک بے پروا اور غیر ذتے دار لڑکا ہے۔ مندی اور خود سر بھی ہے اور بہت اچھے حیثیت دار گھرانے کا فرد ہے لیکن والدین سے ناراضی کے بعد یہاں جاب کر رہا تھا مگر اس نے مجھے بہت مایوس کیا۔ اس کے اندر نہ سنجیدگی ہے اور نہ احساس ذتے داری۔“ میڈم خالدہ نے ہلکی پھلکی سرزنش کے ساتھ اسے بہت کچھ سمجھایا تھا مگر ان کی باتوں نے اسے اور بھی زیادہ ان سے متنفر کر دیا جو کی تھی وہ رات کو سہیل

سے موبائل پر بات کر کے پوری ہو گئی۔

”ایک دم کریزی عورت ہے وہ۔ اسے بس سب پر حکم چلانے کی عادت ہے۔ دیکھا نہیں اپنے شوہر کو کیسے قابو کیا ہوا ہے خود بڑھی گھوڑی ہیں مگر نو عمر لڑکوں کو دوستی کر کے پھنساتی ہیں۔ اسے دیکھو سعید کو..... کیسا ٹو بنا ہوا ہے ان کا۔ یہی کچھ وہ مجھ سے چاہ رہی تھیں۔ اسی لیے میرے خلاف بول رہی ہیں اور تمہاری میری دوستی سے جل رہی ہیں۔ تم ان کی باتوں میں نہ آنا۔“ سہیل کے دل میں بھی ان کے خلاف آگ بھڑکی ہوئی تھی اور اسے تو میڈم خالدہ سے اس روز سے شدید ترین نفرت ہو گئی۔

اگلے روز وہ آفس گئی تو اس کی نظروں میں میڈم کے لیے اجنبیت سی تھی۔ سعید بھی ان کے پاس کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے سخت نظروں سے سعید کو دیکھا۔ اس روز بجلی بھی چلی گئی اور اس کا بھی آفس میں دل نہ لگا ویسے بھی اس کا دل اب اس کے بس میں کہاں رہا تھا۔ سہیل نے اسے فون کیا تو وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر سہیل کے ساتھ آؤٹنگ پر نکل گئی۔ وہ دن بڑے خوب صورت تھے۔ اس کے پورے وجود میں سہیل کی محبت نشہ بن کر دوڑ رہی تھی۔ وہ اس کی محبت میں پور پور بھیگ چکی تھی اور سہیل بھی اس کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ وہ عورت کی آزادی کا قائل تھا۔ زور زبردستی، دھونس، دھمکی کا اس کی زندگی میں کہیں گزر نہ تھا۔ والدین کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا تھا اور انہی سے لڑائی کی وجہ سے اس کا جیب خرچ بند ہو گیا تھا اسی لیے اس نے عارضی طور پر میڈم خالدہ کے ہاں ملازمت کی تھی۔

”ارے، ہمارا تو اپنا اپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے مجھے کیا ضرورت ہے اس گھٹیا عورت کی دو ٹکے کی نوکری کی۔ وہ عورت سب کو کھلونا سمجھتی ہے۔ اپنے پیسے کے بل پر سب کو جھکانا چاہتی ہے خواہ

وہ مرد ہو یا عورت..... اس نے تو خود اپنے شوہر کو کھلونا بنا رکھا ہے۔“ سہیل کے دل میں میڈم خالدہ کے لیے کوئی رائی برابر بھی عزت نہ تھی اور تمثیل تو ان سے بالکل ہی بدظن ہو گئی۔

☆☆☆

ایک روز میڈم خالدہ نے اسے باقاعدہ انکوائری کے لیے طلب کر لیا۔ سہیل کے ساتھ اس کے افیسر کی خبر انہیں بھی ہو گئی تھی۔ اسے امید تھی کہ میڈم اس سے سہیل کے بارے میں استفسار کریں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔

”آؤ تمثیل..... بیٹھو ذرا۔“ اس کے بیٹھتے ہی انہوں نے چائے کا آرڈر بھی دے دیا۔ ان کا موڈ بہت خوشگوار تھا لیکن اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

”تمثیل ہم نے یعنی میں نے اور سعید نے مل کر یہ طے کیا ہے کہ اپنے ادارے کی لیڈی ورکرز کو کنوینس کی سہولت دیں گے۔ اس طرح ان کی حفاظت بھی رہے گی اور وقت کی پابندی بھی رہے گی۔“ انہوں نے اسے آگاہ کیا۔ اس نئے حکم پر وہ تلملا کر رہ گئی۔ پچھلے دنوں اسے آنے میں خاصی تاخیر ہو رہی تھی پھر واپسی پر وہ اکثر ہی سہیل کے ساتھ نکل جاتی تھی۔ اسی لیے جبراً اسے پابند کیا جا رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اس فیصلے میں سعید بہت پیش پیش ہے۔ وہ زبردستی اس پر مسلط ہونا چاہتا تھا اور اسے بلاوجہ رعب جمانے والے اور اپنی مرضی ٹھونسنے والے لوگ سخت برے لگتے تھے۔

”اوکے میڈم!“ اس نے مختصر کہا۔

وہ ان کی اس بات کو سن کر بری طرح چونک گئی۔ اسے توقع نہ تھی کہ میڈم اس کی زندگی کے اہم معاملے میں مداخلت کریں گی حالانکہ انہیں کوئی حق نہ تھا۔

”سوری میڈم! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ ابھی میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا۔“ اس نے رکھائی سے ٹکا سا جواب دے دیا۔

”لیکن تمثیل، سہیل تمہارے لیے بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ دیکھو میرا تمہارا رشتہ صرف اس ادارے کے تعلق سے ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم کسی مشکل میں پھنسو..... سعید محنتی ہے اور بہت جلد اپنا مقام بنالے گا۔ وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا اور میں نے تمہیں شروع میں ہی وارن کر دیا تھا کہ تم سہیل سے ریزرو رہنا مگر تم نے میری بات پر غور ہی نہیں کیا۔“ انہیں سب معلومات تھیں۔

”سوری میڈم، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ مجھے مجبور نہیں کر سکتیں۔“ اس نے صاف جواب دے دیا۔ تمثیل کو ان پر غصہ آ رہا تھا وہ خود تو دولت میں کھیل رہی تھیں آسائش سے بھرپور زندگی گزار رہی تھیں، اپنے شوہر پر حاوی ہو کر سب طرف خود چھائی ہوئی تھیں اور اسے سعید جیسے تنگ نظر اور حاکمیت پسند مرد کو اپنانے پر مجبور کر رہی تھیں۔

”تمثیل تم بھی یہیں جاب کرتی رہنا، میں تمہاری سگری بڑھادوں گی، سعید بھی بہت محنت کرے گا۔ تم دونوں مل کر اپنا گھر بنانا.....“ میڈم خالدہ ہر طرح سے اسے سہیل سے ملنے سے باز رکھنا چاہتی تھیں۔

”ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں میڈم..... سوری میں آپ کی بات نہیں مان سکتی۔“ وہ تو پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکی تھی مگر مہر آج مثبت کردی اپنے الفاظ کے ذریعے..... اس کے بعد پھر منزلیں آسان ہوتی گئیں۔ میڈم خالدہ کی معمولی سی ملازمت اس نے اسی وقت چھوڑ دی تھی۔ چلتے وقت ایک ہل کے

لیے رک کر اس نے سعید جیسے آمر شخص کو بے حد نخوت سے دیکھا تھا۔ وہ اس کے اشاروں پر عمل کر کے ساری زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ وہ سطوت کی طرح اپنی عمر اور خوب صورتی کو ایک شخص کے لیے ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ زندگی کو اپنی مرضی سے گزارنا چاہتی تھی۔ بنا کسی تسلط اور دباؤ کے۔

☆☆☆

اس کی شادی سادگی سے ہوئی تھی کیونکہ اس کے بھائی بھابی غریب تھے اور سہیل جیسے باحیثیت شخص سے بہت مرعوب بھی ہو گئے تھے۔ وہ ان کی غربت کے ٹاٹ میں نخل کا پوند تھا البتہ سہیل کے گھر والے اس شادی میں شامل نہ تھے لیکن یہ سہیل کی بے تحاشا محبت تھی کہ مخالفت کے باوجود اسے اپنا لیا۔ فی الحال تو اس نے..... اسے ایک لگژری اپارٹمنٹ میں رکھا تھا اور تمثیل اس پرانے محلے کے بوسیدہ سے گھر سے نکل کر اس اپارٹمنٹ میں آئی تو وہ اسے محل کی طرح لگا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، جب میں اپنے والدین کو منالوں گا تو پھر تم میرا ذاتی گھر دیکھ کر دنگ رہ جاؤ گی۔ اس پورے اپارٹمنٹ کے برابر ایک ماسٹر بیڈروم ہے میرا اور جب تم وہاں جاؤ گی تو میرے بیڈروم کی خوب صورتی کچھ اور بھی بڑھ جائے گی۔“ سہیل نے اسے شادی سے پہلے ہی گھر والوں کی مخالفت کے بارے میں بتا دیا تھا اور بعد میں بھی اس نے اسے تسلی دی تھی کہ ایک روز وہ ان سب کو منالے گا۔

”تمثیل میری تو پہلے ہی گھر والوں سے ناراضی چل رہی تھی، میرا جیب خرچ تک بند کر دیا تھا انہوں نے، اب میں نے پھر تم سے شادی کر کے انہیں ناراض کر دیا۔ دراصل وہ لوگ سطحی طور پر سوچتے ہیں۔ اسٹینس کے فرق کو دیکھتے ہیں اگر میرے دل میں جھانکیں تو انہیں معلوم ہو کہ تم میرے دل میں وہی مقام رکھتی ہو جو شہزادہ چارلس کے دل میں پرنس

ڈیانا کا تھا۔“ وہ بار بار اس سے اظہار محبت کرتا رہتا تھا اور تمثیل اپنی قسمت پر ناز کرنے لگتی۔

دن آہستہ روی سے مگر بڑے خوب صورت اور خوابناک سے گزر رہے تھے لیکن سہیل کے گھر والے سرد مہری اختیار کیے ہوئے تھے۔ ایک روز اچانک ہی وہ بہت خوش خوش گھر لوٹا۔

”دیکھا مان گئے نا ماما، پاپا..... خوش ہو جاؤ تمثیل، اب تم میری یعنی ایلین گروپ آف انڈسٹریز کے مالک فرحان انصاری کے چھوٹے بیٹے سہیل انصاری کی بیوی کی حیثیت سے قبول کر لی گئی ہو۔ انہوں نے ہمیں کل اپنے گھر بلا یا ہے۔ دعوت کی ہے ہماری۔“ وہ بے حد خوش تھا اور تمثیل بھی جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی۔

Monthly Digest
SUSPENSE
سپنس
SARGUZASHT
سرگزشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی

مکتبہ اہللا وسہلا
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP

P.O.Box 27869
Karama, Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817

JD Group of Publications

E-mail: welbook@emirates.net.ae

☆☆☆

وہ سہیل کے سنگ اس کی گٹھی میں گئی تو اس کی شان دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ سہیل اس کی سوچ سے بھی بڑھ کر لٹکا تھا۔ بے شمار دولت و جائداد کی ریل پیل تھی وہاں..... سہیل نے اسے بطور خاص سب سے متعارف کرایا۔

”گڈ..... اچھی ٹائٹس لڑکی ہو تم تمثیل..... میرے بیٹے کو قابو کر سکتی ہو تو یقیناً تمہارے اندر کمال کا ٹیلنٹ ہے۔“ اس کی ماما نے ہنستے ہوئے اسے جتایا۔ یہ تعریف تھی یا تنقید، وہ سمجھ نہ پائی، بس ان کا منہ دھمتی رہ گئی۔

”ماما..... کیسا لگا آپ کو میرا انتخاب..... جانتی ہیں ماما میرا ہے یہ..... میں نے اسے پہلی ہی نظر میں پرکھ لیا تھا۔ یہ بالکل میرے معیار کے مطابق ہے لیکن ماما تمثیل بہت ڈر رہی تھی کہ کہیں آپ اسے قبول نہ کریں۔“ سہیل نے لاڈ سے ماں کے گلے میں بازو ڈال کر کہا۔

”شی از پر فیکٹ، اچھی لڑکی ہے سمجھداری، پسند آئی مجھے..... اچھی ہے تمہاری چوائس۔“ انہوں نے کھلے دل سے اسے سراہا۔

”تو پھر ماما..... اب ہم گٹھی میں کب شفٹ ہوں؟“ اُن کی رضا پا کر سہیل خوش ہو گیا۔

”سلی بوائے، اب تم یگ مین ہو، اپنا الگ گھر بساؤ، تمہارے پاپا نے گلشن والا بنگلا شادی کے تحفے کے طور پر تمہارے نام کر دیا ہے۔“ انہوں نے کمال شفقت سے اسے اطلاع دی اور اتنی بڑی خبر سن کر تمثیل حیرت اور خوشی سے گنگ رہ گئی۔ وہ جس کام کو بہت مشکل سمجھ رہی تھی وہ مرحلہ بہ آسانی حل ہو گیا تھا کیونکہ سب نے اسے کھلے دل سے قبول کر لیا تھا، اس کے علاوہ سہیل کو فرحان انڈسٹریز کے شیئرز کے حساب سے ایک پوری فیکٹری کا اختیار کل بنا دیا گیا تھا

198 ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء

جسے چلانا اس کی ذمہ داری تھی۔

زندگی ایک دم ہی بدل گئی تھی۔ وہ بہت زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔ سہیل کی سگت میں اسے ہر آسانس مل گئی تھی۔ سہیل نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ فیکٹری کے اکثر معاملات وہی دیکھا کرتی تھی۔ سہیل اس کے کسی معاملے میں مداخلت بھی نہیں کرتا تھا اور وہ اس بات سے بہت خوش تھی لیکن کچھ عرصے بعد اسے اندازہ ہوا کہ سہیل کو بزنس کے معاملات سے چنداں دلچسپی نہیں۔ وہ تن آسان تھا۔ سویرے اٹھنا محال تھا اور روز کی ڈیوٹی ادا کرنا بھی اس کے لیے مشکل تھا۔ اس کا بیشتر وقت دوستوں میں، گھومنے پھرنے اور فلمیں دیکھنے میں گزرتا تھا۔ لڑکیوں سے دل لگی اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا، وہ اکثر رات گئے تک گھر سے باہر رہتا تھا۔ فیکٹری کے تمام معاملات تمثیل ہی دیکھتی تھی۔ معاملہ خواہ ڈیلنگ کا ہو یا میٹنگز کا، یہ در دسری تمثیل ہی بھگتاتی تھی۔ سہیل کو تو صرف اس جیب خرچ سے سروکار تھا جو اسے دینا تمثیل کی ذمہ داری تھی۔ وہ اس گورکھ دھندے میں اس بری طرح الجھی کہ جب احساس ہوا تو کہیں کوئی دوسرا راستہ نہ تھا سوائے سر جھکا کر کام کرنے کے..... بظاہر تو اس پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن وہ ذمہ داریوں کے جال میں جکڑ کر سہیل کے ساتھ رہنے پر مجبور تھی۔ سہیل نے بڑی خوب صورتی سے اسے زیر کر لیا تھا۔ اسے میڈم خالدہ اور ان کے دیو شوہر کی حقیقت بھی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اسے میڈم خالدہ میں، خود میں اور سطوت میں کوئی فرق نہیں لگ رہا تھا۔ وہ سب ایک ہی بے معنی زندگی گزارنے والی عورتیں تھیں جنہیں زندگی سہل کرنے کی تمنا صدیوں کی تھکن دے کر بے رنگ اور بے کشش کر دیتی ہے..... جنہیں ہر حال میں ایک مرد کی تالیم ہو کر رہنا پڑتا ہے اور وہ بھی ایک عورت تھی۔



صلح زر

ثانیہ رابعہ

زمر بہت دیر سے ابھرن میں تھی۔ نگاہیں چیرے پسند کر رہی تھیں اور کان، ساتھ ہی شاہک میں مصروف لڑکی کی باتوں کی طرف متوجہ تھے۔

”خدا یا! یہ آواز یہ لب و لہجہ اتنا مانوس کیوں ہے، کس سے ملتا جلتا ہے؟“ ایسے میں اس کے کانوں کو ایک فقرہ سنائی دیا۔

”دیکھیں جی..... یہ تو آپ نے دو ہزار کا بتایا تھا۔“

”اوئے سائرہ تم.....؟“ زمر تیزی سے پلٹ کر اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ہائیں یہ تم ہو زمر.....“ اب دوسری طرف سے بھی جوابی فقرہ آیا اور چند لمحوں ہی میں افسانوی ماحول بن گیا۔ دونوں چمچڑکی سہیلیاں گلے مل رہی تھیں آنسو پونچھ رہی تھیں..... لیکن دونوں کی عمروں میں واضح فرق اور حلیے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک قیمتی اور نفیس کپڑوں میں ملبوس ہے، چہرہ ہر قسم کی خوشی سے محروم اور میک اپ سے عاری ہے، کسی قسم کا زور نہیں پہناتا ہوا، آنکھوں کے نیچے حلتے، رنگت روکھی پھٹکی اور چہرہ پریشان ہے جبکہ دوسری سرتاپا خوشبوؤں میں بسی ہوئی ہے۔ جدید فیشن کا مجموعہ، میچنگ جیولری، فرائڈ اور چوڑی دار پاجامہ پہنے، بالوں میں اسٹریپس لگے ہوئے، میک اپ انتہائی غضب کا کیا ہوا، چہرے پر خوشبوؤں کا عکس اور انداز میں بے فکری تھی، یہ زمر تھی۔ ایک دوسرے کا جائزہ لینے کے بعد زمر نے قہقہہ لگایا۔

”اوئے بڈھی روح میں تو تمہیں پہچانی ہی نہیں تھی۔ تمہارے نکمے کلام ”دیکھیں جی“ نے تمہاری



پہچان کروائی۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، کس کا روگ لیے بیٹھی ہو۔“ سائرہ کی براؤن آنکھوں سے موٹے

اقسام محبت

محبت دو قسم کی ہوتی ہے

ایک محبت جسم سے ہوتی ہے اور ایک روح سے...

جوانی میں ہم ان باتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ یہ روح کی محبت کیا ہوتی ہے...؟ مگر اوائل جوانی میں محبت صرف جسم کی محبت ہوتی ہے۔ اسی لیے اس محبت میں انا کے بڑے سخت مقام آتے ہیں مگر جسم کے تقاضوں کے آگے ٹوٹے پھوٹتے رہتے ہیں۔ یہی محبت انسان کو بشر کے جامے میں رکھتی ہے۔

دوسری محبت روح کی محبت ہوتی ہے۔

کسی دن اچانک آپ کی ملاقات کسی روح سے ہوتی ہے۔ روح کا جسم نہیں ہوتا، وہ کیف ہی کیف ہوتی ہے۔ مدد ہی مدد ہوتی ہے۔ اسے ہاتھ لگانے کوئی نہیں چاہتا، اسے چھونے کوئی نہیں چاہتا۔ بس دیکھنے کو اور... دیکھتے رہنے کو چاہتا ہے۔ اسے محسوس کر لینے اور دل میں اتار لینے کوئی چاہتا ہے۔ وہ کسی دن خود بخود آئے، ہماری روح سے کھرا جاتی ہے۔ اس کو کسی شے سے تعلق نہیں دی جاسکتی... نہ ڈوبتی ہوئی شمع شام سے... نہ ابھرتی ہوئی موملہ، خوشبودار صبح سے... نہ چھلپاتی ہوئی سنسان دوپہر سے... مگر وہ ان سب میں حلول ہو کے زندگی میں اتر جاتی ہے۔

ایسی محبت کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ عام طور پر اس عمر میں ہوتی ہے جب سرکش جذبے ٹھک ہار جاتے ہیں۔ اگر جسمانی ضروریات ہی آسودگی کا پیمانہ ہیں تو پھر سب کچھ پالنے کے باوجود آدمی اپنے آپ کو پیاسا کیوں محسوس کرتا ہے؟ دولت، آرام، اقتدار،

موٹے آنسو زمر کی ہتھیلی پر گرے۔

”ارے کیا ہوا؟“ زمر گھبرا گئی۔

”امی بہت بیمار ہیں، کینسر ہے۔“ سائرہ کے گلے میں آواز پھنس گئی لیکن اس کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

”اوہ.....“ زمر چپ کی چپ رہ گئی۔ ”اپنا کوئی ٹیکٹ نمبر دو میں آنٹی سے ملنے آؤں گی۔“ بارہ سال ایک ہی کالونی اور ایک ہی ادارے میں پڑھنے والی دونوں سہیلیاں آج پورے اٹھارہ انیس سال کے بعد اچانک مل کر بے پناہ خوش تھیں۔

سیل نمبروں کے تبادلے ہوئے۔ سائرہ نے زمر کی سات آٹھ سالہ بیٹی کو اسی شاپنگ مال سے انتہائی خوب صورت فریکس لے کر دیے۔ الوداعی کلمات کہے گئے اور رخصت ہو گئیں۔

اپنی امی کی ادویات اور کچھ ضروری اشیاء لے کر سائرہ کو گھر پہنچے۔ مشکل چالیں بیا لیس منٹ ہوئے ہوں گے جب زمر کی کال آگئی۔

”جلدی سے ڈرائیور کو ایڈریس

200 ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

شہرت، آسائش سب مل کر بھی زندگی کو مکمل نہیں کرتیں۔ ہمیشہ ایک فکری سی باقی رہتی ہے جسے بے وقوف انسان مختلف نام دے کر اپنی کمزوریاں یا اپنی طاقتیں بنائے رکھتا ہے اور اپنی ذات کی جنگ اپنے ذہن کے ساتھ کرتا رہتا ہے۔ اس کی روح کو اس دن قرار آتا ہے جب وہ اپنی روح سے، چھڑی ہوئی روح سے ملاقات کر لیتا ہے۔

پتا نہیں بعض لوگوں سے مل کر ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم چھلپاتی دھوپ میں سے نکل کر ٹھنڈے ٹھنڈے سائے میں آگئے ہوں۔ میری، اس کی ملاقات ٹکریٹ کی ایک سہ منزل عمارت کے اندر ہوئی تھی مگر یوں لگتا تھا ارد گرد ایک سبزہ زاراگ آیا ہے۔ آسمان پر اودے بادل ہیں اور پردا کی ہوا اپنے آپ کمرے کے اندر در آئی ہے۔ تاحند نظر سبزہ ہی سبزہ ہے، آنکھوں میں اتر جانے والا... اس سے ملنے کے بعد جی اتنا مسرور ہوا کہ میں مسلسل اداس ہوں۔

زندگی میں خوشیاں بھی ملیں... پریشانیاں بھی آتی رہیں۔ کبھی بچوں کی، کبھی ملازمت کی، کبھی بیماری کی... قربت داریاں، خوشیاں بخشش رہیں اور تلخیاں بھی... پھول بھی ملتے رہے اور کانٹے بھی جیسے رہے۔ حیات کے ساتھ موت کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ پیارے رشتوں کی جدائی کا کرب بھی جھیلنا۔ میں پریشان اور دگرگتہ تو ضرور رہا ہوں، کبھی اداس نہیں ہوا۔ اداس تو بس محبت کے زمانے ہی ہوا کرتا تھا۔ (میں نے محبت کی شادی کی تھی) آج عرصہ دراز کے بعد میرا جی عجیب طرح بوجھل ہے۔ اداس دل زندگی کی علامت ہے۔ اداسی تنہا اور آرزو کی علامت ہے۔

دور کہیں ہولے ہولے، جیسے پہاڑ پر اداسی کی برف گر رہی ہے۔ میرے سفید بال اس برف کو سلام کر رہے ہیں۔ آج کی یہ ساری اداسی میں اس خوبصورت آنکھوں والی عورت کے نام کرتا ہوں، جس کا میں نام بھی نہیں جانتا۔

بشریٰ رحمن کی تصنیف ”جمرو کے میں چاند“ سے اقتباس، تلاش: طلعت جبین نیاز، کراچی

جھکاتے ہوئے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام، جیتی رہو۔“ ماضی کی بارعب جاندار اور گر لیس فل آنٹی ہناز کے بیچائے ہڈیوں کا ڈھانچا پڑا ہوا تھا۔ زمر کی آنکھ سے آنسو ٹکلا اور اس کی پلکوں میں چھپ گیا۔ زمر نے کھانسنے کے بہانے منہ اوٹ میں کیا اور آنسوؤں کی ٹوٹی لڑی پر قابو پانے لگی۔ اتنی مہربان، شفیق، ہستی کو اس حال میں دیکھ کر اس کا دھائیں مار مار کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا سائرہ کو سینے سے لگائے اور خوب روئے۔

دو چار منٹ اسے اپنے اوپر قابو پانے میں لگے۔ سائرہ کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنکس والی ٹری تھی۔ بچوں کو کولڈ ڈرنک پکڑا کر اس نے کھینے کے لیے باہر لان میں بھیج دیا۔ ہنستی مسکراتی، تھکے ہوئے زمر اب سنجیدہ اور مہذب زمر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ باتیں کرتے کرتے کوئی ہوش نہیں رہا، جب آنٹی نے مداخلت کی۔

”زمر کو چائے نہیں پلاؤ گی؟“

201 ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

رات کا آغاز بھی۔“ ان کے دونوں ہاتھوں میں ساڑھ کا ہاتھ تھا جسے وہ اپنی آنکھوں سے لگا رہی تھیں۔

☆☆☆

”ساڑھ ذرا چال ڈھال تو صحیح کرلو، اپنے سرالی کزن کا رشتہ لا رہی ہوں۔“ زمر نے ساڑھ سے کہا۔ اس دفعہ ساڑھ کی امی کی حالت دیکھ کر اس کے دل کو پہلے کی طرح دھچکا نہیں لگا تھا..... بس اسے صرف یہ ڈرتا تھا کہ ایسا نہ ہو آنٹی ساڑھ کو اسی حال میں اکیلے چھوڑ کر آنکھیں بند کر لیں..... اس کھلے آسمان تلے، زندگی کی بھیڑ میں وہ تنہا کس طرح حالات کا مقابلہ کرے گی۔ اتفاق سے ایک دور شے اس کی نظر میں تھی۔ اپنی بچپن کی دوست اور کلاس فیلو کی وہ اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتی تھی لیکن جونہی اس نے یہ بات ساڑھ تک منتقل کی اس کا رد عمل حیرت انگیز طور پر خلاف توقع تھا۔

”نہیں زمر، تم میرے مسائل کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ میں صبح کا آغاز امی کا ہاتھ منہ دھلانے اور پھر پیپر چینج کرنے سے کرتی ہوں تو مجھے رات کے آنے کا پتا نہیں چلتا، کس طرح دبے پاؤں آتی اور گزر جاتی ہے۔ دس دفعہ تو ان کو دوادیتی ہوتی ہے پھر ان کو کھانا پلانا، کپڑے بدلنا، ہر دوسرے دن بیڈ شیٹ تبدیل کرنا، ہر چوتھے دن کمرے کو خالی کر کے دھلائی صفائی کا اہتمام، ہر چھ ماہ بعد پینٹ کرداتی ہوں، امی کی کبھی دن میں دو دفعہ کرتی ہوں، اکثر بیشتر تو امی کو چھ سے کھانا پڑتا ہے۔ میری زندگی میں اپنی ذات کی طرف دیکھنے یا سوچنے کا موقع بھی نہیں ہے۔ گزشتہ آٹھ سال سے میں امی کا ضمیر بنی ہوئی ہوں۔ میری زندگی اسپتال، گھریا بیکیوں تک محدود ہے جہاں سے ابو کی پنشن لیتی ہوں۔ مجھے بس اتنا بتا دو کہ اگر میں یہ رشتہ قبول کر لوں تو امی کہاں جائیں

گی.....؟ میں نے تو ان دس بارہ سالوں میں ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ اسی لیے رد کر دیا ہے کہ میری گفتگو سے لے کر زندگی کا مرکز و محور ہی امی ہیں۔“ ساڑھ کے لہجے میں کوئی حسرت یا غم نہیں تھا بلکہ حقائق کی ترجمانی کرتا قطعی بھرپور لہجہ۔

یہ زندگی کا وہ نازک موڑ تھا جہاں دنیا کی کوئی عزیز سے عزیز ہستی کچھ نہیں کر سکتی سوائے دعا کے۔ کسی کے دکھ بانٹے نہیں جاسکتے لیکن دعا ان دکھوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ تو پیدا کرتی ہے سو زمر دل سے نکلنے والی ڈھیروں دعاؤں کے تحفے لے کر آتی۔ جہاں تک ہو سکتا اس کی معاونت کرتی۔ اسے دن میں ایک دو دفعہ زبردستی سلا دیتی خود آنٹی کے پاس بیٹھی رہتی۔ کچھ نیند لینے پر ساڑھ بہت تقویت محسوس کرتی۔ اسے اپنی امی کی آنکھوں میں چلتے بچتے ویسے کی لونظر آتی۔ کبھی مایوسی اور کبھی امید کے ساتھ دن گزرتے گئے یہاں تک کہ زمر کا پاکستان میں چار ماہ کا قیام مکمل ہوا اور وہ آسٹریلیا روانہ ہو گئی۔

”میں چاہنے کے باوجود اتر پورٹ نہیں جاسکوں گی۔“ ساڑھ نے پھکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں، جہاز اسی روٹ سے گزرتا ہے ہاتھ ہلا کر ٹاٹا کر دیتا۔“ زمر نے مذاق میں بات ٹال دی۔

رخصت ہوتے وقت ساڑھ کے پاس بھی دینے کے لیے دعائیں اور آنسو تھے اور زمر بھی انہی دو چیزوں پر قدرت رکھتی تھی۔

☆☆☆

آسٹریلیا پہنچ کر زمر کا ساڑھ سے روزانہ کا رابطہ تھا۔ انہی مصروفیت کے دنوں میں جب آسٹریلیا شدت کی گرمی سہہ رہا تھا اور پاکستان دھند اور کھری

لیٹ میں تھا زمر کو ساڑھ کی امی کے انتقال کی خبر ملی۔ گزشتہ دس سالہ پردیسی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ زمر کو اپنے ارد گرد غم کی چادر دکھائی دی۔ پاؤں میں کٹی طرح کی زنجیریں۔ یہ وہ پردیس ہے جہاں خواہشیں بس حسرت بن جاتی ہیں لیکن ارادہ نہیں بن پاتیں۔ انہی حسرتوں میں سے ایک حسرت، ایک آہ..... کاش وہ ساڑھ کو سینے سے لگا کر اس کے آنسو پونچھ سکتی، اس کا غم بانٹ سکتی اس کی تنہائی دور کر سکتی۔ اس نے دو نفل پڑھے اور آنٹی کے لیے دعائے مغفرت کے بعد روتے ہوئے ایک ہی دعا کی۔

”اے میرے اللہ، بس تو ہی تو ایک ہے، تو نے کائنات کا حسن ہی جوڑوں میں رکھا ہے، کیا چرند کیا پرند کیا انسان ہر چیز جوڑے میں ہے۔ اللہ تو واحد ہے اپنی وحدانیت کے صدقے میری ساڑھ کا جوڑ طے کر دے اس کی تنہائیاں دور کر دے، اس کے غم کا بوجھ ہلکا کر دے۔“ پتا نہیں کب تک وہ رب کے در پر گڑ گڑاتی رہی..... بس اتنا یاد تھا کہ اس دعا کے بعد جب اس نے ساڑھ کو فون کیا تو لفظ خود بخود ساڑھ کے زخموں کا مرہم بننے لگے۔ فون کال ختم ہونے تک ساڑھ ہی نہیں زمر بھی بہت پرسکون تھی کہ اللہ جو کرے گا وہ بہتر ہوگا۔

☆☆☆

دیب۔ کم پر ساڑھ کی شادی دیکھتے ہوئے زمر کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ ”اللہ تو کتنا مہربان ہے..... ماں کی دعا میں تو نے کتنی طاقت سمو رکھی ہے کہ دنیا سے جانے کے بعد بھی اولاد کو ہالے میں لیے رکھتی ہے۔ کیا رشتے یوں بھی ہوتے ہیں، جھٹ پٹ اور اتنے قابل رشک کہ انسان سجدے میں گر جائے۔ چاند سورج کی جوڑی کہوں یا اللہ کا بہترین انعام؟“

کیسے

طے کروں گا یہ اندھیرا میں اکیلا کیسے میرے ہمراہ چلے گا میرا سایہ کیسے میری آنکھوں کی چکاچوند بتا سکتی ہے جس کو دیکھا ہی نہ جائے اسے دیکھا کیسے چاندنی اس سے لپٹ جائے ہوائیں چھیڑیں کوئی رہ سکتا ہے دنیا میں اچھوتا کیسے میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ وہ پوچھ نہ لے یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے اس لیے صرف خدا سے مخاطب ہے میرا میرے جذبات کو سمجھے گا فرشتہ کیسے گر سمندر سے ہی دریاؤں کا رزق آتا ہے اس کے سینے میں اتر جاتے ہیں دریا کیسے تو تھی رات نے سورج سے یہ سرکشی کی میں نہ ہوتی تو تیرا نور برستا کیسے

شاعر: احمد ندیم قاسمی

انتخاب: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

☆☆☆

خون

جذلوں پہ پہرے ہیں
دل بھی کتنے گہرے ہیں
تسے آنکھیں بند کرلوں
عکس یہیں تو ٹھہرے ہیں
کوئی آواز نہیں سنتے
آنسو گونگے بہرے ہیں
کبھی تو وہ اقرار کریں گے
میرے خواب بہت سنہرے ہیں
صدف سارا وقت چرا لو
آج وہ کچھ کچھ کہہ رہے ہیں
شاعرہ: صدف جاوید قریشی، ہری پور ہزارہ

سائرہ کے شوہر علی حسن ان کا خاندانی پس منظر اور شادی کا سادہ مگر پُر وقار فنکشن دیکھ کر زمر طرح طرح کے تبصرے ذہن میں سیٹ کر رہی تھی۔ ”اچھا ہوا اللہ جی بہت ہی اچھا ہوا اور نہ تو وہ لمحہ کے لیے بھی ماں کی یادوں سے نکل نہیں سکتی.....“ زمر نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

دیکھے بھالے لوگ، سادہ مخلص ہر لحاظ سے قابلِ فخر۔ سائرہ سے بعد میں جب بھی رابطہ ہوا اس کے اندر کی خوشی اس کی باتوں سے جھلکتی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ زمر کے میاں نے دعائی میں جاب کر لی۔ آسٹریلیا اور دعائی کا سفر بہت سے رابطوں کو بھالے گیا۔ نیا ماحول، نئے اسکول، زمر کو سیٹ ہونے میں دو تین سال لگے۔ سائرہ کی کئی دفعہ یاد آئی مگر سب بدلنے سے کئی نمبر ختم ہو گئے لہذا وہ رابطہ نہیں کر پائی۔

”چلو پاکستان جانا ہی ہے۔“ وہ اپنے آپ کو تسلی دیتی رہی۔ ”جب بھی پاکستان جاؤں گی مگر سے باہر پہلا قدم سائرہ کے ہاں اٹھے گا لیکن..... لیکن۔“ زمر نے ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا۔ ”آنٹی کے بعد سائرہ کا سامنا کیسے کر پاؤں گی؟ سائرہ کے وہ آنسو کیسے پونچھوں گی جو ماں کی یاد میں بہہ نکلیں گے؟ پہلے شادی کی مبارک بادوں یا پہلے آنٹی کی تعزیت؟ سوالات کے تانے بانے میں الجھتے وہ پاکستان پہنچ گئی۔

گزشتہ ڈیڑھ سال سے اس کے پاس سائرہ کا نیا کونٹیکٹ نمبر نہیں تھا۔ ”مجھے دیکھ کر پہلے وہ خوش ہوگی یا اپنی امی کی یاد آئے گی اور آتی چلی جائے گی۔ ہماری گفتگو کا موضوع بس آنٹی کی یاد ہو گیا کچھ اور بھی۔“

بالآخر پچیس دسمبر کو جب پاکستان دھند میں ڈوبا ہوا تھا وہ سائرہ کے گھر موجود تھی۔

”اوئے زمر دم.....“ چھلانگ لگا کر سائرہ اس کی طرف آئی۔

”ارے..... یہ تم ہو سارو.....“ زمر کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بے تحاشا موٹی تازہ بیگم نما خاتون..... ہیروں کا میکس پہنے..... جگ جگ کرتی کمرے میں بے بی کاٹ واکر بچے کی موجودگی کا الارم بجا رہی تھی۔ بیش بہا قیمتی جوڑا اور گولڈ کی بھاری بھر کم دس بارہ چوڑیاں پہنے ماضی کی سائرہ سے کوسوں میل دور۔ دس منٹ میں اس نے چالیس دفعہ اپنے میاں کی اور اس کے بہترین اخلاق اور اس سے بھی بہترین جاب کی تعریف کی۔ اس دس منٹ میں بلا مبالغہ پچیس دفعہ اس نے بیٹے کی شرارتوں اور ذہانت سے بھرپور باتوں کا ذکر کیا۔ اس کی شاپنگ کہاں سے اور کتنی مہنگی کی جاتی ہے کا قصہ بیان کیا۔ منٹوں، سیکنڈوں میں اعلیٰ درجے کی ضیافت کے دوران چودہ دفعہ اس نے درجن بھر کام والیوں کے رونے روئے جو بھرپور مراعات حاصل کرتی ہیں اور نمک حلال نہیں کرتیں..... زمر خاموشی سے سنتی رہی۔

گھر سے بار بار فون آرہے تھے، بچے سیٹ نہیں ہو رہے جلدی آجاؤ۔ چھوٹا مانی تو بہت زیادہ رو رہا ہے۔ زمر، سائرہ سے اجازت لے کر باہر آئی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اسے یاد آیا۔

”اوہ، آنٹی کی تعزیت تو کی بھی نہیں۔“ بہت پہلے کی پڑھی ہوئی بات اسے یاد آگئی اس نے مسکرا کر ڈرائیور کو گاڑی چلانے کا اشارہ کر دیا۔ توجہ کا مرکز اور محبتوں والے رشتے بہت سے ہوتے ہیں لیکن اصل زر..... مرکز و محور ایک ہی ہوتا ہے۔ اپنے بچے..... اپنا گھر..... اپنا شوہر..... اور بس.....



داؤد

دودھ کا جلا

نگہت سیما



www.pdfbooksfree.pk

مگر نے کے انداز میں بیٹھیں جیسے میلوں کا سفر طے کر کے آئی ہوں اور مہرین فاطمہ جس نے جوتے کی متوقع آمد سے بچنے کے لیے اپنا سر ایک طرف جھکا یا تھا لمحے بھر بعد سر اٹھا کر جو اماں کی طرف دیکھا تو وہ سر تھاے

اماں کے ہاتھ سے جوتا گر پڑا تھا اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی اور منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا، پھر یکایک ہی ان کی آنکھوں سے صدیوں کی محسن جھانکنے لگی اور وہ یوں بے دم سی ہو کر تخت پر

تخت پر غم حال سی بیٹھی تھیں۔ اسے پہلے تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور اس نے بغور اماں کی طرف دیکھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ جوتا اماں کے ہاتھ میں ہو اور ان کا نشانہ خطا ہو جائے۔ بھلے وہ کتنا ہی سرا دھر اُدھر کرتی۔ اماں کا جوتا ٹھیک نشانے پر بیٹھتا تھا۔ بلکہ اس نے اماں کو دو تین بار مشورہ بھی دیا تھا کہ انہیں نشانہ بازی کے کسی مقابلے میں حصہ لینا چاہیے سو فیصد ان کی جیت کے امکانات ہیں لیکن اماں نے کبھی اس کی بات پر کان نہیں دھرا تھا۔ الٹا ایک جھانپڑ اور رسید کر دیا تھا۔ لمحے بھر بعد ہی وہ حیرت کے اس شدید جھٹکے سے باہر نکل آئی تھی اور اس کی نظر زمین پر اُلٹے پڑے جوتے پر پڑی اور وہ تیر کی طرح ان کی طرف بڑھی۔

”اماں..... اماں کیا ہوا ہے؟“ اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے چونک کر سر اٹھایا اور خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کی نظروں کا خالی پن اسے دہلا گیا۔

”اماں کیا ہوا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”مہرہ..... تم؟“ اماں کے ہونٹ لرزے اور آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں پھر انہوں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ کندھے سے ہٹایا اور نظریں جھکا کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگیں۔

”اماں..... اماں کیا ہوا، کچھ تو کہیں۔“ مہرین فاطمہ گھبرا کر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ انہوں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ پیچھے کر دیا۔ اب کے مہرین فاطمہ نے لپک کر جوتا اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

”یہ لیں دو لگالیں لیکن اس طرح چپ کی مار تو نہ ماریں۔“ انہوں نے آہستگی سے جوتا زمین پر رکھ دیا تو مہرین فاطمہ رو ہانسی ہو گئی۔

”خدا کے لیے اماں کچھ تو بولیں۔ اچھا لیں ٹیہ میں کان پکڑتی ہوں۔ میری توبہ، میری ماں کی توبہ،

میرے باپ کی توبہ جو میں اب کبھی کچن میں سے برتن سینے بغیر باہر نکلوں۔ میں بس ابھی منٹوں میں کچن سمیٹ کر چکا دیتی ہوں..... بس اب تو ہنس دیں میری اچھی اماں۔“ اس نے لگاوٹ سے انہیں دیکھا لیکن وہ یونہی ٹکڑ ٹکڑ اسے دیکھے جارہی تھیں۔ کبھی اس کی مسکارے سے جھکی پلکوں کو، کبھی اس کے آئی شیڈ سے رنگے پونوں کو، کبھی اس کے خوب صورت ہونٹوں کو جو لپ اسٹک سے دمک اٹھے تھے۔

”آپ اس بات پر ناراض ہیں نا اماں کہ میں کھانا کھا کر برتن یونہی کچن کے سلیب پر چھوڑ کر اوپر بھاگ گئی تھی تو سوری اماں۔“ اس نے سچ سچ میں کان پکڑ لیے۔ اماں نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے ساتھ ہی رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے اور وہ بھبک بھبک کر رونے لگیں۔

”اماں..... اماں!“ مہرین فاطمہ نے گھبرا کر ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔

”اماں، بے شک دو چھوڑ دس جوتے لگالیں لیکن اس طرح روئیں تو نہیں۔ آپ کو پتا ہے نا مہرین فاطمہ آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی۔“ اس نے اسی طرح ایک بازو ان کے گلے میں حائل کیے دوسرے ہاتھ سے زمین پر پڑا جوتا اٹھا کر پھر سر ان کے سامنے جھکایا۔

”لیں جتنا دل چاہے مار لیں۔ اگر مہرین فاطمہ سر اٹھا لے تو وہ آپ کی مہر نہیں ہوگی کسی مہترانی کی اولاد ہوگی۔“ وہ تو ایسے ہی الٹی سیدھی باتیں کرتی تھی جو منہ میں آتا ہیٹا سوچے سمجھے بولے چلی جاتی تھی لیکن اماں نے تو اس طرح کبھی نہیں کیا تھا۔ یوں اس طرح کب روئی تھیں وہ۔ بس زیادہ سے زیادہ دو جوتے لٹا کر پُرسکون ہو جاتیں اور جوتے کھا کر مہر فاطمہ مطمئن سی ہو کر اپنے کام میں لگ جاتی اور اماں کی ناراضی تو دو جوتے لگا کر آپ ہی آپ ختم ہو جاتی تھی، پر

ج..... مہرین فاطمہ نے ان کے گلے سے ہاتھیں الٹ کر جھکا ہوا سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ ہاتھوں کی ٹٹ سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

”پر آج ایسا انوکھا کیا ہو گیا تھا جو اماں یوں ارزار رو پڑیں۔“ مہرین نے پریشان ہو کر انہیں دیکھا۔ اماں کی نظریں اب اس کے چہرے پر تھیں لیکن ان میں ایسا دکھ رہا تھا کہ مہرین فاطمہ کا کلیجا جیسے لٹنے لگا۔ وہ اماں کی کیسی نا فرمان بیٹی تھی کہ ایک ذرا ماکام اس سے نہ ہو سکتا تھا۔ کتنی ہی بار اماں نے کہا تھا..... پیار سے سمجھایا تھا۔

”مہرہ بیٹا! جب کھانا پکا کھا لو تو کچن کو سمیٹ کر باہر نکلا کرو، یہ کیا کہ خشک آٹا فرش پر بکھرا پڑا ہے۔ برتن سنک میں پڑے ہیں۔ کاؤنٹر پر جا بجا نمک، مرچوں کے ڈبے پڑے ہیں، پورا کچن مچھلی بازار بنا ہے۔ یہ سکھڑ عورتوں کے طور طریقے نہیں ہوتے۔“ اور اس نے کبھی اماں کی بات پر کان نہیں دھرا۔ جی چاہا تو کچن چکا دیا نہیں تو یونہی چھوڑ چھاڑ کر باہر نکل آئی۔ کیا تھا جو وہ آج بھی کچن چکا کر باہر نکلتی۔ اب ایسی بھی کوئی آفت نہیں آئی ہوئی تھی وہ کچھ دیر بعد بھی اوپر جا سکتی تھی لیکن وحیدہ آپا نے کوئی تین بار اسے پڑوس سے جھانگ کر آواز دی تھی۔ وہ کالج سے آ کر حسب معمول بغیر یونیفارم تبدیل کیے کچن میں ٹمس گئی تھی اور ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا کہ وحیدہ آپا نے اوپر سے جھانکتے ہوئے آواز دی تھی۔

”مہرہ کھانا کھا کر اوپر آنا، میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

”اچھا آپا۔“ اس نے کچن سے باہر آ کر کہا تھا اور پھر جھپاک سے کچن میں ٹمس گئی تھی۔ اماں نے روئی بیٹے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”یہ وحیدہ کو کیا کام ہے تجھ سے۔ دوبار پوچھ چکی ہے کہ مہرہ کب آئے گی کالج سے۔“

”پتا نہیں اماں۔“ اس نے بے پروائی سے جلدی جلدی لقمہ توڑتے ہوئے جواب دیا تھا۔

اماں سالن بنا کر آٹا گوندھ کر رکھتی تھیں اور جب وہ کالج سے آتی تو گرم گرم پھلکے بناتی جاتیں۔ اور پھر دونوں ماں بیٹی وہیں کچن میں بیٹھ کر کھا لیتی تھیں۔ وہ ساتھ ساتھ اماں کو سارے دن کی رُوداد بھی سناتی جاتی تھی۔

”آج یہ ہوا۔ آج فلاں ٹیچر نے کون سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ فلاں ٹیچر نے ڈانٹا۔ فلاں نے سزا دی..... وغیرہ۔“ اور اماں بھی دلچسپی سے سنتی تھیں۔ عموماً ایسا ہوتا تھا کہ اماں روئی پکاتیں اور وہ جلدی سے سالن گرم کرتی۔ اتنے میں اماں روٹیاں پکا لیتیں پھر دونوں اکٹھا ہی کھاتی تھیں۔ لیکن ایک تو آج اسے بھوک بہت لگی ہوئی تھی دوسرا اسے حیدہ آپا کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ اللہ جانے انہیں ایسا کیا کام آ پڑا تھا کہ وہ اسے دوبار آواز دے چکی تھیں چنانچہ اس نے دوسرا پھلکا پکنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور جلدی جلدی کھانے لگی اور جب تک اماں کھانے میں شامل ہوئیں وہ آدمی روئی کھا چکی تھی۔

”اماں چنے بہت مزیدار ہیں۔“ جلدی سے ہاتھ صاف کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”وحیدہ آپا کی طرف۔“

”وحیدہ کہیں بھاگی نہیں جا رہی ہے۔ جا کر یونیفارم بدلو اور پھر کچن صاف کر دو، میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔“ انہوں نے آدمی بچی روئی دسترخوان میں لپیٹے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ایک لمحے کو وہ ٹھکی تھی۔ اماں نے بھی اس کے ساتھ ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا لیکن پھر اس نے ہولے سے سر کو جھٹکا تھا۔

”ابھی کر دیتی ہوں کچن صاف۔“ اور پھر اماں پکارتی ہی رہ گئیں اور وہ بھاگتے ہوئے

وحیدہ آپا ان کے مکان کے اوپر والے حصے میں رہتی تھیں۔ ابا کے باہر جانے کے بعد اماں نے اوپر کا پورشن کرائے پر دے دیا تھا۔ وحیدہ آپا کو تقریباً سال بھر ہو گیا تھا اس گھر میں آئے اور مہرین فاطمہ کی ان سے خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وحیدہ آپا عمر میں اس سے تھوڑی ہی بڑی تھیں اور اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ان کے ابا کسی دفتر میں کام کرتے تھے۔ اماں اسکول ٹیچر تھیں جبکہ وحیدہ ایف اے کے بعد تعلیم کا سلسلہ چھوڑ چکی تھیں۔ ان کی منگنی اپنے کزن سے ہو چکی تھی۔ دو سال تک شادی ہونا تھی۔ اس لیے اماں نے بھی اس کے اوپر جانے پر اعتراض نہیں کیا تھا لیکن وہ اس کے زیادہ دیر تک اوپر رہنے پر چڑچڑ ضرور کرتی تھیں اور مہرین فاطمہ دو جوتے کھا کر اماں کو راضی کر ہی لیتی تھی لیکن آج جانے اماں کو کیا ہوا تھا۔

”اماں..... اماں پلیز۔“ مہرین فاطمہ نے ایک بار پھر ان کے گلے میں بازو جھانک لیے۔

”میں آپ کی بہت نافرمان بیٹی ہوں۔ بہت بری ہوں، تنگ کرتی ہوں، پلیز مجھے معاف کر دیں۔ سنیں میں منٹوں میں سارا کچن صاف کر دیتی ہوں۔ آپ کہہ رہی تھیں کہ بہت دنوں سے کینٹ صاف نہیں ہوئے۔“ اس نے بات مکمل کرتے ہی ان کے رخساروں پر یوسہ دیا۔

”مت کر مہرہ، نہ تنگ کر۔“ انہوں نے اس کے بازو گلے سے باہر نکالے۔

”اماں.....“ اب وہ سچ سچ رو پڑی۔ ”آپ بتاتی کیوں نہیں ہیں۔ ابا یاد آرہے ہیں؟“ انہوں نے پھر نفی میں سر ہلایا اور نگاہیں ایک بار پھر اس کے چہرے پر تنگ کیں۔ اس کے ہونٹوں پر جن پر خوب صورتی سے لگی لب اسٹک نے انہیں اور بھی قائل بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر لانی اور خوب صورت پلکیں

سلیقے سے لگے ہوئے مسکارے سے اور بھی دلکش لگ رہی تھیں۔

”اماں..... اماں اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں مجھے، کیا میری شکل بدل گئی ہے۔ کیا میں بہت بد صورت لگ رہی ہوں۔“ مہرین ان کے اس طرح دیکھنے پر گھبرا گئی۔ نچلے ہونٹ کو دانٹوں تلے کھلتے ہوئے ان کے کانوں میں جیسے استانی جی کی آواز آئی تھی۔

”عاشو تم جانتی ہو عورت کا کب بنے سنور نے؟ جی چاہتا ہے جب..... جب اس کی زندگی میں کوئی مرد آ جاتا ہے۔ اس کا من کرتا ہے کہ وہ خوب بے سنورے تاکہ اسے خوب صورت لگے۔ وہ اسے سراہے..... سراہے جانے کی تمنا تو عورت کی فطرت میں ہوتی ہے نا۔“

اس لمحے وہ کیسی چوری بن گئی تھی اور اس نے اپنے کیونکس لگے ہاتھوں کو فوراً ہی اپنے دوپٹے میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔ اور جب استانی جی ذرا سی دیر کو اٹھ کر کسی کام سے گئی تھیں تو اس نے دوپٹے کے پلو سے رگڑ کر ہونٹ صاف کر لیے تھے۔ ہلکے گلابی رنگ کی لب اسٹک نے اس کے ہونٹوں کی خوب صورتی کو نمایاں کر دیا تھا۔ جب استانی جی واپس آئی تھیں اور اس نے کاپی ان کے سامنے رکھی تھی تو اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے بے اختیار مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو چھوا تھا۔ استانی جی کتنی اچھی تھیں کتنی شفیق۔ وہ ان کے پاس جا کر اماں کی موت کا دکھ بھول جاتی تھی۔ وہ بالکل اماں کی طرح ہی اس سے محبت کرتی تھیں۔ وہ بے اولاد بیوہ تھیں اور گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ جب اماں کی وفات کے بعد وہ سارا دن بستر پر پڑی روئی رہتی تھی تو ایک روز استانی جی نے اس کے گھر آ کر اس کے آنسو پونچھے تھے۔

”یہ تو حکم رتی تھا عاشی بیٹا، تیری ماں اپنی خوشی

سے تو نہیں مگنی نا..... بس وقت پورا ہو گیا اب تو کیوں اس طرح اپنے ابا کو تنگ کر رہی ہے۔“ اور وہ اٹھ کر اینٹ گئی تھی۔ اس نے بے حد حیرانی سے استانی جی کی طرف دیکھا تھا۔

”استانی جی، میں نے تو ابا کو بالکل بھی تنگ نہیں کیا۔“

”یہ تنگ کرنا ہی تو ہے بیٹا! ہر وقت روتی رہتی ہو۔ تمہاری اماں کی روح کو تکلیف ہوتی ہوگی۔“

”میں کیا کروں استانی جی! مجھے اماں بہت یاد آتی ہیں۔“ کہتے ہوئے وہ پھر رو پڑی تھی اور جب استانی جی نے اسے گلے لگا لیا تھا۔

”جب اماں بہت یاد آئے تو قرآن پڑھا کر۔ اس کی مغفرت کی دعا کیا کر۔ قرآن پڑھ لیا ہے نا تم نے؟“ اس نے سر ہلا دیا تھا۔ قرآن تو اس نے نو سال کی عمر میں ہی ختم کر لیا تھا اور ہر روز صبح اٹھ کر ضرور پڑھتی تھی لیکن جب سے اماں فوت ہوئی تھیں اس نے ایک دن بھی قرآن نہیں کھولا تھا۔ ابا کھیتوں پہ جانے سے پہلے خود ہی ناشتا بناتے تھے۔ ننیش کر کر کے اسے کھلاتے پھر بھی دو چار نوالے کھا کر وہ چنگیر بے کر دیتی تھی۔ ابا کو بھلا کہاں اماں جیسے مل دار پرائیوٹ بنانے آتے تھے۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے اس نے اماں ابا کے خوب لاڈ اٹھوائے تھے اور اماں تو ابھی تک اس سے کوئی کام نہ لیتی تھیں۔ مالاٹکے گاؤں میں اس کی عمر کی لڑکیاں گھروں میں سب ہی کام کرتی تھیں لیکن اگر کوئی کہتا تھا کہ زرینہ تو سارا دن اکیلی لگی رہتی ہے۔ تھوڑا بہت کام بیٹی سے بھی کروالیا کرتو وہ کہتیں۔

”نہ میری عاشو تو ابھی پڑھ رہی ہے۔“ اور اب تو دو سال ہوئے اس نے پانچ جماعتیں بھی پاس کر لی تھیں اور پورے بارہ سال کی تھی لیکن اماں نے تو پھر بھی کوئی کام کرنے کے لیے اسے بھی نہیں کہا تھا

بلکہ اب تک وہ خود ہی اس کے بالوں میں کنگھی کرتی تھیں اور اس سے تو خود سے چٹیا بنائی ہی نہیں جاتی تھی اور اس روز جب اماں کو اچانک ہارٹ ایک ہوا تھا انہوں نے صبح ہی صبح اس کے بالوں میں تیل لگا کر اس کی کنگھی کر کے دو چوٹیاں بنائی تھیں اور اس نے اماں سے فرمائش کر کے پف بنوائے تھے۔ ان دنوں گاؤں میں لڑکیاں سیدھی مائیک نکال کر پف بناتی تھیں اور اب کتنے کتنے دن گزر جاتے تھے اور وہ کنگھی کرتی ہی نہ تھی بال اس وقت بھی الجھے ہوئے تھے۔ اس نے تو صبح منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ شرمندہ سی ہو کر اس نے استانی جی کی طرف دیکھا تھا جو پیار سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”ہاں عاشی بیٹی، قرآن پڑھنے سے تمہاری اماں کی روح خوش ہوگی اور دیکھو سارا دن اکیلی گھر میں... پڑی رہتی ہو۔ کام جلدی جلدی کر کے میرے پاس آ جایا کرو۔“ اور اس روز کے بعد استانی جی نے جیسے اماں کی جگہ لے لی تھی۔ کس طرح باتوں باتوں میں اسے گھر کے کاموں کی طرف راغب کیا تھا۔ اب تو وہ ابا کے ساتھ ہی اٹھ جاتی تھی انہیں چائے بنا کے دیتی۔ ابا اسے آگ جلا دیتے تھے اور وہ جیسی بھی ٹیڑھی میٹر می روٹی پکا سکتی پکاتی ابا شوق سے کھا لیتے تھے۔ پھر برتن دھوتی، جھاڑو دیتی اور استانی جی کے اسکول سے آنے کے بعد ان کے گھر چلی جاتی اور ان کے گھر کے کام بھی بڑے ذوق و شوق سے کرتی۔ استانی جی نے باتوں ہی باتوں میں کتنی ہی باتیں اسے سکھادی تھیں پھر ان کے کہنے پر اس نے اُن سے پڑھ کر پرائیویٹ آٹھویں کا امتحان دیا تھا۔ میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی جب ابا نے شادی کر لی۔ سو تیلی ماں نہ بہت اچھی تھی نہ بری۔ وہ خود اب سمجھ دار تھی۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں تو گاؤں میں لڑکیوں کی شادی ہو جاتی تھی لیکن پتا نہیں کیا بات تھی اس کا ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔

ایک بار اس نے ابا کو کہتے سنا تھا وہ اس کی سوتیلی ماں سے کہہ رہے تھے۔

”عاشی کے لیے کسی سے رشتے کی بات کرو۔ اپنے رشتے داروں میں تو کوئی اس کی عمر کا نہیں ہے۔“ لیکن اسے تو کوئی پروا نہیں تھی، وہ سوتیلی ماں کے آنے کے بعد بھی پہلے کی طرح ہی کام کرتی تھی اور کام سے فارغ ہو کر استانی جی کی طرف چلی جاتی تھی۔ بلکہ اب تو اپنے اور ابا کے کپڑوں کے ساتھ ماں کے کپڑے بھی دھونے پڑتے تھے لیکن اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ تو مگن تھی پھر اسے اللہ نے بھائی دیا تو جہاں ابا خوش تھے وہاں وہ بھی بہت خوش تھی وہ اب استانی جی کے گھر سے پڑھ کر جلد گھر آنے کی کوشش کرتی تھی۔ آخر اسے مٹے بھائی کے ساتھ بھی تو کھیلا ہوتا تھا۔

اس نے جب آٹھویں کا امتحان ساتھ والے گاؤں میں جا کر دیا تھا تو اس کی دیکھا دیکھی پٹواری کی بیٹی شمو کو بھی شوق ہوا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح استانی جی سے پڑھ کر پہلے آٹھویں کا اور پھر میٹرک کا امتحان دے گی اور یوں وہ بھی استانی جی کے پاس پڑھنے آنے لگی تھی اور اس کی دوستی شمو سے ہو گئی تھی ورنہ اس سے پہلے تو گاؤں میں اس کی کوئی سہیلی تھی ہی نہیں۔ اماں نے بھی اسے گھر سے نکلنے ہی نہیں دیا تھا اور اماں کے بعد استانی جی کا گھر تھا جہاں وہ جاتی تھی۔ شمو کی ملگنی ہو چکی تھی اور اسے اس کی شادی کی بہت فکر رہتی تھی۔ وہ چڑ جاتی۔

”تجھے کیا جلدی پڑی ہے میری شادی کی، میں کوئی تیرے گھر سے کھاتی ہوں۔“

”بات جلدی کی نہیں ہے عاشی..... پر دیکھ تیری ماں تیری شادی نہیں ہونے دے گی۔“

”لو بھلا وہ کیوں ایسا کرے گی۔ میرا تو ابھی تک کوئی رشتہ ہی نہیں آیا۔ اسے خود بڑی فکر ہے۔“

”تو جھٹی ہے عاشی۔ تیری ماں کو مفت کی نوکرائی ملی ہوئی ہے۔ اسے بھلا کیا ضرورت ہے تیرا رشتہ کہیں کرنے کی..... اور تو نے کبھی آئینے میں خود کو دیکھا ہے۔ پورے گاؤں میں تیرے جیسی سوئی کڑی کوئی نہیں ہے۔ میری ماسی نے خود اپنے پتر کے لیے تیرا رشتہ مانگا تھا تیری ماں نے انکار کر دیا۔“ لیکن اس نے کبھی شمو کی بات پر کان نہیں دھرا تھا۔ وہ بڑی مطمئن تھی۔ اسے کبھی اپنی سوتیلی ماں سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ وہ بڑے مزے سے کہتی تھی کہ وہ تو مزے سے اپنے گھر میں عیش کر رہی ہے اور شمو جلتی رہے اس سے۔

اور پھر پتا نہیں کب اور کیسے نذر حسین اس کی زندگی میں چلا آیا تھا۔ نذر حسین اس کی سوتیلی ماں کا دور پار کا رشتے دار تھا جو گاؤں کے لڑکوں کے پرائمری اسکول میں ٹیچر بن کر آیا تھا اور کبھی کبھار اماں سے ملنے چلا آتا تھا۔ اس کا اپنا گاؤں یہاں سے بارہ کلومیٹر دور تھا۔ پھر اماں نے اسے اپنے ہی گھر رکھ لیا۔ اوپر چھت پر جو کمر خالی پڑا تھا اور جس میں ٹوٹی ہوئی چار پائیاں اور بیکار سامان بھرا ہوا تھا اماں نے اس کے لیے صاف کر دیا تھا۔

گاؤں میں جو چند گنے چنے کے مکان تھے ان میں سے ایک ان کا مکان بھی تھا۔ چنچے دو بڑے کمرے، ایک چھوٹا کمرہ، باورچی خانہ، غسل خانہ، کمروں کے آگے برآمدہ اور پھر بڑا سا صحن جس میں دھریک و امرود اور انار کے درخت تھے۔ غسل خانہ صحن میں تھا اور غسل خانے کے پاس سے ہی میڑھیاں اوپر چھت کی طرف جاتی تھیں اور چھت پر صرف ایک ہی کمر تھا۔

”بے چارہ بچہ ہر روز سنا کر رہا ہے۔ یہاں ہی رہ جائے۔“

”ہاں ہاں۔“ ابا نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

استانی جی نے دبے لفظوں میں اماں سے کہا تھا۔ ”عاشی کے ہوتے یوں کسی غیر لڑکے کو گھر میں مانا سب نہیں ہے۔“

”غیر کہاں ہے، میری ماں کے سسرالی عزیزوں سے ہے۔“ اماں نے ان کی بات پر دھیان ہی نہ دیا اور یوں نذر حسین ان کے گھر رہنے لگا تھا۔ اس نے کرایہ اور کھانے پینے کا خرچ دینے کی بہت کوشش کی لیکن اماں ابا الناس سے ناراض ہو گئے تھے۔ دہریتے اپنے گاؤں چلا جاتا تھا اور وہاں ہی پرڈھیروں میں لے آتا۔ کبھی چاول، کبھی گوشت اور پھل۔ کبھی کے لیے کچھ کھلونے، ابا اماں کے لیے کوئی کپڑا۔ پھر ایک بار وہ شہر گیا تو اس کے لیے بھی چوڑیاں اور ریشمی سوٹ لایا تھا اور وہی لمحہ تھا شاید جب پہلی بار اس کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ جب اماں اسے دہریاں اور سوٹ دے رہی تھیں تو وہ اس کی طرف نگہ رہا تھا اور جس اشتیاق سے وہ اسے دیکھ رہا تھا اس سے وہ شرمائی تھی اور اس کا شکر ادا کر کے وہ جلدی لے۔ اماں کے کمرے سے نکل گئی تھی۔ پہلی بار اپنے کمرے میں آکر وہ بہت دیر تک نذر حسین کے متعلق سوچتی رہی تھی۔

نذر حسین خوش شکل تھا۔ پڑھا لکھا تھا اور بہت اچھا تھا۔ اسی روز وہ شام کو صحن میں جھاڑو دے رہی تھی تو وہ میڑھیوں سے اتر کر بس ذرا سی دیر کو اس کے پاس ہوا تھا۔

”عاشی وہ رنگ تم پر بہت بچے گا، سوٹ ضرور ملوٹا۔“ اس نے جھاڑو ہاتھ میں پکڑے پکڑے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا تھا۔ وہ بہت پُر شوق ٹھہروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم بہت خوب صورت ہو عاشی! بہت مسین..... بڑا خوش نصیب ہو گا وہ جس کا تم نصیب ہو گی۔“ اور پھر وہ تیزی سے صحن میں سے گزرتا دروازہ

کھول کر باہر نکل گیا تھا اور وہ جھاڑو ہاتھ میں لیے کتنی ہی دیر تک بے خیالی میں سوچتی رہی تھی۔

”وہ خوش نصیب تم بھی ہو سکتے ہو نذر حسین۔“ اس کے دل میں نذر حسین کے الفاظ نے ہلچل سی مچا رکھی تھی اور پھر جھاڑو رکھ کے منہ ہاتھ دھو کے وہ کتنی ہی دیر تک آئینے میں خود کو دیکھتی رہی تھی۔ ”شمو صحیح کہتی ہے کہ میں بہت خوب صورت ہوں اور نذر حسین.....“

نذر حسین کو تو اب جب بھی موقع ملتا کوئی نہ کوئی جملہ کہہ دیتا اور وہ کئی کئی گھنٹے دل ہی دل میں اس کے جملے کو دہراتی رہتی۔ ان دنوں اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ خوب صورت لگے۔ ہر روز پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت۔ نذر حسین اسے دیکھ کر حیران رہ جائے اور پھر..... وہ خود پر دھیان دینے لگی تھی۔

اس نے شمو کے کپڑوں کے ڈیزائن دے کر صفیہ درزن سے کپڑے سلوائے تھے۔ نذر حسین کا لایا ہوا سوٹ بھی اس نے سلوا لیا تھا اور گاؤں کے واحد جنرل اسٹور سے شمو کے ساتھ جا کر میک اپ کا سامان بھی خرید لیا تھا۔

جس روز پہلی بار اس نے اپنے ناخنوں پر میرڈن نیل پالش لگائی تھی تو جیسے اس کے خوب صورت ہاتھ دمک اٹھے تھے اور اس نے نذر حسین کو جب جائے پکڑائی تھی تو اس کی نظریں اس کے ہاتھوں پر ہی جم گئی تھیں۔

”تمہارے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں عاشی جی چاہتا ہے کہ.....“ اور اماں کے آنے پر اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

اس روز اس نے کوئی سیکڑوں بار اپنے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ اور اب تو آتے جاتے، کھانا کھاتے، قریب سے گزرتے نذر حسین کچھ نہ کچھ کہہ دیتا۔ وہ لجا

جانی لیکن دل جیسے کھل اٹھتا۔ وہ ہر روز تیار ہوتی۔ کبھی ہلکی لب اسٹک لگا لیتی، کبھی ذرا سا بلشر گالوں پر لگا لیتی۔ یہ وہی عاشی تھی جسے اماں کے بعد کنگھی کرنا عذاب لگتا تھا اور ہفتوں وہ یوں ہی الجھے بال لیے پھرتی رہتی تھی۔ کپڑے بدلنے کا اسے خیال نہیں آتا تھا۔ استانی جی ٹوکتیں تو بے دلی سے کنگھی کرتی اور کپڑے بدلتی۔ لیکن اب تو ادھر چائے کا پانی چولہے پر رکھتی اور جھپاک سے اپنے کمرے میں کھس کر جلدی جلدی کنگھی کرتی، ہلکی سی لب اسٹک ہونٹوں پر لگاتی اور پھر باورچی خانے میں کھس جاتی۔ نذر حسین سڑھیوں سے اتر کر باورچی خانے کے پاس آ کر کھٹکھارتا تو وہ دروازے سے جھانک کر اسے دیکھتی۔

”آپ بیٹھیں میں چائے لا رہی ہوں۔“ وہ برآمدے میں پڑی چارپائی پر بیٹھ جاتا۔ ابا بھی اپنے کمرے سے نکل آتے۔

نذر حسین کی پُرشوق نظریں بار بار اس کی طرف اٹھتیں۔ کبھی جب ابا کو سویرے کھیتوں میں جانا ہوتا تو پھر نذر حسین کی نظریں اس پر سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ وہ سرگوشیوں میں کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہتا تھا اور وہ سرخ ہوتی رہتی۔ اماں نے تو اس کی اس تبدیلی پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ ہاں استانی جی تھیں جن کی نظروں نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا اور باتوں باتوں میں وہ اسے کئی نصیحتیں کر جاتی تھیں۔ اسے ان دنوں لگتا تھا جیسے استانی جی نے اماں کا عہدہ سنبھال لیا ہو۔ استانی جی کی نظریں اسے جیسے اندر تک کھوج آتی تھیں اور ہمہ وقت اس کی نگران رہتیں۔

”میکے کے بغیر عورت کی عزت نہیں ہوتی عاشی۔ جس عورت کے پیچھے میکے کی دیوار کا سہارا نہ ہو اس کی سسرال میں کوئی وقعت نہیں ہوتی۔“ اسے بالکل سمجھ نہیں آئی تھی کہ استانی جی ایسا کیوں کہہ رہی ہیں اور استانی جی جیسے اس کے اندر کی الجھن پا گئی تھیں۔

”جو لڑکیاں اپنے والدین کو ناراض کر کے گھر بساتی ہیں عاشی، سسرال میں بھی عزت نہیں ہونے کی۔“

”والدین کو ناراض کر کے کیسے گھر بساتی ہیں استانی جی اور کیوں؟“

”بس بسا لیتی ہیں اور پھر ساری زندگی تڑپا رہی ہیں۔“ استانی جی اس کی کاپی چیک کرنے لگیں۔ شمار غلطیاں تھیں۔ استانی جی کو غصہ آ گیا تھا۔

”تمہارا دھیان کہاں ہوتا ہے عاشی! چند ماہ بعد میں نے تمہیں پیپر دلوانے کے لیے شہر لے کر جانا ہے اور تمہارا حال یہ ہے کہ تین دن سے ایک مضمون بار نہیں ہو رہا تم سے..... عاشی کون ہے وہ؟“ استانی جی نے یکدم کاپی بند کر دی تھی اور وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔

”نذر حسین۔“ استانی جی نے کیسا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا سر ہل گیا تھا۔

”اس سے کہو ماں باپ کو بھیجے تمہارے ابا کے پاس رشتہ مانگنے کے لیے۔“

”میں کہوں؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔

”ہاں تم کہو اگر وہ تمہارے ساتھ تخلص ہے اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو سیدھے سبھاؤ رشتہ بھیجے..... یہ آنکھ مجھولی مت کھلے تمہارے ساتھ۔ عاشی لڑکیوں کو بہت احتیاط سے زندگی گزارنی چاہیے۔ کل کلاں کچھ ہو جائے تو بہت نازک کا نچ ایسی ہوتی ہیں لڑکیاں..... عزت پر ذرا آنچ آ جائے تو ساری عمر گھر بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا انہیں۔“ لیکن نذر حسین نے اب تک اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی..... بس کوئی خوب صورت جملہ..... پُرشوق سراہتی نظریں..... اور بس۔ ”کیا نذر حسین اس سے محبت کرنے لگا ہے؟“ اس نے خود سے پوچھا لیکن

اس کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ ہاں..... اس نے نذر حسین کے حوالے سے ڈھیروں خواب دیکھ ڈالے تھے۔ نذر حسین اور وہ..... ایک چھوٹا سا گھر..... اور شاید یہی محبت تھی۔ اس نے سوچا تھا۔

”عاشی تنہائی میں کبھی نذر حسین کے پاس مت جانا۔“ استانی جی نے نصیحت کی تھی اور ایک روز نذر حسین نے بیڑیاں چڑھتے چڑھتے غسل خانے کے پاس کھڑی عاشی کو دیکھا تھا اور پھر اسے اوپر آنے کا اشارہ کیا تھا لیکن وہ پانی بھر کر اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ حالانکہ اس کا کتنا دل چاہا تھا کہ وہ چلی جائے اماں بھی تو گھر پر نہیں تھیں اور ابا ابھی تک نہیں آئے تھے۔ بس تھوڑی دیر کے لیے..... اور نذر حسین اسے دیکھے، اسے سراہے لیکن پھر اسے استانی جی کا خیال آ گیا تھا اور اس نے خود کو روک لیا تھا لیکن پھر تو جیسے نذر حسین کو ایک ہی رٹ لگ گئی تھی۔

”عاشی تھوڑی دیر تنہائی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں..... مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔ اپنے دل کا حال سنانا ہے۔“ اسے جب موقع ملا چپکے سے کہہ جاتا۔ لیکن عاشی سنی ان سنی کر دیتی۔ نذر حسین بہت تلملاتا۔ آخر ایک روز اس نے عاشی کا ہاتھ پکڑ کر روک ہی لیا۔ اس روز اماں، ابا دونوں ہی ساتھ والے گاؤں کسی فوننگی میں گئے ہوئے تھے۔ وہ برتن دھو رہی تھی کہ نذر حسین اچانک ہی آ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ دھو کر جلدی سے برتن کا ٹوکرا چوڑے پر رکھا اور دوپٹے سے ہاتھ پونچھ رہی تھی کہ نذر حسین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”تم مجھ سے بھاگتی کیوں ہو عاشی؟ کیا میں تمہیں کھا جاؤں گا..... میں تو تمہاری محبت میں پاگل ہو رہا ہوں۔“ اور دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔ مارے شرم کے نگاہیں اٹھ ہی نہیں رہی تھیں۔

”عاشی ادھر دیکھو میری طرف، کیا میں اچھا نہیں لگتا؟ کیا تمہارے دل میں میرا ذرا بھی نہیں ہے۔“ نگاہیں، میں تمہیں بہت چاہتے لگا ہر تم بہت خوب صورت ہو عاشی..... اتنی خوب صورت کہ جی چاہتا ہے تم سامنے بیٹھی رہو اور میں تمہیں رہوں۔“ اور اس کا دل تو مانو جیسے سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی پلکیں اٹھائی تھیں۔

”آپ مجھے اتنا چاہتے ہیں تو پھر اپنے اماں کو کیوں نہیں بھیجتے ہمارے ہاں؟“

”بھجوں گا..... لیکن پہلے تم بھی تو اعتراف میری محبت کا۔ کیا تم بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے سر ہلایا تھا اور یکدم تیز سے کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔

اعتراف محبت کیا کیا تھا دل ہر وقت نذر کی قربت چاہنے لگا تھا۔ وہ استانی جی کی ہر نصیحت بھول کر گھنٹوں نذر حسین سے باتیں کرتی رہتی۔ نذر حسین نہ ہوتا تو اس کے تصور میں وقت کٹ جاتا اور وہ استانی جی کی طرف جانا بھی بھول جاتی۔ استانی جی شمو سے کہلو کر بھیجتیں کہ وہ پڑھائی کا حرج نہ کرے لیکن اسے اب پڑھائی کی پروا ہی کب رہی تھی۔ نذر حسین نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد اسے میاہ کر اپنے سنگ لے جائے گا۔ گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں اماں تو مٹنے کو لے کر کمرے میں گھر جاتیں اور نذر حسین کے اسکول سے آنے کے بعد دونوں غسل خانے کے پیچھے دھریک کے درختوں کے نیچے چار پائی پر بیٹھے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ اماں کو خبر تک نہ ہوتی۔ وہ جب دن ڈھلنے پر کمرے سے باہر نکلتیں تو نذر حسین اوپر چھت پر جا چکا ہوتا۔ وہ بان کی چار پائی پر بازو کا تکیہ بنائے منہ پر اپنا دوا

لے سو رہی ہوتی۔ انہیں تو اس روز خبر ہوئی جب نذر کی ماں اس کا رشتہ لے کر آئی تو ان کی آنکھیں..... کچھ دیر تو انہیں سمجھ ہی نہیں آئی کہ وہ نذر حسین کی ماں کو کیا جواب دیں اور پھر جیسے وہ اس جھٹکے سے ل آئیں اور بڑے رसान سے انکار کر دیا۔

”نذر حسین سے بڑھ کر ہمیں کون ہو سکتا ہے پر کے ابا نے اس کی اماں کی زندگی میں ہی اپنے الی عزیزوں میں زبان دے دی تھی۔“ اس کے ہال والے سب سندھ میں رہتے تھے وہاں کس جا کر تصدیق کرتی تھی، اسے علم ہوا کہ اماں نے سے ذکر کیے بغیر خود ہی انکار کر دیا ہے تو اس روز ماں اسے شمو کی بات سچ لگی تھی کہ اماں اس کی ماں کی بھی نہیں کرے گی۔ مارے غصے کے وہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی تھی اور اماں نے بڑبڑ کرتے برتن مومے اور کھانا پکایا تھا۔ وہ تو طبیعت کی خرابی کا بہانہ مے کھانے کے لیے بھی باہر نہیں نکلی تھی اور نہ ہی ابا آنے پر۔ اس نے کمرے میں لیٹے لیٹے ابا کی ہانسی تھی۔

”عاشی کدھر ہے؟“

”اس کے سر میں درد ہے۔“ اماں نے بتایا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے تم ہی چلم (حقہ) تازہ کر کے لے آؤ..... اور عاشی کو سر درد کی گولی دے دو۔“

”لیکن یہ سر درد گولی سے جانے والا تو نہیں ماں وہ ساری رات روتی رہی۔ وہ بھلا نذر حسین کے کیسے جیے گی۔ اور اماں نے نذر حسین سے جانے کیا کہا تھا کہ وہ چھت کا کمر خالی کر کے پھر سے اسکول میں موجود رہائشی کمرے میں منتقل ہو گیا تھا۔ وہ تڑپ رہی تھی۔

وہ نذر حسین سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ ایک بار پھر اپنے والدین کو ابا کے پاس بھیجے اور وہ اماں کے ہائے ابا سے بات کریں۔ ادھر نذر حسین بھی تڑپ

رہا تھا کہ ملاقات کی کوئی صورت ہو، چنانچہ اس نے ایک بچے کے ہاتھ اسے پیغام بھیجا کہ وہ چھٹی والے دن اس کا انتظار کرے گا۔ وہ اسکول کے پچھلے دروازے سے آجائے اور وہ تو خود اس سے ملنا چاہتی تھی۔ شمو کے گھر جانے کا بہانہ کر کے نذر حسین سے ملنے جا پہنچی۔ وہ بہت پریشان تھا۔

”اب کیا ہو گا عاشی! ہم نے تو ایک ساتھ زندگی گزارنے کے بیان کیے تھے۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم اپنے ناکوں (نھیال) کی منگ ہو۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے نذر! اماں نے جھوٹ بولا ہے۔ وہ دراصل میری شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ اگر میری شادی ہو گئی تو گھر کا کام کون کرے گا بھلا۔ تم اپنے ابا کو ابا کے پاس بھیجو تو.....“

”نہیں۔“ نذر حسین نے صاف انکار کر دیا۔

”ہرگز نہیں، میری اماں اور ابا دونوں ہی دوبارہ اس گھر میں نہیں آئیں گے جہاں سے ایک بار انکار ہو چکا ہو۔“

”تو..... تو پھر کیا ہو گا..... کیا ہم.....؟“ اور آنسو بے اختیار ہی اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

”خدا کے لیے رو تو مت عاشی! تم نہیں جانتیں تمہارے آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں۔“

لیکن وہ بدستور رونی رہی۔

”اچھا چلو میں اب کے اتوار کو گھر جاؤں گا تو پھر بات کروں گا اماں سے۔ لیکن میری ماں بڑی آن والی ہے عاشی! ایک بار میری ماں نے اس کے جانے پر ناک بھوں چڑھائی تھی..... آج دس سال ہو گئے اس نے پھر اس کے گھر میں قدم نہیں رکھا، ماما خود ہی آکر مل جاتا ہے..... پھر بھی میں پوری کوشش کروں گا اماں کو لانے کی۔“ اس نے اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے تھے۔ اسے تسلی دی تھی لیکن پھر بھی وہ بولا کی بولا کی سی پھرتی رہی۔ استانی جی نے دو تین بار بلوا

بھیجا لیکن وہ گئی ہی نہیں تب وہ خود چلی آئیں۔

”کیا ہوا ہے عاشی! تم نے آنا ہی چھوڑ دیا ہے، یہ دن تو بڑے قیمتی ہیں، میں نے تمہارے داخلہ فارم منگوانے ہیں، شمو اور تم دونوں نے اس سال امتحان دینا ہے۔“

”نہیں استانی جی! میں امتحان نہیں دوں گی، میری تیاری نہیں ہے۔“

”تیاری ہو جائے گی، داخلہ بھیجتے ہی کون سا پیپر شروع ہو جائیں گے، دو تین ماہ ہوں گے نا تیاری کے لیے، میں کروادوں گی تیاری۔“

”وہ اماں کہتی ہے گھر کا کام کرنا ہوتا ہے تمہیں، استانی جی کے گھر جا کر نہ بیٹھ جایا کرو۔“

”میں تیری اماں سے بات کر لوں گی عاشی۔“

آنے والے وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ آدی کے ہاتھ میں کچھ ہنر ہونا چاہیے۔“ اور تب وہ چپ کر گئی تھی۔

وہ استانی جی سے کیا کہتی کہ اب خود اس کا پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کتاب کھولتی تو آنکھوں کے سامنے نذر حسین آکر کھڑا ہو جاتا، کانوں میں اس کی کہی باتیں رس گھولنے لگتیں۔

استانی جی نے اس کا داخلہ بھجوا دیا تھا اور وہ ایک بار پھر استانی جی کے گھر جانے لگی تھی۔ لیکن اس کا دھیان نذر حسین کی طرف ہی لگا رہتا۔

”پتا نہیں اس کی اماں مانیں گی بھی یا نہیں اور اگر مان گئیں تو کہیں ابا، اماں پھر انکار نہ کر دیں۔ ابا بھلا اماں کی بات کیسے ٹالے گا۔ آخر کو وہ اس کے بیٹے کی ماں ہے۔ لاکھ اسے مجھ سے محبت سہی لیکن اماں بھی تو.....“

”کیا بات ہے تو اتنی پریشان کیوں رہنے لگی ہے..... کیا اماں کچھ کہتی ہے؟“ استانی جی نے کتنی ہی بار پوچھا تھا۔

”نہیں۔“

”کیا تمہیں اس بات کا دکھ ہے کہ تمہاری اماں نے نذر حسین کے رشتے سے انکار کیوں کیا؟“ وہ پوچھتیں تو وہ چپ رہتی۔ کیا کہتی، اپنا دل چیر کر استانی جی کو کیسے دکھائی۔ کیسے بتاتی کہ دکھ تو بڑا چھوٹا سالن ہے اس کا دل تو اس دکھ سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔

”دیکھو عاشی انسان کے مقدر میں جو ہوتا ہے وہ اسے ضرور ملتا ہے۔ وقت آنے پر تمہیں بھی سب کچھ ملے گا..... محبتیں کبھی تحفظ بھی اور اگر نذر حسین کے ساتھ تمہارا مقدر جڑا ہے تو وہ تمہیں ضرور ملے گا اور اگر نہیں تو کیا پتا اللہ نے تمہارے مقدر میں اس سے بھی اچھا بندہ لکھا ہو۔ تمہارا امتحان ہو جائے تو میں تمہارے ابا سے خوب بات کروں گی اور نذر حسین کے متعلق بھی ہا کروادوں گی کہ کیسا ہے۔ اس کے گاؤں میں میری ایک شاگرد پیار ہی ہوئی ہے۔“ لیکن اس کی تو نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ نذر حسین گھر سے آیا تو اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کی اماں اور ابا ہرگز ہرگز اس کے گھر رشتہ لینے نہیں آئیں گے۔ تمہاری اماں نے ہمارے گھر جا کر بڑی باتیں سنائی ہیں..... اور مجھ پر الزام لگائے ہیں۔“

”کیا کہا اماں نے؟“ وہ ڈر گئی تھی۔

”تمہاری اماں نے میری اماں سے کہا کہ ایک تو ہم نے اپنے گھر میں رکھا اور پھر سے میں نے ان کی بیٹی پر ڈورے ڈالے۔“ وہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

”میں تو مر جاؤں گی نذر۔“ کچھ دیر بعد اس نے کہا تھا۔

”اور میں..... تم سمجھتی ہو میں تمہارے بغیر زندہ رہوں گا۔“

”استانی جی کہتی ہیں وہ میرے ابا سے خود بات کریں گی..... اور.....“

”اب کوئی فائدہ نہیں بات کرنے کا عاشی!“ وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔ ”اماں نے یہاں سے جاتے ہی میرا

ملے کر دیا ہے۔“ اور وہ حیران اسے دیکھنے لگی تھی۔

”اب کیا ہوگا؟“

”کیا ہوتا ہے یا تو دونوں زہر کھالیں اگلے ل میں مل جائیں گے یا پھر.....“

”یا پھر.....“ وہ جیسے رونا بھی بھول گئی تھی۔

”یا پھر بھاگ چلیں دونوں۔“

”نہیں۔“ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

”ہاں بس یہی ایک حل ہے میرے پاس۔“

”لیکن میں کیسے..... نہیں نذر حسین، میرا..... وہ تو.....“

”تو بس پھر ٹھیک ہے تم جاؤ..... ابا کے پاس در مجھے میرے حال پر چھوڑ دو..... لیکن یاد رکھنا میں ہمارے بغیر زندہ نہیں رہوں گا..... مر جاؤں گا۔“

”آؤ سوؤں نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں کی راہ لی۔ بہت دیر رونے کے بعد اس نے سراٹھا کر نذر

مین کو دیکھا تھا۔

”لیکن ہم بھاگ کر جائیں گے کہاں؟“

”کہیں بھی۔“ نذر حسین کی آنکھیں چمک اٹھی

جس۔“ یہ دنیا بہت بڑی ہے..... کہیں بھی رہ لیں گے۔ میں نے ٹرانسفر کے لیے درخواست دی ہوئی ہے۔ ہفتے ڈیڑھ ہفتے میں میرے آرڈر آ جائیں گے۔ پھر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ پہلے

ناہی کریں گے پھر ہمارا اپنا ایک گھر ہوگا۔“ وہ اسے

اسے خواب دکھانے لگا تھا۔

”اور تمہارے اماں ابا کیا تمہیں وہ یاد نہیں

تیں گے؟“ اس نے بے وقوفی سے پوچھا تھا۔

”جب انہوں نے میرا خیال نہیں کیا تو میں

دن ان کو یاد کروں گا۔ اور ویسے بھی ماں باپ زیادہ

ن اولاد سے ناراض نہیں رہ سکتے، منالیں گے دو چار

مال بعد۔“

”لیکن استانی جی کہتی ہیں گھر سے بھاگنے والی

لڑکیوں کو نہ ماں باپ منہ لگاتے ہیں نہ سرال میں ان کی عزت ہوتی ہے۔“

”تمہاری استانی جی بھی بس..... اور سنو اب اپنی استانی جی کو جا کر نہ بتا دینا کہ تم میرے

ساتھ.....“

”میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں نذر۔“

”بے وقوف نہیں ہو لیکن معصوم تو ہونا، تمہاری اسی معصومیت نے تو مجھے گرویدہ بنایا ہے تمہارا۔“

”لیکن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے نذر۔“

”ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے عاشی! لڑکی کو نہ

تو میکے والوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہوتی ہے نہ سرال کے ساتھ۔ اسے اپنے شوہر کے ساتھ رہنا

ہوتا ہے۔ وہی اس کا گھر ہوتا ہے سمجھیں تم۔“

”لیکن استانی جی کہتی ہیں جو لڑکی اپنے سرال

والوں کے ساتھ بھا کر نا نہیں جانتی وہ اپنے شوہر کا گھر

بھی نہیں بسا پاتی۔“

”خدا کے لیے عاشی، مجھے اپنی استانی جی کے

اقوال نہ سنا پا کرو۔ کان پک گئے ہیں سن سن کر۔“ اور

اب جاؤں میں تمہیں خود ہی بتا دوں گا..... اور کسی سے ذکر

مت کرنا، میرے آرڈر آ جائیں تو پھر ملے کر لیں گے کیا

کرنا ہے۔ اچھی طرح سوچ لینا..... میں مجبور نہیں کرتا،

تم پر میرا اختیار نہیں ہے لیکن اپنی زندگی پر مجھے اختیار

ہے اور میں اپنی زندگی ختم کر لوں گا۔ زہر کھالوں گا،

کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں گا، کچھ بھی کر گزروں گا

لیکن وہ زندگی جس کے سفر میں تم میرے ساتھ نہیں ہوگی

عاشی وہ مجھے قبول نہیں ہے.....“ وہ نذر حسین کی موت کا

تصور کرتی تو اس کا پورا وجود لرز اٹھتا۔

”نہیں، اگر نذر حسین مر گیا تو پھر میں جی کر کیا

کروں گی..... لیکن ہم دونوں ہی کیوں مریں..... ہم

اپنی الگ زندگی کیوں نہ شروع کریں..... آخر ایک نہ

ایک دن تو ہمیں اپنا گھر بسانا ہی تھا پھر.....“

ماہنامہ پاکیزہ - مئی 2012ء

217

نذر حسین اس کے کان میں سرگوشی کرتا تو وہ چونک کر خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگتی۔ اگر وہ نذر حسین کے ساتھ چلی گئی تو پتا نہیں پھر کبھی وہ اس گھر میں آسکے گی یا نہیں۔ یہ گھر..... وہ صحن میں نظر دوڑاتی۔ دھریک کا درخت جب کاسنی پھولوں سے لد جاتا تھا تو کیسی جھنجھنی خوشبو پورے آنگن میں پھیل جاتی تھی۔ ابھی سردیوں کا اختتام تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس درخت نے پھولوں سے بھر جانا تھا اور پھر..... صحن میں چکر لگا کر وہ مٹنے کے پنگوڑے کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی۔ وہ گھنٹوں اسے سوئے ہوئے دیکھتی رہتی۔ کتنا خوب صورت تھا اس کا بھائی..... بالکل ابا جیسی آنکھیں..... ویسی ہی ناک..... اور رنگت تو بالکل ابا جیسی ہی تھی۔ ایک دم گلابی گلابی سی۔ اماں کا رنگ ابا جیسا گورا نہ تھا۔ اس نے اپنی اماں کا کوئی نقش نہیں لیا تھا، اور وہ مٹنے سے بھی نہیں مل سکے گی۔ نذر کہتا ہے تین چار سال بعد وہ اماں ابا کو منا لے گا لیکن تین چار سال تو وہ مٹنے کو نہیں دیکھ سکے گی۔ اسے کتنا شوق تھا کہ مٹنا جلدی جلدی بڑا ہو کر بولنا سکے اور اسے آپا کہہ کر بلائے لیکن اب جب مٹنا بڑا ہو گا تو وہ نہیں ہوگی اور وہ آپا کسے کہے گا؟ وہ گھبرا کر منے کے پنگوڑے کے پاس سے ہٹ جاتی اور ابا کے کمرے میں گھس کر ان کے میلے کپڑے اکٹھے کر کے دھونے بیٹھ جاتی، کبھی انہیں ناک سے لگا کر سوچتی۔ ابا کے کپڑوں میں کیسے ابا کی خوشبو رچ گئی ہے۔ کپڑے دھلنے والے نہ ہوتے تو ان کا حقہ تازہ کرنے لگتی۔

استانی جی کے گھر آتی تو بار بار ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی۔ کیا پتا انہوں نے ابا کو منا لیا ہو، بات کر لی ہو ان سے پھر بلا سے نذر حسین کی اماں نہ مانتیں۔ وہ تو اپنے ابا کی مرضی سے نذر حسین کے سنگ رخصت ہوگی۔ اس کے لیے تو اس گھر کے دروازے بند نہیں ہوں گے لیکن استانی جی تو جیسے

بات کر کے بھول گئی تھیں۔ اس کی نظریں مایوس کتاب کے صفحوں پر دوڑنے لگتیں لیکن لفظ جیسے سے ہو جاتے۔

استانی جی دونوں کے ساتھ بہت محنت کر تھیں لیکن اسے لگتا تھا جیسے ان کی ساری محنت اکا کر جائے گی۔ وہ سب کچھ بھول جائے گی شاید خالی دے کر ہی آجائے۔ اس روز استانی جی نماز پڑھتیں اور شمو کا مکمل کر کے باتیں کرنے لگی تھی۔

”پتا ہے عاشری! ابا چھوٹو کو شہر کے اسکول میں داخل کروانے لگا ہے۔ وہاں ہاسٹل رہے گا وہ۔“

”تمہارا بھائی؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”ہاں لڑکوں کے کتے مزے ہوتے ہیں تا میں نے بھی ابا سے کہا ہے کہ مجھے بھی کالج میں پڑھ رہے۔ دس جماعت پڑھ لوں تا تو مجھے بھی شہر میں داخل کروادینا لیکن ابا نے صاف منع کر دیا۔“

”لیکن تمہارے ابا اسے شہر میں کیوں بھیج رہے ہیں ابھی تو وہ بہت چھوٹا ہے تا۔“

”ابا بھی کیا کریں بے چارے، گاؤں میں کوئی ماسٹر نکلتا ہی نہیں۔ ابھی یہ جو نیا ماسٹر آیا تھا نذر حسین بھی ہفتہ ہوا چلا گیا اور ابھی تک کوئی نیا ماسٹر آیا ہی نہیں۔“ شمو پتا نہیں کیا کیا کہہ رہی تھی لیکن اس نے پھر کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ بس اس کا دل تو جیسے نیچے نیچے گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

”نذر چلا گیا..... بتائے پتا..... اس نے تو کہا تھا وہ مجھے بھی ساتھ لے کر جائے گا پھر.....“

اس پھر کے بعد اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ نماز پڑھ کر استانی جی آئیں تو اس کی کاپی خالی تھی۔ رنگت زرد ہو رہی تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ استانی جی نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور پھر کچھ کہے پتا شمو کا کام چیک کرنے لگیں۔ کام

کے انہوں نے اسے چھٹی دے دی۔

تم جاؤ شمو..... تمہاری سری میں اسپینک کی ہاں ہیں وہ یاد کر لیتا۔“ شمو چلی گئی تو استانی جی لطف متوجہ ہوئیں۔

”عاشری کیا بات ہے؟“ اور اس کی آنکھیں ہلک پڑیں۔ اس کا جی جا ہوا وہ ان سے گلہ کرے لے اب اسے بات نہیں کی اور وہ چلا گیا ہمیشہ لپے۔ اس کی زندگی سے نکل گیا اور استانی جی تو اس کے دل میں اتر جاتی تھیں۔

”عاشری! میں نے تمہارے ابا سے بات نہیں کی، نذر حسین کوئی بہت اچھا لڑکا نہیں ہے۔ تمہاری ماں نے جس وجہ سے بھی انکار کیا، تمہارے حق میں اچھا واسے۔ اپنے گاؤں میں اس کی شہرت اچھی نہیں۔ جو اٹھیلنے کی بہت بری لت ہے اسے۔ اپنی تنخواہ ملا وہ سنا ہے ماں کا بھی سارا زور جوئے میں ہار ما ہے۔ ایسا شخص قابل اعتبار نہیں ہوتا عاشری۔ ٹھیک اوش شکل ہے۔ بارہ جماعت پڑھا ہوا ہے لیکن یہ بہت بری ہے۔ سنا ہے یہاں بھی بچوں کو مانے کے بجائے تاش کھیل رہتا تھا اور بھی کئی بری فہم ہیں اس میں۔ تمہارے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے عاشری، اللہ بہتر کرے گا۔ بس تو ہر طرف سے مہمان ہٹا کر اپنی پڑھائی پر توجہ دے، میں نے بھی اسے لیے کچھ سوچ رکھا ہے۔“ اب ان ساری باتوں کا کیا فائدہ تھا۔ وہ تو چلا گیا تھا..... اچھا تھا یا برا.....

عاشری نے استانی جی کی باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا تھا اور سر درد کا بہانہ کر کے کام ختم کیے بغیر کمر آگئی تھی۔ کتابیں گھر میں رکھ کر اس نے بلا وجہ ہی کمر تک چکر لگایا تھا پھر گھر آ کر سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی اور گھنٹوں ٹیکے میں منہ بہائے روتی رہی تھی۔

دوسرے دن بھاری سر اور بوجھل دل کے ساتھ

وہ استانی جی کے گھر جانے کے لیے نکلی تو ایک اجنبی لڑکے نے اسے آواز دی۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ یہ لڑکا اس کے گاؤں کا نہیں تھا۔

”سنو تم عاشری ہونا.....؟“ غیر ارادی طور پر اس نے سر ہلا دیا تھا۔

”یہ نذر بھائی نے دیا ہے.....“ لڑکے نے ادھر ادھر دیکھا۔ گلی میں کوئی نہیں تھا وہ جلدی سے ایک کاغذ اسے پکڑا کر تیز تیز چلتا ہوا گلی سے نکل گیا..... تو کیا نذر نے اسے بھلایا نہیں ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر نہیں گیا۔ اس نے مٹی کو تختی سے بند کر لیا..... اور استانی جی کے گھر جانے کے بجائے واپس گھر لوٹ آئی۔ اماں مٹنے کو نہ ہلا رہی تھیں۔ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا تھا بس، پوچھا کچھ نہیں۔ اور یوں بھی وہ اس سے بلا ضرورت بات نہیں کرتی تھیں۔

اس نے اپنے کمرے میں آ کر جلدی جلدی کاغذ کی تہ کھولیں۔ یہ نذر کا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

”سنو عاشری، میرے ٹرانسفر کے آرڈر آگئے تھے۔ مجھے قصبے کے ایک پرائمری اسکول میں جگہ ملی ہے۔ میں نے رہائش وغیرہ کا بندوبست کر لیا ہے۔ اپنے اس دوست کے ہاتھ خط بھیج رہا ہوں جو تمہیں دیکھ چکا ہے خود جان بوجھ کر گاؤں میں نہیں آیا کہ کسی کو مجھ پر شک نہ ہو اس لیے ہفتہ بھر پہلے ہی چلا گیا تھا لیکن تمہیں بتانے کا وقت نہیں ملا اگر تم میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہو تو آج رات اسکول کے پیچھے کی طرف آ جانا۔ میں ادھر ہی پتیل کے درخت تلے تمہارا انتظار کروں گا۔ ٹھیک بارہ بجے..... میں آدھے گھنٹے رکوں گا یہاں..... اگر تم نہ آئیں تو میرے اور تمہارے راستے جدا..... تم کیا کروگی میں نہیں جانتا لیکن میں وہی کروں گا جو تمہیں بتا چکا ہوں۔“

نذر کا خط پا کر جہاں اسے خوشی ہوئی تھی وہاں ایک خوف نے بھی اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ

ان کے سامنے رکھا۔ ایک بار پھر حسب معمول ابانے اسے دعائیں دیں۔ وہ جھکے سر کے ساتھ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ یہ سب آج بھی اسے پوری جذبات کے ساتھ یاد تھا۔

وقت لمحہ لمحہ کر کے گزر رہا تھا۔ سارے گاؤں میں ہولے ہولے خاموشی چھا گئی تھی۔ کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی یا بھینس کے ڈکرانے کی آواز آتی تھی اور پھر بھیا تک خاموشی۔ گاؤں میں عموماً لوگ جلدی سو جاتے تھے اور ان دنوں تو کسی گھر میں ٹی وی وغیرہ نہیں تھا۔ ہاں چند گھروں میں ریڈیو اور ٹرانسٹریز تھے۔ خود اس کے گھر میں بھی ریڈیو تھا۔ جس پر اس نے کروشیے کا غلاف بنا کر ڈالا تھا اور یہ ریڈیو اسی کے لیے ابالائے تھے۔ اس نے ریڈیو کے اوپر رکھی ٹائم پیس کو دیکھا، ابھی صرف گیارہ بجے تھے، وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔

”نہیں، میں ابابا کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“ لیکن کچھ دیر بعد وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”وہ وہاں انتظار کر رہا ہوگا..... میں نہ گئی تو..... بس تھوڑی دیر کے لیے جاؤں گی اور اس سے کہوں گی کہ اپنی زندگی ختم نہ کرے، اسے اپنی قسم دوں گی تو وہ اپنے ارادے سے باز آجائے گا، وہ زندہ رہے، بلا سے مجھے ملے نہ ملے۔“ اس کی نظریں گھڑی کی سوئیوں پر تھیں۔ ریڈیم والے ہند سے اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ بڑی سوئی نو پر پہنچی تو وہ گھڑی ہو گئی۔ بارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس نے آہستگی سے اپنے دروازے کی کنڈی کھولی، باہر جھانکا، اوپر..... آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ چاند کی آخری راقمیں تھیں۔ اماں ابابا کا کمر بند تھا۔ اماں کے خرائے بند کمرے سے باہر تک آ رہے تھے۔ اس نے مڑ کر اپنی چارپائی پر پڑے کپڑے کے تھیلے کو دیکھا جس میں اس کے چند جوڑے کپڑے اور کتابیں تھیں،

”نہیں کرتی؟“ بہت دنوں بعد آج پھر ابابا پوچھ رہے تھے تو اس کا دل بھر آیا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ ابابا کے کمرے پر پھوٹ پھوٹ کر روئے، چٹخیں مار مار کر۔

”نہیں ابابا۔“ وہ آہستگی سے کہہ کر روٹی توڑے پر لے لگی۔

”وہ تجھ سے لڑائی جھگڑا کر کے تو دیکھے، چوٹی پڑ کر گھر سے باہر نکال دوں گا، میں نے اسے لہو دن ہی کہہ دیا تھا۔“ یہ بات ابانے پہلے بھی کئی بار بتائی تھی۔ اس نے بہ مشکل اپنے آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا تھا اور صافی سے دبا دبا کر روٹی کے تارے پکانے لگی۔ ابابا بڑی رغبت سے روٹی کھا رہے تھے، ابابا نے تو اس دن بھی اسی شوق اور لہت سے روٹی کھائی تھی جب پہلی بار اماں کے بعد اس نے کچی پکی میٹھی میٹھی روٹی پکائی تھی حالانکہ خود اسے ذرا بھی اپنی پکائی روٹی اچھی نہیں لگی تھی۔

”ابا روٹی اچھی نہیں ہے مت کھاؤ۔“

”واہ، کیوں نہ کھاؤں، میری دھی رانی نے پائی ہے تو اچھی ہے۔“ ابابا روٹی کھا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اور دعائیں دے کر چلے گئے تھے۔ وہ صبح کے گئے ہوئے تھے اور اس وقت انہیں آرام کی ورت تھی۔ آج کچھ نیا تو نہیں تھا۔ ابابا ہمیشہ ہی اسے مائیں دیتے لیکن شاید کچھ نیا ہونے والا تھا۔ چولہے کے پاس بیٹھے بیٹھے اس نے کتنے ہی آنسو بہا ڈالے تھے۔ اماں کے لیے روٹی پکا کر اور چولہے سے لکڑی کھینچ کر اس پر پانی ڈال کر اسے بجھایا اور لکڑی سے لکڑی الگ کر کے ایک طرف کیے۔ چولہے پر دوبارہ ماگ والی ہانڈی رکھی، راکھ میں موجود چنگا ریوں، سینک سے ساگ کچھ دیر گرم رہتا۔ اماں اور وہ ابابا بعد ہی کھانا کھاتے تھے۔ آج اسے بھوک نہیں تھی..... اندر اماں مٹنے کو سلا رہی تھیں۔ اس نے بے پردہ جلتے کوئلے رکھے اور ابابا کا حقہ تازہ کر کے

بھڑک اٹھتی ہے اور بعض اوقات اس آگ میں کچھ جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ عورت کا مان، عزت سب کچھ۔ عقلمند عورت وہ ہوتی ہے عالم آگ کو بھڑکنے نہیں دیتی۔“

”پتا نہیں یہ استانی جی کی باتیں مجھے ہر م کیوں یاد آ جاتی ہیں اور نذر حسین کتنا چڑتا ہے میں بھلا استانی جی کی باتوں کو بھول سکتی ہوں.....“ مجھے یاد آیا کریں گی اور نذر حسین کہے گا، خدا کے عاشری مجھے استانی جی کے اقوال مت سنایا کرو۔“ اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس پر اسے اپنی طرف کھسکا کر مہارت سے پتھر اٹھایا تب ہی ابابا نے سخن کا دروازہ کھولا۔ اس نے اپنا جھانک کر دیکھا، وہ تھکے تھکے سے برآمدے کے کمرے میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گئے تھے۔

”ابا میں روٹی پکا رہی ہوں، منہ ہاتھ دھو آ جاؤ۔“ پھر اس نے سخن میں لگے پنڈ پمپ کی آواز سنائی۔ وہ منہ ہاتھ دھونے کے لیے پانی نکال رہے، یہ روز کا معمول تھا۔ اس نے روٹی پکا کر چنگیر رکھی اور ابابا پیڑھی تھکیٹ کر باورچی خانے میں ہی بیٹھ گئے۔ اس نے روٹی پلیٹ میں سالن ڈال کر ابا کی طرف کھسکایا اور دوسری روٹی بنانے لگی۔ آگ کے شعلوں کا عکس اس کے رخساروں پر پڑ رہا تھا۔ روٹی کا نوالہ توڑتے ہوئے ابابا کی نظر اس پر پڑی تھی سوچی ہوئی آنکھیں، ان کا ہاتھ وہیں ٹھہر گیا تھا۔

”کیا ہوا ہے عاشو؟“

”وہ سر میں درد ہے ابابا۔“

”تو روٹی کیوں پکانے بیٹھ گئی ہے، آرام کرنا تیری ماں پکا لیتی۔“ انہیں غصہ آ گیا تھا۔

”اب ٹھیک ہے ابابا اور ساگ تو اماں نے ہی پکا تھا۔“

”اچھا..... سچ بتا عاشو تیری ماں تجھ سے لڑائی

تو مغرب کے بعد کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی..... اور رات بارہ بجے..... اس نے خوف سے جھرجھری سی لی۔ ایسے میں تو جن بھوت ہوتے ہیں گلیوں میں، اس نے خط کو ایک بار پھر پڑھا۔ کونے میں لکھا تھا۔

”اپنی ضروری چیزیں ساتھ لے آنا یہ کیا تھیں اس کی ضروری چیزیں..... اس نے اپنے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ چند جوڑے کپڑے اور اسکول کی کتابیں کتابیں اکٹھی کر کے اس نے ایک تھیلے میں ڈالیں۔ خط کو چوتھی بار پڑھنے کے بعد اس نے اسے پرنے پر زور کر کے پھینک دیا۔

”نہیں، میں نہیں جاؤں گی اس طرح..... میں ابابا اور مٹنے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لیکن وہ..... وہ بھی تو مر جائے گا۔ زہر کھالے گا۔“ وہ سوچتی رہی اور مغرب ہو گئی۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر گیا..... اماں نے باہر سے آواز دی۔

”تیری طبیعت اگر ٹھیک ہے تو دو روٹیاں ڈال دے اپنے ابابا کے لیے، آتا ہی ہوگا۔“ ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ خود ہی روٹیاں پکالے لیکن پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا پتا میں آخری بار ابابا کے لیے روٹیاں پکا رہی ہوں۔“ اس نے خط کے پرزے اٹھائے اور چولہے میں ڈال دیے۔ چولہے پر ساگ کی دپٹی رکھی تھی۔ اس نے دپٹی اتار کر ایک طرف رکھی..... ایک لکڑی اور چولہے میں رکھ کر پھونکنی سے آگ جلائی..... آگ یکدم بھڑک اٹھی تھی، اس نے تو چولہے پر رکھا۔ اس کے اندر بھی تو ایسی ہی آگ بھڑک رہی تھی۔ عشق کی آگ..... محبت کی آگ.....

استانی جی کہتی تھیں..... ”یہ مرد جو ہوتا ہے نا اپنے خوب صورت لفظوں سے عورت کی تعریف کر کے، اس سے محبت کا اظہار کر کے اس کے اندر کی آگ کو بھڑکا دیتا ہے جیسے پھونکنی سے چولہے کی آگ

تو مغرب کے بعد کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی..... اور رات بارہ بجے..... اس نے خوف سے جھرجھری سی لی۔ ایسے میں تو جن بھوت ہوتے ہیں گلیوں میں، اس نے خط کو ایک بار پھر پڑھا۔ کوئے میں لکھا تھا۔

”اپنی ضروری چیزیں ساتھ لے آنا یہ کیا تھیں اس کی ضروری چیزیں..... اس نے اپنے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ چند جوڑے کپڑے اور اسکول کی کاپیاں کتابیں اکٹھی کر کے اس نے ایک تھیلے میں ڈالیں۔ خط کو چوتھی بار پڑھنے کے بعد اس نے اسے پرزے پرزے کر کے پھینک دیا۔

”نہیں، میں نہیں جاؤں گی اس طرح..... میں ابا اور ممتے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لیکن وہ..... وہ بھی تو مر جائے گا۔ زہر کھالے گا۔“ وہ سوچتی رہی اور مغرب ہو گئی۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر گیا..... اماں نے باہر سے آواز دی۔

”تیری طبیعت اگر ٹھیک ہے تو دور وٹیاں ڈال دے اپنے ابا کے لیے، آتا ہی ہوگا۔“ ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ خود ہی روٹیاں پکا لے لیکن پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا پتا میں آخری بار ابا کے لیے روٹیاں پکا رہی ہوں۔“ اس نے خط کے پرزے اٹھائے اور چولہے میں ڈال دیے۔ چولہے پر ساگ کی دہکی رکھی تھی۔ اس نے دہکی اتار کر ایک طرف رکھی..... ایک لکڑی اور چولہے میں رکھ کر پھونکنی سے آگ جلائی..... آگ یکدم بھڑک اٹھی تھی، اس نے توا چولہے پر رکھا۔ اس کے اندر بھی تو ایسی ہی آگ بھڑک رہی تھی۔ عشق کی آگ..... محبت کی آگ.....

استانی جی کہتی تھیں..... ”یہ مرد جو ہوتا ہے نا اپنے خوب صورت لفظوں سے عورت کی تعریف کر کے، اس سے محبت کا اظہار کر کے اس کے اندر کی آگ کو بھڑکا دیتا ہے جیسے پھونکنی سے چولہے کی آگ

بھڑک اٹھتی ہے اور بعض اوقات اس آگ میں کچھ جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ عورت کا مان، عزت سب کچھ۔ عقلمند عورت وہ ہوتی ہے نا آگ کو بھڑکنے نہیں دیتی۔“

”پتا نہیں یہ استانی جی کی باتیں مجھے ہر کیوں یاد آ جاتی ہیں اور نذر حسین کتنا چڑتا ہے میں بھلا استانی جی کی باتوں کو بھول سکتی ہوں..... مجھے یاد آیا کریں گی اور نذر حسین کہے گا، خدا کے عاشی مجھے استانی جی کے اقوال مت سنایا کرو۔“ کے لبوں پر تدم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس پر ات کو اپنی طرف کھسکا کر مہارت سے جڑا ہاں تب ہی ابا نے صحن کا دروازہ کھولا۔ اس نے ا جھانک کر دیکھا، وہ جھکے جھکے سے برآمدے کے میں پڑی چار پائی پر بیٹھ گئے تھے۔

”ابا میں روٹی پکا رہی ہوں، منہ ہاتھ دم آ جاؤ۔“ پھر اس نے صحن میں لگے ہینڈ پمپ کی آ سنی۔ وہ منہ ہاتھ دھونے کے لیے پانی نکال رہے، یہ روز کا معمول تھا۔ اس نے روٹی پکا کر چنگیر رکھی اور ابا پیڑھی تھسٹ کر باورچی خانے میں ہی گئے۔ اس نے روغنی پلیٹ میں سالن ڈال کر ا طرف کھسکایا اور دوسری روٹی بنانے لگی۔ آگ شعلوں کا عکس اس کے رخساروں پر پڑ رہا تھا۔ کا نوالہ توڑتے ہوئے ابا کی نظر اس پر پڑی تھی سو جی ہوئی آنکھیں، ان کا ہاتھ دھیں ٹھہر گیا تھا۔

”کیا ہوا ہے عاشو؟“

”وہ سر میں درد ہے ابا۔“

”تو روٹی کیوں پکانے بیٹھ گئی ہے، آرام کر تیری ماں پکا لیتی۔“ انہیں غصہ آ گیا تھا۔

”اب ٹھیک ہے ابا اور ساگ تو اماں نے ہی پکا تھا۔“

”اچھا..... سچ بتا عاشو تیری ماں تجھ سے لا

ا نہیں کرتی؟“ بہت دنوں بعد آج پھر ابا پوچھ رہے تھے تو اس کا دل بھرا آیا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ ابا کے لمبے گر پھوٹ پھوٹ کر روئے، جینیں مار مار کر۔

”نہیں ابا۔“ وہ آہستگی سے کہہ کر روٹی توڑے پر لگی۔

”وہ تجھ سے لڑائی جھگڑا کر کے تو دیکھے، چوٹی ہلا کر گھر سے باہر نکال دوں گا، میں نے اسے ن ہی کہہ دیا تھا۔“ یہ بات ابا نے پہلے بھی کئی بار بتائی تھی۔ اس نے بہ مشکل اپنے آنسوؤں کو باہر سے روکا تھا اور صافی سے دبا دبا کر روٹی کے پکانے لگی۔ ابا بڑی رغبت سے روٹی

ہا ہے تھے، ابا نے تو اس دن بھی اسی شوق اور سے روٹی کھائی تھی جب پہلی بار اماں کے بعد لے گئی تھی میٹر میٹر روٹی پکانی تھی حالانکہ خود ارا بھی اپنی پکانی روٹی اچھی نہیں لگتی تھی۔

”ابا روٹی اچھی نہیں ہے مت کھاؤ۔“

”واہ، کیوں نہ کھاؤں، میری دمی رانی نے لیا ہے تو اچھی ہے۔“ ابا روٹی کھا کر اس کے سر پر پھر کر اور دعائیں دے کر چلے گئے تھے۔ وہ صبح کے گئے ہوتے تھے اور اس وقت انہیں آرام کی

ان کے سامنے رکھا۔ ایک بار پھر حسب معمول ابا نے اسے دعائیں دیں۔ وہ جھکے سر کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ یہ سب آج بھی اسے پوری جذبات کے ساتھ یاد تھا۔

وقت لمحہ لمحہ کر کے گزر رہا تھا۔ سارے گاؤں میں ہولے ہولے خاموشی چھا گئی تھی۔ کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی یا بھیینس کے ڈکرانے کی آواز آتی تھی اور پھر بھیانک خاموشی۔ گاؤں میں عموماً لوگ جلدی سو جاتے تھے اور ان دنوں تو کسی گھر میں فی دی وغیرہ نہیں تھا۔ ہاں چند گھروں میں ریڈیو اور ٹرانسٹرز تھے۔ خود اس کے گھر میں بھی ریڈیو تھا۔ جس پر اس نے کروشیے کا غلاف بنا کر ڈالا تھا اور یہ ریڈیو اسی کے لیے ابالائے تھے۔ اس نے ریڈیو کے اوپر رکھی ٹائم ٹیس کو دیکھا، ابھی صرف گیارہ بجے تھے، وہ چادر اوڑھ کر لیٹ گئی۔

”نہیں، میں ابا کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“ لیکن کچھ دیر بعد وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”وہ وہاں انتظار کر رہا ہوگا..... میں نہ گئی تو..... بس تھوڑی دیر کے لیے جاؤں گی اور اس سے کہوں گی کہ اپنی زندگی ختم نہ کرے، اسے اپنی قسم دوں گی تو وہ اپنے ارادے سے باز آ جائے گا، وہ زندہ رہے، بلا سے مجھے ملے نہ ملے۔“ اس کی نظریں گھڑی کی سوئیوں پر تھیں۔ ریڈیم والے ہند سے اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ بڑی سوئی نو پر پہنچی تو وہ کھڑی ہو گئی۔ بارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس نے آہستگی سے اپنے دروازے کی کنڈی کھولی، باہر جھانکا اور..... آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ چاند کی آخری راتیں تھیں۔ اماں ابا کا کمرابند تھا۔ اماں کے خرائٹے بند کمرے سے باہر تک آ رہے تھے۔ اس نے مڑ کر اپنی چار پائی پر پڑے کپڑے کے تھیلے کو دیکھا جس میں اس کے چند جوڑے کپڑے اور کتابیں تھیں،

پھر پلٹ کر تھیلا اٹھا لیا اور قدم برآمدے میں رکھ دیے۔ دبے قدموں سے چلتے ہوئے محن تک آئی، بہت احتیاط سے محن کے دروازے کی کنڈی کھولی اور پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے قدم گلی میں رکھ دیا۔ پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے اور دل خوف سے سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ چوکنے انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اسکول کی طرف جاری تھی۔ اسکول گاؤں کی آبادی سے ہٹ کر کافی دور تھا۔ کئی بار اسے لگا جیسے کوئی اس کے پیچھے چل رہا ہو لیکن پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ ”کوئی جن یا بھوت پیچھے مڑ کر دیکھوں تو دیو بوج لے۔“ اس نے رفتار تیز کر دی۔ دور سے ہی پتیل کے تلے کھڑے دو سائے اسے نظر آ گئے تھے۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

”یہ..... میں کیا کرنے جا رہی ہوں۔“ استانی جی کہتی تھیں جو لڑکیاں رات کے اندھیرے میں اپنے گھر کی دہلیز پار کر جاتی ہیں ان کے لیے پھر واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔

”تو کیا میں.....؟“ اس نے چاہا کہ وہ پلٹ جائے لیکن قدم جیسے زمین میں گڑ گئے تھے..... ایک سایہ درخت کے نیچے سے نکل کر آگے بڑھا اور آہستگی سے اسے بلایا۔

”عاشی تم آگئی ہو۔“ اس نے ایک گہری لمبی سانس لی تھی، سایہ آگے بڑھا۔

”عاشی ادھر اڑے کی طرف میرے دوست کی سوز کی کھڑی ہے۔ آؤ جلدی کرو۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”پہلے میرا حساب تو چکاؤ۔“ دوسرا سایہ بھی قریب آ گیا تھا۔ یہ وہی خط لانے والا لڑکا تھا۔

”لڑکی کتنا مال لائی ہو؟“

”مال، کیسا مال؟“ اس نے حیرانی سے نذر حسین کو دیکھا تھا۔

”وہ میں نے تمہیں لکھا تھا نا کہ اپنی چیزیں بھی لے آتا۔“

”ہاں تو یہ ہیں نا میرے کپڑے اور کاپیاں۔“ اس نے تھیلا آگے کیا۔

”میرا مطلب تھا زیور وغیرہ۔“

”زیور.....!“

”ہاں، تمہاری شادی بیاہ کے لیے زیور تو ہوا گا تمہارے ماں باپ نے، وہ نہیں لائی ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتا تھا۔ ”میرے پاس تو نہیں ہے زیور، اماں کے ہونگا۔“ لڑکا اب نذر حسین کی طرف مڑ گیا تھا۔

”ہاں، اب بول کیسے چکائے گا میرا قرضہ؟“

”کہتا تھا وہ زیور لائے گی تو تم لے لینا۔“

”مجھے کیا پتا تھا کہ.....“ نذر حسین ہلکا رہا تھا۔

”اب پتا چل گیا ہے نا تو اسے بھیج واپس!“

”کبہ پیسہ، زیور لے کر آئے جو بھی ہے۔“

”لیکن پھر واپس جائے گی تو..... دیکھ یارا وقت یہاں زیادہ رکنا ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی ہمیں چلو..... میں وعدہ کرتا ہوں، ایک دو ماہ تک تیرا قرضہ چکا دوں گا۔“

”کہاں سے چکائے گا میرا قرضہ؟“

”تیری روٹی ہی پوری ہوگی، کیا بیوی کا سودا کرے گا؟“

رات کی خاموشی میں ایک ایک لفظ اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھی استانی جی نے صاف سنا تھا۔

استانی جی نے سوچا تھا کہ اب مزید چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ کھڑے کھڑے قہر قہر کانپ رہی تھی، ام استانی جی پیچھے سے آکر اسے تھام نہ لیتیں تو اوہ دھم دھم مڑ جاتی۔

استانی جی کو دے کی تکلیف تھی جو سردیوں میں اکثر زیادہ ہو جاتی تھی۔ آج رات بھی کھانسی

میں سونے نہیں دیا تھا۔ انہوں نے گرم پانی میں شہد ل کر پیا تو کچھ سکون ملا۔ لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔

گہرا ہٹ سی ہو رہی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر کھڑکی مولی اور پھر جیسے وہ ساکت سی ہو گئی تھیں۔ گلی کے

دوسری طرف عین ان کی کھڑکی کے سامنے عاشی گھر کا اڑہ کھول کر باہر نکلی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔

اس کی مدھم روشنی میں انہوں نے اسے مڑ کر پیچھے دیکھا اور پھر تیزی سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے

دیکھا تھا۔ وہ تیر کی طرح کھڑکی کے پاس سے ہٹی تھیں اور پھر کمرے کا دروازہ کھول کر انہوں نے تقریباً

اڑتے ہوئے محن پار کیا تھا اور جب وہ اپنے گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکلیں تو عاشی گلی کا موز مڑ رہی تھی۔

ایک لمحے کو انہوں نے سوچا کہ وہ عاشی کو آواز دے کر ہاتھیں کہ رات کے اس پہر وہ کہاں جا رہی ہے لیکن

دوسرے ہی لمحے انہوں نے تنگ گلی کے ارد گرد مکاؤں کو دیکھا۔ کہیں کوئی ان کی آواز نہ سن لے۔ وہ

نامملا چھوڑ کر دبے قدموں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔ پتا تو چلے وہ کس ارادے سے اور کس کے لیے

جا رہی ہے۔ اور جب عاشی رکی تو انہوں نے بھی سامنے پتیل تلے کسی کو کھڑے دیکھ لیا تھا۔ اسکول کی

دیوار کے سامنے اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ اسکول کے اندر کچھ نئے کمرے تعمیر ہو رہے تھے۔ وہ دیوار

کے ساتھ چپکے چپکے چلتے ہوئے اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھ گئیں۔

عاشی نے مدھم روشنی میں انہیں پہچاننے کی کوشش کی تھی اور پھر استانی جی کہہ کر ان سے لپٹ گئی

تھی۔ قہر قہر کانپتی عاشی کو سہارا دیتے ہوئے انہوں نے نذر حسین کی طرف دیکھا تھا۔ ایک دو بار ان کی

اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ بلکہ پچھلے دنوں انہوں نے اپنی ایکسٹینشن کے لیے درخواست بھی اسی کے ہاتھوں

ای۔ ای۔ او کے آفس میں بھجوائی تھی جو نا منظور ہو گئی

تھی۔ نذر حسین سر جھکائے کھڑا تھا۔

”نذر حسین جو لوگ دوسروں کے گھروں میں نقب لگاتے ہیں کبھی کبھی ان کے اپنے گھروں میں بھی

نقب لگ جاتی ہے۔ تمہاری بھی سنا ہے دو جوان بہنیں ہیں۔“ وہ نذر حسین پر ایک نظر ڈال کر عاشی کو سہارا

دیے دیے واپس مڑ گئیں۔ عاشی ان کے ساتھ ساتھ کھینچی ہوئی جارہی تھی۔

”عاشی اپنے قدموں کو مضبوطی سے زمین پر رکھو۔ واپسی کا سفر مشکل تو ہے لیکن ابھی نزدیک سے

ہی پلٹ آئی ہو تو ناممکن نہیں۔ اس سے پہلے کہ تمہارے گھر میں کوئی جاگ جائے ہمیں واپس پہنچنا

ہے۔“ اور پھر جتنی خاموشی سے وہ گھر سے نکلی تھی اتنی ہی خاموشی سے پلٹ آئی۔ نہ ابا کو پتا چلا نہ اماں کو۔

”اور جو استانی جی نہ آئیں تو.....“ وہ صبح تک جاگتی رہی تھی۔ رو، رو کر ٹپ ٹپ کر اس نے رات

گزار دی تھی۔ صبح جب ابا نے اسے جگایا تو وہ بخار میں جل رہی تھی۔ ابا گھبرا کر اماں کو آوازیں دینے لگے اور

پھر بھاگتے ہوئے حکیم صاحب کو بلا کر لے آئے۔ استانی جی بھی ناشتے کے بعد آگئیں وہ بہت دیر تک

اس کے پاس بیٹھی اس کا سرد بانی رہیں۔ نہ انہوں نے کچھ پوچھا نہ کہا۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔

”یا اللہ میں استانی جی کا کیسے سامنا کروں گی، کیسے ان کا شکریہ ادا کروں گی۔“ پھر بخار اتر بھی گیا

اور وہ استانی جی کے گھر نہ جاسکی۔ بہت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ تب استانی جی اسے خود بلانے آگئیں۔

”عاشی اب تیرا بخار اتر گیا ہے نا تو پھر پڑھنے کیوں نہیں آئی، تیری پڑھائی کا خرچ ہو رہا ہے۔“ پھر

وہ پڑھنے بھی گئی، اس نے میٹرک کا امتحان بھی دیا لیکن استانی جی نے ایک بار بھی اس رات کا ذکر

نہیں کیا۔ ہاں اس کے امتحان کے بعد ایک روز وہ ایک بے حد مددگار خاتون کے ساتھ ان کے گھر

ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

www.pdfbooksfree.pk

اسے بہلا بہلا کر تھک جاتا تھا۔

”خدا کے لیے عاشی اپنے آپ کو سنبھالو۔“ لیکن وہ روئے چلی جاتی..... پھر ہولے ہولے اسے مہر آ ہی گیا۔ لیکن وہ استانی جی کو کبھی بھولی تو نہیں تھی۔ اللہ نے دوبار اسے بیٹوں کی نعمت سے نوازا لیکن دونوں باری اس کی گود خالی ہو گئی۔ ایک نے دنیا میں آکر چند سانس لی تھیں اور دوسرا تین ماہ جیا۔ دونوں اللہ کی رضا پر راضی تھے لیکن وہ ہر وقت بوکھلائی بوکھلائی رہتی۔ اسے مہر کی بہت فکر تھی۔ لیکن مہر کے مزاج میں بڑا بچپنا تھا وہ اس کی کسی بات پر دھیان ہی نہیں دیتی تھی۔ بس ہنستا ہنسانا..... وہ کبھی ڈانٹ دیتی اسے تو عزیز ناراض ہوتا۔

”بچی ہے ابھی، اس کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں مت ٹو کا کرو اسے۔“ وہ خاموش ہو جاتی لیکن اس کا دل اندر ہی اندر سہا رہتا۔

”یا اللہ میری بچی کو بھٹکنے سے بچانا۔ ہر لڑکی کو استانی جی نہیں ملتیں۔ ہر لڑکی عاشی جیسی خوش قسمت بھی نہیں ہوتی..... اگر کبھی مہر.....“ اور اس سوچ کے ساتھ ہی اس کا دل ڈوبنے لگتا..... اس کی آنکھیں ہر وقت مہر کی نگران رہتیں۔ وہ کیسے چلتی ہے۔ کیسے باتیں کرتی ہے، کہیں اس کے اندر کوئی تبدیلی تو نہیں آگئی۔

”اماں ہر وقت پتا نہیں میرے چہرے میں کیا کھوجتی رہتی ہیں۔“ کبھی مہر پوچھتی۔

”کچھ نہیں بس یونہی تمہیں دیکھتی ہوں۔“ وہ کیا کہتی کہ وہ کیا سوچتی ہے۔

”تمہاری اماں کو تم سے بہت محبت ہے؟“ عزیز کہتا۔

”وہ تو ہے۔“ مہر اس کے گلے میں بائیں ڈال کر کہتی۔ جب عزیز نے اسے کالج داخل کروایا تھا تو اس نے بہت رولا ڈالا تھا۔

”نہ کیا ضرورت ہے اتنا پڑھنے کی.....“ کرنی ہیں بہت ہے۔ اب گھر بیٹھ کر سلائی کڑھا بیٹھو۔“

”آج کل کے دور میں دس جماعتیں کچھ نہیں ہیں عاشی۔ آنے والے وقت کا کچھ پتا ہوتا، لڑکیوں کو پڑھا لکھا ہونا چاہیے“ عزیز نے با استانی جی والی بات کہی تھی۔

”ہتا ہے، اب اماں نہیں چاہتیں کہ میں ان سے زیادہ پڑھ جاؤں۔“

”بکومت۔“ اس نے پاؤں سے جوتا نکالا اور وہ ماں کا نشانہ خطا ہونے پر کھلکھلا کر ہنستی ہوئی عزیز کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

”آپ کی بات صحیح ہے عزیز لیکن زمانہ بہن خراب ہے اور لڑکیاں تو کالج کی طرح ہوتی ہیں۔ ذرا سی انٹیس سے کرچی کرچی ہو جاتی ہیں۔“

”زمانہ کبھی بھی خراب نہیں ہوتا عاشی لوگ خراب ہوتے ہیں۔ تربیت اور تعلیم کی کمی ہوتی ہے۔ اور ہماری مہر کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہیں ہے، وہ اپنا اچھا برا پہچانتی ہے۔“ لیکن اس کے دل کی تسلی تب ہوئی تھی جب عزیز نے اسے کالج چھوڑنے اور پھر لانے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ لیکن سال ہونے کو تھا کہ عزیز باہر چلا گیا۔ گورنمنٹ کی نوکری اس نے چھوڑ دی تھی۔ رشوت نہ لینے کی بنا پر کچھ لوگ وہاں اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ اب جب تک وہ کالج سے آئے جاتی اس کا دل دہلا رہتا اور لبوں سے دعائیں نکلتی رہتیں۔ جانے سے پہلے عزیز نے ویکین لگوا دی تھی۔

”دو سال کی بات ہے عاشی پھر واپس آ جاؤں گا، تم گھبرانا مت۔ اتنا پیسہ ہو جائے گا کہ کوئی کاروبار کر سکو۔“ وہ عزیز کے باہر جانے کے خلاف تھی لیکن یہاں بھی کوئی کام نہیں مل رہا تھا۔ عزیز چلا گیا تھا اور جانے سے پہلے اوپر والا حصہ کرائے پر دے گیا تھا۔

”بہت شریف لوگ ہیں راجا صاحب، مراہٹ بھی رہے گی اور مجھے فکر نہیں ہوگی کہ تم اور وہ اکیلی ہو۔“ ایک لمحے کو تو اس کا دل کانپ سا گیا۔ اسے اپنی چھت کا کرایہ یاد آ گیا تھا جہاں نذر حسین کر ٹھہرا تھا۔

”ہماری بیٹی جوان ہے اس طرح غیر.....“ ”تم اتنا ڈرتی کیوں ہو عاشی؟ وہاں گاؤں میں کیا کیا ہوا تھا؟“ اور وہ پوری جان سے لرز گئی تھی۔ عزیز نے شک نہیں کیا تھا لیکن آج پہلی بار وہ عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”وہاں تو کچھ نہیں ہوا تھا۔“ اس نے تھوک نکالا۔ ”وہ استانی جی کہتی تھیں نا کہ گھر میں جوان لڑکی مگے ہوتے.....“ اور عزیز بے اختیار ہنس دیا تھا۔

”ایک تو یہ خالہ جی نے بھی نہ جانے کیا کیا کہہ کر تمہارے اندر ڈر اور دوسو سے ڈال دیے ہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر انہیں اوپر کا پورشن دیا ہے، راجا صاحب کا کوئی جوان بیٹا نہیں ہے۔ بس ایک بیٹی ہے اور ہم نے برسوں ایک ہی آفس میں اکٹھا کام کیا ہے۔“ وہ تب کہیں جا کر مطمئن ہوئی تھی اور اس ایک مال میں راجا صاحب اور ان کی بیگم کی وجہ سے اسے بہت سہارا رہا تھا۔ باہر کے زیادہ تر کام بیل جمع کروانا چیک کیش کروانا وغیرہ وہی کرتے تھے۔ لیکن آج..... اب انہوں نے پھر مہرین کی طرف دیکھا جو ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ کاجل اور مسکارا آنسوؤں کے ساتھ رخساروں پر لکیریں چھوڑ گیا تھا۔ اب کے جو اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے تو کاجل نے مزید پھیل کر رخساروں پر نقش بنا دیے۔

”تو کیوں رو رہی ہے؟“ انہوں نے قدرے حیرت سے پوچھا اور دل میں کہا۔

”رونا تو مجھے چاہیے، اتنی نگرانی کی، اتنا دھیان

رکھا پھر بھی.....“

”آپ جو اتنی دیر سے بت بنی بیٹھی ہیں، میں کبھی سکتہ ہو گیا ہے۔“

”مہر..... یہ..... یہ تو نے..... بتا اوپر کون تھا؟“

”اد پر وحیدہ آپا تھیں اور کس نے ہونا تھا؟“ مہرین نے حیرت بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ آئی کے اسکول میں آج کوئی میٹنگ ہے وہ دیر سے آئیں گی اور انکل ابھی دفتر سے آئے ہی نہیں۔

”پھر.....“ ان کی نظریں اس کا جائزہ لے رہی

پیارے ابو جی

اسلام آباد کا حسین شہر

اداس ہے

گلیاں چپ چاپ ہیں

درخت ساکت، باغ خاموش

یہ سب ایسا ہی ہے یا مجھے لگ رہا ہے؟

وہ مہربان چہرہ

شفیق ہاتھ

روشن آنکھیں

اب کبھی نہ دیکھ پاؤں گی

کہ پیارے ابو جی نے

اس شہر کو اپنی آخری آرام گاہ بنا لیا

اے میرے میکے

میرے اسلام آباد

تو سدا آباد رہے

شاعرہ، طلعت جبین نیاز، کراچی

رکھا پھر بھی.....“

”آپ جو اتنی دیر سے بت بنی بیٹھی ہیں، میں کبھی سکتہ ہو گیا ہے۔“

”مہر..... یہ..... یہ تو نے..... بتا اوپر کون تھا؟“

”اد پر وحیدہ آپا تھیں اور کس نے ہونا تھا؟“ مہرین نے حیرت بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

آئی کے اسکول میں آج کوئی میٹنگ ہے وہ دیر سے آئیں گی اور انکل ابھی دفتر سے آئے ہی نہیں۔

”پھر.....“ ان کی نظریں اس کا جائزہ لے رہی

تھیں۔ وہ ان کے اس طرح دیکھنے سے جزبہ ہوئی جا رہی تھی۔

”اوپر کوئی نہیں تھا۔“ وہ بڑبڑائیں۔

”اگر کوئی اوپر جاتا تو یہاں سے گزر کر ہی جاتا، ابھی بن کر تو نہیں جاتا تھا اس نے۔“

”اوپر کوئی نہیں تھا۔“ انہوں نے پھر زپر لب کہا تھا۔ اب کے مہرین فاطمہ چونکی۔

”اماں کیا آپ وحیدہ آپا پر شک کر رہی ہیں۔“

”نہیں تو۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ

بتا تو نے یہ سب کیوں تھوپ رکھا ہے؟“

مہرین فاطمہ کو ان کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

”یہ میک اپ.....“ اس نے سوالیہ نظروں سے

اماں کو دیکھا۔ ”یہ تو وحیدہ آپا نے کیا ہے۔ اس لیے تو

وہ بلا رہی تھیں۔ آج انہوں نے پارٹی میک اپ کرنا

سیکھا تھا اپنی پارلروالی سہیلی سے اور مجھ بے چاری پر اپنا

ہنر آزمایا کر دیکھا ہے کہ وہ پارٹی میک اپ میں کس حد

تک کامیاب ہیں۔ ویسے اماں لگتا ہے اب مجھے اکثر

ہی تختہ مشق بننا ہوگا اور میں آپ سے یہی تو پوچھنے آئی

تھی کہ کیسی لگ رہی ہوں؟ لیکن لگتا ہے وحیدہ آپا نے

میک اپ صحیح نہیں کیا۔“

”استانی جی کہتی تھیں عورت تب ہی بھتی سنورتی

ہے جب اس کی زندگی میں کوئی مرد آ جاتا ہے۔“

”کیا اماں..... کیا کہا؟“ ان کی آواز اتنی

آہستہ تھی کہ مہرین سمجھ نہ سکی۔

”اور میری بھی مت ماری مٹی ہے۔ آج کل کی

لڑکیاں تو ہر وقت ہی سچی سنورتی رہتی ہیں۔ ہائے

استانی جی آپ کیوں چلی گئیں۔ مجھے اب کیسے پتا چلے

گا اگر کبھی مہرہ کے قدم بہکے تو۔“

”اماں..... اماں یہ آپ خود ہی خود سے کیا

باتیں کر رہی ہیں۔“ مہرین نے ان کے سامنے ہاتھ

ہلائے تو انہوں نے غصے سے اسے دیکھا۔

”جا..... جا کر آئینہ دیکھ اور چل منہ سے

کالک اتار۔ کوئی شکل“ (بری صورت)

”ہائے، وحیدہ آپا تو کہہ رہی تھیں میں شہزاد

لگ رہی ہوں۔“

”بک بک نہ کر۔ چل اٹھ۔“ مہرین اماں

اپنی جون میں واپس آتا دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”بس عزیز آ جائیں تو میں فوراً ہی اس کی شاد

کردوں گی۔ نہیں کروانا مجھے ایم۔ اے، بی۔ ا۔

ہاں۔“ وہ پھر بڑبڑائیں۔ مہرین فاطمہ کی سمجھ

خاک نہیں آیا تھا لیکن کچھ فاصلے پر کھڑے کھڑے ا

نے شریر نظروں سے اماں کو دیکھا۔

”میں جا رہی ہوں ابا کو فون کرنے کہ فوراً

آ جائیں، اماں آپ کی جدائی میں پاگل ہو گئی ہیں۔

آپ ہی آپ باتیں کیے جاتی ہیں۔“ اماں نے پار

پڑا جوتا اٹھا کر اس کی طرف پھینکا جو ٹھیک نشانے پر لگا۔

”ہائے اماں۔“ اس نے بازو سہلایا۔ ”آپ کا

نشانہ۔“ ایک پاؤں پر ناپتے ہوئے وہ مشورہ دینے

سے نہیں چونکی تھی۔

”گنتی بار کہا ہے کوئی گن کلب جوائن کر لیں۔“

اماں نے پاؤں سے دوسرا جوتا نکالا تھا اور اس نے

جھکائی دے کر اس متوقع حملے سے بچنے کی کوشش کی تھی

لیکن جوتا ٹھیک دائیں ٹانگ پر آ کر لگا تھا۔ اب وہ

بازو چھوڑ کر ٹانگ سہلانے لگی تھی اور ساتھ ہی ساتھ

چلا رہی تھی۔

”اللہ اتنی ظالم ماں کسی کی نہ ہوگی۔ کیا غضب کا

نشانہ ہے میری ماں کا۔“ مہرین فاطمہ کبھی بازو سہلاتی اور

کبھی ٹانگ، ان کے لبوں پر تڑپ سی مسکراہٹ نمودار

ہوئی۔ انہوں نے مہرین فاطمہ کی طرف دیکھا تو ان کی

آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرے پر گہری طمانیت تھی۔

بوتیک سے ایک نہایت دیدہ زیب اور نفیس
اماں اور اس کے ساتھ میچنگ accessories
ہٹ کر اردہ باہر نکلیں تو کن کن پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ ایک
لمحے کے لیے ساکت رہ گئیں۔ مطلع آج صبح سے ہی ابر

آلود تھا اور بارش کسی بھی وقت متوقع تھی مگر انہیں نہ
جانے کیوں حیرت سی ہوئی حالانکہ انہیں بارش بے حد
پسند تھی۔ برستی بارش میں لانگ ڈرائیو پر جانا اور اس
دوران مہدی حسن، فریدہ خانم، غلام علی اور اقبال بانو

زندگی پھر گنگنائے

ریاضی سید



کی غزلیں سننا ان کا مرغوب ترین مشغلہ تھا اور یہ ناممکن سی بات تھی کہ بارش ہو اور وہ گھر میں ٹک کر بیٹھ جائیں۔ یہ الگ بات کہ کراچی جیسے شہر میں رہتے ہوئے اس تفریح کا موقع کم کم ملتا تھا لیکن آج کی بارش نے انہیں مسحور نہیں کیا تھا بلکہ اس بے کلی کو اور بڑھادیا تھا جس کی وہ کل رات سے شکار تھیں۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے گاڑی میں آکر بیٹھیں اور ڈرائیور سے قریب ہی واقع اس بیوٹی سیلون چلنے کا کہا جہاں سے اپائنٹمنٹ انہوں نے پہلے ہی لے لی تھی اور جس کی مالک ان کی قریبی سہیلی تھی۔ چند لمحوں میں وہ اس بیوٹی سیلون کے سامنے تھیں۔ کن من کرتی خوب صورت پھوار کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سیلون کے اندر چلی گئیں۔

اپنے چہرے کی کلیننگ کرواتے ہوئے، مٹی کیور اور پیڈی کیور کرواتے ہوئے ان کے کانوں میں مسز خان کے کچھ گھنٹوں پہلے کہے جملے مسلسل گونجتے رہے تھے۔

”مسز انصاری! میں سیدھی اور کھری بات کرتی ہوں، عورت کی کیا وقعت اور حیثیت ہے اس کا فیصلہ اسے خود کرنا چاہیے، اپنی زندگی کی ڈوریاں دوسروں کے ہاتھ میں نہیں تھما دینی چاہئیں۔ اب آپ مجھے ہی دیکھ لیں، میں اپنی زندگی میں کتنی خود مختار ہوں، رشتوں کو رشتے ہی رہنے دیا ہے میں نے، بیروں کی بیڑیاں نہیں بنایا میں نے اور سچ کہوں تو یہ جو رشتے ہوتے ہیں نا عورت کی ذات سے وابستہ، یہ ساری زندگی عورت کو کسی door mat کی طرح استعمال کرتے ہیں اور بیکار ہو جانے پر دوسرے کاٹھ کباڑ کی طرح ڈال دیتے ہیں۔ بس اتنا فرق ہوتا ہے کہ کاٹھ کباڑ اسٹور روم میں ہوتا ہے اور عورت ڈرائنگ روم میں..... میری مثال آپ کے سامنے ہے، میں نے خود کو ارزاں نہیں ہونے دیا۔“

مسز خان ان کی چند عزیز ترین سہیلیوں میں سے تھیں، بلا کی خوش گفتار اور جامہ زیب، نقیس سی خان گیٹ ٹو گیدرز، کئی پارٹیز اور ہائے ٹیز کی جاہ کھلاتی تھیں۔ خواتین کے مخصوص کلیمز اور این جی ۱۱ کی اہم ترین ممبر تھیں۔ خوش اخلاق اور ہنسنے ہنسانے والی مسز خان میں ایک ہی خامی تھی۔ ان کی گفتار ہمیشہ ”میں“ سے شروع ہو کر ”میں نے“ سے ہوتی ہو کر ”مجھ پر“ پر ختم ہوتی تھی۔ ان کی باتیں اچھے اچھوں کا دماغ ٹھکانے پر لے آتی تھیں، کسی کی معمولی سی پریشانی من کر وہ اس اندوہ ناک انداز میں بیان کرتی تھیں کہ اگلا بندہ نہ چاہتے ہوئے بھی پُر کو پرندہ مان لیتا تھا۔ وہ ایک مکمل exaggerating queen تھیں۔ ان سے مل کر ہمیشہ وہ عجیب طرح کے کمپلیکس میں مبتلا ہو جاتی تھیں لیکن آج ان کی باتوں نے انہیں کم مائیگی کا احساس شدت سے دلایا تھا۔ جو کسک کل رات سے انہیں ستا رہی تھی اس میں گونا گوں اضافہ ہو گیا تھا۔

”میں اب کسی کام کی نہیں رہی..... کسی کو میری ضرورت نہیں رہی۔“ جس خیال نے کل رات سے ان کے دل میں ڈیرے ڈال رکھے تھے وہ مزید پختہ ہو گیا تھا۔ بے چینی اور بیزاری حد سے سواتھی۔ وہ انہی تمام خیالوں اور باتوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے مسز خان کے پاس گئی تھیں اور انہوں نے مسز خان سے اپنی سوچوں اور احساسات کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی تھی مگر مسز خان واقعی ناڑنے والی قیامت کی نظر رکھتی تھیں۔ لمحے میں ان کا چہرہ پڑھ گئی تھیں اور اس کے بعد وہ تھیں اور ان کی زبان کے جوہر..... جو اگر امریکا اور اس کے حواری سن لیتے تو ڈرون طیاروں سے تائب ہو کر ان کی خدمات حاصل کر لیتے..... وہ مسلسل ان کے تاریک مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہوئے نادر دنیا ب مشورے بھی دیتی

رہی تھیں۔ ساتھ ہی خود کو رول ماڈل کے طور پر بھی پیش کیا تھا۔ ان کی باتیں من کر وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے لٹچ کرتے ہی ان کے گھر سے باقاعدہ بھاگی تھیں۔

ڈپریشن نے انہیں بے حال کر رکھا تھا جس کو زائل کرنے کا ایک ہی حل تھا۔ ”شاپنگ تھراپی“ لہذا اگلے ڈھائی گھنٹے انہوں نے مال میں گزارے تھے۔ انہوں نے گھر والوں کے لیے کپڑے، پرفیومز، ہینڈ بیگز، ٹائی پنز، کف لٹکس کے علاوہ کڈز ہوم کے بچوں کے لیے کتابیں، کھلونے اور کپڑے بھی خریدے تھے اور یہ ساری خریداری انہوں نے بنا سوچے سمجھے کی تھی مگر ان کا ڈپریشن کم نہیں ہوا تھا۔

ان کا خیال تھا کہ بیوٹی سیلون میں خواتین کے ساتھ گوسپ کر کے شاید ان کا دھیان بٹ جائے مگر اگلے تین گھنٹے اور ہزاروں روپے اپنے بیوٹی ٹرینمنٹ اور میئر اسٹائل کی تبدیلی پر خرچ کر کے جب وہ بیوٹی سیلون سے باہر آئیں تو بظاہر بے حد فریش اور یٹک نظر آرہی تھیں مگر اندرونی طور پر ان کے خلفشار اور انتشار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ پھوار تیز موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو چکی تھی مگر وہ حد سے زیادہ انہیں بری لگ رہی تھی اور اس پر وہ بے حد حیران تھیں۔

ہینڈ بیگ سے سیل فون نکال کر انہوں نے ڈرائیور کو کال ملائی اور اسے بیوٹی سیلون کے گیٹ کے سامنے گاڑی لانے کا کہہ کر کال منقطع کر دی۔ گاڑی میں بیٹھ کر چند لمحوں کے لیے وہ سوچ میں پڑ گئیں کہ اب کہاں جائیں گھر وہ کسی قیمت پر جانا نہیں چاہتی تھیں..... وہاں تھا بھی کیا..... تنہائی..... اداسی..... منفی سوچیں..... آوازیں..... پرچھائیاں..... اور باہر..... انہوں نے کھڑکی سے باہر دیکھا..... برستی بارش میں لوگوں میں محسوس کی جانے والی گہما گہمی اور جوش و خروش تھا..... باہر بھی انہیں کچھ اچھا نہیں

لگ رہا تھا..... شور سے انہیں وحشت ہو رہی تھی اور لوگوں کے ہنسنے مسکراتے چہرے انہیں کوفت میں ڈال رہے تھے۔ ایسا زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا..... ایک ننھی سی خواہش ان کے دل میں پیدا ہوئی تھی اور اس کا بدترین انجام ان کے سامنے تھا۔

کڈز ہوم چلو۔“ انہوں نے یکدم ڈرائیور سے کہا اور بیک سیٹ سے ٹیک لگائی۔ راستے میں انہوں نے ایک بڑے اسٹور سے کیک، بسکٹس، چاکلیٹ، کھلونے اور کپڑے وغیرہ بھی پیک کر واپس لے لیے تھے۔

کڈز ہوم پہنچ کر انہوں نے کچھ لمحے وہاں کی انتظامیہ کے ساتھ گزارے جو انہیں وہاں بے وقت دیکھ کر کچھ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ کبھی اطلاع کیے بغیر وہاں نہیں آتی تھیں۔ وہ اس کڈز ہوم کی منتقلی ڈونیٹر ہونے کے ساتھ رضا کارانہ طور پر وہاں کے ذہنی اور جسمانی معذور اور یتیم و بے آسرا بچوں کو پڑھاتی بھی تھیں اور ان کے علاج معالجے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرتی تھیں۔

کڈز ہوم میں چار ساڑھے چار گھنٹے گزار کر جب وہ باہر آئیں تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ بارش رک چکی تھی، آسمان بالکل صاف مگر بوجھل اور تاریک تھا۔ فضا میں بھی ایک عجیب سی خاموشی کا راج تھا اور حیرت انگیز طور پر ان کے اندر کی خلش بالکل ختم ہو چکی تھی اور وہ بے حد اچھا محسوس کر رہی تھیں۔

”آج میں نے اپنی زندگی کی ایک بہترین شام گزاری ہے۔“ انہوں نے گاڑی میں بیٹھ کر مسکراتے ہوئے سوچا۔ انہیں کل رات سے اپنے وجود پر چھائی بے سکونی اور کلفت یاد نہیں تھی۔ انہیں جس طرح کی سوچیں گھیرے ہوئے تھیں ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ جس سناٹے اور تنہائی سے خوفزدہ ہو کر وہ لٹچ سے قفل.... گھر سے نکلی تھیں اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

انہیں یہ بھی بھولا ہوا تھا کہ آج ان کی زندگی کا ایک خاص دن ہے۔ انہیں یاد تھا تو بس یہ کہ کچھ گھنٹے انہوں نے کڈز ہوم میں بہت انجوائے کیا تھا۔

کڈز ہوم میں انہوں نے ان بچوں کے ساتھ مختلف طرح کے گیمز کھیلے تھے، ان کے ساتھ بالکل بچہ بن کر شرارتیں کی تھیں، شور مچایا تھا، ان کی معصومانہ باتیں سن کر کھلکھلا کر ہنسی تھیں، ان کی مسحور کر دینے والی مسکراہٹوں نے ان کے اندر کی کڑواہٹ کو ختم کر دیا تھا۔ ان بچوں کے چہروں پر ان کتابوں، کھلونوں اور کپڑوں کو دیکھ کر جو خوشی اور احسان مندی آئی تھی اس نے انہیں سرشار کر دیا تھا۔ ان بچوں کے جو پاس تھا اور جوتل رہا تھا خوش کرنے کے لیے کافی تھا۔ جو کچھ ان کے پاس نہیں تھا، ان سے چھین لیا گیا تھا، ان کا انہیں رتی بھر ملال نہیں تھا یا شاید انہیں ابھی شکوہ کرنا نہیں آتا تھا اور وہ خود..... کل سے ان کی زبان اور دماغ میں شکوے، شکایت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ان کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں اور جب انہوں نے ان بچوں کے ساتھ مل کر کیک کاٹا تھا..... کیسی راحت محسوس ہوئی تھی انہیں۔

”پہلے والدین، پھر شوہر اور بچے، پھر بچوں کے بچے، ان سب کی زندگیاں بنانے کے لیے عورت اپنی جان مارتی ہے، اپنی فیلنگو، خواہشات کا گلا گھونٹی ہے اور آخر میں اس کے ہاتھ کیا آتا ہے..... کچھ بھی نہیں..... صرف یہ احساس کہ اسے for granted لیا جاتا ہے۔ اسے اندر ہی اندر ختم کرتا رہتا ہے..... اب مجھے ہی دیکھیں..... مجھے اب کسی کی فکر نہیں، شوہر کہاں ہے، بچے کہاں ہیں، پوتے پوتیاں کہاں ہیں؟ میں کسی کے انتظار میں بیٹھ کر اپنی زندگی ضائع نہیں کرتی، کب وہ میرے پاس آکر بیٹھیں، مجھے وقت دیں، میں ان باتوں پر نہیں کڑھتی، میں نے اپنی زندگی الگ کر لی ہے اور بے حد مطمئن

اور خوش ہوں۔“ مسز خان کی آواز نے ایک بار پھر ان کا پیچھا کیا تھا جسے جھٹکتے ہوئے انہوں نے ہینڈ بیگ سے سیل فون نکال کر دیکھا..... انہیں شاک سا لگا تھا۔ وہ دوپہر سے گھر میں نہیں تھیں اور اتنے گھنٹوں میں کسی کو بھی ان کا خیال نہیں آیا تھا جبکہ وہ..... وہ تو ہر دوسرے گھنٹے بعد اپنے گھر کے ہر فرد کو یہاں تک کہ ملازمین کو بھی کال کر کے خبر گیری کرتی تھیں..... اچھا لگتا ہے ناں یہ جان کر کہ گھر میں کوئی ہے جسے آپ کی فکر ہے، جو آپ کا انتظار کر رہا ہے، یہ معمولی سا gesture ایک انمول خوشی دیتا ہے..... انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سیل واپس رکھ لیا..... وہ کوئی منفی بات نہیں سوچنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

مسز شمع انصاری ساٹھ برس کی نہایت ایکٹو اور ہر آن متحرک رہنے والی خاتون تھیں، یہی وجہ تھی کہ موسمی بیماریوں کے علاوہ وہ کسی سنجیدہ نوعیت کے عارضے میں مبتلا نہیں تھیں۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر آرام کرتے ہوئے زندگی گزارنے کے سخت خلاف تھیں حالانکہ ان کے بچے انہیں اکثر و بیشتر آرام کرنے اور اپنی صحت کا خیال رکھنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ وہ پڑھی لکھی تھیں، انہوں نے اس دور میں گریجویشن کیا تھا جب لڑکیوں کی تعلیم صرف قرآن پاک تک ہی محدود تھی بلکہ بعض علاقوں میں اس پاک علم کے لیے بھی لڑکیوں کو کسی قابل نہیں گردانا جاتا تھا۔ ان کی والدہ بھی علی گڑھ سے فارغ التحصیل تھیں اور پاکستان کے قیام کے بعد انہوں نے نیگم رعنا لیاقت علی کے ساتھ خواتین اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے شانہ بہ شانہ کام کیا تھا۔ ان کی یہی خصوصیات اکلوتی بیٹی میں بھی آئی تھیں۔

شادی کے بعد انہوں نے اپنے شوہر کی اجازت اور ساس کی رضامندی کے ساتھ اپنی والدہ

کے مشن کو جاری رکھا تھا۔ ان کے دو ہی بچے تھے۔ بیٹی ارہہ جو زولوچی میں ماسٹر تھی اور شادی کے بعد ایٹینس میں سیٹلڈ تھی اور وہاں کسی ریسرچ سینٹر سے منسلک تھی۔ اس کے تین بیٹے تھے اور تینوں شادی شدہ تھے جبکہ ان کا بیٹا فرحان انصاری کرمیل لائبریریاں اور شہر کی جانی مانی شخصیت تھا۔ اس کی بیوی بھی وکیل تھی اور وہ دونوں ان دنوں چھٹیاں گزارنے شمالی علاقہ جات گئے ہوئے تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا ارسل جو آئی ٹی انجینئر تھا اور ایک بڑی کمپنی میں اہم عہدے پر فائز تھا جبکہ اس کی بیوی ہما مقامی کالج میں پچھرا تھی۔ ان کی زندگی ہر لحاظ سے مکمل تھی، اپنی زندگی میں انہوں نے سب ہی کچھ دیکھ لیا تھا۔ وہ سب کچھ جس کی آرزو ہر انسان کرتا ہے، ربّ العزت نے انہیں ہر نعمت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ کہیں کوئی خلش، کوئی غلا نہیں تھا۔ لیکن کچھ عرصے سے نہ جانے کیوں انہیں لگنے لگا تھا کہ ان کے بیٹے، بہو اور پوتے پوتیوں کے پاس ان کے لیے نام نہیں ہے، وہ انہیں نظر انداز کر رہے ہیں، حقیقت میں ایسا کچھ نہیں تھا، وہ سب اپنی زندگیوں میں پہلے جیسے ہی مصروف تھے۔ ان کی روٹین میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بعض دفعہ وہ اس خیال کو جھٹک دیتی تھیں مگر بعض دفعہ ناکام رہتی تھیں۔

کل رات کھانے کی ٹیبل پر کھانے کے دوران ہانے کوئی بات کہی تھی اور انہیں جیسے یاد آ گیا تھا کہ کل ان کی سالگرہ ہے اور وہ توقع کرنے لگی تھیں کہ وہ دونوں کچھ دیر بعد انہیں وٹس کریں گے مگر خلاف توقع وہ دونوں ”تھکن بہت ہو رہی ہے“ کہتے ہوئے جلدی سونے چلے گئے تھے۔ انہوں نے چاہا تو تھا کہ انہیں بتادیں لیکن پھر رک گئیں۔

وہ ٹی وی لاونچ میں جا کر ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئیں اور براہوا کہ ایک ٹی وی چینل پر کسی پروگرام میں

جلتے خواب

گزاریں کس طرح اب
جدا یوں کا موسم
کہ یہ موسم تو
میرے اندر تک اتر گیا ہے
کہیں چھپتے ہیں
بچے لمحوں کے کانٹے
تو کہیں
تیری معطر سانسوں کے
گلاب کھلتے ہیں
دل میں آج بھی
تیری یادوں کے پھول کھلتے ہیں
یہ اب کون سمجھے
تو دل تو اجڑ گیا ہے
شب بھر میرے ساتھ میرے
خواب جلتے ہیں

شاعرہ..... فصیحہ آصف خان، ملتان

چند بوڑھی خواتین مدعو تھیں اور وہ اسی چینل کو دیکھ رہی تھیں۔ ان عمر رسیدہ خواتین کو ان کی اولادوں نے اولڈ ہومز میں داخل کر دیا تھا اور وہ بے چاریاں حسرت و یاس کی تصویر... بنی اپنی اولادوں کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو لیے بیٹھی تھیں۔ ان کی حالت حقیقتاً قابل رحم تھی جسے دیکھ کر وہ بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکی تھیں۔ انہیں ان بد نصیب اولادوں پر تاد بھی آ رہا تھا۔ مکمل پروگرام دیکھے پتا وہ ٹی وی بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ رہ رہ کر انہیں ان مظلوم خواتین کا خیال آ رہا تھا۔ محض ایک لمحے کے لیے انہوں نے خود کو ان عورتوں کی جگہ رکھا..... ان کا دل

بند ہونے لگا تھا۔ انہوں نے شکر ادا کیا کہ ان کی اولادیں ایسی بے حس اور خال نہیں مگر شاید وہ تادیر اپنے اس خیال پر قائم نہیں رہ سکیں۔

لیپ ٹاپ کھول کر وہ آن لائن ہو گئیں، ارسہ اور اس کی فیملی سے وہ اکثر آن لائن ہی بات چیت کرتی تھیں لیکن پورے ڈیڑھ گھنٹے انتظار کرنے پر بھی وہ آن لائن نہیں ہوئی۔ انہیں حیرت سے زیادہ تشویش ہوئی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ارسہ کو یاد نہیں رہا۔ بیٹیاں تو اس طرح کے معاملوں میں زیادہ حساس ہوتی ہیں، ایک لمحے کے لیے دل میں آیا بھی کہ اسے کال کر لیں لیکن پھر انہوں نے ارادہ بدل دیا۔ مگر انہیں تشویش سے زیادہ صدمہ بیٹے پر ہوا تھا جو اس عمر میں اپنی مومن پر گیا ہوا تھا اور ماں اسے یاد نہیں تھی۔ انہیں غصہ آنے لگا تھا، جبکہ ان کا موبائل وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔

وہ پوری رات جاگتی رہی تھیں اس امید پر کہ ان کی اولادیں انہیں ایک ٹیکسٹ میسج، ایک کال کر لیں مگر یہ انتظار لا حاصل ہی رہا۔ صبح تک وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھیں کہ ان کی وہ اولادیں جن کی ایک ایک معمولی اور غیر معمولی بات انہیں تاریخوں اور دنوں کے ساتھ آج تک یاد ہے، ان کے نزدیک ماں کی زندگی کے کسی دن کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ کون سا اپنی سالگرہ پر جشن کا اہتمام کرتی تھیں، بس ایک چھوٹی سی خواہش پیدا ہوئی تھی دل میں کہ ان کے بچے اپنی معروف زندگیوں کے 365 دنوں میں سے ایک دن کے چند لمحے ان کے لیے وقف کر دیں۔ اتنا تو وہ حق رکھتی تھیں۔

صبح وہ ناشتے کی ٹیبل پر بے حد خاموش اور لمول سی بیٹھی تھیں۔ ارسل اور ہما دونوں نے ہی نہ ان کی خاموشی کو محسوس کیا تھا اور نہ ہی ان کے اترے ہوئے چہرے پر غور کیا تھا۔ وہ دونوں جلد بازی کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑتے ہوئے ناشتا کر کے اپنے کام

دھندوں پر نکل گئے تھے اور وہ ناشتا چھوڑ کر روتے ہوئے اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔

دو پہر تک وہ کڑھتی رہی تھیں، رات ٹی وی پر وہ عورتیں اس وقت انہیں خود سے بہتر لگ رہی تھیں۔ جو نہ ہوں ان پر انسان روپیٹ کر صبر کر رہی لیتا ہے مگر جو سامنے ہوں، ساتھ ہوں اور وہ آپ کو نہ دیکھیں تو یہ نظر اندازی مارتی نہیں ہے، زندہ درگور کر دیتی ہے۔ ان کا دل کہیں بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا اور پھر وہ بچ سے پہلے مسز خان کے گھر پہنچ گئی تھیں۔ ان خواتین کی حالت اور پھر مسز خان کے جیلے وہ اپنا سارا حوصلہ ہار بیٹھی تھیں۔ وہ بے حد مضبوط اعصاب کی خاتون تھیں، کبھی کسی کی بات سے اتنا متاثر نہیں ہوتی تھیں کہ اپنی زندگی کے اصول و ضوابط بدل ڈالیں مگر اس بار وہ مضبوط نہیں رہ سکی تھیں۔ وہ حد درجہ اپنے بچوں سے شاکی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی اپنی سالگرہ کا دن وہ اس طرح رو دھو کر گزاریں گی۔ انہیں اپنے والدین اور شوہر بری طرح یاد آئے۔ مگر وہ شکر گزار تھیں، ان کے بچوں کی جن کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ شاید اسی لیے وہ تنہائی ”بانٹنے“ کے فن سے آشنا تھے۔ کیسی مسیحا کی تھی ان بچوں نے..... ان بچوں کے بارے میں وہ ہمیشہ ہمدردی سے، دکھ سے، تکلیف سے سوچا کرتی تھیں مگر آج انہوں نے دکھوں کی گہرائی کو محسوس کیا تھا۔

”کوئی بات نہیں! آج کے بعد میں اپنی زندگی کا ہر اہم دن ان بچوں کے ساتھ مناؤں گی۔“ اپنے گھر کے پورچ میں گاڑی سے اترتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کیا تھا اور شاپنگ بیگز لے کر وہ اندر بڑھ گئی تھیں۔

لاؤنج میں آکر انہوں نے شاپنگ بیگز ٹیبل پر رکھے اور صوفے پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلائیں، سنا

انہیں گھر میں پھیلے دبیز اور معنی خیز سناٹے کا احساس ہوا، وہ سیدھی ہو بیٹھیں اور اطراف میں نظریں دوڑانے لگیں۔

”ہوں گے معروف سب کہیں نہ کہیں اپنی...“ درستیوں میں، گھر کو تو سرائے سمجھ لیا ہے، یہ تک خیال نہیں کہ گھر میں ایک بڑھیا بیٹھی ہے۔ ”سوچتے ہوئے وہ گڑ بڑائیں، انہیں خود کو بڑھیا سوچنے پر سخت تاؤ آیا تھا۔ حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ اس بات کی قائل تھیں کہ عورت ستر برس کی عمر میں بھی کم عمر ہی رہتی ہے۔

”رضیہ..... شہاب کہاں ہو بھی؟“ انہوں نے کل وقتی ملازم اور اس کی بیوی کو آواز دی مگر جواب نہ ارد..... ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ اٹھ گئیں اور شاپنگ بیگز وہیں چھوڑ کر ہینڈ بیگ لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ دروازہ کھول کر جو بھی انہوں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا ان کے منہ سے حیرت..... بھری چیخ نما آواز نکلی۔

”پپی برتھ ڈے ٹویو!“ کمرے کے دائیں جانب ٹیبل کے اطراف میں فرحان، غزل، ہما، ارسل کے ساتھ رضیہ اور شہاب بھی کھڑے تھے اور کورس میں انہیں وٹ کر رہے تھے۔ ٹیبل پر رنگ برنگے غبارے اور پھولوں کے گلدستوں کے درمیان ایک بڑا ایک رکھا تھا جس پر ان کی عمر کو مد نظر رکھ کر صرف ایک کینڈل روشن کی گئی تھی۔ فرحان اور غزل شام میں ہی کراچی آئے تھے، وہ لمحوں میں ان کی شرارت سمجھ گئی تھیں۔ بھی ان کا موبائل بجا، انہوں نے ہینڈ بیگ سے سیل فون نکال کر کال ریسیو کی، دوسری جانب ارسہ تھی۔

”پپی برتھ ڈے می! آئی ایم سوری.....“ دھماکا ہوا اور ارسل کی پلاننگ تھی کہ اس بار آپ کو سرپرائز دیں لہذا ہمیں ان کی بات ماننی پڑی، کل

زندگی بھر گنگنائے

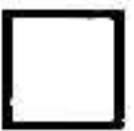
رات سے بے چین تھی آپ سے بات کرنے کے لیے..... ابھی کچھ دیر پہلے ارسل نے ٹیکسٹ کیا تھا کہ پھپھو رنڈی ہو جائیں۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”تھینک یو بیٹا! اور ان دونوں کو تو میں ابھی پوچھتی ہوں۔“ انہوں نے محبت سے ارسل اور ہما کی جانب دیکھا جن کی باچھیں مشرق سے مغرب تک چری ہوئی تھیں۔ کال منقطع کر کے وہ تیزی سے ان کی جانب بڑھیں۔

”پلیز می! ان دونوں کو کچھ نہ کہیں، ان دونوں نے ہی تو ہمیں بتایا ہے کہ دوسروں کی زندگی کے بھی کچھ دن اہم ہوتے ہیں جنہیں منا کر ہم انہیں احساس دلا سکتے ہیں کہ وہ لوگ ہمارے لیے کتنے خاص ہیں۔“ غزل نے ساس کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا دیں۔

”مانا کہ ہمارے معاشرے میں اب بزرگوں کی اہمیت اور حیثیت کم ہوتی جا رہی ہے اور ایسے بد نصیب پیدا ہونے لگے ہیں جو اپنی دنیاؤں میں مگن ہو کر اپنی جنتوں سے غافل ہونے لگے ہیں مگر اب بھی ہزاروں بچے ہیں جو رشتوں کو نبھانا اور محبتوں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔“ تالیوں کی گونج میں انہوں نے ایک کاٹتے ہوئے سوچا تھا۔

کک کٹنے کے بعد وہ ان سب کو کھانے پر ہوٹل لے گئیں، رضیہ اور شہاب بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ ملازمین کو اپنی خوشیوں میں اہم رکن سمجھتی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ خوشیاں انسان تب ہی پاتا ہے جب وہ خوشیاں بانٹتا ہے۔ ”جب کرنیاں ہی اچھی نہ ہوں تو پھل میٹھے کیسے ہوں گے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے سب کے چہرے دیکھے۔ وہاں زندگی گنگنا رہی تھی۔





مکمل ناول

پھر کوئی خواب بنو

عذرا بیگم

دوسرا اور آخری حصہ



ہوتے ہوئے کتنی تنہا اور بکھری بکھری سی تھی۔ زندگی کے اتنے رنگ اس کے آس پاس تھے، اسے اپنی جانب کھینچ رہے تھے لیکن وہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ہراساں تھی۔ کیوں؟

دور خلاؤں میں نظریں جمائے جانے وہ کس دنیا میں گم تھی۔ سیاہ چمکیلے بال پشت پر لہرا رہے تھے۔ اس کے دل میں صرف ایک سوچ چھپ کر بیٹھی تھی۔ وہ اتنی حسین دنیا میں سب کے ہوتے ہوئے سب کچھ

”لیجیے سنبھالیں کہیں برف نہ بن جائے۔“
فلک کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے رخ پھیر کر
حیرت بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ فلک
چہرے پر کسی اندرونی خوشی کا رنگ لیے کافی کنگ
اٹھائے کھڑا تھا۔

”شکریہ!“ علی نے اس کے ہاتھ سے کافی کا
مگ تمام لیا۔ ”آپ نے کیوں تکلیف کی مجھے پکار لیا
ہوتا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

فلک کو اس قدر ملائم انداز کی توقع کہاں تھی۔
حیران سا دیکھتا ذرا قافلے پر بیٹھ گیا اور بسکٹ کا پیکٹ
کھولتے ہوئے بولا۔

”پکار لیتا آپ کو اتنی جرات کہاں مس
علیہ.....“ اس کی آواز میں ہلکی سی حسرت چھپی تھی۔

”اب میں ایسی بھی ہلا کو خان کی بہن نہیں۔“
علی نے مصنوعی غصے میں بات ٹالنی چاہی تو فلک کی
بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ کافی کا گھونٹ جو منہ میں بھرا تھا
بے مشکل نگل پایا۔

”آپ ہنسے کیوں؟“ اس نے نازک ابرو
سیکڑے۔

”بس تصور میں سہیل بھائی کو ہلا کو خان کے
گیٹ اپ میں دیکھ رہا تھا۔“ اس مرتبہ وہ کھل کر ہنس
دیا۔

”بے چارے سہیل بھائی.....“ علی نے پیکٹ
میں سے بسکٹ نکالتے ہوئے کہا۔

”آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔“
”وہ تو ایک مثال دی تھی اور آپ نے پورا
کریکٹر دیکھ لیا۔“ کوشش کے باوجود علی اپنی ہنسی نہ
روک سکی۔ کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی کا پردہ
عائل رہا پھر فلک نے آہستگی سے کہا۔

”مس علیہ؟“
”آپ مجھے مس نہ کہا کریں۔“ وہ چڑ کر

238 ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

بولی۔ ”کیا آپ مجھے صرف علی نہیں کہہ سکتے؟“
”سوری علیہ، اب نہیں کہوں گا۔“ وہ فوراً مان
گیا، کیسے بتاتا کہ ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی کب
تھی اور یہ اجنبیت کیوں ہے؟

”تو آپ کیا کہہ رہے تھے؟“ اس نے
اخلاقاً پوچھا۔

فلک سے فوراً کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ جیسے
دل ہی دل میں کچھ سوچ رہا ہو، اپنی ہمتیں مجتمع کر رہا
ہو۔

”اب بولے بھی۔“ اس نے اصرار کیا۔
”دراصل آپ ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہیں۔“

جانے وہ کیسے کہہ پایا۔
”اچھا.....؟ اور ویسے.....؟“

”بالکل ہلا کو خان کی بہن۔“ اس نے شوخ
نظروں سے دیکھا۔

علیہ جل بھن کر رہ گئی۔ یہ تھا ذرا سی ڈھیل
دینے کا نتیجہ، جناب بالکل ہی پٹری سے اترنے لگے۔

پرسل ہو گئے۔ خیر اب تو مجھے سیاست سے کام لینا
ہے۔ ”لگتا ہے آج سے میرا نام ہلا کو خان رکھ دیں
گے آپ۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

”اب جانے دیجیے ہلا کو خان کو۔“ دراصل میں
نے اپنی کسی بات پر آپ کو بھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا
نا؟“ فلک بھی اس کا نرم رویہ نرم لہجہ اور نرم مسکراہٹ
دیکھ کر بغیر کسی جھجک کے بول گیا۔

”چلیے مان لیا۔ ہم دونوں ہی اچھے لگ رہے
ہیں، خوب صورت اور دوستانہ ماحول میں کافی پیٹے
ہوئے بسکٹ کھاتے ہوئے یہ سب اس سہانے موسم کا
اثر ہے۔ انسان کا دل و ماغ بلکہ روح تک سرشار
ہو جاتی ہے۔ کیوں، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا.....؟“

”جی..... جی ہاں، مگر سے نکل کر انسان اپنے
آپ کو آزاد اور فری سمجھنے لگتا ہے۔“ فلک نے فوراً ہاں

239 ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

قرار پتھی لمبی لمبی زقندیں بھر رہا تھا۔ فلک کا کچھ دیر کا
ساتھ اس کی سادہ لوح باتیں، اس کی موجودگی کا بھرپور
احساس بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔ تصور میں بار بار
اس کا چہرہ ابھر رہا تھا اور یہ چھوٹا سا معمولی سا مختصر سا
واقعہ اسے بے طرح غصہ بھی دلارہا تھا۔ گہری گہری
الکھنوں میں الجھا رہا تھا۔ اسے بے بس ہی نہیں کمزور
بھی بنا رہا تھا۔

”وہ اسی طرح بار بار ٹکراتا رہا، اپنی سیدھی
سادہ باتوں کے جال میں پھنساتا رہا تو ساری
سیاست دھری کی دھری رہ جائے گی۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ اس کا لہجہ کافی تلخی لیے ہوئے
تھا۔

”کیا ناممکن ہے علیہ جانی؟“ اچانک اندر آتی
عالیہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ لمحے بھر کو علیہ بوکھلائی
ڈمگائی پھر بات کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”میں سوچ رہی تھی ان سرسبز پہاڑوں، ان
معطر معطر قضاؤں اور حسین نظاروں کو بھلانا مشکل ہی
نہیں ناممکن ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو عالی، ہم تو خوش نصیب ہیں
کہ ان سہانے موسموں میں چند دن گزارنے کا ہمیں
موقع مل گیا ہے۔“ عالیہ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے
کہا۔ چند لمحے دونوں کے درمیان خاموشی کا آئچل
لہراتا رہا۔ پھر عالیہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”اتنے لمبے سفر نے کچھ تھکا ہی دیا ہے تمہارا سفر
کیسا رہا؟“

”بہت اچھا۔“
”اور یہاں کا ماحول اور موسم؟“

”دونوں پر فیکٹ اور سپر۔“
”اور کمپنی.....؟“ عالیہ کا لہجہ شرارتی تھا۔

”کون سی کمپنی؟“ علیہ نے حیران ہو کر عالیہ کی
آنکھوں میں دیکھا۔

238 ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

”اے ہاں ملائی۔“ آج ضرور کچھ گڑ بڑ تھی۔ علیہ اور
طراہٹیں۔ علیہ اور بے تکلفانہ گفتگو، علیہ اور لمبے
اچھ خوب صورت جملے، کچھ تو ہے، یہ خواب بھی ہو سکتا
ہے لیکن نہیں، میں صاف سن رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں
مرے ہاتھوں میں کافی کا گرمگ ہے۔ سورج بھی
ہلک رہا ہے..... پھر.....؟“

”میں ادھر ہی جا رہی ہوں آپ اپنا مگ مجھے
دے دیجیے۔“ علیہ کی آواز پر اس کی سوچوں کی رو
ت گئی۔ وہ مضطربانہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی تو ابتدا ہوئی
تھی اور ابھی بریک آگیا.....؟ وہ اندر ہی اندر کڑھ
کر رہ گیا اور جب وہ دونوں پر آمدے میں پہنچے تو عالیہ

مابی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ علیہ اور فلک یوں
ماٹھ ساتھ قریب قریب چمکتے چہرے مسکراتے لب،
ٹہ کے کھلے بالوں کی ایک لٹ فلک کے ایک شانے
کو چھو رہی تھی۔ (ہوا کی شرارت تھی) صرف ہاتھ

مکڑنے باقی تھے فلمی انداز میں۔ فلک تو فلک تھا.....
وہ تو جھک سکتا تھا لیکن علیہ تو ٹھوس اور پتھر لی زمین
تھی۔ وہ بھلا اپنی جگہ سے اٹھ سکتی تھی۔ آسمان کو چھو سکتی
تھی۔ وہ سوچتی رہ گئی۔

نرم گرم سورج دن بھر کی مسافت طے کر کے شفق
لی سنہری آغوش میں پناہ گزین ہو چکا تھا۔ ارد گرد کے
پہاڑ اور دادیاں جھلملاتی روشنیوں میں لپٹے ستاروں
بھرے آسمان سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ شاید

پہاڑی علاقوں میں شام کے سرمئی اجالے بڑھتی شب
کے اندھیروں میں جلد سو جانے کے عادی ہوتے
ہیں۔ اسی لیے دن بھر کی تھکن سے چور ماموں منصور
اور ان کی فیملی اپنے اپنے کمروں میں اپنی اپنی مجلس
جمائے ہوئے تھے۔

ایک کمرے میں علیہ بستر پر بیٹھی نرم ملائم کمر
اڑھے ایک میگزین کھولے بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہیں تو
میگزین کے صفحات سے الجھی ہوئی تھیں مگر ذہن کا بے

239 ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

”عالیہ سے فوری کوئی جواب نہیں بن پایا۔ جیسے کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو۔“

”بتائیے ناکون سی کمپنی بھابی؟“ علیہ نے اصرار کیا۔

علیہ ایک بات پوچھوں؟“

”جی فرمائیے۔“ جانے کیوں اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

”دراصل میرے دماغ میں گھنٹیاں سی بج رہی ہیں، کوشش کے باوجود کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔“ عالیہ کافی سیریس نظر آرہی تھی۔

”ایسی کیا بات ہے بھابی؟“ وہ پریشان سی ہو گئی۔

”ایسی کوئی بات نہیں چننا، دراصل..... دراصل میں تم میں جو چیخ دیکھ رہی ہوں وہ مجھے ذرا پریشان کر رہا ہے۔“ عالیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

”کیسا چیخ بھابی؟“ علیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تم میں جو تبدیلی مجھے نظر آرہی ہے وہ ذرا کھٹک رہی ہے۔“

”کیا یہ تبدیلی یہ چیخ اتنا واضح ہے؟“ علیہ حیرت زدہ سی تھی۔

”ہاں اتنا واضح ہے کہ.... کوئی اندھا بھی دیکھ سکتا ہے اور سچ پوچھو تو یہ چیخ بڑا خوشگوار ہے۔“ عالیہ مسکرا کر بولی۔

”یہ سسپنس مجھے ضرور مار دے گا، خدا کے لیے صاف صاف کہیے نا بات کیا ہے؟“ علیہ ہلچلی ہو کر بولی۔

”علیہ اگر صاف صاف سننا چاہتی ہو تو سنو، تم تو فلک سے دو حرف بات کرنے کی روادار نہ تھیں کبھی لفت نہیں دیتی تھیں اور اب.....“

سنہری خواب سیاہ ہو جائیں۔ زندہ رہنے کی تمنا ہی دم توڑ دے؟“ عالیہ نے اس کی پلکوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”خدا نہ کرے میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ سیدھے سیدھے اپنے بھائی کو یہ کیوں نہیں بتا دیتیں کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ یہ لڑکی پتھرا چکی ہے۔ اندر سے مر گئی ہے نہ اس کے دل میں کوئی ارمان زندہ بچا، نہ آنکھوں میں کوئی خواب باقی ہے اس لیے سراپوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اپنا وقت ضائع نہ کرے۔“ علیہ کے چہرے پر اندرونی خلفشار کی سرخی پھیلنے لگی تھی۔ مبروضہ کی دیواروں میں لرزش سی تھی۔

”میں یہی معما تو حل کرنے کی کوشش میں ہوں علیہ جی آخر ایسی کیا آفت آگئی ہے جو دنیا کا بھلے سے بھلا مرد زبرد ہو گیا ہے ایک منگنی ہی ٹوٹی ہے نا؟“

”منگنی ٹوٹا کیا یہ کوئی بڑی بات نہیں؟“ علیہ نے حیرت سے عالیہ کی آنکھوں میں دیکھا۔

”بڑی بات ہے کیوں نہیں بہت بڑی بات ہے، میرا بس چلتا تو اس ذلیل انسان کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیتی لیکن یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ساری سچائی روز روشن کی طرح ہمارے سامنے آگئی اور ہم اس مردود کے دوسرے وار سے بچ گئے لیکن میری جان چند تاروں کے ٹوٹنے سے آسمان بجھ نہیں جاتا۔ بیچارے ماموں جان اور ممانی جان اندر سے کتنے کھوکھلے، مایوس اور دکھی ہیں یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ ٹھیک ہے یہ رشتہ جوڑنے میں بڑوں نے بھی اندھے اعتماد کا مظاہرہ کیا۔ فیصلہ کرنے میں کچھ جلد بازی بھی ہو گئی لیکن اس کا اب یہ مطلب نہیں کہ تم اپنی ضد پر اڑی رہ کر اپنی خود سری سے ان سے انتقام لو انہیں روحانی اذیت دو۔ انہیں زندگی بھر کی شرمساری سہنے کو دے دو۔ یہ تو ظلم ہونا ان بوڑھی جانوں پر۔“

عالیہ کی روشن آنکھوں میں ہلکی ہلکی دھند تھی۔

مصوم اور بھولے بھالے بھائی کو کوئی چکر دکرو یا تو.....“ عالیہ نے گھور کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جیسے دھمکی دی۔

”میں آپ کے بھولے بھالے مصوم سویت ممالی کو کوئی چکر دکر نہیں دے رہی، بس ذرا رنگین لہوؤں میں دل پشوری ہو گیا۔“ وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

”تم دل پشوری کر رہی تھیں یا لاہوری یہ تو میں نہیں جانتی لیکن اگر یہ حقیقت نہیں تو دھوکا ضرور دے لی تھیں۔“

”دھوکا.....؟ اب اتنا بڑا الزام تو نہ لگائیں۔“

”دل شکستہ سی ہو کر بولی۔“

”تم خود بتاؤ اگر کوئی دوسرا انسان صرف اپنا دل خوش کرنے کے لیے تم سے ایسا رویہ اختیار کرے وہ حقیقت پرستی نہ ہو تو حقیقت جاننے پر تمہیں کیسا لگے گا۔ برا لگے گا نا.....؟ اس لیے میرے دل میں دس دس پیدا ہو رہے ہیں۔ ویسے ایک خیال رکھنا علیہ اگر تمہارے کسی رویتے سے میرے بھائی کو ذرا سا اتنا حائل برابر دکھ پہنچا تو میں بھی وہ کرگزروں گی جو تم نے صرف اشار پلس پر ہی دیکھا ہوگا۔“ علیہ کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

”خدا کی قسم بھابی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جس سے فلک نے کوئی غلط مطلب اخذ کیا ہو، میں نے اپنے رویتے میں جو چمک پیدا کی ہے تو صرف اس لیے کہ جب ہم سب وحشی سکون پانے کے لیے چند دنوں کے لیے ان سبزہ زاروں میں آئے ہیں تو یہاں سے مسین یادیں لے کر واپس جائیں۔“ اس کی حسین آنکھیں نم آلود تھیں، وہ کس پل صراط پر کھڑی تھی، ایلے کی گھڑی کتنی قیامت خیز تھی یہ کوئی کیا جانتا تھا۔

”چاہے اس وقتی خوشی خوشی کے کھیل میں کسی کا اگیزہ ارمانوں بھرا دل ریزہ ریزہ ہو جائے۔ سارے

”اور اب ایسا کیا ہو رہا ہے یا میں نے ایسا کم کرو یا ہے یا کہہ دیا ہے جو آپ کے ذہن میں گھنٹاں بجنے لگی ہیں؟“ علیہ نے کھینچے کھینچے انداز میں عالیہ کی بات کاٹی۔

”جو ڈراما ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اس کو دیکھنے کے بجائے آنکھیں کیسے بند کر لیں؟“ عالیہ نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”ڈراما.....؟“

”ہاں ڈراما.....“ اب ان کا لہجہ بھی مضبوط تھا۔

”پتا نہیں بھابی آپ کا اشارہ کس طرف ہے، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔“ علیہ کو واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ عالیہ چند لمحے اس کی حیرت بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاموش رہی جیسے اندر ہی اندر کچھ سوچ رہی ہو کوئی فیصلہ کر رہی ہو پھر ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”آج جو منظر میں نے دیکھا وہ اس قدر حیران کن تھا کہ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ تم اور فلک یوں ساتھ ساتھ سب کے سامنے.....“

”تو اس میں ایسی کون سی انہونی بات ہو گئی، وہ کوئی اجنبی تو نہیں اس گھر کا فرد ہے، مہمان ہے، رشتے دار ہے۔ کیا وہ بہتر سلوک کا مستحق نہیں؟“ علیہ نے ٹالنے والے انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، فرد تو وہ پہلے بھی تھا۔ رشتے دار بھی ہے لیکن تمہارے لیے وہ ایک غائب انسان تھا اور اب اچانک سب اتنا بدلا بدلا کیوں ہے؟“ عالیہ کو علیہ کی مسکراہٹ اور غیر سنجیدہ انداز ذرا نہیں بھایا تھا۔

”آپ پتا نہیں کہاں کہاں کے قلابے ملا رہی ہیں۔“ علیہ نے اس کی سنجیدگی کا کوئی ٹوٹ نہیں لیا۔

”میں تمہیں خوب جانتی ہوں علیہ بیگم۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ بدلاؤ یونہی نہیں ہے۔ اس میں بھی کوئی بید ہے، تمہاری کوئی چال ہے، خبردار جو میرے

سے بڑا میچا ہے۔“ اب کچھ تو وقت دیجیے نا.....“ وہ لپٹی ہو کر بولی۔

”تمہارے پاس وقت ہی تو کم ہے جو کام کل کرنا ہے وہ آج کرو بلکہ ابھی کرو۔ کل کل کرتے کہیں گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔ بچوں کو بھی سٹیل کرنا ہے۔“ عالیہ تھکے ہوئے انداز میں اٹھی۔

”آپ چلیں، میں ذرا ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔“ عالیہ کے جانے کے بعد علیہ واش روم میں آئی۔ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور پھر غور سے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ وہی چہرہ تھا۔ وہی دل میں بے دکھ، اداس اداس آنکھیں لیکن نہ جانے کیوں اپنا آپ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ کچھ بدلا بدلا سا کچھ نیا نیا سا۔ دھیمے انداز میں دھڑکتے دل کی صدا کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ کچھ انجانے سے احساسات بے آواز دھند کی طرح اس کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ یہ کیا تھا، کیوں تھا۔ وہ اپنے ان احساسات کو کوئی نام نہ دے سکی۔ اور یہ بدلاؤ اور گڈنڈ سی الجھی الجھی سی حالت اس وقت سے تھی جب وہ کافی کنگ لیے اُدھر آ رہا تھا جہاں وہ ہری بھری گھاس پر بیٹھی معطر فضاؤں کے حسن میں کھوئی ہوئی تھی اور دل و جان پر ایک کیف و سرور کی سی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ لحظہ بھر کو دل جیسے رک سا گیا تھا جیسے دھڑکنا بھول گیا ہو۔ آئینے کی طرح شفاف چہرہ اندرونی خوشی اور زندگی سے بھرپور چمکتا ہوا۔ پہلے تو اس کی موجودگی کے احساس سے ہی دل و روح کے اندر انگارے سے دھک اٹھتے تھے جیسے وہ اس کا جانی دشمن ہو اور وہ خود اس کے خون کی پیاسی لیکن آج کوئی ایسا خوفناک احساس دل میں نہیں جاگا تھا اور پیشتر اس کے کہ وہ اور قریب آتا اور اس کی چوری پکڑی جاتی اس نے رخ پھیر لیا تھا۔ اور اب.....؟ مسائل ہی مسائل اس

ہی ان میں تیرتی اور چمکتی سچائی کو کتنی رعی، پرکھتی رہی پھر اس کا نم آلود چہرہ اپنے شفیق سینے سے لگا لیا۔

”تو پھر میں انتظار کروں؟“ ان کا لہجہ پُر امید تھا۔

علیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”وعدہ.....؟“

اس نے پھر سر ہلا دیا۔

”فلک ایک نیک دل اور اچھا انسان ہے علیہ“

اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک سچے مسلمان میں ہونی چاہئیں، وہ تمہاری قدر کرے گا علیہ لیکن تم اس کی بے قدری نہ کرنا ورنہ اللہ تعالیٰ کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ہر نا انصافی کا ہر انسان کو حساب دینا ہوتا ہے، یہ تو تم جانتی ہو.....؟“ عالیہ بزرگانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

”میں جانتی ہوں عالیہ بھابی آپ کا بھائی فرشتے سے کم ہو سکتا ہے؟“ وہ دھیرے سے مسکرا دی، ایک ایسی مسکراہٹ جس میں آنسو زیادہ تھے۔

”اب زیادہ مسکا نہ لگاؤ۔“ عالیہ کے لہجے میں خوشی کا عنصر تھا۔ شاید جب دل میں امید کی کوئی کرن چمکتی ہے تو خوشی بھی کسی روزن سے جھانکنے لگتی ہے۔ شاید دونوں ایک ساتھ ہی جنم لیتی ہیں۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں بھابی مسکا نہیں لگا رہی“

علیہ نے صاف گوئی سے کہا۔

”چلو ایک مسئلہ تو حل ہوا..... یعنی تم فلک کو پسند کرتی ہو؟“ عالیہ دل کی بات براہ راست زبان پر لے آئی۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا، میں تو ان خوبیوں کی وجہ سے کہہ رہی ہوں جو ان میں ہیں۔“ لگتا تھا اتنی مغز ماری کے بعد وہ وہیں کھڑی تھی جہاں پہلے تھی۔

”تمہیں سمجھا تاں سیدھی پٹری پر لانا از خود ایک بڑا پر اہم ہے۔“ عالیہ نے ایک گہری سانس لی۔

”آپ خود کئی دفعہ کہہ چکی ہیں کہ وقت سب

بنائے ہیں اور عورتیں بھی پھر تم ہر ایک کو ایک ہی نظر سے کیوں دیکھتی ہو؟ ہر ایک کو ایک ہی ترازو میں کیوں تولتی ہو؟“ عالیہ نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے بہ مشکل کہا۔

علیہ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

”جواب دو علیہ، میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔“

علیہ کو چپ دیکھ کر عالیہ نے اصرار کیا۔

”اس نے جس طرح میری پیشانی داغدار کی ہے وہ تا قیامت داغدار رہے گی اور میرے مستقبل پر یہ داغ سو درج بن کر چمکے گا۔ میری زندگی کو مزید سیاہ بنائے گا۔“ علیہ سے نہ اپنی سسکیاں سنہالی جا رہی تھیں اور نہ ہی بہتے آنسو۔ عالیہ سے اس کے آنسو نہ دیکھے گئے نہ اس کی بے بسی، اس نے بے ساختہ اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

”یہ صرف تمہاری بھول ہے، تمہارا وہم ہے جانی۔ ایسا کوئی داغ تمہارے چاند چہرے پر نہیں۔ ہاں اب اس چمکتی پیشانی پر فلک کے نام کا ٹیکا میں خود اپنے ہاتھوں سے لگاؤں گی۔“ عالیہ نے پیار سے اس کے ملائم بال سنوارتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... نہیں عالیہ بھابی میں اپنے ٹوٹے بکھرے حوصلے..... پاش پاش اعتماد اور چمکتا چور خواب لے کر کسی کی دنیا نہیں سجا سکتی۔ جب تک میں اپنے روتے بلکتے دل کا ایک ایک آنسو نہ جن لوں (یونہی باتیں نہ بنائیں) میں کہاں رو رہا ہوں جو آپ آنسو چنیں گی) کوئی اندر سے کہہ رہا تھا۔ میرا آپ سے پکا وعدہ ہے۔ ایک ایسا روشن دن ضرور آئے گا جب میں آپ کے دونوں ہاتھ تھام کر کہوں گی کہ میں نے اپنی منزل پالی ہے، پلیز مجھے وہاں تک پہنچانے کا انتظام کر دیجیے۔“ وہ جل تھل آنکھوں سے عالیہ کی بھگی بھگی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

عالیہ چند لمحے ان پُر آب روشن جھیلوں کو دیکھتی

”تو بہ تو بہ، عالیہ بھابی آپ کے دل میں یہ خیال بھی کیسے آیا کہ اس خبیث انسان کا انتقام میں اپنے پیاروں سے لوں گی۔ انہیں سزا دے رہی ہوں، یہ تو زیادتی ہوئی نا سراسر.....“ اب علیہ سے مزید ضبط مشکل ہو رہا تھا۔ بے بسی سے سر جھکا کر آنکھوں میں اُمند آنے والی نمی کو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

”ایک حقیقت اور بھی جان لو علیہ اگر اسی طرح اندھی انا اور ہٹ دھرمی پر قائم رہیں تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب وہ دونوں اپنے اپنے زخمی دل لیے سینے پر احساسِ جرم کا بھاری بوجھ لیے خاموشی سے ابدی غند سو جائیں گے اور ہم سب ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔“

”خدا کے لیے عالیہ بھابی آپ کو میری قسم ایسی دل شکن باتیں نہ کیجیے ورنہ میں مر جاؤں گی۔“ یہ دار واقعی کاری تھا۔ علیہ بے اختیار سسک پڑی۔

”کیسے نہ کروں ایسی باتیں، کیا وہ میرے کچھ نہیں لگتے۔ کیا میرا ان سے خونی رشتہ نہیں، کیا مجھے ان کے دکھ کا احساس نہیں۔ جس طرح وہ جلتے اور کڑھتے ہیں اس کا مجھے علم نہیں؟ کیا تو قیر ایسا ہی گلفام تھا جو تم نے دنیا ہی تیاگ دی، اس کی جدائی میں جوگ لے لیا۔ کیا تمہیں اپنے ابو، اپنے بھائی اور فیملی کے تمام مردوں میں وہی عیب نظر آتے ہیں جو اس میں تھے؟ یا ابھی تک دل کے نہاں خانوں میں اسی کی مورتی سجائے بیٹھی ہو جو اور کوئی چتا ہی نہیں۔“ عالیہ نے تکیے انداز میں اور غصیلی آواز میں پوچھا۔

”نہیں..... نہیں عالیہ بھابی میرا اللہ جانتا ہے وہ سب تو اسی دن ختم ہو گیا تھا جس دن.....“ علیہ سے آگے بولا ہی نہ گیا۔ طلق جیسے کانٹوں سے بھر گیا تھا۔

”تو قیر ایک بد چلن اور بد خصلت انسان تھا۔ اس نے اپنی بد چلنی دکھائی لیکن سب میں تو وہ خامیاں نہیں ہو سکتیں۔ اللہ تعالیٰ نے نیک اور اچھے مرد بھی

www.pdfbooksfree.pk

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پر اہلیم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپ کے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک دی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061
0547-521787

فون اوقات

9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

1. بتا ہے۔ پھر راجیل جیسا بے لوث اور جگری اس سے بات کر کے حال دل کہہ کر چھیڑ چھاڑ کے ستا سکا اسے بڑا لطف آتا تھا۔ اُدھر راجیل لک کی شرارت کو خوب سمجھتا تھا لیکن وہ اپنے بے لمبے کو کیسے قابو کرتا جو فلک کے جھوٹ موٹ کے لے پن، انجان پن اور معصومیت پر بالکل بے ہو جایا کرتا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود کچھ کہہ ہی اٹھا اور پچھتا تا بھی تھا۔

”فلک.....؟“ عالیہ کی آواز پر اس نے مڑ کر لہا اور مودبانہ کھڑا ہو گیا۔ عالیہ آگے بڑھی اور پٹنگ ایک کونے پر ٹپک گئی۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟“ وہ اس کی ردہ صورت دیکھتے ہوئے دوسری طرف بیٹھ گیا۔

”ہاں، کچھ تھک گئی ہوں سچ پوچھو تو ذہنی ٹھکن 11 ہے۔“ عالیہ نے آگے ذہنی ٹھکن کی کوئی ماحول نہ کی تو فلک نے بھی زیادہ اصرار کرنا 11 نہ سمجھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی ماں تھیں کئی دے داریاں تھیں ٹھکانا تو لازمی تھا۔

”آپ کچھ دیر ریٹ کر لیں یا کوئی ٹیلیٹ لے لیں۔“ فلک نے مشورہ دیا۔

”اب کھانے کے بعد کچھ کروں گی۔“ اس کے سے ظاہر تھا کہ ان کے دل میں کچھ کھٹک سی م۔ چند لمبے دنوں کے درمیان خاموشی کا آئینہ اتار رہا تھا فلک نے حوصلہ کر کے پوچھا۔

”کیا کوئی بہت سیریس بات ہے؟“

”سیریس تو ہے لیکن ہم ذرا حوصلے اور دھیرج سے کام لیں تو کوئی نہ کوئی حل بھی نکل سکتا ہے۔“ عالیہ نے ایک گہری سانس لی۔

”ماموں تو ٹھیک ہیں نا.....؟“ اس نے لگرمندی سے پوچھا۔

”ہاں، یوں تو ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس

سمجھنے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔“ فلک نے زیادہ چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

”فلک پیارے اس ساری تقریر کا لُب لُب.....“

”لب لُب.....؟“ فلک نے پھر ٹوکنا چاہا۔

”ہاں لب لُب..... یعنی مختصراً اصل مطلب یہ ہے کہ اگر ان دنوں محترمہ کا موڈ خوشگوار ہے تو بندہ بن کر کوئی ہلکی پھلکی ڈھنگ کی بات کر لو لیکن موقع محل دیکھ کر یہ نہ ہو محترمہ ہمتی سے ہی اکھڑ جائیں۔“ راجی نے نرمی سے سمجھایا۔

”یعنی موقع محل ضرور دیکھنا ہے۔ خواہ مخواہ اتنا ٹائم ویسٹ کیا۔ ارسطو سکندر اعظم، پتا نہیں کون سی ملکہ اور پتا نہیں کیا کیا..... خفا نہ ہونا مائی ڈیر فرینڈ تم نے تو میرا ہاں سہا بھیجا بھی پچی کر دیا ہے۔ اب تو لگتا ہے موقع محل بھی مشکل سے ملے گا اور ملا بھی تو نظر نہیں آئے گا۔“ فلک کو راجیل کو چھیڑنے میں بڑا مزہ آرہا تھا۔

”اب تم اتنے اسٹوپڈ بھی نہیں جتنے نظر آتے ہو۔“ راجیل نے ماتھا پیٹنے کے انداز میں کہا۔ اسے فلک کے جھوٹے تجاہل پر سخت غصہ آرہا تھا۔

”ویسے آپ فکر نہ کریں استاد جی جو آپ نے فرمایا ہے ویسے ہی ہوگا۔“ فلک نے اسے یقین دلایا۔

”میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“ راجیل نے دلی دعا دی۔

فلک نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا اور پھر بے اختیار ہنس دیا۔ آج اس نے اپنے پیارے دوست کو کتنا ستایا تھا۔ اسے کتنا مزہ آتا تھا جب معصوم بن کر الٹے سیدھے سوال کرتا تھا اور راجیل تب جانتا تھا لیکن اس کا بھی جگر تھا کبھی زیادہ دیر خفا نہیں رہتا تھا۔ پُر خلوص دوست اور دوستی ایک انوکھی چیز اور کچھ عجیب ہی رشتہ ہے جو اکثر دوسرے رشتوں کو مات

”جئے شیر.....؟ کیا یہ کوئی نیا ناک ہے۔ جس سے بھیجا تیز ہو جاتا ہے؟“ فلک نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔

”پھر وہی بات تم نے تو جیسے کچھ نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“ فلک کو ہلکی ہلکی گرج چمک صاف سنائی دے رہی تھی۔

”اچھا..... اچھا تم اپنی بات جاری رکھو، میں

”اچھا..... اچھا تم اپنی بات جاری رکھو، میں

”ہندوستان..... انڈیا..... ہمارا پڑوسی ملک“

ایتنا بھد اور شاہ رخ خان کا ہندوستان..... بھارت جن کی فلمیں دیکھ دیکھ کر تم دیوانے پاگل ہوتے ہو وہی ہندوستان.....“ راجیل جیسے اپنا ماتھا پیٹ رہا تھا۔

”میں سمجھ گیا میرے بھائی، ہندوستان کے بارے میں پوچھنے کی جو غلطی سرزد ہوئی وہ اس لیے کہ سکندر اعظم تو یونان کا بادشاہ تھا نا.....؟“ فلک نے معصومیت سے پوچھا۔

”ہاں..... ہاں..... وہ سو فیصد یونان کا ہی بادشاہ تھا۔ جب وہ ہندوستان کو فتح کرنے کے ارادے سے نکلا تو اس نے اپنے استاد ارسطو کو بھی ساتھ لے لیا تا کہ وہ..... وہ پتا نہیں اس ملکہ کا کیا نام تھا اس کو پانے کے لیے ارسطو ایک اجنبی دیس اور اجنبی لوگوں میں سکندر کی رہنمائی کر سکے۔ اور پورا پاٹ پڑھا سکے کہ کس وقت کیسے اور کیا بات کرنی ہے اور کب بدھو بن کر ملکہ کی ہاں میں ہاں ملانی ہے تا کہ تعلقات بہتر سے بہتر ہوں۔“ راجیل کافی جھلایا ہوا تھا۔

”سچ بتا راجی سکندر اعظم کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟“ فلک نے بڑی عاجزی سے پوچھا۔

”یار فلک لگتا ہے اللہ میاں نے تمہاری کھوپڑی میں بھیجا نہیں رکھا۔ تمہیں کوئی بات سمجھانا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔“ راجیل نے ایک تھکا ہارا سانس لیا۔

”جئے شیر.....؟ کیا یہ کوئی نیا ناک ہے۔ جس سے بھیجا تیز ہو جاتا ہے؟“ فلک نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔

”پھر وہی بات تم نے تو جیسے کچھ نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“ فلک کو ہلکی ہلکی گرج چمک صاف سنائی دے رہی تھی۔

”اچھا..... اچھا تم اپنی بات جاری رکھو، میں

جو پریشانی دل و دماغ کو اندر ہی اندر کھا رہی ہے وہ چین لینے دے تو.....“

”کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی؟“

”انسان کی پڑمردگی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے فلک، ان کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ ان کے دل پر کتنا بھاری بوجھ ہے اور اس کی وجہ ہیں تمہاری پرنس.....“ عالیہ نے غمی سے کہا۔

”یعنی..... یعنی.....“ اس کی زبان پر علیہ کا نام آتے آتے رہ گیا۔

”ہاں فلک، علیہ.....“ عالیہ نے جیسے یاد دلایا۔ فلک کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ شام تک تو سب ٹھیک چل رہا تھا۔ سب خوش باش تھے پھر علیہ نے بیٹھے بٹھائے کیا گل کھلا دیا جو یہ صورت حال ہو گئی۔ منہ سے تو کچھ نہ بولا چپ چاپ ان کی صورت متوقع نظروں سے دیکھے گیا۔

”فلک میرے بھائی جو میں کہنا چاہتی ہوں وہ سب کہنا میرے لیے آسان نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ماموں ممانی تمہارے بھائی اور میں خود چاہتے ہیں کہ علیہ اپنے اوپر چھائی مایوسیوں کی سیاہ چادر اتار پھینکے اور صاف شفاف فضاؤں میں جینا سکے۔ وہ ایک خوش حال زندگی کی طرف گامزن ہو تو والدین بھی سکھ کا سانس لیں... اور ہم بھی۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے بھابی۔ تو کیا آپ کی نظر میں ایسا کوئی بندہ ہے؟“ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”بندوں کی کمی نہیں فلک اور ایک بندے کے تقاضوں نے تو دلہیز کی مٹی اکھیڑ دی ہے۔ ہم نے اور دیر کی تو کسی دن وہ ہمارے دروازے پر ہی ڈھیر ہو جائے گا۔“ عالیہ کی سیاہ آنکھوں میں جگنو سے چمک رہے تھے۔

”وہ کون ہے بھابی؟“ فلک سوچ بھری آواز میں بولا۔

”ارے تم اسے نہیں جانتے وہ ملک صاحب بیٹا شیر زمان.....؟“

”شیر زمان.....؟“ فلک کے سینے میں بچے شعلے بھڑک اٹھے تھے اور روشن پیشانی شکنوں سے لگی تھی۔

”لیکن بھابی وہ تو بالکل گور یا لگتا ہے۔“ برجستگی سے بولا۔

”تو کیا ہوا..... ہے تو بندہ بشر گھریا بھی ٹھیک ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے علیہ مان جائے گی؟“ فلک نے اپنے دلی جذبات کو دباتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں نہیں مانے گی..... اگر ہم سب مل کر پریشر ڈالیں گے تو ضرور مان جائے گی۔ خاص کر تم۔“ میں.....؟“ فلک کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کی دکھ بھری آنکھیں اور چہرے کا اجاز پن عالیہ کا دل چیر گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے فلک کا چہرہ تھام لیا اور شفقت آمیز لہجے میں بولی۔

”میرے چھوٹے سے معصوم بھیا۔ پریشر ڈالنا ہے اور ضرور ڈالنا ہے لیکن اس کا لے بھینے شیر زمان کے لیے نہیں تمہارے لیے..... سنا؟ تمہارے لیے فلک میرے بھائی۔“ عالیہ کی آنکھیں اشک آلود ہو رہی تھیں اور حلق میں سسکیوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔

”آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔“ فلک شرمندگی سے بولا۔

”ہاں، پریشر ڈالنا ہے بھائی اور یہ جنگ اب تم نے تنہا لڑنی ہے۔ ہم سب اپنی سی کرچکے ہیں اب اس ناؤ کی پتوہ تمہارے ہاتھ میں ہے، اس پار لے جاؤ یا اس پار.....“ عالیہ اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ

بمبجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ فلک سے فوری کوئی بات نہیں بن سکا۔ اس ٹاپک کو لے کر علیہ سے بات نا اتنا ہی مشکل تھا جتنا شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنا۔

”کیا میری نمائندگی آپ نہیں کر سکتیں؟“ اس پر امید لہجے میں پوچھا۔

”نہیں فلک..... چاہے تمہیں برا ہی لگے، میں ہر حصے کا کام مکمل کر چکی ہوں۔ ایک بڑی بہن اور لی کے ناتے..... میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکی ہوں لیکن مجھے کامیابی نہیں ملی۔“ ان کا لہجہ شکست دہ تھا۔

”پھر آپ مجھ سے یہ کیسے توقع کر سکتی ہیں کہ مجھے کامیابی ملے گی؟“ فلک نے ان کی آنکھوں میں گہمتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کامیابی ضرور ملے گی کیونکہ تمہارا جذبہ اخ ہے اور پھر فلک ان حسین موسموں میں گھومتے مرتے مجھے یوں لگا ہے کہ علیہ کا حوصلہ ٹوٹا نہیں ہے۔ اس کی ضد ختم نہیں ہوئی اس کی ہٹ دھرمی وہی ہے۔ سنو یہ بھاری بھاری چٹانیں تھوڑی تھوڑی اپنی جگہ سے ہل سکتی ضرور ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی اندرونی چیخ بول رہی ہو۔ شاید اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے اس حسن اور نیلے نیلے آسمان نے سوچنے سمجھنے کی راہوں کو نیا رخ دے دیا ہو اور اب صرف کچھ دباؤ کی ضرورت ہے،

”سکتا ہے تم بات کرو تو ضرور کوئی بند راہ کھل جائے۔“ تو سکتا ہے نا..... بغیر ٹرائی کیسے تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہیں نا کا کی ہوگی؟“ فلک نے فوراً کچھ کہنے کے بجائے عالیہ کے دونوں ہاتھ اپنے برادرانہ جذبوں سے گرم ہاتھوں میں لے لیے اور مضبوط لہجے میں

”عالیہ بھابی آپ کی خاطر اور علیہ کو شیر زمان سے بچانے کے لیے اور..... اور اپنی منزل پانے کے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اپنی زندگی کی بازی لگا

سکتا ہوں۔ سب کچھ کر سکتا ہوں۔ شکست کی چوٹ کھا کر جینا..... لمبی لمبی صعوبتیں سہنا، سب کچھ برداشت کر لوں گا بھابی سب کچھ اگر علیہ نے مجھ پر اس کا لے بھینے کو ترجیح دی تو وہ زخم بھی اپنی زندگی کا حصہ اور نصیب کا لکھا سمجھ کر زندہ رہ لوں گا لیکن عزت لٹا کر عزت خاک میں ملا کر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔“ اس کی آواز میں جیسے آنسو بول رہے تھے، سسکیاں تڑپ رہی تھیں۔

”جو تم سوچ رہے ہو جو خدشے تمہارے دل میں جنم لے رہے ہیں، یہ سب نہیں..... ہوگا۔ بس تم ایک مرتبہ حوصلہ کر کے اپنا مدعا اس کے سامنے بان کر کے دیکھو..... ہو سکتا ہے کوئی نیک ساعت تمہاری منتظر ہو اور تمہیں کامیابی نصیب ہو۔ اپنے بخت کے دروازے پر دستک دے کر تو دیکھو..... شاید اندر سے کوئی جواب مل ہی جائے۔ بند دروازوں پر نگاہیں جما کر کھڑے رہنا کہاں کی عقلمندی ہے؟“ عالیہ اس کے ہاتھوں میں امید دل کو جیسے امید کے دھاگوں سے باندھ رہی تھی۔ فلک کچھ نہ بولا سخت محضے میں تھا ناؤ اینڈ نیور والا معاملہ تھا۔

”جب تمہارے دل میں کوئی کھوٹ نہیں، تمہاری نیت آئینے کی طرح شفاف ہے تو تم جھجک کیوں رہے ہو؟ اور یقین کر دو ہم سب اس فیصلے سے بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ ہماری یہ خوشی یہ طمانیت اور یہ فیصلہ تمہیں ثابت قدم بنائے گا اگر میری مانو تو لاہور پہنچنے سے پہلے موقع محل دیکھ کر تم اس سے بات ضرور کرو۔ ایک دفعہ موٹروے سے اترے تو وہاں کی ڈتے دار ہاں اور مصروفیات پھر اس کے دل و دماغ کو بھاری کر دیں گی۔ باقی اللہ پر چھوڑ دو اس پار یا اس پار.....“

”موقع محل.....؟“ فلک کے سنجیدہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

”کیوں، میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں۔“ عالیہ نے حیران ہو کر اس کے چہرے کا بدلہ رنگ دیکھا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی، زندگی کے اہم اور نازک فیصلے کرنے ہوں تو موقع محل تو دیکھنا ہی پڑتا ہے۔“ وہ بہ مشکل کہہ پایا۔

”اور نہیں تو کیا، موقع محل دیکھے بغیر کچھ ہو سکتا ہے بھلا۔ میری مانو تو ہم کا آغاز ابھی سے کر لو۔ حالات اچھے ہیں اور پھر ابھی لوہا گرم بھی ہے۔“ عالیہ نے حوصلہ دلایا۔

”اس کا مطلب ہے یہی موقع محل ہے۔“ وہ بے اختیار ہنس دیا۔

”تم نے ٹھیک سوچا ہے فلک، دوریاں مٹانے کے لیے پہلا قدم تو اٹھانا ہی پڑے گا۔“ عالیہ کے لہجے سے لگتا تھا جیسے فلک کو آماہ کر کے اس نے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔

”ٹھیک ہے بھابی آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میری بھی ایک عرض سن لیجیے۔ اگر ایک چھوٹی موٹی سی لڑکی اپنی اندھی ضد اور فولادی انا پر قائم رہ سکتی ہے تو میں بھی ایک غیرت مند اور خوددار انسان ہوں اگر مجھے اپنے ارادوں میں ناکامی ہوئی تو میں لاہور سے چلا جاؤں گا رہی جا ب تو وہ کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ وعدہ کریں کہ پھر مجھے نہ کوئی روکے گا نہ اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کرے گا، ٹھیک۔“

”ہاں، ان حالات میں تمہارا چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔“ وہ آہستگی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

عالیہ کے جانے کے بعد فلک کتنی دیر بستر پر پڑا چھت کو گھورتا رہا۔ عالیہ بھابی کے لیے یہ کہنا کتنا آسان ہے کہ ابھی جا کر بات کر لو ابھی لوہا گرم ہے۔ لیکن فلک کو فوری کوئی قدم اٹھانا بے حد مشکل لگ رہا تھا۔ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے پتا نہیں بھابی کیا گرم سرد کر کے آئی تھیں ابھی تو وہ خود سنبھل نہ پائی

ہوگی شاید ماضی کی بند کھڑکیاں پھر کھل گئی ہوں دلگیر ہوگی رو بھی رہی ہوگی ماضی کی چوٹ کوئی پھول مار تھوڑی ہوتی ہے؟ نہیں میں ابھی نہیں جاؤں گا سنبھلنے اور سوچنے کا موقع دوں گا۔ وہ اندر سے ٹٹا ہوگی تو کچھ کہنے سننے کے قابل بھی ہوگی ورنہ میں بات کرنے کا پہلا اور آخری چانس بھی کھو دوں گا شاید قسمت کوئی حسین و جمیل لمحہ میری جمبولی میں اٹھائی دے۔ ابھی کم از کم نظروں کے سامنے ہے، کر

کیلا انداز بھی نہیں ہے۔ اس لیے احتیاط لازمی کچھ دیر انتظار اور سہی۔ وہ کتنی ہی دیر اپنے بے زل کی فریاد سنی ان سنی کرتا رہا۔ اس کا روشن دا رہنمائی کرتے ہوئے جو راستے دکھا رہا تھا راستے کٹھنایاں سمجھا رہا تھا، وہ اس پر چل کر ہی منزل پا تھا۔ یہی فیصلہ صحیح تھا۔ پھر اگلے دو دن یوں گزر جیسے سب خوشبوؤں اور خوابوں بھری دادیوں میں گم پھر رہے ہوں۔ ہنستے بولتے کھاتے، پیتے سب۔

پریشانیاں بھولے جیسے ہمیشہ کے لیے نہیں رہنے لیے آئے ہوں۔ علیحدہ کے رویے میں کوئی فرق نہیں آ تھا۔ وہ ویسے ہی پہلے دن والا بی بیویر اپنائے ہو تھی۔ بچوں کے ساتھ کھلی ملی، بڑوں کی خاطر مدارات باقیں، لپکیں، لمبی لمبی میریں وہ بھی اتنی ہی ہشا بٹاش نظر آ رہی تھی جیسے سب تھے لگتا ہی نہیں تھا کہ اس کے دل و دماغ پر کوئی بوجھ تھا یا اس کے اور عالیہ فلک کے درمیان کوئی تلخ کلائی ہوئی ہو یا تناؤ ہو۔

عالیہ نے اپنی تسلی کے لیے دو ایک بار آنکھوں ہی آنکھوں میں فلک سے ضرور پوچھا تھا کہ وہ اب تک اتنے اہم مسئلے کو کیوں ٹال رہا تھا لیکن فلک نے سب کچھ سمجھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظر انداز کر دیا عالیہ یہ سوچ کر حیران تھی کہ اس کی بے چینی اس کی جلد بازیاں کہاں عائب ہو گئیں کہاں تو وہ کھڑے کھڑے فیصلے کرنے پر مصر تھا اور اب جیسے پرواہی

اُدھر سہیل نے عالیہ کی جان کھار کھی تھی۔ لگا تار وال کر کے اس کا دماغ چٹ کر لیا تھا۔

”فلک نے بات کی؟ فلک وقت کیوں ضائع کر رہا ہے؟ تم سمجھاؤ اسے یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو دوبارہ نہیں آئے گا؟“ اُدھر ماموں اور مامی کی آنکھوں میں ان گنت سوال بھرے ہوتے۔ ذرا نگاہ لی تو وہی سوال نظر آتے جو پوچھ پوچھ کر سہیل نے بے اُم کر رکھا تھا۔

پھر اگلے دو دن معطر معطر سے خوشیوں بھرے دن یوں گزرے جیسے تیز پون گزرتی ہے۔ سب کو آڈر مل چکا تھا کہ کل صبح روانہ ہونا ہے۔ اس لیے اپنی اپنی بھری چیزیں ابھی سے سنبھالنا شروع کر دیں۔ سب حکم کی بجا آوری کرتے رہے تھے لیکن بے دلی اور بچھے بچھے دلوں کے ساتھ، سب کا یہی اصرار تھا کہ ابھی تو کتنی ہنسیاں باقی ہیں۔ ابھی کیوں جائیں لیکن پھر کرنا تو ہی تھا جس کا ماموں جان نے حکم صادر فرما دیا تھا۔

☆☆☆

ہلکی سی دستک پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو دروازے میں فلک کو بہ نفس نفیس کھڑا پا کر حیرت سے منجمد ہو گئی۔ فلک اور وہ بھی اس وقت اور تھا۔ آخر کیا ایمر جنسی تھی۔ وہ دروازے میں یوں کھڑا تھا جیسے فریم میں کوئی تصویر جڑی ہو۔

”میں اندر آ سکتا ہوں۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں بولا۔

”جی، آئیں۔“ اس نے ارد گرد پھیلی کتابیں اور نوٹ بکس کو جلدی جلدی ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

”آئیں بیٹھیں۔۔۔۔۔“ لہجہ بڑا ملائم اور مہذبانہ تھا۔

وہ ثابت قدمی سے چلتا اندر آ گیا جیسے روز اسی طرح آتا جاتا رہتا تھا۔

”بیٹھیے۔“ علیحدہ نے مہذبانہ انداز میں کہا۔ مارے تجسس کے اس کا برا حال تھا۔ دماغ نے تو جیسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لمبی تان لی تھی اور دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا۔

”علیحدہ منصور آج تم نے ایک شریف بندے سے کوئی بھی بد تمیزی کی یا زیادہ جاہ و جلال دکھایا تو میں پتھر کا بن جاؤں گا۔“

”در اصل میں کیسٹ لینے آیا ہوں ایک آدھ میگزین بھی مل جائے تو وقت ذرا اچھا کٹ جائے گا۔“ اس کے لبوں کی پُرکشش مسکراہٹ علیحدہ پر سے یوں گزر گئی جیسے پتھر پر سے پانی گزر جاتا ہے۔

”جی، میں دیکھتی ہوں۔“ وہ جلدی سے اٹھی اور ایک الماری کھول کر کھڑی ہو گئی۔ فلک نے بیڈ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ باقی کتابیں تو اکٹھے کر کے ایک طرف رکھی تھیں صرف ایک نوٹ بک ایک طرف الٹی رکھی تھی جیسے وہ کچھ لکھتے لکھتے اٹھی ہو۔ فلک نے ہاتھ بڑھا کر وہ نوٹ بک اٹھالی۔ بڑی صاف ستھری تحریر میں لکھا تھا۔

”ایمان داری رشتوں میں ہو تو رشتے فولادی ہوتے ہیں ورنہ کچے دھاگے کی طرح ٹاپا تپا تپا۔۔۔۔۔ نفرت ایک چٹانی جذبہ جو زندگی کو بلندی پر لے جاتا ہے۔ جی لینا اور زندہ رہنا دو الگ الگ کیفیتیں ہیں۔ آنسو خون کا وہ قطرہ ہے جو غم کی شدت سے پانی بن جاتا ہے۔ رشتے زندگی کا پھیلاؤ ہیں یہ دکھ زیادہ دیتے ہیں۔ میرا وجود ہے سچائیوں کا آئینہ یہ اور بات ہے کہ میرا کوئی گواہ نہیں۔ ایک تنہا بھی اپنی جگہ سے سرک جائے تو اتنی محنت سے بنایا نازک گھونسلہ خطروں میں گھر جاتا ہے۔“

”یہ دیکھ لیجیے شاید کوئی آپ کے مطلب کی شکل آئے۔“ علیحدہ نے چند سی ڈیز اور میگزین اس کی طرف بڑھائے جو اس نے تھمکنے سے کہہ کر اس کے ہاتھ سے

لے لیے اور نوٹ بک واپس بیڈ پر رکھتے ہوئے بولا۔

یہ آپ نے لکھا ہے؟“
”سب تو نہیں صرف چند ایک لائنز کچھ اچھا لگے تو نوٹ کر لیتی ہوں۔ جیسے یہ گھونسلے والی لائن۔ آپ نے پچھلے پرآمدے میں ابا بیل کا گھونسلہ تو دیکھا ہوگا۔ کس محنت اور لگن سے ایک ایک تنکا پتا نہیں کہاں کہاں سے اٹھا کر لاتی ہیں اور گھونسلہ بنا رہی ہیں۔“
”واقعی میں ان کی جفاکشی پر بہت حیران ہوتا ہوں بلکہ میں نے اس گھونسلے کی تصویریں بھی لی ہیں۔ ہم انسانوں کے لیے بہت سبق ہے ان کی اس محنت پر۔“ فلک نے چند منٹ توقف کیا پھر نوٹ بک کی طرف دیکھ کر بولا۔

”آپ کا انتخاب واقعی بہت اچھا ہے لیکن میں صرف چند ایک ہی سے متفق ہوں۔“
”باقیوں میں کیا خرابی ہے؟“ اس کی آواز میں ہلکی سی کھنک تھی۔

”کوئی خرابی نہیں، اپنی اپنی سوچ، اپنا اپنا نظریہ ہے۔ البتہ رشتوں کے بغیر زندگی کے خوب صورت رنگ ذرا مدہم ضرور پڑ جاتے ہیں۔“ فلک نے سنجیدگی سے کہا۔ علیچہ چند لمحے خاموش رہی جیسے فلک کے منہ سے نکلنے والے ہر لفظ کو کسی ان دیکھے ترازو میں تول رہی تھی پھر آہستگی سے بولی۔

”زندگی کے ہر روپ، ہر رنگ میں رشتوں اور جذبول کے علاوہ حالات کا سب سے زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔ حالات درست تو زندگی کا رنگ شوخ ورنہ مدہم اور پھیکا۔“ اس کا اندازہ کہہ رہا تھا کیسٹ اور میگزین لینے آئے تھے وہ مل گئیں، تمہارا کام ختم اب فضول کی بحث میں کیوں الجھ رہے ہو۔ کیوں اپنا ... اور میرا وقت ضائع کر رہے ہو.....؟ اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھو۔

سچ تو یہ تھا کہ عالیہ سے لمبی چوڑی فضول کی ماحنامہ پاکیزہ۔ منی 2012ء

بحث کے بعد ابھی تک وہ اپنے اندر کی لرزشیں سنہا نہیں پائی تھی۔ اب اوپر سے یہ حضرت آگئے تھے فلسفہ اور اپنی ذہانت کا رعب جھاڑنے بات زیادہ ہوتی تو شاید کھلم کھلا ڈانٹ بھی دیتی، لڑ بھی لیتی یہی خطرہ تھا۔ گفتگو کا آغاز جس انداز میں ہوا تھا اور جو لے رہا تھا۔ وہ فلک کو اس مقصد سے کوسوں دور جاسکتا تھا جس کی تکمیل کے لیے جانے وہ اپنے آپ کیسے آمادہ کر پاتا تھا۔ جس بہانے سے آیا تھا۔ وہ پورا ہو گیا تھا۔ بغیر کسی وجہ کے بات کو طول دینا۔ اصل مقصد سے دور بھی کر سکتا تھا۔ دل میں جو امیدیں مہک رہی تھیں مرجھا بھی سکتی تھیں۔ جو خوشگفتہ پھول کھاتے تھے وہ ذرا سے تیز جھونکے سے ٹوٹ کر بکھر بھی سکتے تھے۔ لیکن اگر اب وہ دل کی بات زبان پر لائے بغیر اٹھ جاتا تو پھر یہ انمول لمحے دوبارہ نصیب نہیں ہونے تھے۔ فیصلے کی یہی گھڑی تھی اور راجی کا موقع نکل بھی۔
”علیچہ.....“ وہ بڑی ہمت کر کے دھیمی آواز میں بولا۔

اس نے جھکی ہوئی پلکیں اٹھائیں اور متوقع نظروں سے دیکھنے لگی۔
”اگر آپ اجازت دیں تو کیا میں چند سوال کر سکتا ہوں؟“ فلک کی بچی آنکھوں میں جیسے امید ویم کی سی کیفیت تھی۔

علیچہ نے وہ دل میں اتر جانے والی نگاہیں دیکھیں تو اس کے منہ کھولنے سے پہلے ہی معاملے کی گہرائی تک پہنچ گئی۔ ضرور وہ وہی سوال کرے گا جو پہلے عالیہ بھابی کر کے گئی تھیں۔ یہ سوچ کے ہی اس کے سینے میں مد و جزر سے اٹھنے لگے تھے۔ پتا نہیں اس آزمائش سے اسے کتنی بار گزرنا پڑے گا پھر بھی اخلاقی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ملامت سے بولی۔
”بلا تکلف پوچھیں۔“

”سب سے پہلے تو اس سوال کا جواب دیجیے کہ

کے خیال میں، میں کیسا انسان ہوں.....؟“
فلک نے ذرا مضبوط لہجے میں پوچھا۔
علیچہ نے فوری کوئی جواب نہیں دیا۔ دراصل وہ لمحوں کے معدوم ہونے کی منتظر تھی جو فلک کی جودگی کے جادو کی اثر سے اسے کمزور بنا رہے تھے۔
”بہت مشکل سوال ہے کیا؟“ فلک ہنس کر بولا۔

”نہیں، بالکل بھی نہیں، بہت آسان اور سیدھا ما سوال ہے، آپ..... آپ ایک بہت اچھے، نیک اور مند اور قابلِ قدر انسان ہیں۔“ وہ بھی ہنس کر بولی جیسے بہت لاکھلی لے رہی ہو۔
”بقول آپ کے اگر مجھ میں اتنی خوبیاں ہیں تو why not take a chance on me“ فلک کی آواز میں جیسے اس کا دل بول رہا تھا۔

”چانس اور وہ بھی ایک مرد پر.....؟“ اس نے طنزیہ انداز اور دبے دبے غصے سے گلابی ہوتے ہارے سے جواب دیا۔
”ابھی تو آپ مجھ میں پائی جانے والی خوبیاں گوارہی تھیں۔ اس حساب سے تو آپ آنکھیں بند کر کے مجھ پر چانس لے سکتی ہیں۔“ فلک پُر اعتماد لہجے میں بولا۔

”میں ایک دفعہ چانس لے چکی ہوں مسٹر فلک اور آپ اس کے انجام سے بھی واقف ہیں۔“ علیچہ کے لہجے میں کڑواہٹ کھل چکی تھی۔

”کیا اللہ تعالیٰ کی بنائی سب چیزیں ایک سی ہوتی ہیں؟ پھول، پودے، چاند، سورج، زمین، آسمان، بچے، انسان کیا یہ سب ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے؟“ فلک نے جیسے سر پر کفن باندھ لیا تھا۔

پھر کوئی خواب بنو

”کیا کسی نے آپ کو سفیر بنا کر بھیجا ہے؟“ وہ ذرا تکیے لہجے میں بولی۔

”کیوں، آپ سے بات کرنے سے پہلے سفارت خانہ کھولنا پڑتا ہے؟“ فلک نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا۔ آپ کی انفارمیشن کے لیے عرض ہے کہ مجھے کسی نے سفیر بنا کر نہیں بھیجا۔ میرے خواب..... میرے ارمان اور دلی آرزوئیں مجھے آپ کے در پر سوالی بنا کر لائی ہیں ویسے میں بڑوں کی اجازت بھی لے کر آیا ہوں۔“ وہ بڑی پامردی اور حوصلے سے علیچہ کی حیرت زدہ آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو فلک کی جرات اور صاف گوئی پر کمرے تو کیا گھر سے باہر نکال دیتی لیکن اس کی پشت پر تو اس کے بڑوں کا ہاتھ تھا، رضامندی تھی۔ اس لیے نہ تو کمرے سے نکال سکتی تھی، نہ منہ توڑ جواب دے سکتی تھی، نہ اکٹھڑ پن اور بدتمیزی سے پیش آ سکتی تھی لیکن اپنا موقف تو کھل کر بیان کر سکتی تھی۔

”آپ نے ابھی ابھی کہا تھا کائنات کی ہر چیز ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ میں مانتی ہوں آپ نے درست فرمایا تھا لیکن اس زمرے میں مرد نہیں آتے۔ وہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے۔ مکار، فریبی، جھوٹے، خود غرض، دھوکے باز، ان کا خمیر ہی شاید بھونرے کی راکھ سے اٹھایا گیا۔ کسی مرد پر دوبارہ اعتماد کرنا اس سے بڑی نادانی میں کبھی نہیں کر سکتی۔“ اس کے لہجے میں اتنی سچائی اور زہریلا پن تھا، حسین آنکھوں میں غم کی اتنی اتھاہ تھی کہ خود فلک کا دل چل گیا کہ اپنا کیس واپس لے لے اور تو قیر کا گلا اپنے ہاتھوں سے کھونٹ آئے۔ جس نے ایک پھول سی نازک اور فرشتوں سی پاکیزہ لڑکی کو دکھوں کے ساگر میں دھکیل دیا تھا۔ وہ چند لمحے سر جھکائے کچھ سوچتا رہا پھر حوصلے اور نرمی سے بولا۔

ماہنامہ پاکیزہ۔ منی 2012ء

تعلیم، صحت، مستقبل.....

”یہ محض آپ کا خیال خام ہے کہ جس زندگی، آپ سوچ رہی ہیں وہ صرف آپ کے خاندان کے لیے ہے۔ آپ کی ادھوری زندگی سب پر کس طرح انداز ہو رہی ہے وہ آپ کے والدین کو کس طرح متاثر کر رہی ہے، یہ سوچیے اس پر غور کیجیے آپ جو کچھ ان کے لیے کرنے کا عزم کیے بیٹھی ہیں اس کی انہیں پوچھیں تو اتنی ضرورت نہیں۔ اس لیے لا حاصل قربانیاں دینے سے انہیں کیا سکھ ملے گا یہ ضرور سوچیں..... سچ پوچھیں تو میں آپ کے اس نظریے سے ہی متفق نہیں۔“ فلک قدرے سخت لہجے میں بولا، ”تو نہ ہوں متفق، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس کا پارا بھی ہائی ہو گیا۔

”یہی تو اصل وجہ ہے کہ آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ تو اپنے تلخ ماضی اور اس سے جڑے ہر لمبے سے وابستہ ہو کر بہت سکون اور آرام سے ہیں۔ نہ والدین کی گرتی ہوئی صحت اور ان کی مجبوریاں، نہ بھائیوں کی ذلت داریاں اور پریشانیاں نہ جوان بہن کے ارمان نہ اس کے خواب نہ اس کے مستقبل کی فکر..... مجھے صرف یہ بتائیں اپنے تجربے سے نہیں صرف مشاہدے سے بتائیں جب بڑی بہن گھر کی دہلیز کا پتھر بنی بیٹھی ہو تو وہاں کوئی دوسری کے لیے قدم رکھ سکتا ہے؟ آپ اس وقت کے متعلق کیوں نہیں سوچتیں جب دستک دینے والے ہاتھ تھک کر لوٹ جائیں گے اور جب مجبور اور بے بس والدین سب کچھ بھول کر والدین کا حق استعمال کرتے ہوئے شیر زمان کی درخواست منظور کر لیں گے۔“ فلک کے لہجے میں نہ منت تھی، نہ ساجت تھی بلکہ زندہ حقیقت تھی۔

”شیر زمان.....؟“ علیہ کو جیسے کرنٹ سا لگا۔
”ہاں علیہ، شیر زمان آپ کیا سمجھتی ہیں اس کی اماں جی ہر دوسرے تیسرے دن صرف چائے پینے

”دیکھو عالی تم اپنی جگہ جو کہہ رہی ہو بالکل درست کہہ رہی ہو۔ تم ایک اذیت ناک اور دل شکن تجربے سے گزری ہو جس کا اثر صرف تم پر ہی نہیں گھر کے ہر چھوٹے بڑے پر ہوا ہے۔ جو ذہنی اور روحانی صدمہ تمہیں پہنچا ہے اس دکھ کو... صرف تم جانتی ہو اور کوئی اس درد اور اذیت کو نہیں سمجھ سکتا لیکن بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ خداوند کریم نے سب انسانوں کو الگ الگ فطرت عطا فرمائی ہے سب کا خیر بھونرے کی راکھ سے نہیں اٹھا گیا۔ کیا ماموں جان، سہیل بھائی، سلمان بھائی، خود میرے پاپا اور جنید بھائی یا اور فیملی ممبر زان سب میں کیا ایسا کوئی بھی عیب ہے؟ اگر تو قیر میں دنیا بھر کی برائیاں ہیں تو ضروری تو نہیں وہ سب..... میں ہوں اور خاص کر مجھ میں ہوں.....؟“
فرط ضبط سے فلک کا چہرہ کئی رنگ بدل رہا تھا۔ امید و بیم کی سرکش موجیں اسے کبھی اس کنارے لے جا رہی تھیں کبھی اس کنارے۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں، بل بھر کو میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ جو حادثہ میرے ساتھ ہوا وہ میرے نصیب میں تھا لیکن میں اس کا کیا کروں کہ میرا چوٹ خوردہ دل، میری ریزہ ریزہ خود داری اور میری سستی تڑپتی انا دوبارہ ایک نئی ٹھوکر کھانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یقین کیجیے مجھ میں دوبارہ اس بلی صراط پر پاؤں رکھنے کی نہ ہمت ہے نہ حوصلہ..... تصور ہی سے روح لرز اٹھتی ہے۔ باقی رہی میری زندگی تو وہ میں نے اپنے خاندان، والدین اور بھائی بہن کے لیے وقف کر دی ہے۔ برائے مہربانی اس چپٹر کو اب کلوز ہی سمجھیں۔“ علیہ نے بڑے عزم اور مضبوطی سے کہا۔
”خاندان.....؟ آپ کو خاندان کی فکر ہے؟“
فلک کی آواز میں گہرا طنز تھا۔

”ہاں..... فکر ہے اپنی زندگی سے بھی زیادہ فکر“
مجھے ان سے وابستہ ان کی ہر چیز کی فکر ہے، ان کی
254 ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء

آتی ہیں.....؟“ فلک نے دل کڑا کر کے ایک اوچھا وار کیا۔

”کیا..... کیا..... یہ سچ ہے؟“ علیہ کی جیسے جان ہی نکل گئی۔

”میں نے ایک بھاری بھر کم شیر زمان کی ہم شکل آنٹی کو مای کے پاس بیٹھے دیکھا ہے۔ خوب خاطر داریاں ہو رہی ہوتی ہیں۔“ علیہ کی اڑی اڑی رنگت دیکھ فلک کو ایک پھڑکتا ہوا آئیڈیا سو جھاتا تھا۔

”تو..... تو.....“ علیہ سے کچھ سمجھنا کچھ کہنا دو بھر ہو رہا تھا۔

”تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے علیہ جی کہ ماموں اور ممانی آپ کی بہتری کے لیے اور اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھالیں۔ اتنا حق بنتا ہے نہ ان کا۔ اس سے تو آپ ایگری کریں گی نا.....؟“

”ہاں، یہ تو میں مانتی ہوں۔ وہ جس طرح چاہیں میری زندگی کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میری رائے چاہے پوچھی جائے یا نہ پوچھی جائے اور ان کے فرمان کے آگے سر جھکانا میرا فرض ہے لیکن شیر زمان.....؟“

اب ایک نئی فکر علیہ کی روح قبض کر رہی تھی۔

یہاں سے الگ الگ ہیں، کیا یہ وہی جگہ ہے جہاں سے ہمیں ہمیشہ کے لیے پھڑٹا ہے.....؟“ علیہ روکھی پھیکی آنکھوں میں ہلکی سی ملاحت تو کیا شرمندہ تو کیا افسوس تک نہ تھا۔

”آپ کی درخواست کا میں تفصیلی جواب دے چکی ہوں۔ اب اسے پھر مت کھولے پلیز.....! آپ تشریف لے جائیں تو بہتر ہوگا اس سے پیشتر کہ میں لحاظ کی ساری حدیں پار کر جاؤں۔“ وہ بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ لمبے لمبے مباحثوں اور شیر زمان کے بھوت نے اسے دہلادیا تھا۔

”جو حکم علیہ بیگم، آج کے بعد آپ کو میری صورت تو کیا آواز بھی سنائی نہیں دے گی۔“ اگر پتھر بننے کا فن آپ کو آتا ہے تو میں بھی ریت کا بنا ہوا نہیں۔“ اس کی ٹھہری ٹھہری آواز میں کسی جذبے کی کھنک نہ تھی۔ وہ ہارا ضرور تھا لیکن ایک بہت بڑی جنگ لڑنے کے بعد..... پھر وہ آہستگی سے اٹھا اور قریبی ٹیبل سے ٹشو بکس اٹھا کر علیہ کے سامنے رکھ دیا۔

”شاید آپ کو ان کی ضرورت پڑے۔“

”کبھی نہیں پڑے گی۔“ علیہ نے ہاتھ کے ایک جھٹکے سے ٹشو بکس خود سے دور کر دیا جیسے اس۔۔۔ چیز کو چھونا بھی حرام ہو جسے فلک نے ہاتھ لگایا ہو اور فلک ایک لمحے کے بغیر دروازے کی طرف بڑھا۔

”ذرا رکے پلیز.....“ علیہ کی آواز نے اس کے اٹھتے ہوئے قدم روک لیے۔

”میں جانتی ہوں لاہور سے لے کر اب تک جو ڈراما کرتے آئے ہیں.....“

”ڈراما آپ نے چاہے کیا ہو لیکن میں نے کوئی ڈراما نہیں کیا تھا۔ یوں بھی آج اس ڈرامے کا ڈراما پ سین بھی آپ کے ہاتھوں انجام پا چکا ہے۔“ وہ بڑی بیگانگی سے کہہ رہا تھا۔

”اس کا مطلب ہے.....؟“

”مطلب صاف ظاہر ہے۔“ اس نے ذرا سا اس کی طرف اجنبی نظروں سے دیکھا۔

”جس کے حوصلے اتنے بلند ہوں جس کی خود دی چٹان جیسی ہودہ سب صفائیاں سب وضاحتیں اور کسکتی ہے اسے اب کسی ڈراما بازی کی ضرورت میں رہی مس علیہ.....“ وہ لائقیت سے کہتا دروازہ پار رکھا۔

”مس علیہ.....“ یہ دو لفظ لفظ نہ تھے جلتے تھے۔ جو فلک کی زبان سے نکل کر جیسے اس کا دامن جلا گئے۔ اتنی اجنبیت..... اتنی غیرت..... اسے فلک جیسے نرم خوانسان سے اس قدر کٹھورتا کی امید نہیں تھی۔ بے اختیار ہو کر ڈال سے ٹوٹے پتے کی طرح بستر پر ڈھے گئی۔

☆☆☆

آج فلک کی درد بھری آنکھیں اور صبر و ضبط کی ابتداء دیکھ کر اس کے ذہن میں گئے جالے دل کے ہر تار سے لپٹی اپنی زنجیریں بغیر کسی آہٹ کے ایک ایک لپکر کے بکھر گئی تھیں۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ جب کوئی آنکھوں میں امید کے ستارے بھرے ہاتھوں میں ارماتوں کا کشکول لیے کسی کی دہلیز پر آتا ہے اور خالی ہاتھ لوٹا دیا جاتا ہے تو انسان چاہے کتنا ہی بے ضمیر کیوں نہ ہو دل کو اپنی زیادتی کی ہلکی سی چہمن ضرور محسوس ہوتی ہے۔

پہلے تو کبھی ایسی کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ کبھی کسی پچھتاوے کی تپش نے نہیں جلایا تھا پھر آج کیا خاص بات ہوئی تھی جو اسے بار بار لگ رہا تھا کہ اس نے اپنی جھوٹی انا اور اندھی ضد میں آکر ایک نیک دل معصوم اور فرشتہ صفت انسان کی نہ صرف توہین کی تھی بلکہ اس کا دل توڑا تھا، اس کے خواب چور چور کیے تھے۔ اس کی عزت اور غیرت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے اپنے

کمرے سے نکالا تھا نہ صرف اپنا انتقام پورا کیا تھا بلکہ اپنی جلتی سلکتی روح کو شانت کیا تھا۔ آج اس پر یہ حقیقت عیاں ہوئی تھی کہ اس میں اور تو قیر میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی خباثت اپنی بے وفائی دکھا کر کی تھی تو اس نے اپنی زبان کے دار کر کے دکھائی تھی تو پھر اس میں اور تو قیر میں کیا فرق رہ گیا تھا۔ اس مردہ ضمیر شخص نے دھوکا دے کر اسے زخم دیے تھے تو اس نے بھی اپنے ضمیر کی ایک نہیں سنی تھی۔ ایک دفعہ جو منہ سے نہ نکلی تو کسی کی کوئی منت سماجت..... کوئی التجا کوئی دلیل اسے ہاں میں نہ بدل سکی اور اب جب اس نے اپنے من کی کر لی تھی، جب اپنی جیت کا جھنڈا بلند کر دیا تھا اس کا پیار سے بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک کر اسے اپنے کمرے سے بے عزت کر کے نکال دیا تھا تو اپنا فیصلہ غلط کیوں محسوس ہو رہا تھا۔ یہ کیوں احساس ہو رہا تھا کہ جو کہا جو کیا غلط تھا؟

”فلک کو یوں ٹھکرا کر تم نے کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا علیہ..... تمہارے جیسی لڑکی جسے کھوٹے کمرے کی تمیز نہ ہو، جس کی عقل ذہن پر ماضی کے پردے پڑے ہوں، جس کے ہوش و حواس پر صرف اور صرف بے غیرت اور بے حس انسان کی پرچھائیاں لہراتی ہیں وہ اپنا اور اپنے پیاروں کا یا کسی اور کا بھلا کیسے سوچ سکتی ہے۔ وہ تو بس اپنی فتح و کامرانی پر خوش ہے۔ غیرت ایک مرد کا قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ وہ اس کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرتا ہے۔ اس پر ایک پھول کی چوٹ بھی پڑے تو وہ اپنی جان پر کھیل جاتا ہے اور تم نے تو اسے پتھر مار مار کر لہو لہان کر دیا ہے، ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ کسی اور کا انتقام اسے بے نیل و مرام نکال کر لیا ہے اب جو ردِ عمل ہوگا اس کی ذمے دار تم ہوگی، تمہارے اس ناروا سلوک سے اس کے چلے جانے سے ابو پر جو صدمہ گزرے گا، امی کا جو دل ٹوٹے گا کیا تم ان کو قائل کر کے

مطمئن کر سکوگی، انہیں سنبھال سکوگی.....؟“ اس کا ضمیر جیسے اس پر کوڑے برسا رہا تھا۔ اسے سنگدل، ظالم، پاگل بے عقل اور پتا نہیں کیا کیا کہہ رہا تھا۔ جس کی اذیت اتنی ناقابل برداشت تھی کہ سہنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا تھا، یہ تغیر اور تبدل کیوں تھا۔ اچانک پچھتاوے کی آگ کیوں بھڑک اٹھی تھی؟ وہ بے تابانہ اٹھی کمرے کی کھڑکی کھولی اور بلند چوٹیوں کو چھو کر آنے والی ٹھنڈی ہوا کے۔۔۔ سامنے کھڑی ہو گئی۔ کتنی عیادیر وہ بے حس و حرکت سرد ہواؤں کی زد میں کھڑی رہی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہہ رہے تھے اور دل جیسے پچھتاوے کے انگاروں پر تھا۔

”میں تو ایک کمزور اور بے بس لڑکی ہوں جسے شعور کی پہلی میزمری پر قدم رکھتے ہی ٹھوکریں کھانی پڑی تھیں۔ ظالم دنیا اور پتھر دل سماج کے واسطے پڑے تھے۔ میں نہ سنگدل ہوں، نہ ظالم، میں تو بس ایک مجبور، لاچار اور ڈری سہی لڑکی ہوں۔ جس نے لوگوں کی خوشنود نظروں سے بچنے کے لیے اپنے چاروں طرف لائق، ضد اور ہٹ دھرمی کی چادر لپیٹ رکھی ہے۔ لوگوں کی زہریلی زبانوں سے نکلے الفاظ اور خونی آنکھوں سے برستے تیر کس طرح ایک ایک رگ کا خون نچوڑتے ہیں یہ کون جان سکتا ہے میرے سوا کون سمجھ سکتا ہے.....؟“ وہ نم آلود چہرے سے ٹکراتی سرد ہواؤں سے پوچھ رہی تھی اور دکھیا رہے دل کے ایک چھوٹے سے گوشے میں بیٹھی مٹی سی چڑیا اپنی مہین سربلی.... آواز میں کہہ رہی تھی۔

”ایک شخص کے لیے..... ہاں علیہ صرف ایک شخص کے لیے سارے زمانے اور اس کے ہاتھوں پہنچے دکھوں کو بھلا دو۔ ان یادوں کی دیوار گرد و جو تمہیں روکے ہوئے ہے تم اسے منالو علیہ..... یہ لمحے بیت گئے تو پھر ہاتھ نہیں آئیں گے جاؤ اور جا کر اسے

روک لو۔ دو سیڑھیاں نیچے اترنے سے تمہاری / اور وقار میں کوئی کمی نہیں آئے گی..... اسے ایک د بتادو، تم وہ نہیں جو سب سمجھتے ہیں جو وہ سمجھتا ہے تم علیہ ہو..... جس کے زخم خوردہ دل میں نہ نفرت ہے بغض نہ عناد اور نہ انتقام کی آگ۔ جاؤ اور ہمت کے اسے روک لو..... نہیں تو وہ چلا جائے گا اور دنیا بھڑ میں کھو جائے گا اور کوئی کالا کلونا شیر زمان تمہا آچل تھام لے گا۔ بس اب دیر نہ کرو نہیں تو پچھتاوے کی آگ تمام عمر تمہیں جلائی جھلساتی رہے گی۔“ اس بے کل روح نے اس سے کھڑے رہنے کی بھی طاقت چھین لی تھی وہ بہ مشکل کھڑکی بند کر کے مڑی تو عالیہ کھڑاپایا۔

”آخر کار تم نے اپنی من مانی کر کے ہی لیا؟“ عالیہ کی آنکھوں میں اتنی رنجش اور شکایتیں تھیں کہ علیہ سے ان کی طرف ایک لمحے سے زیادہ دیکھا گیا۔

”میں نہیں سمجھتی مجھے اب اتنا حق ہے کہ تمہیں روشنی اور اندھیرے کا فرق بتاؤں یا تمہارے اس فیصلے سے جو پر ابلز ہوں گی یا جو دو خاندانوں میں تو پھوڑ ہوگی وہ باد دلاؤں کیونکہ جو ہوگا تم بخوبی جانتی ہو۔“ عالیہ نے ججھی بجھی آواز میں کہا، لگتا تھا فلک دل پر پڑنے والی چوٹ نے انہیں بری طرح مجروح کیا تھا۔

”تو آپ ہی بتائیں نا میں کیا کروں؟“ اچانک ان کے شانے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

”مجھ سے مشورہ مانگنے کے بجائے تم خود سے پوچھو علیہ۔ یہ تمہاری زندگی ہی نہیں پورے گھر اور اس کے بانیوں کا مسئلہ ہے۔ صحیح راستے پر اٹھایا گیا قدم ہمیشہ منزل پر پہنچتا ہے اور جلد بازی میں اٹھایا پاؤں منزل سے دور لے جاتا ہے۔“ عالیہ نے اس کے ملائم بالوں پر زری سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”آپ کا کیا خیال ہے اگر میں جا کر روک لوں تو وہ میرے کہنے پر روک جائیں گے؟“ اس کی آواز میں سسکیاں تھیں اور چہرے پر بہتے آنسوؤں کی پورش۔

”آزمائے میں کوئی حرج تو نہیں..... آج کل تو صرف سوری کہہ دینے سے ساری ناراضیاں دور ہو جاتی ہیں۔“ عالیہ نے اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھے۔ علیہ فوراً کچھ نہ بولی گوگو کی سی حالت میں کھڑی رہی۔

”چپ کیوں ہو کچھ تو بولو.....“ عالیہ نے ٹھوڑی پکڑ کر اس کا جھکا ہوا چہرہ اٹھایا۔

”میرا دل کہتا ہے کہ میں نے جو کیا غلط کیا اس کے لیے مجھے ان سے سوری کہنا چاہیے۔“ علیہ نے بھیگی بھیگی نظروں سے عالیہ کی آنکھوں میں دیکھا اور عالیہ نے ان اشک آلود آنکھوں میں وہ سچائی چمکتی دیکھ لی جو شاید علیہ کو خود بھی معلوم نہ تھی۔ عالیہ نے سرشاری کے عالم میں اس کو سینے سے لگا لیا اور دعائیہ انداز میں بولی۔

”جاؤ علیہ، دو لفظ کہہ کر سارا فساد یہیں ختم کر دو تاکہ پھر ایسے گمبیر مسکوں سے واسطہ نہ پڑے۔“ علیہ کچھ کہنے کے بجائے پنگ پر ٹک گئی جیسے ٹانگوں میں کھڑا رہنے کی ہمت نہ رہی ہو۔

”اب اٹھو بھی..... کہیں دیر نہ ہو جائے۔“ عالیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

”بھالی آپ میرے ساتھ چلیں۔“ وہ ہلتی ہو کر بولی۔

”نہ بابا، یہ تم دونوں کا معاملہ ہے۔ اس لیے خود ہی بنناؤ۔ پہلے وہ تمہارے پاس آیا تھا، اب تمہاری باری ہے۔ صبر اور تحمل سے سب مسئلے حل ہو جاتے ہیں..... اب جاؤ۔“ عالیہ نے حوصلہ افزائی کرنے کے انداز میں اس کے ہاتھ دبائے۔ علیہ نے ٹشو بکس

سے چند ٹشو نکالے۔ فلک کی چھوڑی ہوئی سی ڈیز اور میگزین اٹھائے ایک لمحے کے لیے عالیہ کی طرف دیکھا۔

”اور آپ.....؟“

”مجھے کئی کام کرنے ہیں، ماموں اور ممانی کو تسلی دینی ہے، سہیل کو اطمینان دلانا ہے۔ اس لیے تم اللہ کا نام لے کر اپنے مشن پر نکلو۔ جاؤ میری جان حوصلہ بلند رکھنا۔“ عالیہ نے تاکید کی۔ علیہ کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جو سوچا تھا اس پر عمل کرے۔

اچانک اسے ایک چینی کہاوت یاد آ گئی جو اس نے اپنی ڈائری میں کہیں لکھی تھی۔

”ایک تنکا بھی اپنی جگہ سے سرک جائے تو اتنی محنت سے بنایا گھونسل خطر دل میں گھر جاتا ہے۔“

”نہیں، میرے جیتے جی یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے ہر حال میں اپنا خوب صورت آشیانہ بچانا ہے، میں اس کا ایک تنکا بھی ادھر سے ادھر نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے کھسنے والے تنکے کو اس کی جگہ پر فٹ کرنا ہے۔ ایک

پاش پاش لہو لہان دل پر دلجوئی کا مرہم لگانا ہے۔ چور چورانا پر پیار بھرا ہاتھ رکھنا ہے اور کھلتی ابلیتی غیرت پر آنسوؤں کا چھڑکاؤ بھی کرنا ہے۔“ وہ اپنی سوچوں میں ڈوبی دھڑکتے دل کو ہزار جتن سے سنبھالے فلک کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یوں جیسے کوئی مجرم تختہ دار کی سمت بڑھ رہا ہو۔ وہ دروازے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ فلک کی آواز نے اس کے اٹھتے قدم روک لیے وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا اور سخت غصے میں تھا۔ فلک اور اتنا غصہ یہ حقیقت آج ہی اس پر کھلی تھی۔

”فارگاڈ سیک، کچھ سوچ سمجھ کر بات کرو۔ بے ٹکی مت ہانکو، اتنی اہم بات میں نے موقع مل دیکھ کر ہی کی تھی۔ یونہی ہوا میں تلواریں نہیں چلا دی تھیں بلکہ

بزرگوں کا اوکے کا سنگل ملنے پر ہی کی تھی۔ یونہی منہ اٹھا کر نہیں چلا گیا تھا۔ "یورٹش جذبات سے فلک کی آواز میں جیسے اس کا دل لرز رہا تھا۔

"اب کیا ہوتا ہے، کل صبح بس واپسی ہوگی میں تو ابھی روانہ ہو جاتا لیکن میں ماموں جان اور فیملی کو ان ویران اندھیروں میں اکیلے نہیں چھوڑ سکتا۔" اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کس قیامت سے گزر رہا تھا۔

"نہیں ہے سمجھنے سمجھانے کی گنجائش..... کانی بے آبرو ہو چکا، بے غیرت بن چکا، مجھ میں تو کسی بچے کا سامنا کرنے کی بھی ہمت نہیں۔ وہاں کم از کم راوی چناب تو ہیں میرے زخمی وجود کو ٹھنڈک پہنچانے والے بڑی خاموشی سے سیٹ لیس گے مجھے اتنی ملائمت اور پیار سے کہ ایک لہر سے دوسری لہر کو بھی پتا نہیں چلے گا۔"

"ہاں، بکواس ہے تو بکواس ہی سہی بزدلی ہے تو بزدلی ہی سہی لیکن میں بے غیرتی کی زندگی نہیں جی سکتا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"اب زیادہ بحث کر کے مجھے اور پاگل نہ بناؤ، مجھ میں کچھ اور سننے کی طاقت ہے نہ حوصلہ..... کہیں میرے آتے آتے راوی چناب خشک نہ ہو جائیں۔" وہ بوجھل آواز میں ہنسا۔ آگے فلک کی ایک طرف نہ گفتگو سننے کی علیحدہ میں ہمت نہ رہی وہ آندھی طوفان بنی اندر داخل ہوئی۔ ہاتھ میں پکڑی سی ڈیز اور میگزین پلنگ پر پھینکے اور جھپٹ کر فلک کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا جو بت بنا اس کی سائیکلون نما انٹری دیکھ رہا تھا۔

"یہ عجیب و غریب گفتگو کس سے کر رہے تھے؟" وہ بہ مشکل تمام بول سکی۔

"کیا بات کرنے پر کرفیو لگا ہوا ہے؟" وہ پہلی دفعہ غصے سے بولا۔

"یہ فلک کس راوی چناب کی بات کر رہے تھے؟" وہ بغیر کسی لحاظ کے تھکمانہ بولی۔

"السلام علیکم!" راحیل غریب نے ہاتھ سے اڑتے طوطوں کو سنبھالنا چاہا۔

"وعلیکم السلام، اب میرے سوال کا جواب دیجیے؟" اس کا انداز اب بھی تھکمانہ تھا۔

"وہ..... وہ دراصل فلک واپسی پر بونٹک کا پروگرام بنا رہا تھا۔" راحیل یہ مشکل کہہ سکا۔

"جھوٹ مت بولیں، سچ بتائیں کیا وہاں طوفان آیا ہوا ہے؟" علیحدہ کا لہجہ کافی سنگین تھا۔

"آیا تو نہیں مگر کسی بھی وقت آنے کا امکان ہے۔" راحیل نے عاجزانہ کہا۔

"سنیے راحیل بھائی اگر آپ نے فلک کو ان کے قریب پھٹکنے بھی دیا تو..... تو میں سارے پڑا پار لر بند کر وادوں گی..... بلکہ..... بلکہ سب کو آگ لگا دوں گی۔" غصے کی شدت سے اس کی آواز ہی نہیں سارا جسم لرز رہا تھا۔

"اتنا خیال ہے میرے یار کا.....؟" راحیل نے موقع غنیمت سمجھ کر سیدھا سیدھا پوچھا۔

"ہاں خیال ہے..... بہت زیادہ....." وہ تقریباً چیخ کر بولی۔

"اگر اتنا زیادہ خیال ہے تو میرا دوست ایسی خونخوار باتیں کیوں سوچ رہا ہے۔ واپس آنے کا پروگرام کیوں بنا رہا ہے؟" راحیل گرمی کھا کر بولا۔

"اب سارے پروگرام کینسل سمجھیں۔ اب وہی پروگرام بنے گا جو میں بناؤں گی سمجھے آپ....."

"جی سمجھ گیا۔" اور پوچھتا اس کے کہ راحیل اپنی بات پوری کرنا علیحدہ نے موبائل بیڈ پر پھینک دیا۔

"اور آپ نے یہ کمرے کا کیا حشر کر رکھا ہے۔ کوئی بھی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں۔" اس نے حیرت سے نجد فلک کے ہاتھ سے شرٹ کھینچ لی جو وہ نہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

فلک کچھ کہنے کے بجائے اس کا حسین جلالی چہرہ

دیکھ گیا۔ علیحدہ اور راحیل کے درمیان ہونے والی گفتگو کی نہ تک پہنچنے کے بعد ہاتھوں پیروں سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔

"اسے خیال ہے میرا..... بہت زیادہ خیال ہے۔ اس کا مطلب ہے غصے کی شدت سے علیحدہ کی زبان سے وہ بات نکل گئی تھی جو ایک گہرا راز بن کر اس کے دل میں چھپی تھی اور جسے وہ اتنی آسانی سے شاید عیاں نہ کر پاتی۔" فلک سے کوئی جواب نہ بن پایا..... حیرت کے سمندروں میں ڈوبا علیحدہ کی صورت دیکھتا رہا۔

"میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں فلک..... داب کیوں نہیں دیتے۔ یہ کمرے کی کیا حالت بنا رکھی ہے کیا بچوں کے ساتھ مل کر فنٹ بال کھیل رہے تھے۔" اس کا جلالی لہجہ صاف ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے پہلے حملہ کرنے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

"وہ دراصل....." وہ سخت نروس ہو رہا تھا۔

"وہ..... کیا دراصل.....؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ پلنگ کر رہا تھا۔ سچ بولنے میں کیا حرج ہے؟" وہ غصیلی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"میں ابھی سب ٹھیک کر دوں گا۔" وہ بحرمانہ اتنا ہی کہہ سکا۔

"کوئی ضرورت نہیں کچھ کرنے کی۔ پڑا رہنے دیں سب کچھ کسی چیز کو ہاتھ لگایا تو....." علیحدہ کا پراگندہ ذہن آئینے کی طرح صاف ہو چکا تھا۔ اس کی جلد بازی اس کی ہٹ دھری فلک کو آخری فیصلہ کرنے پر مجبور کر گئی تھی۔ اس نے واپسی کا ارادہ کر کے اپنی ٹھکست کا اظہار کر دیا تھا اور اب اس کا یہ فیصلہ یہ ارادہ علیحدہ کو ڈرا رہا تھا۔ خوف زدہ کر رہا تھا اور پھر جانے کب اور کیسے خون کے آنسو روتے بے کل دل سے سرکش جذبول کا طوفان سا اٹھا اور علیحدہ کے گردنیں خار دار تاریں ایک ایک کر کے گرنے لگیں۔ اس کی نم آلود

آنکھیں فلک کی ٹھکست خوردہ آنکھوں سے الجھ گئیں جن میں حسرتیں تھیں التجائیں تھیں۔ ریزہ ریزہ خوابوں کی گرد تھی۔ اف وہ نگاہیں..... جیسے مسمار شدہ زندگی دکھائی آکھوں میں سمٹ آئی ہو۔ نگاہوں کی ڈور کیا بندھی جیسے گردش کرتی کائنات تھم کر رہ گئی ہو، ہر چیز اپنی جگہ پر ساکت تھی کچھ باقی تھا تو صرف دو ہیرے جیسی خوب صورت آنکھیں اور خوب رو چہرے کا اضمحلال اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ ہو گیا جو فلک کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ علیحدہ جراتمندانہ قدم اٹھاتی آگے بڑھی اور اس کی جیکٹ کے دونوں فلیپ مضبوطی سے اپنے لرزتے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

"آئندہ کبھی راوی چناب کا نام لیا یا مجھ سے پوچھے بنا کہیں جانے کا تصور بھی کیا تو..... تو....." گلے میں بھری سسکیوں نے اسے کچھ کہنے ہی نہیں دیا اور کہنے کو تھا بھی کیا۔ سب کچھ تو اس کی نازک انگلیوں کی لرزشیں، رخساروں پر بہتے آنسو کہہ رہے تھے۔ سارے راز تو حسین چہرے پر پھیلی مظلومیت کہہ رہی تھی۔ دل و روح کے جذبے نازک لبوں کی کپکپائیں عیاں کر رہی ہوں تو زبان خاموش ہی رہتی ہے نا..... اور پھر حال دل کہنے کی نہ ہمت رہتی ہے نا ضرورت..... اور فلک کی حالت تو نہ گفتہ بہ تھی۔ ساری ہمتیں کھوئے جیسے کسی اور ہی دنیا میں تھا۔ کسی ایسی دنیا میں جہاں نہ کوئی آواز تھی نہ صدا صرف شبیہ فضاؤں کی تھم تھم الوہی گونج تھی اور دور شعور کی وادیوں میں ایک ہلکی سی سرگوشی تیر رہی تھی۔

"پلیز فلک مجھے یوں چھوڑ کر نہ جائیں، مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے، میں اپنی جلد بازی پر بہت شرمسار ہوں۔ میری خطائیں بخش دیجیے۔ خدارا..... مجھے بخش دیجیے۔ پلیز..... پلیز فلک....." اور وہ سرگوشی سرگوشی

نہیں نرم دلائم تھلیاں تھیں جو گرم گرم سانسوں اور آنسوؤں کی رو پر بہتی اس کے سینے کو چھو رہی تھیں بھگور ہی تھیں اور فلک اس کے ملائم بالوں پر ٹھوڑی رکھے خاموش تھا۔ لا جواب تھا جیسے اپنے ہوش و حواس کے ساتھ آواز بھی کھو بیٹھا ہو۔ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا تھا کہ علیہ جیسی خود سر اور ضدی لڑکی اپنی غلطی قبول کر رہی تھی، رو رو کر معافی مانگ رہی تھی مگر کیوں.....؟ ایک مختصر لمحے میں یہ تغیر و تبدل کیوں.....؟

”فلک آپ سنتے کیوں نہیں، بولتے کیوں نہیں، میری معذرت قبول کیوں نہیں کرتے۔ میں وعدہ کرتی ہوں ایسی گستاخی ایسی بدتمیزی پھر کبھی نہیں کروں گی۔ میں اپنے آپ کو بالکل بدل لوں گی۔ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی بس ایک دفعہ معاف کر دیجیے۔“ وہ زار و قطار روتی جا رہی تھی اور کہتی جا رہی تھی۔

”یہ سب آپ میرے لیے کریں گی.....؟“ جانے وہ کن گہرائیوں سے ابھرا۔

”ہاں، آپ کے لیے کروں گی۔“ وہ پورے عزم سے بولی۔

”فلک کے لیے..... ایک بھونرا صفت انسان کے لیے.....“ وہ اپنے اندر کی لٹی کو چھپانے لگا۔

”جی.....“ تنہی سی جی ریزہ ریزہ ہو کر ابھری۔

”مگر کیوں.....؟“ وہ حیرتوں کے سمندر میں غرق شکست خوردہ علیہ سے مخاطب تھا۔

”کیونکہ اب مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ آپ کا کہا ایک ایک لفظ درست تھا۔ ایک ایک دلیل وزنی اور سچ تھی اور آپ بھونرا صفت نہیں ہیں۔“ وہ مضبوطی سے بہ مشکل کہہ سکی۔ فلک نے زندگی میں پہلی بار ایک ہمت کا کام کیا۔ اس نے بڑی ملائمت سے علیہ کے

دونوں بازو تھام کر اسے پٹنگ پر بٹھا دیا اور خود اس کے قدموں میں یوں بیٹھ گیا جیسے کوئی پجاری کسی دیوی کے قدموں میں بیٹھتا ہے پھر اس نے بڑی جرات سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مقید کر لیے۔ اس کی اس بے باکی پر علیہ نہ کسمپاسی نہ ہاتھ کھینچے اور نہ ہی نظر اٹھا کر اس کی صورت دیکھنے کا حوصلہ کر سکی۔

”میرے پاس تو ایک اتنی وجہ ہے علیہ..... لیکن مجھ پر اعتبار کرنے کا آپ کے پاس کیا ریزن ہے؟“ اس نے بڑی نرمی سے سوال کیا۔

علیہ نے کچھ کہنے سے پہلے اشک بار نظریں اٹھا کر اس کی محبت بار آنکھوں میں دیکھا نظروں کی ڈور کیا بندھی سارے دل کے راز افشا ہو گئے۔ اس کے دل کا ہر جذبہ آئینے کی طرح صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے احساسات اس کی سوچیں اس کے خواب کوئی چیز بھی تو مخفی نہ رہی تھی کیونکہ ان کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ تھا۔

”بولو علیہ کچھ تو کہو تا کہ مجھے پتا چلے کہ میں کس کنارے پر کھڑا ہوں۔“ فلک نے اس کا ہاتھ دبایا۔

”میرے پاس..... میرے پاس بھی وہی ریزن ہے فلک جو آپ کے پاس ہے۔ مضبوط اور اتنی.....“ علیہ یہ کہتے ہوئے یہ اقرار کرتے ہوئے پوری جان سے لرز رہی تھی۔

”ایک مرتبہ پھر سوچ لیں علیہ..... کہیں کوئی پریش آپ کو کوئی ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور تو نہیں کر رہا جو آپ نہ کرنا چاہتی ہوں۔ کہیں کوئی زور زبردستی آپ کو کپڑا مانڈ کرنے پر مجبور تو نہیں کر رہی؟ فلک نے جان نثاری سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں فلک، ایسی کوئی مجبوری نہیں، یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔ دیر میں سہی لیکن میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر..... دل اور روح کی پوری سچائیوں سے کہہ

رہی ہوں۔“ اس کی شبیہ آنکھوں میں موتی چمک رہے تھے۔ شاید روحانی طمانیت سے یا دل سے اٹھتی ایسی میٹھی صداؤں سے۔

”دوسرے لفظوں میں آپ جانس لے رہی ہیں۔“ فلک کی آواز میں ہلکی سی شوخی عود آئی۔

”جی.....“ اس نے بار حیا سے سر جھکا لیا۔ دو پاسی ندیوں کا یہی سنگم تھا اور کہنے سننے کو کچھ باقی نہیں تھا۔ کچھ دیر دونوں اسی طرح سحر آگیاں لحوں کی گرفت میں بندھے رہے۔ آخر علیہ نے دھیرے دھیرے فلک کے ہاتھ ہٹائے، چہرے پر بہتے آنسو پونچھے اور آہستگی سے کھڑی ہو گئی..... پتا نہیں عالم غفلت میں کیا کچھ کہہ گئی تھی جذبات کی روائتی اچانک اور منہ زور تھی کہ جو کچھ اب تک چھپاتی آئی تھی چھپا نہیں سکی تھی۔ ادھر فلک کی حالت اس سے زیادہ بہتر نہ تھی، دل و جان پر نئے نئے جذبات اور نئی نئی ملی خوشیوں کا اتنا بوجھ تھا کہ اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ علیہ نے پھر نہ نظر اٹھا کر فلک کی طرف دیکھا نہ ایک لمحہ رکی، بلکہ قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئی اور فلک سرشار سادہ ہوش سا جادو کی خوشبوؤں میں لپٹا ہلے پردے کو دیکھا رہا جہاں سے وہ گئی تھی۔

”چاہے دیر سے ملا۔ ملا تو سہی میرے مولا.....“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے رب کا شکر ادا کیا اور جب ہاتھ نیچے کیے تو نظر بینڈ پر پڑے موبائل پر گئی جس کی اسکرین روشن تھی۔ اس نے موبائل اٹھایا اور آرام سے بستر پر لیٹ گیا۔

”ہیلو راجی کیا بات ہے؟“ فلک کے اندر جو طمانیت اور مسرتوں کے قافلے اترے تھے وہ اسے بے دم و بے حال کیے ہوئے تھے۔ ان کا تقاضا تھا کہ وہی آواز وہی الفاظ سن رہا ہے کچھ اور نہ سنے نہ سنائے لیکن مجبوری تھی۔

”بات تو کوئی خاص نہیں۔“ راجیل شرارت

مدینہ منورہ میں مساجد کی زیارت کے دوران گاندھ ہر مسجد کے بارے میں متعارف کر دار ہا تھا۔ مسجد ایجابہ کا تعارف اس نے ان الفاظ میں کر دیا کہ اس جگہ ظہر یا عصر کی نماز کے دوران رسول اللہ حضرت محمد ﷺ نے تین دعائیں مانگی تھیں دو قبول ہوئیں اور ایک رد ہوئی۔ وہ تین دعائیں یہ ہیں۔ میری امت کو ہلاکت میں نہ ڈالنا۔ مجموعی قحط میں نہ ڈالنا۔ نفاق میں نہ ڈالنا۔ پہلی دو قبول ہوئیں اور آخری رد ہوئی۔ ہمارے پیارے رسول ﷺ نے اپنی امت کے لیے کیا اور کتنی دعائیں کیں ہمیں کسی گواہی کی ضرورت نہیں..... مگر مجھے ایک دم احساس ہوا کہ ہم بحیثیت پاکستانی قوم ان دعاؤں کے حصار سے ضرور نکل گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہلاکت میں نہیں ڈالے گا۔ ہم خود اپنے آپ کو ڈال لیتے ہیں۔ مجموعی قحط تو نہیں مگر ہمارے حکمران ہمیں مصنوعی قحط میں ضرور مبتلا کیے رکھتے ہیں کبھی بجلی نہیں کبھی گیس نہیں کبھی کچھ پانی نہیں کبھی آنا اور چینی نہیں۔ شکر ہے سورج کی روشنی اور ہوا اُن کے قابو میں نہیں۔

از خالہ نسیم..... نیوزی لینڈ

”تو پھر.....؟“

”ذرا کلائی میں ورد ہو رہا ہے۔“ وہ غرے سے بولا۔

”کیا ٹینس کھیل رہے تھے؟“ فلک نے چوٹ کی۔

”ٹینس اور اس اندھیرے میں۔“ وہ پھر ہنسا۔ ”وراصل موبائل پکڑے پکڑے کلائی میں بل پڑ گیا ہے۔“ راجیل نے چھیڑتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تو تم سن رہے تھے؟“ فلک حیرت زدہ رہ گیا۔

”دونوں طرف سے موبائل کھلے ہوں تو کچھ نہ کچھ کان میں پڑ ہی جاتا ہے۔ کوئی بہرا تو نہیں میں۔“

”اخلاقاً تم اپنا موبائل ہی بند کرو دیجے۔“ فلک شرمندہ ہو گیا۔

”کیوں بند کر دیتا، اتنی میٹھی میٹھی apple pie جیسی گفتگو چل رہی تھی۔ کاش لیلیٰ بھنوں‘ شیریں فرہاد، ہیرا پنجا جیسے نامور لوگ دیکھتے کہ آج کل کے ماڈرن نوجوان دل کی باتیں کیسے کرتے ہیں۔ نہ وہ تارے توڑنے کا ذکر نہ پہاڑ سر کرنے کے قصے نہ جان دینے کے دعوے، مجھے تو آج پتا چلا کہ اوپر سے فرشتے نظر آنے والا میرا راندر سے کتنا پکا ہے۔۔۔ موبائل آف کر دیتا تو ہیرے موتیوں جیسی باتیں کہاں سے سنتا؟“ راجیل اتنا ہوشیار تھا کہ بولے ہی چلا گیا۔

”اب بس بھی کرو راجی بیلنس ختم ہو جائے گا۔“ فلک نے جان چھڑانی چاہی۔

”ابھی تو مبارک دینی باقی ہے۔“

”کس چیز کی مبارک؟“ فلک بن کر بولا۔

”صحیح وقت پر موقع محل جول گیا.....“ راجیل

نے یاد دلایا۔

”ہاں راجی ویسے مجھے پتا نہیں تھا کہ یہی موقع محل ہے۔ بس بات نکلی تو دور تک چلی گئی۔“ فلک مسکینی سے بولا۔

”ویسے تم ٹھیک کہتے تھے علیجہ بہن واقعی شیرنی ہیں شیرنی کوئی چڑیا وڑیا نہیں..... میں جو راجا لندر بنا صوفے پر نیم دراز مزے سے پیپسی کے ٹھنڈے ٹھنڈے گھونٹ بھر رہا تھا خدا کی قسم ان کی آواز سننے ہی اٹینشن ہو گیا تھا۔ ہاتھوں کے طوطے اور حواسوں کے معصوم کبوتر ابھی تک قابو میں نہیں آئے اور ہرن جیسا بھولا بھالا دل جانے کس جنگل میں کد کڑے مار رہا ہوگا۔ ای بھی دودھ ماتھا چیک کر کے گئی ہیں کہ راجی بیٹے کو ٹیپر چر تو نہیں ہو گیا جو چپ چاپ پڑا ہے۔ یقین کرو ابھی تک جسم میں جان نہیں آئی۔ تمہارا کیا بنے گا فلک.....؟“ وہ رو دینے کو تھا۔

”اب زیادہ بے پرکی نہ اڑاؤ اور میرے پیچھے کوئی چڑیا گھر کھولنے کا ارادہ ہے کیا؟ طوطے، کبوتر، ہرن، بانی کچھوے اور مگر چھ ہی رہ گئے ہیں ان کا آرڈر بھی دے دو۔“ فلک نے جوابی حملہ کیا۔

”ہاں بھئی، آج تمہارا وقت ہے ہنس لو، جی بھر کے مذاق اڑالو۔ مجھے بھی کسی پہاڑ کے دامن میں کوئی ٹوٹا پھوٹا موقع محل مل ہی جائے گا۔“ وہ بڑا مسکین بنا کہہ رہا تھا۔

”اچھا راجی..... ابھی کے لیے خدا حافظ، انشاء اللہ کل پھر بات ہوگی۔“ فلک نے دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس کر کے بات ختم کی۔ وہ موبائل رکھ کر سیدھا ہوا تو دروازے میں علیجہ کو کھڑا پایا۔ روئی روئی بھیگی بھیگی آنکھیں۔

”کیا واقعی راجیل بھائی جانوروں کا فارم کھول رہے ہیں؟“ علیجہ بے یقینی سے بولی۔

”اس کی چھوڑو علیجہ، دوسروں کی کیا خبر ہے؟“

فلک نے متفکرانہ کہتے ہوئے پتنگ پر بکھرے کپڑوں میں سے ایک بند کور کا سرا پکڑ لیا شاید سہارے کے لیے۔ ”زیادہ تو کچھ نہیں کہہ البتہ ایک سزا تجویز کی ہے۔“ علیجہ نے چادر کا دوسرا کونا پکڑ لیا۔

”سزا.....؟“ فلک ہڑبڑا سا گیا۔

”ہاں سزا.....“ وہ بڑے پختہ لہجے میں بولی۔ فلک سے کچھ اور نہ کہا گیا دل جیسے حلق میں دھڑک رہا تھا۔ ضرور شیر زمان والا قصہ ہوگا۔

”آپ ڈریں نہیں، یہ وہ سزا نہیں جو آپ سوچ رہے ہیں۔ بس یہ کہا ہے کہ سزا یہ ہے کہ میں خود جا کر آپ سے کہوں کہ.....“ وہ دانستہ رک گئی۔

”کیا کہیں جلدی بتائیں.....“ فلک کی بے قراری قابل دید تھی۔

”یہی..... کہ..... کہ وہ میرے بلکہ ہم دونوں کے اس فیصلے سے متفق ہیں بلکہ بے انتہا خوش ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے علیجہ کی خوب صورت آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر سنہری رنگ بکھر رہے تھے۔

”خدا کی قسم علیجہ آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی، میں سمجھا.....“ فلک بے قابو ہو کر آگے بڑھا اور علیجہ کو شانوں سے تھام کر اپنے قریب کر لیا بیٹا اسے کوئی چھین کرے جارہا ہو۔

”زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں، کچھ کام کروائیں۔“ علیجہ نے شرمیلے انداز میں اس کے ہاتھ ہٹائے اور چادر کا دوسرا سرا اس کی طرف بڑھایا۔

”مجھے سب بتاؤ علیجہ آخر مجھے بھی تو ان کا سامنا کرنا ہے۔ مجھ سے کوئی صفائی مانگ بیٹھے، تو میں کیا کہوں گا۔ ماموں جان نے کیا کہا۔ سہیل بھائی خفا ہوئے، مای نے ڈانٹا ڈپٹا.....؟“ فلک پریشانی میں سوال پر سوال کیے گیا۔

”نہیں بھئی ایسا کچھ نہیں ہوا۔ یہ سب ان کا پلان تھا۔ پھر کوئی کیوں خفا ہوتا، سب کی خفیہ رائے تھی

کہ ٹھنڈے ٹھار موسم میں بیٹھ کر کچھ سوچیں گے، کوئی منصوبہ بنائیں گے تو ہر اس سوچے گا۔ پہلے عالیہ بھابی کا آپ سے بات کرنا پھر ان کا میرے پاس آ کر مجھے برین واش کرنا اور پھر میری اور آپ کی پانی پت کی جنگ اور پھر اشک بھائی اور لازماً پھر پسپائی۔ ہو گیا نا سارا مسئلہ حل.....“

”یہ کوئی فلمی سین پاٹ تھا کہ آنے جانے ہی میں سارے مسائل حل ہو گئے۔ ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، ہماری روایات.....؟“ وہ اب بھی پریشان تھا۔

”پتا نہیں آپ بات کو اتنا طول کیوں دے رہے ہیں؟“ علیجہ نے زچ ہو کر بات کاٹی۔

”ایسا کچھ نہ ہوا نہ ہونے کا امکان ہے، ادھر کا محاذ بھی میں نے اچھی طرح سے سنبھال لیا تھا۔ ابو کے سینے پر سر رکھ کر جو نگا جتنا بھائی..... تو کمرے میں موجود ہر فرد اشکوں کے ریلے میں بہہ گیا۔ سارے گلے شکوے جاتے رہے۔ ابو کے پُر شفقت ہاتھوں کے دباؤ میں سب کچھ تھا۔ محبت، اعتماد، بھروسا اور بے پناہ خوشی..... زیادہ کہا سنی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ جب ذرا امن ہوا تو سزا کا آرڈر سنایا گیا اور یہ سزا بھی کوئی سزا نہیں تھی بلکہ..... بلکہ ایک نئی زندگی کا پیغام سمجھیں۔“ اس کی دلی مسرتوں کا اظہار اس کے چہرے پر چھائے سکون اور چاند کی کرنوں جیسی پر نور مسکراہٹوں سے ہو رہا تھا۔

”اس کا مطلب ہے.....“ علیجہ اپنی بات پوری نہ کر سکی۔

”کل ایک روشن صبح طلوع ہوگی۔“ فلک نے اس چادر کا دوسرا سرا پکڑ کر علیجہ کی طرف بڑھایا جو وہ فولڈ کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن علیجہ نے نیم نہ شدہ چادر اکٹا کر بیڈ پر پھینک دی۔ دونوں کے مسکراتے چہروں پر روحانی خوشیوں کا نکھار تھا۔

ماہنامہ پاکیزہ — مئی 2012ء 265

ڈائری سے انتخاب

میری پرانی ڈائری سے منتخب، آزمودہ گھریلو نسخوں اور چٹکوں کو بہت پسند کیا گیا۔
فرمائشیں ہیں کہ میں سارے نسخے ان صفحات کے ذریعے قاری بہنوں تک پہنچاؤں مگر مشکل
یہ ہے کہ معراج صاحب کی دیکھ بھال کے بعد میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔ یہ سالگرہ نمبر
دو ہے۔ اس کے لیے بہر حال مجھے وقت نکالنا پڑا۔ ذاتی صحت اور دیکھ بھال کے حوالے
سے مزید کچھ خاص نسخے وغیرہ حاضر خدمت ہیں۔

عذر قبول

..... روزمرہ غذا میں وٹامن "C" والی اشیاء مثلاً کھنڈے والے پھل، امرود، چیری، اناناس، بنہ
گوبھی، شلجم، نمائڑ، پیٹے اور کدو شامل ہوں۔
..... وٹامن "F" والی اشیاء مثلاً دودھ، مکھن، کلیجی، انڈے، گندم، بکئی، بنولے اور سویا بین کا تیل
بند گوبھی، مونگ پھلی کے علاوہ کچھ بزیوں اور گریوں کو اپنی غذا کا حصہ بنائیں۔
..... وٹامن "A" مکھن، دودھ، انڈے، کلیجی، مچھلی، گاجر، خوبانی، آڑو، پیٹے اور شلجم میں پایا جاتا
ہے۔ روزمرہ کی غذا وٹامن A کے بغیر نامکمل ہے۔
..... وٹامن B.1 گوشت، مٹر، چنا، چاول، چھلکے دار اناج، گندم، سویا بین کے آٹے، انڈے،
مچھلی، آلو بخارا، پھول گوبھی، بادام، اخروٹ اور پیٹے میں پایا جاتا ہے۔
..... وٹامن B.6 کلیجی، گندم، بھورے رنگ کے چاول، اخروٹ، مونگ پھلی، چٹکوں والے
اناج، کیلے، انڈے، ناشپاتی، انگور، گوبھی، بند گوبھی، ہرے مٹر، سویا بین، گاجر، نمائڑ اور شلجم میں ہوتا ہے۔
..... میکلائسم کے لیے گندم کی بھوسی، مونگ پھلی کا مکھن، گاجر، کیلا، خوبانی، پالک، دودھ اور انڈے
بہترین ذریعہ ہیں۔
..... وٹامن D دودھ، انڈے کی زردی اور مچھلی کے جگر کے تیل میں پایا جاتا ہے۔ اس کے استعمال
سے نیند طاری ہو سکتی ہے۔
..... وٹامن K سویا بین، پالک، بند گوبھی، پھول گوبھی، گائے کی کلیجی اور گروے، نمائڑ، اسڑا بری
گندم اور انڈے کی زردی میں ہوتا ہے۔ یہ جگر کے فضل کی اصلاح کرتا ہے، خون کو گاڑھا ہونے سے روکتا
ہے کلوث نہیں بننے دیتا ہے۔
..... وٹامن C اور D کی طرح E بھی بہت اہم ہے یہ دودھ، مکھن، کلیجی، انڈے، گندم، بکئی کے
تیل، سویا بین، بنولے اور کسم کے تیل، مارجرین، بند گوبھی، ہرے پتوں والی بزیوں، مونگ پھلی
بادام، پیٹے اور اخروٹ وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ بھی خون میں کلوث بننے کو روکتا ہے۔ آپریشن کے
مرحلے سے گزرنے والے مریضوں کے لیے مفید ثابت ہوا ہے دل کے عضلات کو مضبوط بنانے کے علاوہ
جسم کو غیر ضروری پانی سے نجات دلاتا ہے۔ بلڈ پریشر کو ہائی ہونے سے روکتا ہے۔ آئرن کے کپسول
وٹامن E کے کپسول میں 8 گھنٹے کا وقفہ ہونا چاہیے۔ تب ہی وٹامن E کو اپنی اثر انگیزی دکھانے کا

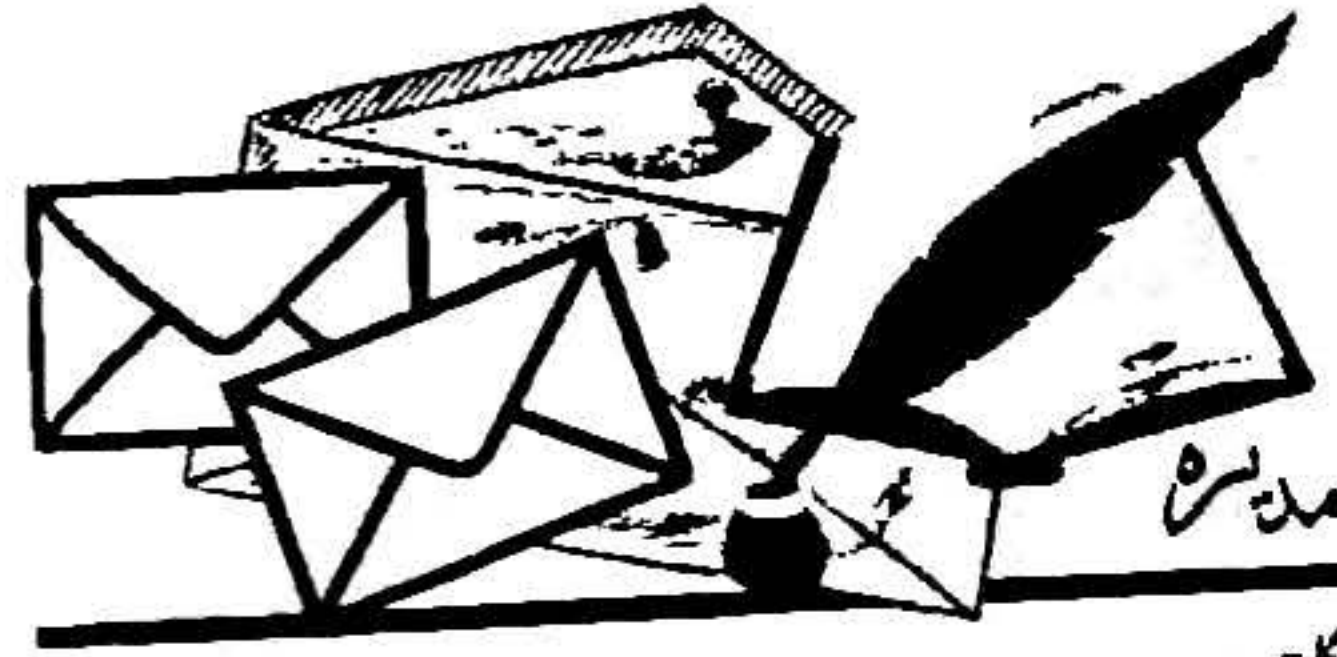
وقع مل سکے گا۔

..... وٹامن B کے خاندان کا ایک اور جز Paba (پابا) ہے جس کی کمی سے بال سفید ہونے لگتے
ہیں۔ یہ وٹامن کلیجی، بادام، پیٹے، اخروٹ، چاول، گندم، بھوسی اور کچھ بزیوں میں ہوتا ہے۔

کام کس باتیں

..... سالن میں آلو بالکل نہ گھٹنے دیتا چاہیں تو نصف کلوے کر کے نمک لگا کر رکھ دیں پندرہ منٹ بعد
ہلایا میں ڈال دیں تو آلو نہیں گھٹیں گے۔
..... گرمی میں گوشت کو خراب ہونے سے بچانا ہو تو ایک کپڑے کو سر کے اور پانی میں تر کر کے
گوشت پر لپیٹ دیں کافی دیر خراب نہیں ہوگا۔
..... چاولوں میں پسا ہوا نمک ملا دیں تو کیز انہیں لگے گا ایک من چاول کے لیے ایک سیر نمک ہو۔
..... مچھلی کی بدبودار کرنے کے لیے قتلوں کو لیموں کے عرق سے رگڑ کر بھونیں۔
..... نمائڑوں کے سروں پر تھوڑا سا سوم لگا کر رکھ دیجیے۔ نمائڑ کئی دنوں تک تازہ رہیں گے پانی میں
لگ محول کر نمائڑ اس میں ڈال دیں تو بھی نمائڑ کافی دیر تک سخت اور تازہ رہیں گے۔
..... کپڑے پر سے پان کا داغ دور کرنا ہو تو کچا امرود کاٹ کر داغ کو ملیں اور پانی سے دھولیں۔
..... کپڑوں پر سے گھاس کا داغ دور کرنا ہو تو پرہیزا نمک لگا کر چند منٹ بعد دھویں بالکل صاف
ہو جائے گا۔
..... سبزی کے داغ دور کرنے کے لیے آلو چھیل کر دو کلوے کر کے داغ پر ملیں۔
..... ریٹھی کپڑے دھوتے وقت اگر تھوڑا سا نمک پانی میں ڈالیں تو چمک برقرار رہتی ہے۔
..... سردرد کے لیے پسا ہوا نمک سوگھنا فائدہ مند ہے۔
..... بھکی آری ہو تو ذرا سا باریک نمک کھانے سے بند ہو جاتی ہے۔
..... نمک ملا کر پانی سے فرش دھویا جائے تو کھیموں اور کیزوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔
..... گلدان کے پانی میں ایک دو کوئلے ڈالنے سے پھول زیادہ دیر تک تازہ رہتے ہیں۔
..... چاول ایلنے لگیں تو اس میں لیموں کے رس کے چند قطرے ڈالیں چاول سفید ہو جائیں گے
موتی کی طرح چٹکیں گے۔
..... پالش والے فرنیچر کو تیل کے تیل سے صاف کیجیے اور پھر خشک کپڑے سے رگڑیں تو کافی چمک
پیدا ہو جائے گی۔
..... تار پین کا تیل، تل کا تیل اور اسپرٹ تینوں چیزیں ملا کر فرنیچر پر پالش کریں تو گرمی اور پانی کا
اس پر اثر نہیں ہوگا۔
..... اسٹیل کے برتنوں کو خوب چمکدار بنانے کے لیے صابن کے محلول میں چند قطرے لیموں کے چھوڑ کر
برتن دھویں اور کپڑے سے پونچھ لیں۔ شیشے کی چیزیں بھی صاف کرتے وقت چند قطرے لیموں کے ڈال
لیں چمک بے انتہا بڑھ جائے گی۔

بہنوں کی محفل



مدیر

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو جو بخشا اور درود و سلام حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ پیاری بہنو! پاکیزہ کا سالگرہ نمبر 1 پسند کرنے کا بے حد شکر یہ۔ ڈاک کا نظام خراب ہونے کے باعث بھی اور کراچی شہر کے دیگر گوں حالات کی وجہ سے بھی ہمیں آپ کے خطوط آہستہ آہستہ مل رہے ہیں۔ مگر بے فکر رہیے۔ آپ کا لکھا ہوا خط ہمیں خواہ کتنی ہی تاخیر سے ملے، وہ اس محفل میں شریک ضرور ہوگا۔ اس لیے اس شمارے کی تحریریں پڑھنے کے بعد آپ پہلا کام یہ کریں کہ ہمیں فوراً اپنی رائے سے آگاہ کریں۔

☆ موسم گرما کی لہر نے پورے ملک کو ہی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اس پر طرہ یہ کہ بجلی اتنی آتی نہیں ہے جتنی کہ جاری ہے۔ گرم موسم میں غصے اور اشتعال میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپ کو شش کریں کہ اس پر قابو پائیں۔ کہ غصے کی حالت میں چیزیں ہمیشہ بگڑ جایا کرتی ہیں، سنورا نہیں کرتیں۔ اسی لیے ہمارے مذہب میں غصے کو حرام کہا گیا ہے۔

پاکستان کا بڑا شہر ہوا چھوٹا۔۔۔۔۔ ان دونوں۔۔۔۔۔ ذرا سی بات بھی نیڑی ہو کر یوں ناگتی ہے۔۔۔۔۔ کہ شہر کے حالات دیگر گوں ہونے میں تاثر نہیں لگتا۔۔۔۔۔ اور ایسے حالات جب رونما ہو جائیں تو ہر قسم کے شر سے بچنے کے لیے یہ دعا کثرت سے پڑھیں۔
اللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِیْ نُحُوْرِهِمْ وَ نَعُوْذُ بِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ

پیاری بہنو! گو کہ میری چھٹی حس نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ میں اپنی بہت سی بہنوں کے نام لکھتا بھول جاؤں گی مگر مجھے واقعی یہ معلوم نہیں تھا کہ میں ان بہنوں کے نام لکھتا بھی بھول جاؤں گی۔۔۔۔۔ جو نہ صرف میرے دل کے قریب ہیں بلکہ ان کی تحریریں پاکیزہ کا سنگار بھی ہیں۔۔۔۔۔ اور ان میں پہلا نام لفظی عروج کا ہے۔۔۔۔۔ جنہوں نے ایک بڑے قحط کے بعد پاکیزہ میں دوبارہ لکھنا شروع کیا بلکہ ہماری فرمائش پر۔۔۔۔۔ ارم احتشام ہماری مستقل تبصرہ نگار ہیں۔۔۔۔۔ وہ کراچی میں ہوں یا کوئٹہ میں۔۔۔۔۔ ان کے تبصرے۔۔۔۔۔ باقاعدگی سے تو نہیں مگر اکثر و بیشتر پاکیزہ کے صفحات پر جھمکاتے ہیں۔۔۔۔۔ ارم اچھی تنقید نگار بھی ہیں۔ نجمہ ابراہیم داد نے عمان سے شکوہ کیا ہے اور بالکل صحیح کیا ہے۔ نجمہ ابراہیم داد پاکیزہ میں اس وقت سے تبصرے لکھ رہی ہیں۔۔۔۔۔ جب ان کے شوہر پاکستان میں عمان کے سفیر تھے۔۔۔۔۔ نجمہ اردو بولنا، لکھنا، پڑھنا بخوبی جانتی ہیں حالانکہ سعودی خاتون ہیں۔۔۔۔۔ اس سال بھی ان کے کئی تبصرے شائع ہوئے تھے۔ پیاری نجمہ میں معذرت خواہ ہوں کہ پتا نہیں کیسے میرے ذہن سے تمہارا نام محو ہو گیا۔۔۔۔۔ اسی طرح ایک خاص نام راحت وفا کا بھی ہے۔۔۔۔۔ ایک تھی نیناں ان کا ناول ابھی تو ختم ہوا ہے۔۔۔۔۔ مگر کیا کہیں۔۔۔۔۔ بشر ہونے کے ناتے غلطیاں ہم سے بھی ہوتی ہیں۔ راحت و فاقم یہ یقین کر لو میں نے ایسا قصد ابھر کر نہیں کیا ہے۔۔۔۔۔ بفضل خدا میری تمام تبصرہ نگار بہنوں اور رائٹرز بہنوں سے اچھی دوستی ہے اور کسی سے بھی کوئی لڑائی یا بدحرکتی نہیں ہوئی ہے۔۔۔۔۔ غصہ مجھے بے شک آتا ضرور ہے مگر کم آتا ہے۔۔۔۔۔ میں عطیہ ہدایت اللہ کا نام بھی لکھتا بھول گئی۔ پیاری عطیہ تمہارے مختصر افسانوں کی میں خود فین ہوں۔ مختصر افسانہ لکھنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔۔۔۔۔ مگر تم اس میں کامیاب ہو۔ نگینہ ضیائیکش ہماری کراچی کی تبصرہ نگار اور شاعرہ ہیں۔ صائمہ سجاد بخش ہماری کواٹ کی شاعرہ، تبصرہ نگار اور افسانہ نگار ہیں۔۔۔۔۔ آپ دونوں

بہنوں کی محفل

☆ ان کا فون سن کر بغیر نام بتائے میں آپ کو پہچان جاتی ہوں۔۔۔۔۔ مگر آپ دونوں بے حد پیاری، بہنوں کا نام لکھنے سے رہ گیا۔ اس کے لیے اپنی باجی کی معذرت قبول کر لیجیے۔ رابعہ فیاض قادری ہماری تبصرہ نگار بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔۔۔۔۔ ان کا ام بھی شام نہیں ہوا۔ رابعہ نے ہمیں فون تو کیا مگر شکایت نہیں کی۔۔۔۔۔ ان کے فون سے منٹ کر میں نے لہرست چیک کی تو معلوم ہوا۔۔۔۔۔ رابعہ کا نام تو لکھا ہی نہیں تھا۔ سلسلی اعوان جیسی مایہ ناز مصنفہ سے میں پہلی مرتبہ اسلام آباد میں ہونے والی ایک اہل قلم کانفرنس میں ملی تھی۔۔۔۔۔ اس بات کو یقیناً مترہ، اٹھارہ سال ہو گئے ہوں گے۔۔۔۔۔ مگر سلسلی اعوان سے رابطہ بدستور ہے رائٹر تو یقیناً وہ بہت اچھی ہیں سگر مجھے ان کا دعائیہ انداز بے حد پسند ہے۔۔۔۔۔ اور ایسی دعا دینے والی شخصیت کو میرا قلم کیسے بھول گیا۔ واقعی میری بد نصیبی ہے، اللہ انہیں سلامت رکھے اور وہ پاکیزہ کے بارے میں اسی طرح اپنی رائے دیتی رہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرا لکھا ہوا کوئی صفحہ۔۔۔۔۔ ادھر ادھر ہو گیا۔۔۔۔۔ اس کے لیے میں نے آمنہ حماد سے بھی پوچھا۔۔۔۔۔ مگر اس نے یہی کہا کہ کپور جنگ کے وقت وہ وہیں تھی۔۔۔۔۔ مگر میرا دل ابھی تک نہیں مان رہا کہ نیلوفر عباسی کا نام کیسے رہ سکتا ہے۔۔۔۔۔ نقد ہار آواز والی نیلوفر ہماری اچھی رائٹر ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد پیاری عادتوں کی ہیں بلکہ دونوں میاں بیوی کی جوڑی کی پہچان ہی اعلیٰ اخلاق ہے۔ لوگ خواہ مخواہ شناختی کارڈ پر گال پر تل یا ماتھے پر چوٹ کا نشان لکھتے ہیں۔۔۔۔۔ نیلوفر عباسی اور قمر عباسی کو تو میٹھی گفتگو کرنے والے لکھتا چاہیے۔ نیلوفر کی یادیں ہوں یا کوئی تبصرہ۔۔۔۔۔ ان کے جملے مشاس سے گوندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجھے تو بشری سرور۔۔۔۔۔ کا نام بھی لکھتا تھا۔۔۔۔۔ وہ بے شک پاکیزہ کے لیے نہیں لکھ پارتی ہیں۔۔۔۔۔ مگر ان سے ایس ایم ایس کے حوالے سے رابطہ قائم ہے۔ بشری ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں۔۔۔۔۔ اور انشاء اللہ ان سے رابطہ ہمیشہ برقرار رہے گا۔۔۔۔۔ ہاں بشری اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ صائمہ قیصر۔۔۔۔۔ ایک اچھی رائٹر ایک اچھی تبصرہ نگار کا نام اپنے دل سے تو کبھی نہیں بھول سکتی۔ جس کے لہجے میں شائستگی اور انکسار ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ماشاء اللہ اب تو ٹی وی رائٹر بھی ہیں۔ پیاری صائمہ یہ وعدہ رہا۔۔۔۔۔ اب آئندہ میرا قلم ایسی غلطی کبھی کرنے کی ہمت بھی نہیں کرے گا۔ (انشاء اللہ) گزشتہ ماہ ہماری بہت اچھی مصنفہ اور ہماری بہت ہی پیاری دوست دلشا و نسیم کو ایک گھرے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے شوہر جناب خالد محمود اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔ ایسے ہی صدمے سے کراچی میں مقیم ہماری بے حد اچھی تبصرہ نگار اور مصنفہ نگہت عبدالغفار کو بھی سامنا رہا۔ میں اپنی مصنفات دوستوں سے استدعا کروں گی کہ دکھ کی اس گھڑی میں اپنی ان بہنوں سے رابطے میں رہیں اور ان کا دکھ بٹائیں۔

اب آئیے پہلے ہم سب ایک بار درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں اور ایک بار آیت کریمہ۔

لا الہ الا انت سبحنک انی کنت من الظالمین

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ہماری بہت پیاری افسانہ نگار نگہت نسیم ان دنوں پاکستان آئی ہوئی ہیں۔۔۔۔۔ ان کے آنے کی وجہ اپنے کزن اور بہنوئی خالد محمود کے اچانک انتقال کے باعث ہے۔

☆ گزشتہ دنوں پاکیزہ کی تبصرہ نگار صبا نور، لیلیٰ بھائی کی شادی ہوئی ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ مسرت حسین، ٹورنٹو کے کراچی قیام کے دوران ان کی پیاری سی بیٹی نازیہ حسن کے نکاح کی تقریب مقای ہوئی۔ (بے حد مبارک باد)

☆ آپ کی باجی انجم انصار کا ٹی وی سوپ اٹھیلیاں اے پلس چینل پر شروع ہو چکا ہے جو ہر ہفتہ اور منگل کو شام سات بجے دکھایا جاتا ہے۔ منگل اور بدھ کی دوپہر ایک بجے دوبارہ ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے۔ یہ ایک گرم حراج ڈراما ہے۔ جس کے

نمایاں فنکاروں میں اظفر ریحان، فضا ملک لاشاری، شہناز پرویز، محمود اسلم، روبینہ اشرف، عائشہ طور، عائشہ خان اور دیگر شامل ہیں۔

☆ ہماری بے حد پیاری معنفہ رضوانہ پرنس کے افسانے خوشی کے رنگ پر بنایا ہوا ڈراما جو عمل ہم سے دکھایا گیا۔ رضوانہ کی مزید کئی کہانیوں پر ڈرامے بنائے جا رہے ہیں۔ (بے حد مبارک باد)

☆ سندھی زبان کا ایک ماہنامہ سر پیو سہیلیاں بے حد مقبول ہو چکی ہے اور معروف بھی۔ جو سندھی ادبی بورڈ کی جانب سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں اردو اور سندھی کی معروف ادیبہ سدرۃ العظمیٰ ہمارے ناول چاندنی کا سندھی ترجمہ بہت خوب صورتی کے ساتھ کر رہی ہیں۔ چاندنی کی پہلی قسط اس ماہ کے شمارے میں شائع ہو گئی ہے۔ (بے حد شکر یہ، سدرۃ العظمیٰ آپ کا بھی اور ہمارے سندھی قارئین کا بھی جو ناول چاندنی کو دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں)

☆ پاکیزہ کی تیسرہ نگار عائشہ سلیم کی شادی ہو گئی ہے اب وہ ماشاء اللہ عائشہ سلمان بن گئی ہیں اور لاہور سے انٹر جا چکی ہیں۔ (بہت ساری دعائیں)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری پروین قاسم، کراچی ان دنوں بیمار ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ ڈاکٹر انوار الحق ان دنوں شدید علیل ہیں ان کی کلی صحت کے لیے دعا کے لیے التماس ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تیسرہ نگار اور شاعرہ رفعت یمن رنی، کراچی تاحال بیمار ہیں ان کی صحت و تندرستی کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تیسرہ نگار اور شاعرہ امینہ عندلیب، سلاوا لی ہنوز بستر علالت پر ہیں ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆ ہماری بے حد سنیئر اور معروف معنفہ اختر بیگم کا افسانوں کا دوسرا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ اس کتاب کی روحانی بہت جلد ہوگی۔ (بے حد مبارک باد)

☆ معروف معنفہ نگہت العظمیٰ کے افسانوں کا مجموعہ آجکینے شائع ہو گیا ہے۔ ان کی کتاب کی تقریب بھی بہت جلد ہو گی۔ مبارک باد اس کتاب کی قیمت 225 روپے ہے، کتاب منگوانے کا ایڈریس علی میاں پبلی کیشنز۔ 20 عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

☆ پاکیزہ کی قاری حافظہ صبا صدیقی، لاہور کو حکومت پنجاب کی جانب سے بی ایس آنرز میں 75 فیصد نمبر لانے پر لیپ ٹاپ انعام میں دیا گیا۔ (مبارک باد)

☆ سڈنی میں مقیم شاہ تاج فاطمہ کی نامک میں فریچر ہو گیا ہے۔ وہ ان دنوں بستر علالت پر ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری پروین یوسف، ہالینڈ کی بنی عروج نے اپنی یونیورسٹی میں ٹاپ کر کے ایم بی بی ایس پاس کر لیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ جاسوسی پبلی کیشنز سے وابستہ محمد شہزاد خاں اپنے اہل خانہ کے ساتھ عمرے کی سعادت حاصل کر کے آگئے ہیں۔ (بے حد مبارک باد)

☆ معروف ٹی وی ایٹر اور معنفہ شازیہ افتخار خاں ان دنوں اپنے والد کی علالت کی وجہ سے لاہور سے کراچی آئی ہوئی ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تیسرہ نگار زرین زبیر کوٹھاری، کراچی ان دنوں ٹی وی کے کوئیک شو میں شرکت کر رہی ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ افسانہ نگار اور شاعرہ خالدہ نسیم کی پیاری بیٹی ڈاکٹر تہمتہ اپنی فیملی کی شادیوں میں شرکت کے لیے لندن سے

پاکستان آرہی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ افسانہ نگار ناول نگار اقبال مانو کے بیٹے ٹیپو نے اس سال بھی اپنی جماعت میں اول پوزیشن لی ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ ہماری بہت پیاری شاعرہ نگہت العظمیٰ کا دوسرا شعری مجموعہ ان دنوں زیر طبع ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ عظمیٰ آفاق سعید کی ساس اور میری بہت ہی محبت کرنے والی سوسن سروری باجی ان دنوں علیل ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆ افسانہ نگار اور شاعرہ رفاقت جاوید کا شمار بہت جلد ٹی وی رائٹرز میں ہونے والا ہے۔ وہ ان دنوں ٹی وی کے ایک چینل کے لیے سیریل لکھ رہی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ گزشتہ ماہ میری بیٹی رابعہ سلیم کی آئین کی تقریب سڈنی کے مقامی ہوٹل میں ہوئی۔ جس میں بہت سارے مہمانوں نے شرکت کی۔ (بے حد دعائیں اور مبارک باد)

☆ معروف ادیب اور شاعر جناب شجاع الدین غوری اور عزیز جبران انصاری نے مل کر ایک بہت خوب صورت اور دلچسپ کتاب بذلہ سبجان کراچی کے نام سے شائع کی ہے جس میں کراچی کے موجودہ طنز و مزاح نگار اور شعرا کو

ان کے مختصر انٹرویو اور تخلیقات کے ساتھ شامل کیا ہے۔ تصاویر بھی اچھی خاصی شائع کی ہیں۔ نثر نگاروں میں آپ کی باجی انجم انصاری شامل ہیں اور شعرا میں ہماری زہرہ جنید ہیں۔ اس کتاب کی قیمت صرف 400 روپے ہے اور صفحات 272 ہیں۔

کتاب منگوانے کا پتا یہ ہے۔ جبران اشاعت گھر۔ 102۔ عائشہ منزل۔ اردو بازار۔ کراچی۔ فون نمبر 021-35461804

☆ معروف شاعر ثاقب انجان کی دو کتابیں ہمارے پاس تیسرے کے لیے آئی ہیں جو بے حد اچھے کاغذ پر شائع کی گئی ہیں۔ ایبر کرم نعتوں کا مجموعہ ہے۔ جس پر کتاب کی قیمت درج نہیں ہے۔ دوسری کتاب جس کا نام من آنگن ہے وہ ثاقب

انجان صاحب کا شعری مجموعہ ہے جو بہت ہی اچھا ہے۔ عام فہم اور پراثر نعتوں، غزلوں کا جواب ہی نہیں ہے۔ ثاقب انجان کی مادری زبان میمنی ہے اور گجراتی رابطے کی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں خصوصاً غزلوں میں

راجستھانی، ہندی، گجراتی، دکنی، مارواڑی اور مقامی زبانوں کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ من آنگن کی قیمت صرف 250 روپے ہے۔ اور یہ دونوں کتب اس ایڈریس سے منگوائی جاسکتی ہیں۔ بزم تنویر ادب۔ ای 7۔ قانیو اسٹار گزٹری

اپارٹمنٹ بلاک نمبر 14۔ گلشن اقبال۔ کراچی۔ 75300 فون نمبر 34935675

☆ آپ کی باجی انجم انصاری کی طنز و مزاح کی نئی کتاب کھری کھری کتابی شکل میں شائع ہو گئی ہے۔ اس ضخیم کتاب کا

انتساب ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے نام ہے۔ اس کتاب کے بارے میں قمر علی عباسی، فریدہ لاکھانی، علامہ عبدالستار عاصم اور دیگر لوگوں کی آرا شامل ہیں۔ طنز و مزاح کے کٹھے ٹٹھے رنگوں والی یہ کتاب آپ کے ڈپریشن کو یقیناً ختم کر دے گی۔

کتاب کی قیمت صرف 500 روپے ہے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ مقبول اکیڈمی۔ چوک اردو بازار۔ سرگرم روڈ لاہور۔ فون نمبر 0333-4393422

☆ شاعرہ اور نثر نگار صدف جاوید قریشی کا پہلا شعری مجموعہ آس کو دل میں رہنے دو کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے۔ صفحات 169۔ کتاب کی قیمت درج نہیں ہے مگر کتاب بے حد سلیقے سے اور اچھے کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔

☆ ہماری نئی کتاب انمول خزانے کی دعائیں اور آزمودہ دعائیں اور ٹوٹے شائع ہو گئی ہے۔ قیمت صرف 200 روپے۔ کتاب منگوانے کے لیے فون کیجیے۔ 021-36981952

☆ شاعرہ، افسانہ نگار، ناول نگار نگہت العظمیٰ کا ناول ان دنوں زیر طبع ہے۔ (بیٹھی مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تیسرہ نگار اور شاعرہ فریدہ جاوید فری کا مجموعہ کلام پانچواں موسم شائع ہو گیا ہے۔ صفحات 144۔ قیمت 200 روپے۔ کتاب کی ناشر غزالہ جلیل راؤ ہیں۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ بارگاہ غزل پبلی کیشنز۔

پی او بکس نمبر۔ 7۔ جی پی او۔ اوکاڑہ۔ موبائل نمبر 0346-7414220۔ فریدہ جاوید فری نے اپنے نام کے ساتھ اب یوسف زلی کا اضافہ بھی کر لیا ہے۔ ان کا اسی ادارے سے ایک ناول بھی شائع ہونے والا ہے جس کا نام ہے۔ اس میں عکس وہ تیرا تھا۔

☆ دوہین رائٹرز فورم، پشاور کے زیر اہتمام ہما بیگ کی نئی کتاب کی رونمائی ہوئی جس میں بہت سی بہنوں نے شرکت کی۔ اسی فورم کے حوالے سے دوسری نوز یہ ہے کہ شاعرہ بشری فرخ کی صدارت میں خواتین کے عالمی دن کے حوالے سے ایک تقریب ہوئی جس میں خواتین نے اپنی نظمیں اور مضامین پڑھے۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی قاری ڈاکٹر سعدیہ، پشاور ایک پیاری سی بیٹی کی ای جان بن گئی ہیں۔ بیٹی کا نام صبا نہ سلمان رکھا گیا ہے۔ یوں ہماری شاعرہ فاتزہ شہزادانی بن گئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ افسانہ نگار رابعہ فیاض قاری ماشاء اللہ مرے کی سعادت حاصل کر کے آئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز ثروت شعیب، سوات مرے کی سعادت حاصل کر کے آئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری نسرین بانو، کراچی مرے کی سعادت حاصل کر کے آئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ ہماری ایک معتمدہ شاعرہ کو اپنے 28 سالہ گریجویٹ بزنس میں بھائی کے لیے گریجویٹ، خوب صورت مختصر فلمی سے رشتہ مطلوب ہے۔ خواہش مند قارئین 03122743303 پر رابطہ کریں۔

انتقالِ بر ملا

☆ ہماری مایہ ناز معتمدہ و شاد و نسیم لاہور کے شوہر خالد محمود مختصر علات کے بعد انتقال کر گئے۔

☆ میرے والد جناب انصار حسین صدیقی کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ ڈاکٹر آرزو نسیم کے والد سید خالد جیلانی کی اس ماہ برسی ہے۔

☆ تبصرہ نگار، شاعرہ فاتزہ شہزاد کے بہنوئی صلاح الدین بٹ صاحب انتقال کر گئے۔

☆ ہماری افسانہ نگار، شاعرہ نگہت عبدالغفار کے شوہر انتقال کر گئے۔

نوٹ: تمام مرحومین کے لیے دعائے مغفرت ضرور کریں اور تین بار سورۃ اخلاص پڑھ کر دعا کریں، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

کچھ ایسے عندلیب، سلاوالی سے۔ "میں ان دنوں بھی شدید بیمار ہوں۔ آپ سب بہنیں میرے لیے دعا کریں۔ میں اپنے اسکول اس وجہ سے بھی چلی جاتی ہوں کہ میرا دل پہلے..... کہ اسکول کی ہیڈ مسٹر نیس سے لے کر سارا اسٹاف بے حد محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا ہے۔ اپریل کا پاکیزہ میرے اسکول کی تمام ٹیچرز نے بڑے شوق اور بڑی محبت سے پڑھا اور دیکھا..... اندر کے صفحات کی تصاویر کو کہ خراب ہو گئی تھیں اور ان پر کلر پھیلا ہوا لگ رہا تھا مگر مجھے تو وہ بھی اچھی لگیں..... سارے ناول..... سب افسانے اے دن لگے..... میں کس کس کی اور کیا کیا تعریف کروں۔ عذرا باقی کی ڈائری کے صفحات بے حد مفید ہیں اور بہنوں کو خوب صورت بنانے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ آخر میں بہنوں سے استدعا ہے کہ وہ میرے لیے یہ دعا ضرور کریں کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔" (پیاری بہنو..... یہ دعا ہم کو سب کے لیے روزانہ کرنی چاہیے..... اللہ ہم سے راضی ہو جائے..... اور دونوں جہاں میں ہم سب کو خیر حاصل ہو، آمین ثم آمین)

کچھ شیریں نسیم، لاہور سے۔ "پاکیزہ نہ صرف مجھے اور میری فیملی میں پسندیدہ ہے بلکہ میری سہیلی پروفیسر رافدہ شاہ کی بہن اور بیٹیاں بھی اسے بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ میری دوست پروفیسر خاور بدر کی فیملی میں بھی بہت مقبول ہے اور ہم سب مل کر اس کی تحریروں پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ گزشتہ دنوں میں خاصی پریشان رہی میرے ایک داماد کے والد اور دوسرے

داماد کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بڑے اچھے لوگ تھے جواب نہیں رہے۔ اپریل کا شمارہ اے دن رہا۔ عمیر کی شادی کا احوال ہے وہ پسند آیا۔ تصاویر کی گلی۔ خاص طور پر ہم عظمیٰ آفاق کو ان کی فیملی سمیت دیکھنا چاہتے تھے۔" (انشاء اللہ آئندہ کسی موقع پر آپ ان کی تصاویر دیکھ لیں گی)

کچھ رمشا، کوٹ مٹھن سے۔ "پاکیزہ بہت اچھا لگا۔ کالج سی لڑکی میرا پسندیدہ ناولٹ ہے۔ عمیرہ احمد، ناہید سلطانہ اختر کے ناول بھی بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ پاکیزہ کے ساگرہ نمبر میں ایک شہزادے کی شادی کا مضمون، ہمیں بہت اچھا لگا۔ عظمیٰ آفاق اور ستارہ شیخ نے بہت مزے کا لکھا ہے، پڑھ کر ہنسی بھی آتی رہی۔ ہاں میرے کوٹ مٹھن میں میری تمام سہیلیاں پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔" (بہت شکریہ)

کچھ زبیدہ حبیب، لاہور سے۔ "اپریل کا ساگرہ نمبر بہت پسند آیا۔ تمام ناولز اچھے لگے۔ شیریں حیدر نے اپنے ناول کا اختتام ٹھیک کیا ہے۔ عظمیٰ نے بڑے دلچسپ انداز میں عمیر بیٹے کی شادی کا حال قلم بند کیا ہے۔ ہاں میری بیٹیاں ہنس رہی تھیں۔ انجم آنٹی کو سوجی کا طلوہ بنانا نہیں آتا۔ میں نے کہا انہوں نے ایسا مذاق میں لکھا ہوگا۔ تمام رائٹرز کو میرا سلام پہنچا دیں..... کہ وہ ہمارے لیے کیسی دلچسپ اور کارآمد تحریریں لکھا کرتی ہیں۔ اللہ ان کو خوش رکھے۔" (اور آپ کو بھی)

✉ عائشہ سلمان، سعودی عرب۔ مجھے تمہارا اس سے قبل کوئی خط نہیں ملا۔ شادی کے کارڈ پڑھ کر مجھے یہ معلوم ہی نہیں ہوا تھا کہ اسے کس نے بھیجا ہے اس لیے میں تمہیں مبارک باد نہیں دے سکی تھی۔ میری بے شمار دعائیں تمہارے لیے ہیں۔ ہاں یہ تو کبھی سوچنا بھی نہیں کہ میں تم سے کبھی ناراض ہو سکتی ہوں۔ تمہاری خوشیوں کے لیے ہمیشہ دعا گو رہوں گی۔ نہ جانے کیوں تم سے ایک خاص قسم کی اپنائیت سی رہی ہے۔

✉ تمثیلہ زاہد، کراچی۔ اللہ تعالیٰ تمہارے بھائی شیخ محمد طلحہ کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ تمہارا خط پڑھ کر میں اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں پاسکی۔ میری بہو عدوت میرے کرنے میں آئی اور مجھے اکتبار دیکھ کر پریشان ہو گئی..... میں نے اسے جب بتایا کہ ایک بچی کا خط پڑھ کر میرے دل پر اثر ہوا ہے..... تو اس نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا..... آپ کے پاس تو ہر روز ہر طرح کے خطوط آتے ہیں..... مگر تمثیلہ تم نے جس طرح اپنے دکھ کو مجھ سے شیئر کیا تھا، یہ میں ہی سمجھ سکتی تھی..... تم لکھنے کی جانب اپنا ذہن لگاؤ..... اپنے بچوں کا خیال کرو..... اللہ تعالیٰ تمہیں بے حساب خوشیاں عطا فرمائے، آمین۔

کچھ پروین عذرا تشنہ، کراچی سے۔ "انجم میں تم سے سخت ناراض ہوں۔ میں نے اتنے دل کے ساتھ سندیرہ بھیجا تھا مگر اس کو تم نے شائع نہیں کیا..... دیگر معذرت کے بارے میں بھی تو پیغامات لگے ہی تھے اگر تمہارے بارے میں بھی شائع ہو جاتا تو کیا بات تھی۔" (پیاری پروین بچی بات متاؤں آپ کو..... آپ نے جو میرے بارے میں سندیرہ لکھ کر بھیجا تھا، اس کو پڑھ کر میں شرماتی تھی..... پس اسی لیے نہیں لگایا..... ہاں کالج سی لڑکی خصوصی طور پر پسند کرنے کا شکریہ)

کچھ فریدہ سجاد، کراچی سے۔ "اپریل کا پاکیزہ پڑھا، بہت اچھا لگا..... مجھے حیرت ہوئی آپ نے مجھے عمیر کے ویسے میں نہیں بلایا..... آپ سے تو میری فون پر بہت بات چیت رہتی ہے۔ (میں اس ضمن میں معذرت خواہ ہوں) تمام ناول شاندار جا رہے ہیں۔ نمرہ احمد آئیں اور چھا گئیں۔ شیریں حیدر کے ناول کا اختتام بہت خوب صورت تھا۔ عکس، زندگی اور کالج سی لڑکی خوب صورت ترین ناول ہیں۔" (نوازش)

کچھ رضوانہ پرنس، کراچی سے۔ "انجم تمہارے بیٹے عمیر کا ولیمہ ماشاء اللہ بہت شاندار تھا ہر لحاظ سے..... مگر مجھے سب سے اچھی اپنی انجم انصار لگیں..... پہلی مرتبہ سیک اپ میں دیکھا..... ڈیفرنٹ سا انداز بہت بھایا..... ہاں اے پلس پر آپ کا ڈراما اٹھیلیاں بھی دیکھا۔ اس کے ڈائلاگز سن کر فوراً چلا چلا گیا کہ اسے انجم انصار نے لکھا ہے۔ نام کے بغیر واقعی کام نظر آتا ہے۔ دلی مبارک باد۔" (نوازش)

کچھ خالدہ نسیم، لندن سے۔ "آپ سے ملاقات ہمیشہ خواب کے مانند لگتی ہے۔ اس بار باقی سب رائٹرز سے ملنا میرا

ایک خواب تھا جو پورا ہوا۔ عمیر اپنی دہن کے ہمراہ واپس چلا گیا ہوگا اور بھی اداس کر کے۔ یہی زندگی ہے۔ بچوں نے اپنے ساتھی کے ہمراہ اپنی دنیا بسائی ہے، ہماری دعائیں ہمیشہ اُن کے ساتھ ہیں۔ اس ماہ کا رسالہ پڑھا ہے سارا نہیں۔ آپ کا ناول اور عقلی کا لکھا احوال، تعریف کتنی کروں؟ بہت اچھے ہیں۔“ (شکر یہ آپ سے مل کر مجھے بھی ہمیشہ اچھا لگا ہے)

کچھ ارم پرویز، لاہور سے۔ ”میں نے دو سال پہلے پاکیزہ پڑھنا شروع کیا تھا اور اس کو پڑھ کر اتنا لطف آتا ہے کہ اب تو جیسے جان ہی بن گیا ہے۔ گھر والوں کی مخالفت کے باوجود ہر ماہ پاکیزہ پڑھتی ہوں۔ پاکیزہ کی کہانیاں، بہنوں کی محفل، ناول سب ہی دلکش اور حسین ہوتے اور اقوال زریں تو اور بھی تعریف کے حامل اور بہت ہی خوب صورت ہوتے ہیں۔ میں نے پاکیزہ کے ناول بلکہ پاکیزہ کے پورے ڈائجسٹ سے زندگی کی بہت سی چیزیں سیکھی ہیں۔ اور کئی بری عادات کو ختم بھی کیا ہے اور امید ہے کہ آئندہ بھی میں زندگی میں بہت کچھ سیکھوں گی۔ مختصر یہ کہ میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں کہ جن میں پاکیزہ کی تعریف کر سکوں۔ میرے والدین تو ڈائجسٹ، ناول وغیرہ کے خلاف ہیں لیکن میں نے اس سے جتنی اچھی چیزیں سیکھی ہیں اور امید کرتی ہوں کہ میرے والدین بھی اس چیز کو جان سکیں گے، میں ناول، کہانیاں وغیرہ لکھنے کا شوق رکھتی ہوں اور شوق کے ساتھ ساتھ خدا کا شکر ہے تھوڑا سا ہنر بھی ہے لیکن کوئی یہ بتانے والا نہیں ہے کہ وہ شائع ہونے کے قابل ہیں کہ نہیں۔“ (گڑیا اس محفل میں خوش آمدید، آپ اپنے مراسلات ہمیں ضرور بھیجیں۔۔۔۔۔ آپ کی حوصلہ افزائی کرنے کی پوری کوشش کروں گی)

کچھ شازیہ سرور، شاہدرہ سے۔ ”آئی آپ جس قدر محنت اور عرق ریزی سے ڈائجسٹ پاکیزہ کی نوک پلک سنواری ہیں، یہ سب آپ کی ہم سے محبت اور لگاؤ کا ثبوت ہے۔ لڑکیاں جو نازک آئینوں کی طرح ہوتی ہیں ان کے جذبات و احساسات کو من و عن لفظوں کا لباس پہنا کر کاغذ کے سینے میں اتارنے کا فن کمال فن ہے جو کہ آپ کے دائر میں ہاتھ کا کھیل ہے اور جس محبت سے آپ نے لکھنے والوں کو حوصلہ دیتی ہیں اس حوصلہ افزائی نے مجھے بھی کچھ لکھنے پر مجبور کیا۔ باقی آپ کا رسالہ دن ڈگنی رات چوگنی ترقی پائے، آپ کو اللہ پاک صحت دے، باقی تمام کھاری بھی زبردست لکھ رہی ہیں۔ انشاء اللہ آپ کے دستِ شفقت سے کبھی ہم بھی فیض یاب ہو کر کامیاب ہو جائیں گے، انشاء اللہ۔“ (اس محفل میں خوش آمدید۔۔۔۔۔ آپ کے تبصرے کا اب ہر ماہ انتظار رہے گا)

کچھ صدف آصف، کراچی سے۔ ”بہنوں کی فیس بک میں کافی دنوں بعد لاگ ان ہو رہی ہوں۔ دل تو چاہتا ہے کہ رسالہ پڑھتے ہی خط لکھنے بیٹھ جاؤں مگر اکثر مصروفیت آڑے آجاتی ہے۔ میں اس محفل میں اگر شریک نہ بھی ہوں۔ تب بھی تبصرہ نگار بہنوں کی آرا پڑھ کر ہی خوش ہوتی رہتی ہوں۔ پاکیزہ کا درجہ ہماری زندگیوں میں یوں ہے جیسے کوئی پہلی جو، ہمیں بھلائی کی باتیں بتاتی ہو یا ایسی تمکسار جس کی مخلصانہ کوششیں ہماری زندگی کے بہت سے معاملات میں مثبت تبدیلی لائیں، میری ساری قاری بہنیں میری اس رائے سے اتفاق کریں گی کہ پاکیزہ میں چھپنے والی کہانیاں، افسانے، ناولات یا قطع وار ناول اپنے اندر کوئی نہ کوئی مثبت پیغام پوشیدہ رکھتے ہیں جو پڑھنے والے کے دل پر ضرور اثر کرتا ہے۔ ان کو پڑھنے کے بعد ہم اپنی زندگی کے بہت سے گزرنے والے ادوار کا مزہ بھی لے لیتے ہیں کچھ کہانیاں ہماری کالج لائف کی یادیں تروتازہ کر دیتی ہیں تو کچھ میں ہمارا بچپن چھپا ہوتا ہے۔ کچھ ہماری زندگیوں میں ایسی ٹخنوں کا مزہ چکھا دیتے ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہمارے وہ حالات جن پر زبان کھولنا بے ادبی سمجھی جاتی ہے تو کوئی مصنفہ بہن اپنی تحریر کے ذریعے اُن باتوں کی عکاسی اس طرح سے کر دیتی ہیں جو ہمارے دل پر گزری ہوتی ہیں۔ مارچ کے پاکیزہ میں شامل تمام کہانیاں، افسانے شاندار ہیں خصوصاً سیکینہ فرخ کی دوام زندگی پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ہر دوسرے گھر میں ساس بہو کے درمیان ایسی ہی باتیں موجود ہیں۔ انجم آبی کا جلتزنگ پڑھ کر ہی ترنگ جاگ اٹھی۔ عمیرہ احمد کی کیا بات ہے؟ اُن کی تعریف کرنا جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ کالجی لڑکی اچھا جا رہا ہے اور زندگی پڑھ کر بھی بہت مزہ آیا۔ کرن احمد کی 23 مارچ پر لکھی خصوصی تحریر بہت سادہ اور معصوم سی تھی بہت اچھا لگا۔“ (نوازش)

کچھ صائمہ احمد، کراچی سے۔ ”میرے پیارے بھائی سید عامر اعجاز 20 جنوری کو شادی کے بندھن میں بندھ گئے، میری بھابی سیرنی گورنمنٹ کالج میں استاد ہیں اور عامر بھائی سویڈن میں مقیم پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ شادی کے فوراً بعد یہ

اپنی مون پر جانے کے بجائے عمرہ کرنے کے لیے سعودی عرب روانہ ہو گیا۔ بفضلِ خدا عمرہ کر کے ساتھ خیریت کے لوٹے۔ بس آئی کیا بتاؤں جن کے بھائی یا بیٹے پردیس میں رہتے ہیں اُن کی فیلنگو کیا ہوتی ہیں۔ عامر بھائی کے سویڈن روانہ ہونے کے بعد گھر میں ایک دم سے سناٹا ہو گیا ہے جب بھائی یہاں تھے تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا دعوتیں شادی کے لئے، ہونٹنگ خوب رونق رہی اور اب خیر یہ سب تو ہوتا ہے آپ کے دو بیٹے بھی تو ملک سے باہر ہیں آپ تو خود اس دور سے رہ چکی ہوں گی۔ آپ کے ناول کی تو کیا تعریف کروں بہت ہی خوب ہے ویسے آئی یہ ریاض صاحب اور اُن کی بیٹی نہاں لڑکھواہ میں قربانی کا بگڑا نہیں بن رہے اور نواز کے کیریئر سے تو مجھے خوف سا محسوس ہوا۔ اب آج کے زمانے میں انسان آخر اس پر بھروسہ کرے کہ دنیا میں اتنے گھٹیا لوگ بھی ہوا کرتے ہیں۔ آئی اگر آپ کے پاس انسانوں کی پرکھ کا کوئی طریقہ ہے تو لہجہ ضرور بتائیے گا۔ راحت وفا کو بے حد مبارک باد آخر کو ساری گھٹیاں سلجھای دیں۔ ناہیدہ آئی اور عمیرہ احمد کے تو کیا ہی کہنے ہیں اتنا زبردست لکھتی ہیں کہ نام ہی کافی ہے، پلیز آئی ان دونوں خواتین کا چہرہ تو کرائیں قسم سے بے حد جستجو ہے اُن دونوں کو دیکھنے کی اور ہاں آئی میری امی بھی جلتزنگ بہت شوق سے پڑھتی ہیں اور روحانی مشورے بھی۔ آئی میرے بھائی عامر جو کہ قادی بیک میں منجر ہیں اُن کی دیرینہ کو لیک مہ جہیں کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔“ (اللہ ان کی مقدرت فرمائے، تبصرے کا شکریہ)

کچھ نجمہ اقبال، سیماڑی کراچی سے۔ ”مارچ کا پاکیزہ ہاتھوں میں ہے۔ عمیرہ احمد، ناہیدہ سلطانہ اختر کے ناول اور آپ کا ناول تو بے حد اچھے ہیں۔ اس ماہ کے افسانے اور ناولت بے حد اچھے ہیں خاص طور پر تجھ اور سیکینہ فرخ کا دوام زندگی بے حد پسند آئے۔ مارچ کے مہینے کے پاکیزہ میں اپنا پیغام صابرہ سلطانہ کے نام پڑھا ہے مگر صابرہ سلطانہ نے ابھی تک کوئی رابطہ نہیں کیا۔ انجم باجی کیا صابرہ نے آپ سے کوئی رابطہ کیا ہے؟ صابرہ بہن خیریت سے تو ہیں؟ میں پاکیزہ کی پچھوڑ سالہ پرانی قاری ہوں مگر خط پہلی مرتبہ ارسال کیا ہے۔“ (پیاری نجمہ اس محفل میں خوش آمدید، صابرہ بہن نے کوئی رابطہ نہیں کیا ہے۔ اللہ کرے کہ وہ خیریت سے ہوں)

کچھ جمیلہ، واہ کینٹ سے۔ ”سب سے پہلے آپ کے مہکتے الفاظ سے فیض یاب ہوئی یعنی مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا۔ پھر عکس کی باری آئی، اچھا جا رہا ہے۔ زندگی بہت زبردست تحریر ہے اور کالجی لڑکی کا تو جواب ہی نہیں بہت اچھی تحریر ہے۔ پھولوں کے سوداگر میں انسانی ہمدردی کا جذبہ نمایاں ہے۔ پڑا اثر تحریر ہے۔ بوجھ پڑھ کر دل بوجھل ہو گیا۔ اس خوب صورت زمین پر گندگی میں تھڑے ہوئے لوگوں کا بوجھ بھی موجود ہے جو معاشرے میں گندگی کو پھیلا رہا ہے۔ خدا ہم سب کو اپنی امان میں رکھے۔ کفارہ بھی اچھی تحریر ہے کہ دوسروں کو غلط راستے سے روکنا بہت اچھا مل ہے اور اچھا مشورہ بہت بڑی نیکی ہے۔ تجھ بہت ہی اچھا لگا۔ افسانہ تجھ کی رائٹر کو مبارک باد۔“ (تبصرے کا شکریہ دیگر باتوں کے لیے آپ اپنے علاقے کے کونسلر سے مدد لیں۔ میں آپ کو اور آپ کے بچوں کی رہائش کا مسئلہ کیونکر حل کر سکتی ہوں، یہ میرے لیے مشکل ہوگا)

✉ چندا رحیم، کراچی۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ پاکیزہ میں شائع ہونے والے ناول شائع ہونے کے بعد آپ انہیں ٹی وی پر بھی دیکھ سکیں گی۔ ٹی وی پر ڈرامے اتنی جلدی نہیں جتنے کہ ایک ماہ میں بن جائیں۔ اس کے لیے بہت ٹائم لگتا ہے۔ اس لیے آپ کی پریشانی بے معنی ہے۔

ہو صرف دل ہی نہیں روح بھی ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ بہنوں کی ڈھارس اور محبت سے اس مردہ روح میں تھوڑی سی جان اری ہے۔ کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ صائمہ سجاد بخش کو ہاٹ میں پاکیزہ کے توسط سے آپ کو کافی عرصے سے ہاتھی ہوں اور ہمیشہ سے آپ سے دوستی کی خواہش مند تھی۔ آپ نے جس طرح سے میرے لیے دعا کی رب کریم آپ کو اس کا اجر دے، آمین۔ اسی طرح سے نسیم نیازی لاہور انہوں نے ماں پر غم لکھی تھی۔ میں اُن سے بھی دوستی کی خواہ ہوں بہنوں جیسی۔ اور مارچ کے پاکیزہ کی بہنوں کی محفل میں کیوٹی شاز یہ سرور تحصیل فیروز والا کا خط میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ کچھ لمحے ملتے کی کیفیت میں رہی پھر رو کر اللہ سے فریاد کی یا اللہ میں نے تمام عرصہ اور غم دیکھے ہیں، گندے مطلبی لوگوں سے واسطہ ڈالنے اور ہر رشتے سے دھوکا ملا ہے۔ کیا دنیا میں میرے لیے قلعے اور نیک لوگ ہیں؟“ (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے) کچھ تابندہ جنیں عاطف، گلشن اقبال کراچی سے۔ ”اس ماہ آپ نے میرا خط اور ایک مراسلہ شامل کیا اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ اتفاق سے کسی اور تابندہ جنیں کا افسانہ بھی شائع ہو گیا تو سب یہ سمجھے کہ یہ بھی میں نے ہی لکھا ہے اور سلسلے وار ناول نیناں ختم ہوا شکر ہے بس ٹھیک ہی تھا حقیقت سے کچھ دور اور اینڈ بھی ایسا ہی تھا۔ شیریں آنٹی کا شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں اچھا تو جا رہا تھا مگر کرداروں کی بہتات رہی مگر شیریں آنٹی کے ناول کی ہر قسط تجس رکھتی رہی تھی کہ اب کیا ہوگا۔ رخ چوہدری نے بھی اچھا لکھا مگر اس ناپ کا افسانہ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ آپ کا ناول بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ واقعی غم میں انسان ایسا ہی اندھا ہو جاتا ہے کہ الٹی سیدی حرکتوں پر اتر آتا ہے۔ باقی سب افسانے بھی ٹھیک تھے۔“ (شکر یہ)

کچھ فرحت احمد، گلشن حدید کراچی سے۔ ”کافی عرصے بعد آپ سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ دیے پاکیزہ کے ذریعے آپ کی اور اپنی بہنوں کی ہر خبر سے باخبر رہی ہوں، اُن کے دکھ میں دھکی اور خوشی میں شاد رہی ہوں۔ سب سے پہلے تو باجی بیٹے کی شادی کی بہت بہت مبارکباد قبول فرمائیں۔ شادی کا احوال اور تصاویر بہت پسند آئیں۔ دونوں ہی بہت پیارے اور معصوم لگ رہے تھے (ماشاء اللہ) عمیرہ احمد کے عکس نے تو دل جیت لیا ہے۔ زندگی اور شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں۔ کردار کی بہتات کے باوجود اچھے جا رہے ہیں۔ ایک نئی نیناں آخری قسط لکھا دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ ناول میں سیکینہ فرخ کا دوام زندگی بہت پسند آیا۔ اب آئیے خط لکھنے کی اصل وجہ کی جانب تو اس کی اصل وجہ ہے کالجی لڑکی یعنی کہ ہماری انجم باجی کا بہت ہی زبردست ناول۔ یقین مانیں بے انتہا پسند آ رہا ہے۔ تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں اس لیے بس۔ ویسے بھی آپ کو تعریف پسند بھی نہیں ہے۔ بوجہ، سیمیا سمین جتنی کا ایک چھتا ہوا افسانہ۔ پھولوں کے سوداگر، ایک ہلکی ہلکی اچھی تحریر۔ سراغ زندگی، عہد حاضر کی ایک حقیقت بیاں تحریر۔ تحفہ، واقعی ایک خوب صورت تحفہ ہے۔ باقی افسانے بھی پسند آئے۔ مستقل سلسلوں میں بہنوں کی محفل سرفہرست اور باقی سب ہمیشہ ہی اچھے لگتے ہیں۔ ویسے اس وقت پاکیزہ میں عکس اور کالجی لڑکی ٹاپ پر ہیں سچ بہت اچھے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ اور بہنوں کے بارے میں تو معلومات پاکیزہ سے مل جاتی ہیں اور جن کی وجہ سے میں بھی خوشیوں میں خوش اور غمی میں دکھ محسوس کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ اللہ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“ (آمین)

کچھ سکلی غزل، کراچی سے۔ ”کالجی لڑکی، عکس اور زندگی تینوں ہی زبردست ہیں لیکن عمیرہ احمد کے لیے تو نام ہی کافی ہے کہنا کافی ہے۔ ایک شکایت ہے آپ نے بہت زیادہ سلسلے وار کہانیاں پرچے میں شامل کر کے بہت لوگوں پر ظلم کر دیا ہے۔ باقی سلسلے وار کہانیاں میں اس لیے نہیں پڑھتی کہ اس قدر کردار ہیں جن کا نام یاد رکھنا ناممکن ہے جھلک اور پیچیدہ حالانکہ لکھنے والیاں نامور معنفات ہیں جس میں کوئی شک نہیں۔“ (ہماری سلسلے وار کہانیاں بھی بے حد پسند کی جاتی ہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے)

کچھ فوزیہ رحمان، شیخوپورہ سے۔ ”آپ ایک بہن صائمہ کراچی نے لکھا تھا مارچ 2012ء کے شمارے میں کہ پھولوں کی پتیوں کو کھانے سے وہ صحت یاب ہوئیں۔ میں نے سوچا کہ میں بھی آپ کو اپنی پیاری کے بارے میں بتاتی ہوں اگر کسی بہن کو اس کا علاج معلوم ہو تو مجھے ضرور آگاہ کریں، مجھے بہت تمنش ہے ایک آنکھ سے تو نہ کھانے کا حرہ اور نہ کچھ اور۔ اصل میں بچپن میں خسرہ کی وجہ سے میری گردن کی اندرونی اسکن پھٹ گئی ایسے محسوس ہوتا ہے دیکھنے میں جیسے جلی ہوئی ہو اس کی وجہ

✉ ام طیفور، گوجرانوالہ۔ خوش آمدید۔ ہمیں روزانہ بہت سی کہانیاں موصول ہوتی ہیں۔ ان کو پڑھنے میں بہر حال خاصا نام بھی لگتا ہے مگر آپ کے لیے تو خوش خبری ہے۔

✉ ایک، بہن، واہ کینٹ۔ ہڈیوں کے مہروں کے علاج کے لیے، زیتون کے تیل پر یاسین شریف گیارہ مرتبہ دم کر دیں اول و آخر درود اور بھیجی کے ساتھ۔ اس تیل کی مالش کریں۔

کچھ صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ سے۔ ”ثمینہ عظمت علی نے اچھے موضوع پر لکھا۔ اسلام میں صرف 3 دن کا سوگ ہے۔ ہم سوگ کو سالوں پر محیط کر لیتے ہیں، یہ سوچے سمجھے بغیر کے اس کا اثر دوسرے کی زندگی پر پڑتا ہے۔ شادیاں بھی لمبی چلتی ہیں اور سوگ بھی لمبا چلتا ہے۔ ہر چیز کو اپنی لمٹ میں رکھنا چاہیے۔ کالجی لڑکی بہت اچھا جا رہا ہے۔ ساجدہ بیگم کو بھی اندازہ نہیں ہوگا کہ اُن کا یہ ایکشن ان کے لیے وہال جان بن جائے گا۔ خیر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ جلت رنگ بھی اچھا رہا۔ بعض نندیں واقعی جہاں آرا بتول ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ کنواری ایسی ہوں بعض عمر رسیدہ بھی کچھ کم نہیں ہوتیں۔ بڑھاپے تک پہنچنا چلتا رہتا ہے اُن کا۔ انجم باجی پاکیزہ کے مئی آرڈر کس ایڈریس اور کس کے نام پر کریں۔ ذرا گنا کر کریں۔“ (ماہنامہ پاکیزہ کے نام اور پاکیزہ کے ایڈریس پر بھیج دیں)

کچھ سیدہ ہما شاہ، ہارون آباد سے۔ ”پاکیزہ کا خوب صورت سالگرہ نمبر بہت ہی پیارا لگا۔ آپ نے جس خوب صورتی سے اس چاند کو تاناک کیا وہ قابلِ داد ہے اور ایک بات جو بہت ہی اچھی لگی کہ آپ نے اس خوب صورت ماہنامے سے جڑے ہر شخص کو اہم جاننے ہوئے اس کا تذکرہ کیا۔ جیسے گلستاں کے باغبان کو ہر پھول کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔“ (اللہ ہمارے اس پاکیزہ گلستان کے ہر پھول کو اپنی حفاظت میں رکھے، آمین)

کچھ ذکیہ ایوب، لاہور سے۔ ”سالگرہ کی مبارکباد۔ نائل سے لے کر ہومیو پیتھ تک ہر تحریر پر فیکٹ۔ سب سے پہلے کالجی لڑکی کو پڑھا۔ میں نے پچھلے ماہ کہا تھا اللہ نہاں کو ناگہانی آفت سے بچائے۔ اللہ نے سرفراز صاحب کی رسی دراز کر رکھی ہے۔ تم آخری قسط میں سرفراز صاحب کو عبرت کا نشان ضرور بنانا تاکہ دل کو سکون ملے۔ نائل پر ثمینہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ معصوم سادو لکھا اور نازک سی دلہن۔ اللہ آپ کو ان کی خوشیاں دکھائے۔ اقبال بانو کا پہلا قدم اچھا تھا۔ ناہید سلطانہ اختر کے ناول کی قسط سبق آموز تھی، علیہ عمر کا موضوع پرانا تھا مگر اللہ پر بھروسہ اور یقین نے تحریر کو موثر کر دیا۔ شیریں حیدر کے ناول کی آخری قسط بہت اچھی تھی۔ سیکینہ فرخ کا افسانہ پڑھ کر ہنسی آئی۔ نمرہ احمد کا ایلین زبردست رہا۔ عنوان ہی چونکا دینے والا تھا۔ واقعی سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ عذرا بیک کے ناول کی پہلی قسط بہت اچھی لگی۔ نوشین ناز نے بے حد اچھا لکھا۔ عزیزہ سید کے افسانے کے اتار چڑھاؤ بھی اچھے لگے۔ دیل ڈن..... عکس سب سے آخر میں پڑھا بہترین لگا۔ اس کے بارے میں لکھنا مشکل ہے۔ عذرا رسول کے گھریلو نوکے اپنے لیے نہیں اپنی بہو اور پوتیوں کے لیے پڑھے اچھے لگے۔ بہنوں کی محفل بہت پر محبت تھی۔ ایسی کہیں نہیں ہوتی۔ عظمیٰ جہیں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ میرے لیے اس نے پُر محبت جملے لکھے شکر یہ۔ مگر ذیشان کی شادی پر جو عظمیٰ نے جس محبت سے میزبانی کے لیے کہا ہے مجھے پڑھ کر بہت اچھا لگا۔“ (اللہ ہم سب کو خوشیوں میں خوشی کے ساتھ ملنا نصیب کرے آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا ہے)

کچھ عائشہ خورشید انور، کراچی سے۔ ”میں پہلی بار بزم پاکیزہ میں شرکت کرنا چاہتی ہوں اور پاکیزہ ڈائری میں اپنی ذاتی لکھی ہوئی حمد پیش کرنا چاہتی ہوں کیا آپ مجھے اپنی بزم میں آنے کی اجازت دینا چاہیں گی۔ پلیز مجھے اپنی بزم میں اس حمد کے ساتھ شریک کر لیں جو میں نے بڑی محبت سے اپنے پیارے اللہ کی محبت میں لکھی ہے۔“ (اس محفل میں اور پاکیزہ ڈائری میں خوش آمدید)

کچھ زم زم، دیہاڑی سے۔ ”عمیرہ احمد کا ناول عکس خوب جا رہا ہے۔ آنٹی انجم آپ کا ناول کالجی لڑکی اور عکس کسی چیز سے بھی دیکھ سکیں گے انتظار ہے۔ بہنوں کی محفل کو میں اپنی فیملی سمجھتی ہوں۔ جس میں دکھ سکھ سانچے ہوتے ہیں۔ آنٹی انجم کا شکر یہ جنہوں نے میرے خط کو شامل کیا اور جن پیاری بہنوں نے میرے دکھ کو محسوس کیا جب تنہائی، غم اور دکھ سے دل ٹوٹا

میرے ہندو آئے ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا اور مستقل سلسلے اپنی تعریف آپ ہیں۔ جلتی گت تو ہے ہی لا جواب۔“ (نوازش)
 کچھ ہمارے عہد میں ایک سنگم سے۔ ”میں پورے سات ماہ بعد آپ کی محفل میں حاضر ہو رہی ہوں۔ ان دنوں میں نے
 آپ کا پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھا ہے۔ آپ کی تحریر کا نچ سی لڑکی بہت اچھا ناول ہے۔ پڑھ کر مزہ آ گیا ہے۔ باقی سلسلے بھی
 اچھے ہیں۔ ایک تھی خیاں راحت و قاف کا ایڈ بہت اچھا لگا مگر آئی آپ نے بزم پاکیزہ والا سلسلہ کیوں بند کر دیا ہے۔ اس کی کمی
 بہت محسوس ہوتی ہے۔ عائشہ خان کا ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں بہت اچھا لگا، جو لوگ وقت کے ساتھ نہیں چلتے وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔
 آئی جی زندگی انسان کو ایک پیسے کی طرح گھما دیتی ہے۔ محفل کی سب لکھاری اور قاری بہنوں اور محترم ہستیوں کو میرا عقیدت
 سے سلام دیجیے گا۔ انشاء اللہ میں ضرور اب ہر ماہ حاضر ہوتی رہوں گی۔“ (بیاری ہما، تبصرے کا شکر یہ۔ دیگر باتوں کے۔۔۔
 جواب کے لیے تم مجھے فون بھی کر سکتی ہو ہاں تیسرے کلمے کا درود زیادہ رکھا کرو۔ پریشانوں سے بچی رہو گی، انشاء اللہ)

کچھ فرحت جمال، کراچی سے۔ ”جب دلہن بنی ثمنینہ کو سرورق پر دیکھا تو بے ساختہ دل نے ماشاء اللہ کہا۔ عظمیٰ آفاق
 کے قلم سے نکلا خوب صورت احساس میں ڈوبا احوال شادی میرے شہزادے کی پڑھ کر ہم انہی رونقوں میں کھو گئے۔ دل سے دعا
 ہے اللہ تعالیٰ خوشیوں میں خوشیاں دکھائے، آمین۔ عذرا باجی کے ٹوٹے اب ہم نے بھی ٹوٹ کر لیے ہیں۔ عذرا باجی بہت پسند
 آئیں خاص کر ان کی سادگی۔ اقبال بانو کی تحریر پہلا قدم بہترین لگی۔ ناہید سلطانہ اختر کا ناول زندگی خوب صورتی سے آگے بڑھ
 رہا ہے۔ آئیوں کی بستی علیہ عمر کا ناول پسند آیا۔ شیریں حیدر کا ناول شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں بہترین اختتام رہا۔ بات تو سمجھ کی
 ہے سیکر فرخ نے اچھا لکھا اور ہماری پسندیدہ لکھاری بھی ہیں۔ المیس نمرہ احمد کی خوب صورت تحریر لگی۔ پھر کوئی خواب بنو عذرا
 بیک کے ناول کا پہلا حصہ اچھا لگا۔ کا نچ سی لڑکی انجم باجی کا ناول بہت زبردست جا رہا ہے۔ دوسرا آپشن ٹوشین ناز اختر کی تحریر
 پسند آئی۔ عمیرہ سید کا مکمل ناول حساب زیباں جاں زبردست رہا۔ شاعری ہمیشہ کی طرح لا جواب لگی۔ انجم باجی آپ کے محبت
 سے جگہ گدستوں کا بے حد شکر یہ۔ رہے پاکیزہ کہ سلسلے وہ تو سب ہیں ہی لا جواب۔“ (پسندیدگی کا شکر یہ)

کچھ فرزانه نسیم، سیالکوٹ سے۔ ”کچھ عرصے سے پاکیزہ رسالہ پڑھ رہی ہوں جو کہ سب سے اچھا لگا۔ خاص کر
 روحانی مشورے وہ تو میں سب سے پہلے ہی پڑھتی ہوں۔ آپ کا ناول کا نچ سی لڑکی بھی بہت اچھا جا رہا ہے اور عمیرہ احمد کا
 ناول بھی بہت دلچسپ ہے بلکہ سبھی لکھنے والی رائٹر بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ بہت انتظار رہتا ہے۔ پاکیزہ رسالے کا۔ سب سے
 زیادہ تو باجی آپ سے فون پر بات کر کے بہت اچھا لگا۔ آپ نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ آپ بہت اچھی ہیں آپ کے
 لہجے میں اتنی محاسن ہے۔۔۔ پاکیزہ رسالے میں میرا پہلا خط ہے۔ اگر یہ خط آپ کو مل گیا تو آئندہ بھی خط لکھتی رہوں گی۔
 آپ مجھے بالکل اپنی بڑی بہن کی طرح لگی ہیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔“ (بیاری فرزانه، اس محفل میں خوش آمدید مجھے
 خوشی ہو گی کہ آئندہ تبصرے میں تمام تحریروں کے بارے میں اپنی مختصر آراء دو)

کچھ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”سرورق پر ماڈل نے جو لباس پہنا ہوا تھا میرے خیال میں اس کی قیمت
 ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہو گی۔ کیا میرا یہ خیال درست ہے؟ (آپ کا خیال غلط ہے) پاکیزہ کے لاکھوں چاہنے والوں
 میں سے چند بہنوں میں آپ نے دعاؤں کے گلدستے بھیجے ان میں ناچر کے نام کو شامل فرمایا بہت شکر یہ۔ ہماری دعا ہے سبز
 نصاب، نسیم مدنی، طاہرہ واسطی اور علیہ عمر کی ساس کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ ناول تو سب ہی
 اچھے ہوتے ہیں مگر شادی میرے شہزادے کی مضمون پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم بھی آپ کے بیٹے کی شادی میں شریک
 ہیں۔ واقعی سالگرہ نمبر نے ہمارا دل موہ لیا ہے۔“ (نوازش)

کچھ نرہت جبین ضیا، کراچی سے۔ ”خوب صورت سرورق جس پر نازک اور من موئی بیہورانی کو مسکراتا دیکھ کر بے
 ساختہ ڈھیروں دعا میں دل سے نکلیں، خدا تعالیٰ آپ کو اور آپ کی فیملی کو سدا ہنستا مسکراتا رکھے، آمین۔ آپ کی محبتوں پر دل باغ
 باغ ہو گیا کہ آپ نے مجھ ناچر کو ہمیشہ لفظوں میں یاد رکھا۔ اور وہ بھی اچھے لفظوں میں شکر یہ کہہ کر آپ کے غلوں کو کم نہیں ہونے
 دوں گی بلکہ جڑا کہ اللہ کہوں گی بس ہماری محبتیں اسی طرح قائم رہیں، آمین۔ عظمیٰ نے جس خوب صورتی سے عمیرہ اور ثمنینہ کی

سے میری دائیں آنکھ کا پردہ ڈیج ہو گیا ہے۔ اگر کوئی اللہ کی بندی اس کا علاج بتا دے تو اللہ اس کا بھلا کرے، اللہ اس کی
 آنکھوں کو سلامت رکھے۔ آپ کی دوسری وجہ خط لکھنے کی یہ ہے کہ آپ کا ناول کا نچ سی لڑکی اس دفعہ اتنا زبردست ہے کہ ہم
 بیان نہیں کر سکتی۔ دیگر رسائل بھی کبھی کبھار پڑھ لیتی ہوں لیکن جو پاکیزہ ہے اس کا تو کوئی پانی ہی نہیں۔ میری عمر 41 سال ہے
 جب سے ہوش سنبھالا ہے پاکیزہ پڑھتی آرہی ہوں۔ آج کے دور میں آپ کی آنکھوں کے ساتھ اتنی مجلس ہیں کہ حیرت ہوتی
 ہے ایسے تو اپنے بھی نہیں ہیں۔ اللہ آپ کو صحت و تندرستی دے۔ اللہ آپ کی آنکھوں کو سلامت رکھے۔ آپ لوگوں کے لیے انا
 کام کرتی ہیں آپ کی میری بری عادت یہ ہے کہ میں مستقل حراج نہیں ہوں۔ البتہ سورہ رجن اور آنکھوں کے لیے فیکشنسٹ
 عینک والی آیت باقاعدگی سے پڑھتی ہوں کہ مجھے ایک آنکھ کے بغیر بہت مشکل ہے۔“ (اگر کسی بہن کے پاس کوئی دعا، ٹونکا،
 علاج ہو تو رابطہ کرے)

کچھ انجم مشیر، کراچی سے۔ ”گزشتہ چھ سات سال سے پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں۔ ہر مہینے ہی سوچتے تھے اس دفعہ
 ہم بھی بہنوں کی محفل میں خط لکھ کر شریک ہوں گے قاری کی حیثیت سے شامل ہوں مگر یہ مصروفیات۔۔۔ انجم تقریباً چار سال
 پہلے ایک بار آپ سے فون پر بات ہوئی تھی جب سالگرہ کی تقریب ہونا تھی پاکیزہ کی ہم شامل ہونا چاہتے تھے آپ نے کہا
 اپریل میں ہو گی پھر فون کرنا مگر اتفاق سے تقریب ہوئی نہیں۔ انجم پاکیزہ ایک معیاری ڈائجسٹ ہے اس کے سلسلے وار ناول
 ہوں یا افسانے سب ہی پڑھنے والوں کی توجہ کی اور طرف کم ہی ہوتے دیتے ہیں۔ عمیرہ احمد کا ناول عکس بہترین جا رہا ہے۔
 اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ دین کی باتیں معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ مارچ کے شمارے میں ہمارا مان ہو تم کرن احمد نے
 خوب لکھا، وطن سے محبت کرنے والوں کے لیے تحفہ اور زیادہ پر دین کا تحفہ واقعی تحفہ ہے۔ مایہ ناز ناول نگار ناہید سلطانہ اختر کا
 ناول زندگی زبردست ہے دیکھیں آگے کیا اسرار کھلتے ہیں ابھی تو سہنس ہے۔ انجم آپ کا ناول کا نچ سی لڑکی بہت خوب
 صورت ہے بس نہاں کو مزید آزمائش میں مت ڈالنا اور جناب بہنوں کی محفل کی تو بات ہی کیا اب ہم بھی کوشش کریں گے کہ
 مستقل شامل ہوں۔ انجم میں سوشل سیکورٹی میں بحیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر فرائض انجام دے رہی ہوں۔“ (اس محفل میں خوش
 آمدید۔ آپ کا انٹرویو بھی موصول ہوا ہے۔ تصویر واضح سی بھیج دیجیے)

کچھ بشری نوید باجوہ، اودکاڑہ سے۔ اپریل 98ء سے پاکیزہ سے جو رشتہ قائم ہوا وہ آج تک قائم ہے درمیان میں رابطہ
 کچھ کم تو ہوا مگر دل کا رشتہ پاکیزہ سے قائم و دائم ہے۔ جب ابو جان حیات تھے تو پاکیزہ میں لگی اپنی ہر تحریر ان کو پڑھوائی تھی اب
 ان کو جدا ہوئے گیارہ سال ہو جائیں گے۔ ابو کے جانے کے بعد زندگی نے بھی اپنا رنگ ڈھنگ بدل لیا۔ عظمیٰ کی دلہن بنی تصویر
 دل لگتی تھی اور آج جب ان کے ماں کے قد سے بڑے ہونے تک کافی وقت گزر گیا جب معراج انکل کو سہنس، جاسوسی میں
 پاکیزہ سے رشتہ قائم ہے جن سے دل کا رشتہ ہودہ کب بھولتے ہیں۔ باجی میں نے ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے لکھنے کی۔ اپنا افسانہ
 چادر اور چادر یواری آپ کو ارسال کر رہی ہوں پڑھ کر رائے ضرور دیجیے گا کہ میں لکھ سکتی ہوں یا نہیں۔ آپ کی آرا میرے لیے
 مقدم ہو گی، آپ پاکیزہ کے توسط سے مجھے آگاہ کر دیجیے گا، میں انتظار کروں گی۔ پاکیزہ میں انعامی سلسلے دوبارہ شروع کریں،
 ماشاء اللہ تمام رائٹرز حمد لکھ رہی ہیں لیکن عکس کا جواب نہیں ہے۔ آپ ساجدہ حبیب سے بھی کچھ لکھوائیں۔ باجی میری بہت سی
 نیک تمنائیں اور دعائیں آپ کے لیے آپ کی فیملی پاکیزہ اور خصوصاً معراج انکل اور عذرا آپ کی لیے۔ اللہ تعالیٰ معراج انکل
 کو شفاء کا ملہ عطا کرے، آمین۔“ (دعاؤں کے لیے مشکور ہوں۔ آپ کا افسانہ قابل اشاعت ہے)

کچھ ایس انمول، گاؤں بھابڑہ سے۔ مارچ کا پاکیزہ زبردست تحریروں سے سجا ہوا تھا۔ ایک تھی خیاں کا اختتام
 بہت اچھا ہوا۔ اتنا پیارا ناول لکھنے پر راحت و قاف کو ڈھیروں دعا میں اور مبارک باد۔ باقی ناول بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔
 کا نچ سی لڑکی بہت ہی زبردست تھا اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ سیکر فرخ کا ناول بھی بہترین تھا۔ تائبندہ بھی کا
 افسانہ متاثر کن تحریر تھی۔ ایک چھوٹی سی تحریر میں انہوں نے بہت کچھ سمجھا دیا باقی تمام افسانے بھی زبردست تھے۔ پاکیزہ کی کوئی

فسانہ نہیں حقیقت ہے کہ

رضوانہ پرنس

میں یہ منظر آنکھوں سے اوجھل ہو کر مجھے اداس کر گیا۔
کاش یہ منظر ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا، وقت ٹھہر جاتا۔
بچپن کے وہ دن کتنی پیاری یادوں کو اپنے اندر
چھپائے قطار در قطار میری آنکھوں کے سامنے سے
گزرتے چلے جا رہے ہیں، ایک منظر چھپتا ہے تو

فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ جو کہ آپ سب کا
پندیدہ سلسلہ ہے۔ اس میں آج آپ لوگوں کو اپنی
کہانی سنانے رضوانہ پرنس خود حاضر خدمت ہیں۔ تو
دوستو! آج ہم آپ کا ہاتھ تھام کر آپ کو اپنے ماضی
مکے اس باغ کی سیر کرانے جا رہے ہیں جہاں
گلابوں کی مہک کے ساتھ ساتھ کانٹوں کی چھین
بھی ہے۔ یہ ایک ایسی ہنسی مسکراتی لڑکی کی کہانی
ہے جس نے بہت ساری خوشیاں سمیٹنے کے ساتھ
ساتھ ڈھیر سارے آنسوؤں کو بھی اپنے دل کے
اندرا تار ہے۔

بچپن کا دور انسان کی زندگی کا سب سے
حسین دور ہوتا ہے جب ایک بچہ ہر غم و فکر سے
دور ایک بے خبری کی زندگی جیتا ہے۔ اس
وقت بچپن کے خوب صورت دنوں کی
جھللا ہٹیں میری آنکھوں میں اتر آئی ہیں
اور ان جھللا ہٹوں کے پیچھے ایک سرخ
رخساروں اور ٹھنڈے بالوں والی بچی
اپنے بپا (والد) کا ہاتھ تھامے ایک سنہری
بالوں والی گڑیا خریدتی نظر آرہی ہے۔
اس کے معصوم چہرے پر کتنی خوشی اور
طمینانیت ہے اور کیوں نہ ہو اس کے ساتھ
اس کے بپا جو موجود ہیں جن کی وہ بے
حد چہیتی اور لاڈلی بیٹی ہے۔ پل بھر

شادی اور ویسے کا احوال پیش کیا پڑھ کر مزہ آ گیا۔ مجھے کچھ کہنا ہے سو فیصد سچ کہا آپ نے۔ پھر دین کی باتیں پڑھیں دل
سکون ملا۔ خصوصی گوشہ ڈائری سے انتخاب میں عذرار رسول باجی کو دیکھ کر سمجھیں روح تک سرشار ہو گئی ویسے یہ سوال تو اکمل
میرے دماغ میں بھی آتا تھا کہ عذرار باجی اتنی کیوٹ اور اسارت ہیں اس کا راز کیا ہے، جزاک اللہ کہ انہوں نے بہت قیمتی نہیں
دیں۔ اللہ تعالیٰ عذرار باجی کے حسن میں مزید اضافہ فرمائے، آمین۔ یہ کالج کی لڑکی کاش ایک دفعہ ہی مل جائے مکمل تو مزہ
آجائے سچ میں۔ افسانے سب ہی بہترین رہے۔ مکمل ناول عنبرہ سید نے بہت خوب لکھا۔ سلسلے دار ناول بھی بڑی خوب
صورتی سے آگے کی جانب رواں دواں ہیں۔ اگر پاکیزہ جسم ہے تو بلترنگ دل بن کر اس جسم کو زندہ رکھنے میں بھرپور مددگار
ہے زبردست، ہنستے ہنستے مزہ آ گیا اللہ آپ کو بھی زندگی عطا فرمائے، آمین۔ آپ تو روتوں کو ہنسا دیتی ہیں جزاک اللہ۔ دیگر
سلسلے بھی اچھے رہے۔ پاکیزہ ڈائری اور میرا انتخاب بھی اچھے رہے۔ سندیے بھی اچھے لگے۔ اللہ تعالیٰ معراج رسول بھائی کو
صحبت کا ملہ عطا فرمائے، آمین۔ عذرار رسول باجی اور آپ اور آپ کی ٹیلیڈ اور اسٹاف کے لیے پُر خلوص دعائیں۔“ (شکریہ)
کچھ فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے۔ ”اپریل کا پاکیزہ ملا، ٹائٹل بے حد دلکش لگا اور ٹائٹل پر آپ کی بھولی بھولی عیبر
کی دلہن ہے جو کہ بے حد پیاری لگی۔ عیبر تو شہزادہ ہے آپ کو بے حد مبارک ہو۔ میں نے شادی میرے شہزادے کی پڑھا اس
طرح لگ رہا تھا کہ ہم بھی اس شادی میں شرکت کر رہے تھے کاش ہم کراچی میں ہوتے تو ضرور آتے۔ اس مرتبہ بھی تمام
افسانے اور ناولٹ بے حد پسند آئے۔ بات تو سمجھ کی ہے۔ ایلین، آئینوں کی ہنسی میں زیادہ اچھے لگے، ہم نے آپ کو اپنی بک
ارسال کی تھی پانچواں موسم اگر پسند آئی تو ضرور بتائیے گا اور بھی ہمیں نوٹ کر لیں ہماری شاعری کی کتاب پانچواں موسم آگئی
ہے ضرور خرید کر پڑھیں اور تبصرہ کریں، شکریہ۔ اقبال بانو دیر سے آئیں مگر اتنی اچھی تحریر لے کر آئیں پہلا قدم اقبال بانو جی
آپ پاکیزہ میں ضرور لکھا کریں۔ کالج کی لڑکی کی پانچویں قسط پڑھی اگلی قسط کاشت سے انتظار ہے۔ خوش ذائقہ میں شلیم کا
قورمہ مزید اترتا۔“ (شکریہ)

کچھ فرح طاہر قرنگی، ملتان سے۔ ”آج پہلی مرتبہ آپ سے قلمب ہوں، اس سے پہلے میں پاکیزہ کی خاموش ریڈر
تھی پاکیزہ رسالہ مجھے بہت پسند ہے ڈیڑھ سال قبل میں نے خود بھی لکھنے کا آغاز کیا ہے۔ آئی میں نے فرمانہ ناز ملک، فیصلہ
آصف اور فریدہ جاوید فری سے آپ کے متعلق بہت تعریفیں سنیں تو دل نے کہا میں اپنی تحریر پاکیزہ میں بھی بھیجوں اس لیے اپنی
پہلی تحریر کے ساتھ حاضر ہوں امید کرتی ہوں کہ میری تحریر پاکیزہ رسالے کے معیار پر پوری اترے گی اور پاکیزہ کی زینت
بنے گی۔“ (خوش آمدید..... آپ کا افسانہ پڑھ کر رائے دے دوں گی)

بیاری بہنو! ہمیں افسوس ہے کہ اس ماہ پاکیزہ شارٹ ہو جانے کے باعث بہت سی بہنوں کو مل نہیں سکا۔ آپ کو آئندہ
کبھی پاکیزہ ملنے میں دشواری ہو تو آپ فوراً ہمارے سرکولیشن منیجر بدرالدین صاحب سے رابطہ کریں۔ فون نمبر یہ ہے۔
021-35802551

خط لکھنے اور اپنی تحریریں بھیجنے کے لیے بھی ہمارا ایڈریس نوٹ کر لیجیے۔ مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ C-63 فیز 11 ایکس پرنٹیشن
ڈیفنس کمرشل ایریا۔ مین کورنگی روڈ کراچی 75500۔

اور اب اجازت دیجیے اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو مرضی و مساوی آفات، تمام پریشانیوں، بیماریوں اور
شیطانوں اور حاسدین کے شر سے بچا کر رکھے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ اور عافیت کے ساتھ صرف اپنا محتاج رکھے، آمین
شم آمین۔

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار





اپنے بیٹا، بیٹی، داماد اور نواسے کے ساتھ

کہ اس وقت اس کے بچپن کی خوب صورت یادوں میں گھومتے ہوئے آپ اب رضوانہ کے کالج کے دور میں پہنچ رہے ہیں۔

کالج کے خوب صورت دلوں کی یادیں گو کہ مختصر ہیں لیکن سوچتی ہوں تو ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ اپنی شرارتی نچر کے باعث فرسٹ ایئر کی طالبہ ہوتے ہوئے بھی فائل ایئر تک کی لڑکیاں میری شرارتوں سے محفوظ نہیں رہتی تھیں۔ سب سے دلچسپ بات تو ابھی بھی مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہے، وہ یہ کہ میں نے کالج میں اپنے آپ کو کچھ اس طرح پاسٹ کے طور پر مشہور کیا کہ لڑکیاں مجھ سے باقاعدہ اپائنٹمنٹ لے کر ہاتھ دکھاتی تھیں اور میں اپنے فری ہیریڈ میں کسی خالی کلاس میں بیٹھ باقاعدہ زانچہ بنا کر باری باری قسمت کا حال بتایا کرتی۔ ان کی پریشانیوں اور مسائل کو شیر کرتے ہوئے انہیں مستقبل کی بہت اچھی اور خوب صورت باتیں بتا کر نفسیاتی طور پر انہیں بہت پوزیٹو کرنا بھی مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔۔۔۔۔

گھر گونجا کرتا۔ ہماری دادی کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ میرا بچپن ایسے ہی بھرے پُرے ہنستے گنگناتے ماحول میں گزرا جہاں پیار اور یگانگت کے پھول ہر طرف کھلے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ پھر بابا کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا۔ یہاں پر ہمیں تحصیل کی محبتوں نے اپنے حصار میں لے لیا۔ مجھے یاد ہے کہ ہر اتوار کو ہم لوگ اور ہماری خالہ کی فیملی ماسوں جان کے گھر اکٹھا ہوتے تھے۔ ہم سب کزنز مل کر خوب ہلکا کرتے۔ ہر نئی بکچر دیکھنا لازمی ہوتا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ سب بڑے بھی بہت خوشی خوشی اس پروگرام میں شامل ہوتے تھے۔ خوب بڑا سا قافلہ جب بکچر ہاؤس پہنچتا تو اس کا اپنا ہی ایک لطف ہوتا تھا۔ کتنے خوب صورت اور بے فکر دن تھے وہ مہکتی ہوئی یادوں سے پُر۔

ارے دیکھیں یادوں کے اس باغ میں آپ رضوانہ کے سنگ سنگ کتنی دور نکل آئے ہیں لیکن ابھی تو آپ کو اس کے ساتھ ماضی کی اس راہ گزر پر بہت آکے تک جانا ہے، راستے میں رک مت جائیے گا جیسے

کر خوب روتی۔ جب دو تین بار ایسا ہوا تو میرا بھائی شاہین مجھے روتا دیکھ کر سخت غصے میں میری دوست کے گھر گیا اور سب گڑیاں اٹھا لیا لیکن نتیجے میں بہت عرصے میری دوست مجھ سے روٹی رہی۔ کتنی معصوم اور پیاری پیاری سی یادیں ہیں یہ۔ ہم لوگوں کا بچپن امی بابا کی محبتوں کی چھاؤں تلے بہت دل فریب گزرا ہے۔ دولت کی ریل پیل بہت زیادہ نہ سہی لیکن بڑا پرسکون اور خوشیوں بھرا دور تھا۔ بابا پی آئی ڈی سی میں بہت اہم اور اونچی پوسٹ پر تھے اور وہ پوسٹ ایسی تھی کہ اگر وہ چاہتے تو بے اندازہ دولت میں کھیل سکتے تھے لیکن انہوں نے پیسوں سے زیادہ ہمیشہ اپنے اصولوں کو اہمیت دی۔ بڑے سے بڑا لالچ بھی کبھی ان کا ایمان حزنزل نہ کر سکا۔ ہم بہن بھائی اپنے بابا کے رزق حلال کے سائے میں پروان چڑھے ہیں۔ بابا اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ہمارے دادا کے بے وقت انتقال نے انہیں وقت سے بہت پہلے بڑا بنا دیا تھا۔ اپنے سب بہن بھائیوں اور بیوہ ماں کی ذمہ داری انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھائی۔ جو بابا ان کے بہن بھائیوں نے بھی ہمیشہ ان کا بے حد احترام کیا اور اپنے باپ کی جگہ سمجھا۔ اپنی دادی کے لبوں پر میں نے ہمہ وقت بابا کے لیے دعائیں ہی دیکھیں۔ میری تینوں پھوپھیاں اپنے بچوں کے ہمراہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے جب دو ماہ کے لیے ہمارے گھر آئیں تو جیسے ہم بہن بھائیوں کی چھٹیاں بھی عید بن جاتیں۔

دادو ذلیل کا وہ بڑا سا گھراب بھی نگاہوں میں گھوم رہا ہے جہاں ایک خوشگوار سا ہنگامہ ہمیشہ پیار رہتا تھا۔ ہمارے چچا تو ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ دو ماہ کا عرصہ بتای نہیں چلا کہ کیسے گزرا گیا۔ ہم سب بچے مل کر خوب اودم چھاتے گھر کے بڑے سے لان میں نت نئے کھیل کھیلے جاتے۔ بڑوں کی باتوں اور قہقہوں سے

دوسرا سامنے آ جاتا ہے۔ بابا کی محبتوں سے معمور ایک اور دن میری آنکھوں میں آنسو بن کر جھلکا رہا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار جب میری سالگرہ آئی تو امتحانات نزدیک ہونے کی وجہ سے امی نے میرے کہنے پر صرف نزدیک رہنے والی ایک آدھ دوست کو ہی انوائٹ کر لیا۔ امی سے بس یہ غلطی ہو گئی کہ انہوں نے بابا کو آفس سے واپسی پر ٹیک لائے کو کہہ دیا اور آپ یقین کریں جب بابا گھر آئے تو ہمارے گھر میں کام کرنے والا لڑکا کار سے طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزوں کے پیکٹ اتارتے اتارتے تھک گیا۔ امی تو ان بے تحاشا چیزوں کو دیکھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ یہ کوفت بھی تھی کہ اتنا ڈھیر سارا کھانے پینے کا سامان آنا تھا تو بہت سے لوگوں کو ہی انوائٹ کر لیا جاتا لیکن بابا کا بس ایک ہی جواب تھا۔ ”واہ ہم اپنی بچی کی سالگرہ پر بھلا ایک آدھ چیز کیسے لاسکتے تھے۔“ ماشاء اللہ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کی وجہ سے خوب ہی لاڈ پیار میں بچپن بیتا ہے میرا۔ شاہین، سلیم اور میں اوپر تلے کے ہیں جبکہ اسد ہم لوگوں سے کافی چھوٹا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب اسد پیدا ہونے والا تھا تو مجھے اور سلیم کو سب لوگ خوب ستاتے کہ تمہارا چھوٹا بھائی آنے والا ہے اور اسے امی بابا زیادہ چاہیں گے تب ہم دونوں خوب غصہ کرتے تھے کہ اسے پیدا تو ہونے دو ہم اسے سمندر میں پھینک آئیں گے۔ اب جب یہ بات یاد آتی ہے تو بہت ہنسی آتی ہے اور اپنے اس لاڈلے بھائی پر جی بھر کر پیار آتا ہے جس میں ہم سب بہن بھائیوں کی جان ہے۔ مجھے بچپن میں گڑیوں کا بہت شوق تھا۔ میری ایک دوست تھی جس کا ایک ہی گڈا تھا، میں جب بھی کوئی گڑیا خریدتی وہ فوراً اپنے گڈے سے اس کی شادی طے کر دیتی اور میں ایسی پاگل کہ خوب دھوم دھام سے اپنی گڑیا اس سے بیاہ دیتی۔ وہ گڑیا رخصت کرا کے اپنے ساتھ لے جاتی اور میں بیٹھ

جواب میری تواضع کوک، سموسوں اور پیٹیز وغیرہ سے کی جاتی۔ ہمارے لیے کیتھین سے مزے مزے کی چیزیں آرہی تھیں اور اپنے گروپ کی خوشخوار نظروں سے بے نیاز ہم بہت شوق سے اس ٹریٹ سے انصاف کرتے۔ میں اور عذرار رسول فرسٹ ایئر میں ایک ہی کالج میں تھے لیکن ہمارے سبکیٹ الگ الگ تھے بس ایڈوائس اردو جو کہ عذرار نے میری وجہ سے لیا تھا اس میں ہمارا ساتھ ہوتا تھا۔ عذرار بہت پڑھا کو اور سنجیدہ مزاج کی تھی۔ لیکن مزاج کے اس فرق نے ہماری دوستی پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا اور ہم دونوں اپنے اس سبکیٹ کو بھی انجوائے کرتے تھے۔ ابھی کالج کے اس حسین زمانے کو پوری طرح سے انجوائے بھی نہیں کیا تھا کہ فرسٹ ایئر میں ہی پرنس کا رشتہ میرے لیے آگیا۔

پرنس حال ہی میں لندن سے انجینئرنگ کر کے آئے تھے۔ پتا نہیں انہیں میری کون سی بات کون سی ادا اتنی بھاگنی تھی کہ انہوں نے میرے گھر کی دہلیز ہی پکڑ لی۔ ایسا لگتا تھا گویا ان کی دنیا یہیں پر آ کر ختم ہو جاتی ہے حالانکہ میں نے ان سے کبھی ڈھنگ سے بات تک نہیں کی تھی لیکن ببا کو پرنس بے حد پسند تھے۔ مجھے یاد ہے جب پرنس کا رشتہ آیا تو ببا نے مجھے اپنے کمرے میں بلوا کر کہا تھا۔

”بیٹی مجھے پرنس ہر لحاظ سے تمہارے لیے بہت مناسب لگ رہا ہے۔ وہ بے حد قابل، محنتی، شریف اور سیلف میڈ لڑکا ہے۔ تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گی لیکن میرے لیے تمہاری مرضی کی زیادہ اہمیت ہے۔“

ببا جس وقت مجھ سے یہ باتیں کر رہے تھے پتا نہیں کیوں مجھے ان کے لہجے میں ایک مان سا چھپا ہوا نظر آرہا تھا جیسے انہیں یقین ہو کہ میں ان کی رائے ان کے فیصلے سے کبھی نا اتفاقی نہیں کروں گی۔ انہوں نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔ میں نے کچھ سوچنا بھی چاہا لیکن ببا کا اپنے اوپر مان، ان کا اعتماد جیسے ہر چیز پر حاوی ہوتا چلا

گیا۔ ان فیکٹ میری رضامندی جان کر ببا چہرے پر جو خوشی بکھری تھی اس خوشی پر میں اپنی خوشیاں قربان کر سکتی تھی میرے ببا نے واقعی میرے لیے بہت اچھا سوچا تھا۔ پرنس نے جتنا مجھے چاہا تھا ہی کسی شوہر نے اپنی بیوی سے اتنی محبت کی ہوگی پرنس اپنے گھر کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

کے والد کا ان کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ ہالہ امی (میری ساس) نے بڑے صبر و استقلال اور ہمدردی کے ساتھ اپنے سات بچوں کی پرورش کی تھی۔ جب میری شادی ہوئی تو پرنس کے سب بہن بھائی پڑھ رہے تھے اور بڑے ہونے کے ناتے گھر کی ذمہ داری پرنس پر تھی جسے وہ بہت خوش اسلوبی سے پورا کر رہے تھے۔ فرسٹ ایئر کی معصوم اور لالباہالی لڑکی کا ایک دم سے اتنے بھرے پڑے گھر کی بڑی بہو بن جانا کوئی آسان بات نہیں تھی لیکن پرنس کی سہ اندازہ محبت کے حصار میں مجھے کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ سسرال بھی بہت پیار کرنے والی ملی۔ میں بہت جلدی سب میں گھل مل گئی۔ اسکرینیل، لوڈو اور تاش خوب ہنستے مسکراتے ماحول میں کھیلے جاتے۔

باجی امی ہم سب کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر خوش ہوا کرتیں۔ باجی امی بڑے بیٹے ہونے کے ناتے پرنس کے معاملے میں کافی حساس تھیں۔ پرنس کا مجھ سے بے پناہ التفات، ان کی اتنی دیوانگی پر انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا لیکن کبھی کبھی ایک سرد مہری سی درمیان میں آ جاتی لیکن یہ ایک فطری سی بات ہے۔ یہ ان کا بڑا پن تھا کہ انہوں نے بلا وجہ کی طعن و تشنیع اور دخل اندازی سے نہ اپنی زندگی اجیرن کی اور نہ ہماری۔ جن گھروں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایک ایسا بیٹا دیا جاتا ہے وہاں سے سکون رخصت ہو جاتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ چھوٹی موٹی رنجشوں کو ہم میں سے کسی نے بھی ایک روگ بنا کر اسے گھر کی خوشیوں پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

زندگی اتنی حسین ہو جائے گی یہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ پرنس شادی سے قبل بہت ریزرو اور سنجیدہ مان تھے جن کی زندگی میں (بقول ان کے) کوئی لمحہ نہیں تھی لیکن شادی کے بعد ان کے انداز میں خود فرد شوخی اور برجستگی آگئی۔ وہ بات بے بات مسکرانے لگے۔ ہنسی مذاق میں بھرپور حصہ لینے لگے۔ ان کا یہ دھڑا ہوا روپ سب کو حیران کر رہا تھا۔ انہوں نے اس لہجے میں مجھے چاہا کہ میں اسے الفاظ میں لکھ ہی نہیں سکتی۔

مشق کی معراج کیا ہوتی ہے یہ مجھے پرنس کی محبت نے بتایا ہے۔ ایک گڑیا کی طرح سنبھال کر رکھا انہوں نے مجھے۔ اب تک میری اس خوب صورت زندگی کی مثال ناندان میں دی جاتی ہے۔ ہم دونوں کے درمیان روایتی میاں بیوی کا رشتہ تو کبھی تھا ہی نہیں۔ دوستو جب میں عذرار رسول کی کہانی لکھ رہی تھی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ شاید معراج رسول کی محبتوں کی اس شدت پر لوگوں کو یقین نہ آئے لیکن تمہارے پرنس کی محبت بھی تو ایسی ہی ایک مثال ہے اور یہ سچ ہے کہ اب بھی دنیا میں کچھ ناقابل یقین محبتوں کے عکس بکھرے ہوئے ہیں۔

پھر ہنی اور علی کے آجانے سے ہماری زندگی مکمل ہو گئی۔ پرنس اپنے بچوں کو بے اندازہ چاہتے تھے۔ ہنی کو انہوں نے ہمیشہ ابو بچی اور علی کو علی بھائی کہہ کر پکارا۔ لیکن مسئلہ بس وہی اظہار کا تھا۔ حیرانی کی بات ہے کہ انہوں نے سوائے میرے کبھی کسی رشتے سے اپنی محبت اور احساسات کا اظہار نہیں کیا۔ ہنی اور علی نے ایک بار یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر وہ دونوں نہ بھی پیدا ہوتے تو ابو کو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ان کے پاس ای جو ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے یہ بات پرنس کو بتائی تھی تو وہ بے ساختہ ہنس رہے تھے۔

”ارے تم میری زندگی ہو تو میرے بچے میری جان ہیں۔ انہوں نے میری زندگی کو مکمل کیا ہے۔“ ببا

کا پرنس کے متعلق اندازہ بالکل درست تھا انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اتنی تیزی سے ترقی کی منازل طے کیں کہ سب حیرن رہ گئے۔ میری زندگی کتنی مکمل اور خوب صورت تھی، ایک بے حد چاہنے والا شوہر جس کے بنا میں سانس لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ دو پیارے پیارے سے بچے۔ شاندار گھر، گاڑیاں نوکروں کی فوج، زبردست اسٹیٹس۔ اللہ نے جی بھر کر نوازا تھا مجھے۔ کوئی بھی کمی نہیں رکھی تھی میری زندگی میں۔ ہر سو خوشیاں، روشنیاں اور مسکراہٹیں تھیں۔ مجھے غم کا مطلب ہی نہیں پتا تھا، میں سمجھتی تھی کہ زندگی صرف خوشیوں کا نام ہے۔ انہی جگمگاتے دنوں میں ایک روز میں نے یونہی بیٹھے بیٹھے ایک افسانہ لکھ ڈالا۔ اس دن اتفاق سے میری کزن گڈو میرے گھر آ گئی۔ باتوں باتوں میں اسے میں نے وہ افسانہ دکھایا تو وہ کچھ غلطی سے بولی۔

”میں نے پہلے بھی تم سے کئی بار کہا ہے کہ تم اپنے فیلنٹ کو ضائع کر رہی ہو لیکن اس بار تمہیں ہر حال میں اپنا یہ افسانہ چھوٹانا ہے۔“ اس کی حوصلہ افزائی اور اصرار پر بہت ہمت کر کے میں انجم انصار کے پاس اپنا پہلا افسانہ جس کا نام آخری خط تھا لے کر چلی گئی۔

پاکیزہ ڈائجسٹ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اپنے عروج پر تھا۔ عذرار رسول میری دوست، میری کزن تھیں لیکن میں نے انجم انصار پر اس وقت اپنے اس رشتے کو بالکل بھی ظاہر نہیں کیا۔ میں بنا کسی سفارش کے اپنے فیلنٹ کو آزمانا چاہ رہی تھی۔ وہ انجم سے میری پہلی ملاقات تھی۔ انہوں نے بہت مہربان مسکراہٹ سے مجھے خوش آمدید کہا۔ پورا افسانہ ایک سرسری سی نگاہ سے پڑھا اور شہد آ گئیں لہجے میں اسی وقت مجھے بتادیا کہ آپ کا افسانہ شائع ہو جائے گا۔ بس اس لمحے کی خوشی نہ پوچھیں دل چاہا انجم کے رخسار چوم لوں لیکن اپنی مسکراہٹ اپنی خوشی کو بڑی مشکل سے ضبط کرتے



امی بتا اور تینوں بھائی

دیں گے۔ اپنا کیرئیر دوبارہ اسٹارٹ کریں گے۔ اُن کی نسلی امیر باتیں میرے دل میں ایک سکون بن کر اترتی جا رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے وہی پرانے والے پرس واپس مل گئے ہیں۔ ایک عرصے کے بعد پرس نے باہر دُڑکا پر دُگرام بھی بنایا تھا لیکن اُن کے چہرے پر نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ دل کچھ پریشان سا ہو گیا۔

”پرس آپ چائے پیئیں گے؟ ساتھ میں کچھ کھانے کو بھی لے آؤں؟ آپ کے چہرے پر کافی کمزوری... لگ رہی ہے۔“ میں نے فکر مندی سے انہیں دیکھا۔

”نہیں، میرے خیال میں صرف چائے ہی لے آؤ۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔ میں الجھنے لگی تو انہوں نے مجھے پکارا پھر میرا ہاتھ تھام کر بولے۔

”آئی لو یو۔“ میں اُن کے بے وقت کے اظہار پر بے ساختہ ہنس دی۔

”ہاں جناب ہمیں پتا ہے۔“ میں مسکراتے ہوئے کچن کی جانب چلی گئی۔ کاش میں یہ جان جاتی کہ یہ اُن کے آخری الفاظ ہیں تو جواب میں بھی اُن سے اپنے دل کی تمام شدتیں بیان کر دیتی۔ اب میں سوچتی ہوں کہ پتا نہیں انہیں اپنی طبیعت اپنی کیفیت کیسی محسوس ہو رہی تھی اس وقت۔ کیا وہ سمجھ رہے تھے کہ بس وہ جانے والے ہیں۔ کاش۔ کاش میں بھی کچھ اندازہ کر لیتی۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم دونوں کا ساتھ کچھ ہی لمحوں کا ہے، وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑنے والے ہیں بہت دور جانے والے ہیں۔ اگر مجھے ذرا سا بھی پتا چل جاتا کہ موت اُن کے اتنے

سے بہت دور محسوس ہونے لگے تھے۔

پرس کی صحت آہستہ آہستہ گرتی جا رہی تھی لیکن انہیں اس کی بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ انہیں بس یہ یقین تھا کہ جب وہ کامیاب ہو جائیں گے تو حالات کے ساتھ ساتھ اُن کی صحت بھی بالکل ٹھیک ہو جائے گی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حالات مزید بگڑتے جا رہے تھے اور پرس ان ناکامیوں کو برداشت نہیں کر پارہے تھے۔ لوگوں کے طعن و تشنیع، بے سرو پا باتیں، میری خفگی اور انہوں کی بے رخی نے جیسے انہیں آہستہ آہستہ توڑنا شروع کر دیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اتنی جلدی زندگی کی جنگ ہار جائیں گے تو میں دل پر پتھر رکھ کر بھی اُن کے غلط فیصلوں پر سر جھکا دیتی لیکن انہیں خوش رکھتی۔ وہ سیاہ دن آج بھی میرے ذہن کے ایک گوشے میں چھپا خاموش آنسوؤں سے روتا رہتا ہے جب پرس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ صبح کتنی عجیب سی تھی، ایک بے نام سی اداسی جیسے پورے گھر میں چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں بار بار میری آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔ اس دن بہت عرصے بعد پرس نے میری اداسی کو محسوس کیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے نزدیک بٹھالیا۔ اُن کی آنکھوں میں مجھے وہی والہانہ پن اور پیار نظر آ رہا تھا جو بہت دنوں سے کہیں کھو گیا تھا۔ حالانکہ چہرے پر کچھ کمزوری سی عیاں تھی۔

”تم اتنی اداس اور خاموش مت رہا کرو۔ میرا دل بہت پریشان ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے بہت پیار سے کہا تو میں بے اختیار رو دی۔

”پرس میں بہت تھک گئی ہوں، پلیز آپ ہمارے پہلے جیسے پرس بن جائیں۔“ مجھے آج بھی اپنا یہ جملہ یاد ہے۔ تب پرس نے میری آنسوؤں سے بھیگی چلوں کو اپنی انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ میری روشنی ہوئی ساری خوشیاں واپس

ہوئے ان کا شکریہ ادا کر کے ہم واپس لوٹ آئے۔ وہ دن اور آج کا دن ہے کہ انجم ادب کی اس دنیا میں اب تک میرا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ معراج بھائی اور عذرا کی حوصلہ افزائی نے بھی مجھے آگے بڑھنے میں بہت مدد دی ہے۔ معراج بھائی بہت کم کسی کی تعریف کرتے تھے لیکن بقول عذرا تم ان خوش قسمتوں میں شامل ہو۔ کتنا حسین دن تھا وہ جس دن میرا پہلا افسانہ چھپا تھا۔ پرس بک اسٹال سے چار پانچ پاکیزہ ڈائجسٹ لے کر آئے تو میں بچوں کی طرح خوش ہوئی تھی۔ پھر اس رات وہ مجھے اور بچوں کو اس خوشی میں ایک شاندار سے ریسٹورنٹ میں ڈنر پر لے گئے۔ میری ہنسی کھلتی زندگی پر غموں کے مہیب سائے آہستہ آہستہ اپنے پر پھیلا رہے تھے۔ پرس کو پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ اپنی بے حد شاندار جاب چھوڑ کر پرس کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگے۔ وہ شخص جسے پرس کی الف ب نہ پتا ہو، جو بے حد ایمان دار، سچا اور کھرا ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں پر اندھا اعتماد بھی کرنے والا ہو بھلا وہ پرس کی دنیا میں کیسے چل سکتا تھا۔ پرس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا وہ بری طرح سے اپنے آپ کو الجھاتے گئے۔

اپنی جاب، اپنی جمع پونجی، اپنا شاندار کیرئیر سب ہی کچھ داؤ پر لگا دیا۔ پرس میں جہاں ڈھیر ساری خوبیاں تھیں وہاں ضد جیسی خالی بھی اُن میں موجود تھی۔ سب ہی نے انہیں سمجھایا کہ اُن کا اتنا شاندار کیرئیر ہے جملگانا مستقبل ہے وہ اسے یوں برباد نہ کریں جو ہو گیا سو ہو گیا ان ٹھوکروں سے سبق لیں اور واپس اپنی جاب پر چلے جائیں۔ لیکن پرس اب پہلے والے پرس رہے ہی نہیں تھے۔ کسی کی بات کسی کی محبت کسی کی نصیحت سے اُن کو کوئی سروکار ہی نہیں رہا تھا۔ بس ان پر ایک ہی وُمن سوار ہو گئی تھی کہ اس فیلڈ میں بھی وہ کامیاب ہو کر دکھائیں گے۔ زندگی بے حد مشکل اور تلخ ہو گئی تھی۔ مجھے پرس اب اپنے آپ سے اور بچوں

قریب کھڑی ہے تو میں ایک بل کو بھی ان کا ہاتھ نہ چھوڑتی۔ انہیں اپنے دل میں چھپا لیتی۔ میں جب کچن سے واپس آئی تو وہ اپنی خوب صورت آنکھیں موندے ہمیشہ کی نیند سوچکے تھے۔ میں نے انہیں چیخ چیخ کر آوازیں دیں۔ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ گھبرا کر اپنی کزن گڈو کو فون کیا۔ وہ فوراً ایسبولینس کے ساتھ گھر پہنچی، ڈاکٹر بھی ساتھ تھا لیکن کوئی کچھ نہ کر سکا۔ پرس چلے گئے تھے۔ میں صدمے اور حیرانی سے ساکت رہ گئی۔ چند ہی لمحوں میں میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ کوئی تھوڑی سی دیر کے لیے بھی باہر جاتا ہے تو لوگ اسے خدا حافظ کہتے ہیں اور پرس تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور جا رہے تھے اور مجھے خبر ہی نہ تھی۔ مجھے پھر سے میری خوشیاں واپس لوٹانے کا وعدہ کرتے کرتے وہ کیسے یوں اچانک خاموش ہو گئے مجھے کسی طور یقین نہیں آ رہا تھا۔

موت نے چپکے سے جانے کیا کہا
زندگی خاموش ہو کر رہ گئی
پورے خاندان میں پرس کی اچانک موت نے
ایک کھرام پکا کر دیا تھا۔ اپنے پرانے سب ہی مل کر رہ
ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

گئے۔ باجی امی (میری ساس) کا انتقال ڈیڑھ سال قبل ہی ہوا تھا۔ کتنی خوش قسمت تھیں وہ کہ اپنے سب سے لاڈلے بیٹے کی جدائی کا غم نہیں سہنا پڑا ان کو۔ دوستو، آپ لوگ یقین کریں کہ وہ وقت وہ لمحہ میرے دل کے اندر جا کر ٹھہر سا گیا ہے۔ سبز رنگ کی شرٹ میں پرنس کا چہرہ اتنا خوب صورت اور پُرسکون لگ رہا تھا کہ دل ماننے کو تیار ہی نہیں ہو رہا تھا کہ چند لمحے پہلے مجھ سے باتیں کرنے والا میرا یہ محبوب ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے۔ میرے بچے یتیم ہو گئے ہیں۔ اب انہیں بن باپ کے جینا ہوگا۔ ہنی کو جب یہ خبر ملے گی تو اس پر کیا گزرے گی۔ میرے بچے علی کو اس عمر میں باپ کی محبت شفقت اور توجہ کی کتنی ضرورت ہے یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں بار بار پرنس کو پکار رہی تھی۔ گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ پرنس کے بہن بھائی غم سے غڑ حال تھے۔ لندن میں بھی یہ خبر ایک قیامت بن کر ٹوٹی تھی۔ پہلی فلائٹ سے سب آرہے تھے۔ لیکن میرا دماغ بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ کسی کی تسلی، دلاسا، پُرسہ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس یاد تھی تو ایک بات کہ میرے اور میرے بچوں کے سر سے پرنس کا سایہ اٹھ گیا ہے۔

گئے وقتوں کی کچھ باتیں کچھ آنسو اور کچھ یادیں

یہ سب مل کر زمین دل کو اب شاداب رکھتے ہیں

وقت چاہے جیسا بھی ہو گزر رہی جاتا ہے۔ پرنس کو مجھ سے بچھڑے تین چار ماہ بیت چکے تھے، ان کی اچانک موت نے مجھے جیتے جی مار دیا تھا۔ روح کے اندر ایسا گہرا سناٹا اتر آیا تھا کہ سانس لینا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ یہ سوچ کر ہی دل بیٹھنے لگتا کہ اب پرنس مجھے کبھی نظر نہیں آئیں گے، وہ میری زندگی سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں۔ ایک چھوٹی سی بچی کی طرح میں بالکل سہم کر رہ گئی تھی۔ امی اور باپ کو میرا یہ دکھ جیسے اندر سے ختم کیے دے رہا تھا۔ میرے بچوں پر اس حادثے

کا گہرا اثر تھا۔ ایک عجیب سی سوگواریت اتر آئی تھی ہماری دنیا میں۔ انہی دنوں ایک بار ہنی کی کسی بات پر مجھے یہ احساس ہوا کہ میرا جڑا ہوا یہ خاموش روپ کہیں میرے بچوں کو بالکل ہی اکیلا نہ کر دے۔ ایک مایوس اور ڈپرینڈ ماں کے سائے میں بھلا وہ کیسے زندگی کی راہوں میں آگے بڑھ سکیں گے۔ تب میں نے اپنی آنکھوں میں چھپے ہوئے آنسوؤں کو بالکل پیچھے دھکیلتے ہوئے اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ میں اپنے پیاروں کی خوشیوں کو اپنی مسکراہٹوں سے واپس لوٹا دوں گی۔ میں جانتی تھی کہ مجھے اسی معاشرے میں جینا ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میرے گرد میرے بہت پیار کرنے والے رشتوں کا حصار تھا جو میری آنکھوں میں آنسو نہیں بلکہ لبوں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ میرے سسرال والوں کی محبت اور ان کی سپورٹ کے علاوہ میری بہت پیاری دوستوں جیسی کزنز اور میرے خاندان کے کچھ بہت بے لوث محبت کرنے والے لوگوں نے بھی مجھے جینے کا حوصلہ بخشا اور یوں اپنے آپ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق میں پھر سے وہی پہلے جیسی ہنستی مسکراتی رضوانہ بن گئی۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ چھوٹی ذہنیت کے لوگوں کو میرا یہ ہنستا مسکراتا خوش رنگ کپڑوں میں ملبوس روپ نہ بھایا ہو لیکن میں دقیانوسی سوچ کے تحت زندگی گزارنے والی عورتوں میں سے نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے کسی کی ہمدردی لینا پسند ہے۔ میری زندگی کا ایک اصول یہ بھی رہا ہے کہ میں نے کبھی لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کی ہے۔ میں جو پرنس کی زندگی میں ایک ڈرپوک قسم کی لڑکی ہوا کرتی تھی ان کے بعد میں نے زندگی کو بہت ہمت اور بہادری سے فیس کیا ہے۔ عورت اگر مضبوط ہو، اسے خود پر اعتماد ہو تو پھر کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میری پوری کوشش یہ تھی کہ میں بالکل نارمل زندگی گزاروں۔ میرے ہونٹوں پر ہنسی سب دیکھ لیتے تھے لیکن دل پر

گرنے والے آنسو کسی کو نظر نہیں آتے تھے لیکن پتا نہیں میرے بپا کیسے میرے دل میں جھانک لیتے تھے۔ اکثر وہ مجھے پاس بلا کر پوچھتے۔

”بہٹی تمہارا دل تو نہیں گھبراتا، تم پریشان تو نہیں ہوتی ہو؟“

ان کے اس سوال پر کبھی کبھی دل چاہتا کہ ان کے گلے لگ کر خوب روؤں۔ لیکن میں جانتی تھی کہ باپ پہلے ہی میری وجہ سے بہت ٹوٹ چکے ہیں اور مجھے اس طرح بہادری سے جیتے دیکھ کر انہیں بہر حال کچھ تسلی رہتی ہے سو میں مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہتی۔ ”نہیں بپا، میں تو نہیں گھبراتی۔“ میں باپ کے پاس گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتی، فی وی پر ان کے ساتھ خبریں دیکھتی۔ ان کے ساتھ واک پر جانا بھی۔ مجھے بڑا اچھا لگتا تھا۔ وہ مجھے اس پوری دنیا میں اپنے سب سے زیادہ قریب محسوس ہوتے تھے لیکن پرنس کی طرح وہ بھی اچانک مجھ سے بچھڑ گئے۔ میں ان دنوں ساپھر لیس میں تھی کیونکہ وہاں علی اسکا لرشپ پر پڑھ رہا تھا اور ہنی بھی شادی کے بعد وہیں سیٹل تھی۔ میں ایک ماہ قبل ہی لندن سے واپس لوٹی تھی کہ اچانک میرے بڑے بھائی شاہین اور میری بچپن کی دوست اور بھابی رخسانہ کی ساپھر لیس آمد نے مجھے بہت خوشگوار سر پر اثر دیا۔ شاہین نے اپنے اچانک آنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا تھا کہ کچھ دن قبل بپا نے پتا نہیں کیوں تمہیں بہت یاد کیا، وہ تمہاری باتیں تمہارا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار رو پڑے تھے موبہا کی تسلی کے لیے ہم نے اچانک ہی یہاں آنے کا پروگرام بنالیا۔ اب واپس جا کر جب یہاں کی باتیں باپ کو بتائیں گے تو وہ خوش ہو جائیں گے۔ میرا دل باپ کی اس محبت پر رو دیا۔ کاش وہ سفر کر سکتے تو وہ خود یہاں آ جاتے میرے پاس۔ میں نے اداسی سے سوچا۔ کافی عرصے سے وہ سفر کرنے سے گریز کرنے لگے تھے۔ شاہین، رخسانہ

کے آجانے سے گھر میں ایک خوشی اور رونق سی آگئی تھی۔ اسی شام ہم لوگ ریسٹورنٹ سے ڈنر کر کے ہنستے کھلکھلاتے گھر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ لندن سے اچانک فون آیا کہ باپ کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ میرا دل جیسے بیٹھ سا گیا۔ میں برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی کہ میرے باپ کو کچھ ہو جائے۔ وہ میرے باپ ہی نہیں میرے دوست، میرے غم خوار اور میری ڈھارس تھے۔ ہمیں صبح کی فلائٹ ملی۔ کتنی طویل لگ رہی تھی وہ بھیا تک رات۔ ایک پل کو بھی آنسو نہیں قہم رہے تھے۔ شاہین کی آنکھوں میں خاموش آنسو تھے، وہ اپنے بازوؤں کے حصار میں ایک چھوٹی بچی کی طرح مجھے لپٹائے ہوئے بیٹھا تھا۔ ابھی کل ہی تو وہ باپ کو خدا حافظ کہہ کر آیا تھا۔ اس وقت وہ مجھے اپنا بڑا بھائی نہیں بلکہ بالکل باپ کی طرح لگ رہا تھا۔ کیا یہ باپ کی محبت کی طاقت تھی جس نے شاہین کو اچانک ہی یہاں آنے پر مجبور کر دیا تا کہ اس کڑے وقت میں اس کی وجہ سے مجھے تسلی اور ڈھارس رہے اور وہ مجھے تسلی دے سکے۔ اچانک اس مہوچ نے جیسے میرے دل کو ٹھکی میں دبوچ لیا۔

”بپا میرے پیارے بپا، آپ ابھی مجھے چھوڑ کر مت جائیے گا، میں ایک بار اور آپ کو دیکھ لوں بپا۔ پلیز اللہ میاں میرے باپ کو بچا لیجیے۔“ میں نے روتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے دعا کی لیکن شاید وہ قبولیت کی گھڑی نہ تھی۔ جب ہم لوگ لندن پہنچے تو بپا ہم سب سے بہت دور جا چکے تھے۔ میری زندگی میں ایک بار پھر پرنس کے بعد جیسے دوبارہ گہرا اندھیرا چھا گیا لیکن ایسے میں میرے بھائیوں نے مجھے اپنی محبت اور حفاظت کے حصار میں لے لیا۔ اپنے باپ کی جدائی کا غم ہم چاروں بہن بھائیوں نے مل کر بانٹا۔ اپنے اپنے آنسو چھپا کر ایک دوسرے کو ہنایا۔ میری امی کے لیے وہ ایک بہت بڑی ڈھارس بن گئے اور یوں یہ عظیم غم



پاکستان کے لئے دعا ہے کہ

تمہی دست

میں تیرے جنم دن پر
نذر کیا کروں تجھ کو
زندگی کے آگن میں
آرزو کے دامن میں
پھول ہیں نہ کلیاں ہیں
خسک زرد پتوں کے
موسموں کی آہٹ سے
منجھدی پلکوں پہ
آنسو دیپ جلتے ہیں
چپ سی ہے ہونٹوں پر
جسم ایک صحرا ہے
میں تیرے جنم دن پر
نذر کیا کروں تجھ کو
میرے ہاتھ خالی ہیں

از: صبا نور، لیہ

سالگرہ

رات کے درتے میں
زرد ساعتیں لے کر
اک خیال گوہر کو
عکس نا خدا کہہ کر
زندگی کے آئینے سے
پھر سے باندھ رکھا ہے
رقص آگنی جاری
ساعتیں شہر جائیں
اور میری ٹٹھی میں

آنگھوں سے لگا لوں میں تیرا نام میرے اللہ
مل جائے مجھے بھی کوئی مقام میرے اللہ
تیری چوکھٹ سے یہ سرائے گا نہ اب تو
کٹ جائے تیرے در پر یہ شام میرے اللہ
والی ہے تو میرا وارث بھی تو ہی ہے
پھر کیوں مجھے ملے فکر و الم میرے اللہ
جھولی میری بھردی ہر شے مجھے دے دی
ہر شے میرے لیے تیرا انعام میرے اللہ
ایسی زباں مجھے دے کہ ہر دم تجھے پکاروں
ہر دم میں لوں تیرا ہی نام میرے اللہ

شاعرہ: عائشہ خورشید انور، کراچی

نعت رسول مقبول ﷺ

بھٹکے ہوؤں کے سہارے محمدؐ
ہیں نور مجسم ہمارے محمدؐ
مری آنکھ جنت کے دیکھے نظارے
زباں میری جب جب پکارے محمدؐ
نہ محشر میں ساحل ملا جو کسی کو
لگائیں گے کشتی کنارے محمدؐ
بنا کر خدا نے قلم توڑ ڈالا
ہیں صورت میں یکتا ہمارے محمدؐ
ابو جہل بولا یہ کیسا کیا ہے بتاؤ
تو مٹھی میں سے نکلا پکارے محمدؐ
محبت کا عطیہ تقاضا یہی ہے
مجھے جہاں سے بڑھ کر ہوں پیارے محمدؐ
مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ جیوٹی وی اور
اے آروائی پر بھی میرے ڈرامے آچکے ہیں اور اب
انشاء اللہ ہم ٹی وی پر بھی آپ میری تحریروں کو ڈرامائی
شکل میں دیکھ سکیں گی۔ یہ سب کامیا بیاں مجھے اپنے
اللہ پر بھروسے اور اپنے یقین کی طاقت کی وجہ سے
حاصل ہوئی ہیں۔ دوستو! میری زندگی میں اس مقولے
کی بھی بڑی اہمیت ہے کہ ”زندگی زندہ دلی کا نام
ہے۔“ آپ کو میری شخصیت میں شرارت، شوخی اور
زندہ دلی بہت واضح نظر آئے گی تبھی تو سب کہتے ہیں
کہ میں جہاں جاتی ہوں ماحول میں ایک زندگی سی
آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے لوگوں میں خوشیاں
بانٹنا بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے اُن کے دکھ درد اپنے دل
پر محسوس ہوتے ہیں جنہیں بانٹ کر مجھے روحانی سکون
ملتا ہے بالکل ایک عبادت کی طرح۔ اللہ نے شاید میری
اس عبادت کو قبول کر لیا ہے اور جو اب میرا دامن بہت سی
بے لوث محبتوں سے بھر دیا ہے۔ میری ای (پلیز ان کی
صحت کے لیے دعا کیجیے) میرے پیارے بھائی اور
محبت کرنے والی بھابیاں، مجھے چاہئے والے میرے
بچے، میرا داماد، میری پُرخلوص کزنز اور سچی دوستیں، بے
لوث پیار کرنے والا سسرال اور اب میرے ننھے منے
سے سیف (نواسے) نے آکر جیسے میری زندگی کے
آئینے پر چاند ستارے ٹانک دیے ہیں۔

دوستو! اپنی زندگی کے اس سچے افسانے میں
اپنی خوشیوں اور اپنے آنسوؤں کو آپ کے ساتھ شیئر کر
کے مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے اگر میری اس کہانی سے
کسی نے کچھ حاصل کر لیا تو میری خوشی دوچند ہو جائے
گی۔ ہمیشہ خوش اور پوزیٹو رہیے آخر میں اس شعر کے
ساتھ اجازت چاہوں گی۔

کسی کسی کو تھماتا ہے چابیاں گھر کی
خدا ہر ایک کو اپنا پتا نہیں دیتا

☆☆☆

ایک دوسرے کے سہارے ہم لوگ سہہ سکے۔ پیری
پیاری بھابیوں کی بے لوث محبتوں کا بھی اس عظیم غم کو
سہنے میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ
شادیوں کے بعد بہن بھائیوں میں دوریاں خود بخود
بڑھ جاتی ہیں۔ اپنی اپنی مصروفیات ہو جاتی ہیں لیکن
ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔ لندن جیسی مصروف
زندگی میں بھی ہم سب اکٹھا ہو کر خوب محفلیں جاتے
ہیں۔ ساتھ کھانا کھاتے ہیں، گھومنے پھرنے کے
پروگرام بناتے ہیں۔ اللہ کرے میرے ببا اور ای کی یہ
پھلوا ری ہمیشہ ایسے ہی خوشیوں، محبتوں اور یگانگت کے
پھولوں سے مہکتی رہے۔ دوستو! اگر اللہ نے میری ہنسی
مسکراتی زندگی میں آنسوؤں کی نمی گھولی بھی ہے تو اس
کے ساتھ مجھے ان امتحانوں سے گزرنے کا حوصلہ بھی
عطا کیا ہے۔ وہ میرے دل کے اتنے پاس رہتا ہے کہ
میں اپنی بہت چھوٹی چھوٹی سی باتیں تک اس سے شیئر
کرتی رہتی ہوں مجھے ہمیشہ یہ یقین رہا ہے کہ میرے ہر
مشکل وقت میں میرا اللہ میرے نزدیک رہتا ہے۔
میری آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھتا بھی تو وہی
ہے نا مجھے دوسری پیاری پیاری سی خوشیاں دے کر۔ وہ
میری بہادری میرے حوصلوں پر مجھے انعامات سے
نوازا رہتا ہے۔ ساتھیو! اللہ سے دوستی کیجیے بہت سچے
دل کے ساتھ۔ اس پر اعتماد اور بھروسہ کیجیے دل کی
گہرائیوں کے ساتھ پھر دیکھیے وہ آپ کا ہر مشکل میں
کس طرح ساتھ دے گا۔ میں نے ہمیشہ پوزیٹو سوچ
کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ یاد رکھیں اپنے یقین کی
طاقت کے بل پر ہماری زندگی معمولی یا شاندار بن
جاتی ہے۔ سوچ کا زندگی پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔
شاید اللہ کو میری یہ بات پسند آئی تھی تبھی تو میرے ننھے
افسالوں کے مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پاکیزہ
ڈائجسٹ میں میرا قسط وار ناول چھپ کر پسندیدگی کی
سند حاصل کر چکا ہے اور اب انشاء اللہ جلد ہی کتابی

شاعر: نعیم رضا بھٹی

مرسلہ: سیدہ ہاشم شاہ، ہارون آباد پنجاب

تذنب

تیری راہ سکتے سکتے میری آنکھیں بھر ہو گئی ہیں
دن کا سکون اور راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں
نہ تیرے آنے کا پتا نہ تیرے جانے کی خبر
جانے والے اتنا تو بتا دے کب ختم ہوگا

تیرا یہ آنا اور جانا

تیرے آنے کی خوشی مناؤں

یا تیرے جانے کا غم سہوں

شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

نقصانات

فقیر: ”صاحب ایک روپیہ دے دو۔“

صاحب: ”کل آنا۔“

فقیر: ”اس کل کل کے چکر میں اس کالونی میں
میرے لاکھوں روپے پھنسے ہوئے ہیں۔“

مرسلہ: منور شہزادی، گوجرانوالہ

چلو مان لیا

چلو مان لیا کہ میرا

ہونا نہ ہونا

تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا

میں ہوں نہ ہوں تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا

مگر سنو!

مجھے تنہا چھوڑ کے اب جو

یہ اداسی سی تمہاری آنکھوں میں

ہمد وقت رہتی ہے

یہ بے چینی سی جو تمہارے

دل کو تڑپاتی ہے

جو شکست سی تمہارے

اٹھتے ہوئے قدموں میں دکھتی ہے

کیا یہ اس بات کی علامت نہیں
کہ کبھی تمہیں بھی
مجھ سے محبت تھی

شاعرہ: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدرمرجان

وجہ

ایک موٹر کار والے نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی
طرح سامنے چلنے والی موٹی عورت کو بچالے لیکن
جب ناکام رہا تو عورت کو ٹکڑے مارے ہوئے گاڑی
روک لی۔ موٹی عورت بلبلا تے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی
اور چلاتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم میرے گرد گھوم کر
نہیں جاسکتے تھے۔“

موٹر کار والا بولا۔ ”ہاں گھوم کر تو چلا جاتا مگر کیا
کردوں گاڑی میں اتنا پیٹرول نہیں تھا۔“

مرسلہ: ریحانہ شہزاد، کراچی

گزر رہا ہوا وقت

سنو!

مجھے بھول نہ جانا

جب بھی ہاتھ اٹھانا دعا کے لیے

مجھے بھی یاد کر لینا

بھول نہ جانا

سنو!

مجھ کو اندہ دینا

میں چلا گیا تو پھر لوٹ نہ پاؤں گا

مانا کہ میں نے تمہیں غم دیے

مگر خوشیاں بھی تو ساتھ تھیں

میری ڈوریں مگر پھر بھی تمہارے ہاتھ تھیں

میں جا رہا ہوں

دیکھو!

میرا اعتبار کر لو

تھوڑا سا خیال کر لو

تمہارے اپنوں کو تم سے جدا کیا

مگر دوست بھی تو انمول دیے
کٹھنایاں آئیں ساتھ میرے
مگر چین بھی تو ساتھ تھا

شاعرہ: آشا کرلائی، گولارچی

کاش

ایک دفعہ ایک انسان نے کوئل سے کہا۔ ”اگر تو
لی نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا؟“ پھر سمندر سے کہا۔
”اگر تو کھارا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا؟“ پھر گلاب سے
کہا۔ ”اگر تجھ پر کانٹے نہ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا؟“

تب ان تینوں نے کہا۔ ”اے انسان اگر تجھ میں
دوسروں کے عیب ڈھونڈنے کی عادت نہ ہوتی تو کتنا
اچھا ہوتا؟“

مرسلہ: صدف آصف، کراچی

بند کتاب

اس کے لیے میری ذات

ایک ایسی بند کتاب تھی

جو مجھے ورق ورق پڑھنا چاہتا تھا

آج وہ مجھے

کہیں رکھ کر بھول سا گیا ہے

شاعرہ: فرحت جمال، کراچی

وجہ خاص

بیوی نے شوہر سے کہا۔ ”ذرا دیکھیں تو میں

آپ کے لیے کیا لائی ہوں۔“

”ارے کُرتے کا کپڑا لیکن بیگم، میرے لیے

کپڑے خریدنے کا تمہیں کیسے خیال آ گیا؟“ شوہر

نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیوں خیال نہ آتا، پانچ ساڑیاں خریدنے پر

کُرتے کا کپڑا مفت جو مل رہا تھا۔“ بیوی نے مسکرا کر

جواب دیا۔

مرسلہ: نگینہ ضیا بگٹش، کراچی

زیادہ تر

میں نہیں کہتی

کہ وہ ہر بات

غلط ہی کہتا ہے

مگر اس کے لبوں پر

میرے لیے

زیادہ تر باتیں

صرف دکھ دینے والی ہوتی ہیں

شاعرہ: طلعت رانا، چیچہ وطنی

تصحیح

دل کے بڑے آپریشن کے بعد ایک خاتون
نازک حالت میں تھیں۔ ان کے شوہر بیڈ کے قریب
پریشان کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں تسلی دیتے
ہوئے کہا۔ ”آپ فکر مند نہ ہوں یہ جلدی ٹھیک
ہو جائیں گی کیونکہ ان کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے۔“

”کچھ ایسی کم بھی نہیں ہے۔“ شوہر نے جواب
دیا۔ ”چینٹا لیس سال کی ہیں۔“

مریضہ آہستگی سے کسمائی ہوٹ ذرا سے ہلے
اور ڈاکٹر کو سرگوشی سنائی دی۔ ”چوالیس سال۔“

مرسلہ: شبانہ حیات، لاہور

وعدہ

ضبط کا ایک بند

اپنی آنکھوں کے حصار پہ باندھ کے

اور چہرے کو آئینہ تلے ڈھانپ کے

تجھ کو رخصت کیا اور وعدہ کیا

دور ہو کے میں تجھ سے نہیں روؤں گی

میرے ساجن مگر تو نے یہ کیا کیا

اس کے ہمراہ جاتے ہوئے رک گیا

ایک پل کے لیے

کیوں پلٹ کر مجھے دیکھتا ہی رہا

شاعرہ: ناہید عزی، کراچی



دل کی باتاں

ہمارے تو میکے کے لوگ بھی اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کے سامنے میں اپنے منہ کی بساند نکال سکوں۔ اب بڑے بھیا کے سامنے میں نے اپنے سرالیوں کی ایک، ایک زہریلی بات چار سے ضرب کر کے اس وجہ سے بتائی کہ وہ مجھے دلاسا دیں، تقویت دیں اور میرے گھر لدے پھندے آئیں کہ چھوٹی بہن کے مجروح دل کو کچھ تو قرار سا آجائے۔ طمانیت دینے کے یہی طریقے ہوا کرتے ہیں۔

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو دلا سے دینے کے تقاضے اسی طرح پورے کیے جاتے ہیں مگر چلتی قسم کے لوگوں سے الفت کے تقاضے نبھائے نہیں جاتے۔ میری ساری کلیجے کی آگ نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ وہ بڑے بقراطی انداز میں بولے۔ ”شبوتم میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ مسرت، امید اور ہمت زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ تینوں چیزیں مل کر نہ صرف زندگی کو بلکہ چہرے کو بھی خوب صورت بنا دیتی ہیں۔“

”اونہ بنا دیتی ہوں گی.....“ میں نے کندھے اچکائے۔ میں نے تو مسرت کی جگہ تکلیف، امید کی جگہ ناامیدی اور ہمت کے مقابلے میں بے ہمتی ہی دیکھی تھی۔

کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا تھا۔ مجھے ہر شخص چڑانا چاہتا ہے..... گھر میں پھرنے والی مرغیاں..... میرے ہی دروازے پر آکر بیٹ کر کے جاتی تھیں اور

انڈا ہمیشہ جیٹھانی کے اسٹور روم میں جا کر دیتی تھیں۔ جس دن اسکوٹر سوار چھلا دامیرا پرس لے کر اڑن چھو ہوا..... جس میں میری چوڑیاں، پالیاں اور میاں کے رکھے ڈھکے پیسوں کی خفیہ پوٹلی تھی۔ ٹھیک اسی لمحے میرے موبائل پر نند کی چبکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”بھابی جان..... میرا پرائز بانڈ نکلا ہے..... پورے دس لاکھ روپے ملیں گے۔“ تب میں پھوٹ پھوٹ کر ردی..... میرا ایک لاکھ کا نقصان ہوا تھا..... اور میری نند کو اس سے بڑھ کر رقم انعام میں ملی تھی۔

اور یہ کوئی خوشی کی بات تھوڑی تھی مگر دل کی یہی باتاں بھلا کوئی کسی سے کہہ سکتا ہے۔ ہرگز نہیں.....

☆☆☆

اگر ایسا ہوتا تو.....

نزاکت آرا..... واقعی نازک سی تھیں۔ شادی کو چار سال ہو گئے تھے مگر اُن کے وزن میں رتی بھر بھی زیادتی نہیں آئی تھی۔

ایسی دلی..... اور نازک سی لگا کرتی تھیں کہ لگتا تھا کہ اگر وہ ترازو میں کھڑی ہو جائیں تو پانچ پھولوں کے بعد چھٹا پھول نہ چڑھے۔ اپنے میکے میں تو خاصی آرام طلب سی تھیں کہ ان کا دبلا پادیکھ کر اُن کی بڑی بہنیں ان پر رحم کھا کر کسی کام کے لیے کہتی ہی نہیں تھیں مگر جب شادی کے بعد سسرال کا ماحول دیکھا تو اپنے آپ کو سب سے زیادہ ایکٹیو پایا۔

ان کی موٹی موٹی سی نندیں سارا سارا دن سونے کی عادی تھیں..... دوپہر کا ناشتا بھی ظہر کے

بعد ہوا کرتا تھا۔ سسر کی دکان تھی وہ بھی اپنی مرضی سے دکان آتے جاتے تھے ہاں، میاں کالج میں پڑھاتے تھے۔ وہ ہمیشہ صبح نہار منہ جانے کے عادی تھے۔

نزاکت آرانے بھی ان کے ٹائم ٹیبل میں تبدیلی کرنی ضروری سمجھی۔ بھوک کی وہ شروع سے ہی مچی تھیں۔ اس لیے صبح باورچی خانے میں اپنے لیے ناشتے بنانے جاتیں تو ساس، سسر کو بھی پکا کر دینا پڑتا..... وہ کر کے فارغ ہوتیں تو دیور کھنکھارتے ہوئے آجاتے۔

ناشتے کا اس قدر لاپ کرتے کہ انہیں باورچی خانے سے نکلتا دو بھر ہو جاتا۔ دونندیں ان کی شادی شدہ تھیں۔ وہ یوں تو صبح شام چڑھائی کیا کرتیں مگر نزاکت آرا کو پریشانی اس وقت ہوتی جب وہ اپنے بچوں کی سالگرہ..... اپنے میکے میں مناتیں بلکہ ڈھیر سارے مہمانوں کو بھی مدعو کرتیں۔

یہ دتیرہ ان کے سسرال میں آئے دن کا ہو گیا تھا اور نزاکت آرا کام کرتے کرتے تھک جاتیں۔ اتنے کام تو انہوں نے کبھی اپنی زندگی میں نہیں کیے تھے۔ موٹی، موٹی نندیں جو غیر شادی شدہ تھیں انہیں بیوی پارلر جا کر سجنے، سنورنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ ساس کا خیال تھا..... اس طرح کی تقاریب کرنے سے لڑکیوں کے رشتے بڑی آسانی سے آجاتے ہیں۔ ان کی دد لڑکیوں کے رشتے کچھ اس قسم کی تقاریب کے طفیل ہوئے تھے۔

نزاکت کا وزن جو پچاسی پونڈ شادی سے پہلے تھا اب وہ شاید ستر پونڈ رہ گیا ہے..... پانچ فٹ چھ انچ پر اتنے کم وزن میں وہ واقعی سراچہ کا بانس سا لگا کرتی تھیں۔ وہ اکثر ویٹ مشین پر کھڑے ہو کر رد ہانسی ہو جاتیں۔ نزاکت آرا نے یوں تو پوری کوشش کی تھی کہ جب سسرال میں کوئی تقریب کا موقع آتا تو اپنے اوپر ناٹھی نگوڑی بیماریاں طاری کرتیں مگر ان کے میاں

جلت رنگ

جانی پانچ بہنوں کے ساتھ لمبے بڑھے تھے..... جو بیوی کو حقیقی بیمار پا کر بھی یقین کرنے کو تیار نہیں ہوا کرتے تھے۔

اس لیے انہیں ایکٹیو بن کر رہنا پڑ رہا تھا اور یوں بھی وہ اپنی سسرال کی ابھی اکلوتی بہن تھیں..... دیوروں کی شادیوں میں تاخیر ہو رہی تھی اور سارے مصائب نزاکت آرا کو تنہا ہی بھگتنے پڑ رہے تھے۔ ایسی ہی ایک تقریب کا ذکر تھا۔ ان کی بڑی نند اپنی بچی کی سالگرہ منا کر فارغ ہوئی تھیں..... اس تقریب میں کھانے کا پوٹلا باندھ کر دیا گیا تھا، شادی شدہ نندیں جاتے ہوئے مارے خوشی کے ان سے ہاتھ ملارہی تھیں۔ ان کی نندوں کا ہاتھ ملانے کا عجیب سا طریقہ تھا۔ دوسرے کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے ہلکے ہلکے دبائی تھیں جیسے ہاتھ پر مساج کر رہی ہوں۔

یہی وجہ تھی..... وہ اپنا ہاتھ نندوں کے ہاتھ میں دے کر بھول جاتی تھیں۔ دونوں نندوں نے خدا حافظ کہتے ہوئے ہتھیلی سے لے کر مونڈھے تک کا مساج اپنی عادت کے مطابق کر دیا تھا..... ان کو خدا حافظ کہنے کے بعد وہ اپنی اماں کو فون پر رپورٹ دیتے ہوئے بولی۔

”اماں، اب فارغ ہوئی ہوں..... ابھی گئی ہیں سب..... درد میرے پیروں میں تھا..... اور وہ میرا ہاتھ تو دبا گئیں، پیر کوئی نہیں دبا کر گیا۔“

”اری پاگل ہے تو بھی..... کیوں نہیں دبوائے اپنے پیر ان سے؟“ اماں..... ان کی محبت میں آکر ان کے مزاج کے حساب سے باتیں کر رہی تھیں۔ اور وہ سوچ رہی تھیں..... ”اماں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی ہیں..... وہ جب ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھا رہی تھیں تو مجھے اپنے پاؤں آگے کر دینے چاہیے تھے اور اگر ایسا کر دیتی تو.....؟“ اس سے آگے وہ سوچ نہیں سکیں۔ میاں جی کا غصہ کیسے بم پھوڑتا

ہے..... اس سے بھی تو وہ بخوبی واقف تھیں۔

سچی محبت

بے بی بھابی کی باتوں پر کبھی غصہ آتا تھا تو کبھی ہنسی۔ ان کی شادی کو دس سال ہو گئے تھے مگر انہوں نے اپنے سرال کو ذہنی طور پر آج تک قبول نہیں کیا تھا۔ ہر اچھی چیز ان کے گھر میں ہوتی تھی اور ہر بری بات سرال میں۔ ان کا پہلا بیٹا نکلا چپٹا ہوا تو اسے دیکھتے ہی انہوں نے کہہ دیا۔ ”یہ تو اپنی دادی پر گیا ہے۔“

دادی نے ہنس کر پوچھا۔ ”بے بی تم نے مجھے بچپن میں کب دیکھا تھا جو تم نے اس میں میری مشابہت دیکھ لی؟“

”اماں یہ آپ کی طرح منہ کھول کر سوتا ہے۔ ضد تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ غصہ آجائے تو دودھ نہیں پیتا، آپ کو تو اس عمر میں غصہ آجائے تو کہاں کھانا کھاتی ہیں؟“ تب دادی کچھ کہتے کہتے رک گئیں کہ اپنی طبیعت کی وجہ سے وہ بارہا ایسے مواقع پر بہو کی طبیعت صاف کرنے کے بجائے خاموش رہنے کو زیادہ بہتر سمجھتی تھیں۔ دوسری بیٹی ہوئی تو وہ ناک نقشبے کی بہت اچھی تھی۔ رنگت بھی گلابی سی بے بی بھابی نے بچی کو دیکھتے ہی اعلان کر دیا۔

”یہ تو میری بڑی آپا جیسی ہے۔“

”لیکن تمہاری آپا تو کالی کلوٹی ہیں۔“ ان کی جیٹھانی نے بھابی سے کہا۔

”ان کا رنگ تو آپ سے بھی صاف ہے۔“ فوراً ہی بدل لے لیا گیا اور بے چاری جیٹھانی برے برے منہ بناتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ بے بی جو اچھا کپڑا پہنتی وہ ان کے میکے کا ہوتا، بچے کا ہر اچھا سوٹ ان کے بھائیوں یا بہنوں کا دیا ہوا ہوتا۔ اب شہزاد بھائی بچوں کے ڈھیروں ڈھیر

کپڑے لاتے۔ بے بی بھابی کو اچھے خاصے پیسے دیتے کہ اپنی پسند کی شاپنگ کر لو تو وہ شاپنگ کر کے آئیں تو سارا کریڈٹ اپنے گھر والوں کو دیتے ہوئے کہتیں۔

”یہ سوٹ جو آپ کو اچھا لگ رہا ہے ٹائیہ میری چھوٹی آپا کو نظر آ گیا تھا۔ دکاندار تو تین ہزار سے کم دے ہی نہیں رہا تھا۔ میں شہزاد کے ساتھ جاتی تو شاید ساڑھے تین ہزار میں لے کر آتی مگر چھوٹی آپا وہاں دکان میں موجود مالک کو پہچان گئیں۔ وہ دو لکھا بھائی کے پاس بھی آیا ہو گا بس اسی حوالے سے یہ سوٹ مجھے مندرہ سو میں ملا۔“ کبھی جان پہچان کے حوالے ہوتے کبھی ان کی بہن دکانداروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے ستا کر دالیتیں اور بقول ان کے انہوں نے دکاندار کو لوٹ لیا۔

”دلہن لوٹا تو اس کو کہتے ہیں جو پیسے خرچ کیے بنا چیز آجائے، تم تو پیسے دے کر لاتی ہو اس قیمت پر تو ہر جگہ سیل میں یہ سوٹ مل رہے ہیں۔ میں خود لائی ہوں ایسا سوٹ۔“ ایک مرتبہ ان کی جیٹھانی نے ویسا ہی سوٹ جو وہ ہزار کا لے کر آئی تھیں صرف انہیں رک پہنچانے کے لیے اپنے سوٹ کی ویلیو گرا کر اس لیے کہا کہ وہ اپنے میکے کی ہمہ وقت تعریفوں سے باز آ جائیں مگر بے بی بھابی نے کبھی کسی کی رائے سے اتفاق کرنا کہاں سیکھا تھا۔ اگر ساس کبھی تو رمدہ پکانے کو کہتیں تو اس دن ان کا کڑا ہی گوشت کھانے کو دل چاہنے لگتا تھا جو ساس کہتیں کبھی کر کے نہ دینا ان کا معمول تھا۔ یہ عادت جس کو گھر کے سب لوگ دیکھا کرتے تھے اس لیے جب جیٹھانی ان جیسا سوٹ جس کا صرف رنگ فرق تھا نچاتے ہوئے لائیں تو بے بی نے ہاتھ سے کپڑا دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کا سوٹ میرے سوٹ جیسا تو ہے مگر ویسا نہیں ہے۔“ ان کا لہجہ تو فلی بھرا تھا۔

”جیسا ہے اور ویسا نہیں کا کیا مطلب ہوتا ہے

بہورانی؟“ جیٹھانی بھی آج دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرنے کا ارادہ کیے بیٹھی تھیں۔

”بھابی جان آپ کے سوٹ کی کوالٹی ہلکی ہے۔ کپڑا خاصا گھٹیا ہے بس آپ یوں سمجھیں کہ ڈھائی ہزار والے لان کے سوٹ کی نقل سات آٹھ سو والے سوٹوں میں ہوتی تو ضرور ہے مگر وہ ڈھائی ہزار والے کا مقابلہ کسی صورت نہیں کر پاتے۔“ ان کی بات سن کر سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو ہنس کر دیکھا اور کہا۔

”بے بی سے باتوں میں بھلا کوئی جیت سکتا ہے۔“ بے بی بھابی کی عادتوں کے گھر والے تو عادی تھے۔ مگر جب کوئی مہمان آتا..... تو وہ حیرت سے دیکھتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مذاق اڑاتا..... ایک دن وہ اپنے بیٹے کو پڑھا رہی تھیں کہ یہ چار آڑو ہیں۔ بچے نے پوچھا۔ ”امی آڑو کس کو کہتے ہیں.....“ تو وہ ہنس کر بلند آواز میں بولیں..... ”بیٹا جب تم اپنی بڑی خالہ کے گھر گئے تھے تو انہوں نے اس کا چھلکا اتار کر ہمیں کھلایا تھا تو وہ آڑو تھا..... آڑو اسے کہتے ہیں جو تم نے اپنی خالہ کے گھر کھائے تھے جب بھی ان کے ہاں چلے جاؤ آڑو ہمیشہ کھانے کو ملیں گے۔“

”امی چیری کسے کہتے ہیں؟“ ان کا بیٹا بھی آج مہمانوں کے سامنے ننھیال کا جھنڈا اونچا کرنا چاہتا تھا۔

تب بے بی بلند آواز سے بولیں..... ”بیٹا آپ کے ماموں کو بند سے جب بھی آتے ہیں چیری کی پیٹیاں کس قدر لاتے ہیں جب وہ آئیں گے تو چیری کھانے کو خوب ملیں گی اب دعا کر دما ماموں جلدی سے کو بند سے آئیں۔“

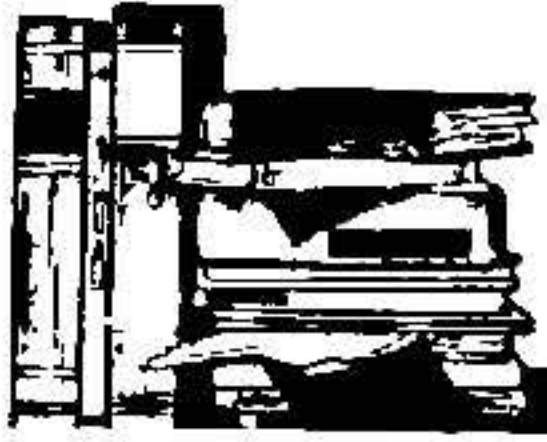
”بہورانی تمہارے بھائی جوتے کے ڈبے میں چیری لاتے تھے..... پیٹی میں تو نہیں لاتے تھے.....“

بڑی بھابی کو انہیں چھیڑنے میں مزہ آتا تھا۔

وہ ان دیکھے جزیروں پہ

دعاؤں کا ہوا طالب
رکا اک قافلہ ایسے
وہ جس میں رقص کرتا تھا
زمانہ اک محبت کا
جہاں انہونی چاہت کا
صداقت کا رفاقت کا
دعاؤں کے جزیرے سے
عطاؤں کی عنایت تک
تمناؤں کی دنیا میں
ہوا کو میں گواہ کر کے
صبا کو چاند تاروں کو
سبھی رنگیں نظاروں کو
زمین کی سب بہاروں کو
تمہارے نام کرتی ہوں
تیری پاکیزگی ہر دم
تیرے بختوں میں ڈھل جائے
دیے روشن امیدوں کے
ہمیشہ چاند سے چمکین
تمہیں سورج کی کرنوں میں
طلوع صبح مبارک ہو
نیا یہ دن مبارک ہو

شاعرہ: سیدہ ہاشمہ شاہ، ہارون آباد



میرا انتخاب آسن جمد

الفاظ کو برتا بھی ایک جادوگری ہے۔ کچھ شاعر لفظوں سے اس طرح کھیلتے ہیں کہ قاری اس کے سرخیل کا حصہ بن جاتے ہیں۔ وہ خیالات اور خیال کی جادوگری سے بہ مشکل نکل پاتا ہے۔ اختر الایمان بھی پس دیوار چمن میں عشق پچاں اور اپنے محبوب کی زلف گرہ گیر کا شکار ہیں اور اسے پالنے کی تمنا نے انہیں ہر شے سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اس کا انتخاب ارم غفل نے لڑچی سے کیا ہے۔

پس دیوار چمن

گھٹ گل نے سحر دم اسے بیدار کیا اور چپکے سے کہا جا پس دیوار چمن عشق پچاں کی گھنی نخل کے چپچپے تنہا چاہنے والا ترا دل میں لیے تیری لگن نظر کب سے ہے وہ چونک کے اٹھی جیسے اپنی آہٹ سے کوئی آہوئے وحشی چونکے پھر چلی سوئے چمن زلفوں کو شانہ کرتی اس تغافل سے کہ جیسے پئے گل گشت کوئی یونہی جاتا ہو کوئی ملنے کا ارمان نہ ہو اپنے سائے کے سوا اور سے پہچان نہ ہو بدرقہ بوئے گل تر تھی کہیں باور نسیم وہ ہی وہ فرش پہ تھی عرش پہ تھا رب کریم لہلہاتا ہوا سبزہ تھا ندی کج خرام چال ایسی کہ نہیں جس کا کہیں کوئی بھی نام عزیز و مشک کا لک قافلہ تھا زلف کا بار یا کوئی ابرو داں دوٹپا ہوا پہ تھا سوار پھول بوئے ہر تن گوش تھے کچھ منہ سے کہے خاک لپٹی چلی جاتی تھی قدم تھامے ہوئے

کہاں کا ہوتا ہے کہ وہ مجھے لے کر الگ ہوں گے۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کی پریشانیوں میں ہی زندگی گزرتی نظر آرہی ہے۔ اب یہاں ہماری امی کے گھر کا ماحول تو ہے نہیں۔ ہماری ساری بھائیاں اپنی سسرال میں عیش کرتی ہیں۔ صبح کو بجے اٹھنے کے بجائے دوپہر ایک بجے اٹھا کرتی ہیں۔ یہاں تو سونے تک پر پابندی ہے، چھٹی کے دن اگر دس گیارہ بجے اٹھوں تو سب آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جاتے ہیں۔ گو کہتے کچھ نہیں ہیں۔ مگر ان کی آنکھوں کا مسخرانہ پن تو میں پہچان جاتی ہوں۔ کس قدر تحقیر ہوتی ہے۔ میرے لیے۔ میں سب جان لیتی ہوں مگر یہ میری اپنی زندگی ہے میں اس کو خود بسر کرنا چاہتی ہوں۔ میں جودل چاہے بولوں، جس طرح رہوں کسی کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے بچوں کو جودل چاہے سکھاؤں، جہاں دل چاہے پڑھاؤں کسی کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے اگر مجھے اپنی سسرال کے لوگ اور یہاں کا ماحول پسند نہیں ہے تو میں دنیا کی پہلی بہو نہیں ہوں۔ جو اس قسم کی رائے رکھتی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر لڑکی کو اپنے میکے والوں سے کچی محبت ہوتی ہے۔ سسرال والوں سے کون محبت کرتا ہے۔ یہاں تو ہر بہو صرف اپنا وقت گزارتی ہے وقت۔ بعض عیار بہوئیں جھوٹی محبت کا ٹانک رچایا کرتی ہیں جیسے آپ۔۔۔۔۔ مگر میں منافق نہیں ہوں۔ (آپ کی طرح) اسی لیے میری باتیں لوگوں کو زیادہ پسند نہیں آتیں مگر معاف کیجیے گا میں دوغلی عورت نہیں ہوں جو میرے دل میں ہوتا ہے وہی میری زبان پر ہوتا ہے اب کسی کو برا لگتا ہے تو میری بلا سے مجھے پروا نہیں ہے۔ ہاں! تب ان کی جیٹھانی انہیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔



”بھابی جان۔۔۔۔۔ چیری کی پٹی ڈبا ہی ہوتی۔۔۔۔۔ وہ اتنی نازک ہوتی ہے۔۔۔۔۔ چھوٹے ڈبوں میں ہی رکھ کر بکا کرتی ہے۔۔۔۔۔ مگر اسے پٹی کہتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ لوگوں کے ہاں چیری اس وقت آتی ہے۔۔۔۔۔ جب کوئی بیمار ہو تو اس لیے آپ کو زیادہ پتا نہیں ہے۔۔۔۔۔“ (لوکر لوگل)

ہمارے گھر میں کھیر زیادہ اچھی بنتی ہے، ہمارے گھر کی بریانی کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں، ہمارے گھر کے اے سی زیادہ اچھے، ہمارے گھر کی ہوا زیادہ اچھی جیسی باتیں۔۔۔۔۔ بعض مرتبہ شاق گزرنے لگتیں۔

تب ایک مرتبہ ان کی جیٹھانی نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”تمہارا نک نیم بے بی ضرور ہے مگر اب تم بڑی ہو گئی ہو، یہ ہر وقت میکے کے گیت گانا بند کرو۔۔۔۔۔ سسرال کے لوگوں کو ہر وقت جو گراتی رہتی ہو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے اب اگر کوئی تمہاری بات کا جواب نہیں دیتا تو یہ مت سمجھا کرو کہ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے، وہ تمہیں اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ تمہاری کسی بات کا جواب دیا جائے۔“ تب بے بی بھابی دھواں دھار روتے ہوئے بولیں۔

”چوبیس سال کی عمر میں میری شادی ہوئی۔۔۔۔۔ جس گھر میں، میں نے چوبیس سال گزارے سسرال والے چاہتے ہیں کہ میں چوبیس گھنٹوں میں ان سب کو بھول جاؤں۔۔۔۔۔ جن لوگوں کے ساتھ میں رہی ہوں۔۔۔۔۔ جو عادتیں میری ہیں۔۔۔۔۔ وہ اتنی جلدی کیسے بدل سکتی ہیں۔“

”دہن دس سال تو تمہاری شادی کو ہو گئے بات کرنے کا طریقہ تمہارا ایسا ہے کہ بات نہیں کر رہیں بلکہ کسی کو تپا رہی ہو۔۔۔۔۔ تو یہ تمیز کیسے میں ہمیں چوبیس سال تو نہیں شاید اڑتالیس سال لگیں۔۔۔۔۔“

”ارے وقت تو یوں گزرتا ہے چٹکی میں، آپ بھی یہیں اور میں بھی یہیں ہوں۔۔۔۔۔ شہزاد میں ایسا

راہ میں کتنی جگہ شاخوں نے دامن پکڑا بارہا شانے سے بے دھیانی میں آنچل ڈھلکا شاخ سی کچلی تخیل سی رکی، اٹھلائی ہر قدم پر نئے انداز سے ٹھوکر کھائی میں وہاں گوش بر آواز جو بیٹھا تھا اٹھا اور اسے لینے کو آغوش میں جیسے ہی بڑھا پاؤں الجھا، گرا، یوں آنکھ کھلی پچھلے پہر اور دیکھا کہ ابھی باقی ہے کچھ شب کا سفر یونہی بیٹھا رہا، دیکھا کیا ہوتے تحلیل پل کو گھڑیوں میں دنوں سالوں میں لمحات جمیل زخم بنتے گئے، ناسور بنے، اشک بنے جیسے ہم گردش پر کار تھے دیے ہی رہے ناچتا رہتا ہے آگے سحر و شام یونہی لوح تدبیر پہ لکھا ہوا اک حرف نہیں



ہر شے میں تغیر رونما ہو رہا ہے۔ وقت کے بدلنے تقاضوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جنم دن خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اسے یادگار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جتنے تحائف سے دیر پا الفاظ ہیں۔۔۔۔۔ ہمیشہ یاد رہ جانے والی تحریر۔۔۔۔۔ ایوب خاوری کی یہ نظم بھی کتنے ہی ماہ و سال بیت جائیں ہمیشہ خوشبو کے مانند اپنی مہک سے ہر شخص کے جذبات کو تروتازہ رکھے گی۔ اس نظم کا انتخاب شازیہ حمیر نے اسلام آباد سے کیا ہے۔

ایک دعا تمہاری سالگرہ پر

یہ ماہ سال کے سلسلے

یہ فراق و وصال کے مرحلے

یہ چراغِ شام کی لوح کی طرح
کھلے ہوئے
یہ متاعِ صبح کی طرح
سینکھلے ہیں جو بچے ہوئے
یہ وہ روز و شب ہیں
کہ جن کی آب و ہوا نے تجھ کو بہار دی
خدا کرے
ترے جسم و جاں کی بہار پر
ترے آئینے کی کنار پر
تری چشمِ خوابِ سرا پر
ترے خاص رنگِ گلاب پر
یہی آب و تاب بھی رہے
یہ میری دعا ہے کہ
ترے دل کی کلی ہمیشہ کھلی رہے

ۛۛۛۛ

زندگی کے کچھ لمحے کچھ گھڑیاں اور کچھ باتیں
ہمیشہ کے لیے دلوں پر نقش ہو جاتی ہیں۔ کچھ چہرے
وقت کی اڑتی ہوئی دھول میں کبھی نہیں دبتے۔ ان کی یاد
کبھی فراموش نہیں ہوتی۔ گزرتے وقت کا بہت تھوڑا
حصہ ہمیں ایسی سوغاتیں دے جاتا ہے جن کے اچھوتے
پن سے انکار ممکن نہیں۔ ایسی ہی اک سوغات حنا ریاض
نے کراچی سے ارسال کی ہے۔

غزل

بھلے دنوں کی بات ہے بھلی سی ایک شکل تھی
نہ یہ کہ حسن نام ہو نہ دیکھنے میں عام سی
نہ یہ کہ وہ چلے تو کھکشاں سی رہ گزر گئے
مگر وہ ساتھ ہو تو پھر بھلا بھلا سفر گئے
کوئی بھی رُت ہو اس کی چھب فضا کا رنگ دروہ تھی
وہ گرمیوں کی چھاؤں تھی، وہ سردیوں کی دھوپ تھی
نہ مدتوں جدا رہے، نہ ساتھ صبح و شام ہو
نہ رشتہ وفا پہ ضد نہ یہ کہ ازل عام ہو
ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

نہ ایسی خوش لباسیاں کہ سادگی گلہ کرے
نہ اتنی بے تکلفی کہ آئینہ حیا کرے
نہ عاشقی جنوں کی کہ زندگی عذاب ہو
نہ اس قدر کٹھور پن کہ دوستی خراب ہو
کبھی تو بات بھی خفی، کبھی سکوت بھی سخن
کبھی تو کشتِ زعفران، کبھی اداسیوں کا بن
سنا ہے ایک عمر ہے معاملاتِ دل کی بھی
وصالِ جاں فزا تو کیا، فراقِ جاکسل کی بھی
سو ایک روز کیا ہوا، وفا پہ بحث چھڑ گئی
میں عشق کو امر کہوں، وہ میری بات سے چڑ گئی
میں عشق کا اسیر تھا، وہ عشق کو قفس کہے
کہ عمر بھر کے ساتھ کو بدتر از ہوں کہے
شجر ہجر نہیں کہ ہم ہمیشہ پایہ گل رہے
نہ دھور ہیں کہ رسیاں گلے میں مستقل رہیں
میں کوئی پینٹنگ نہیں کہ ایک فریم میں رہوں
وہی جو من کا میت ہوا سی کے پریم میں رہوں
نہ اس کو مجھ پہ مان تھا نہ مجھ کو اس پہ زعم ہی
جب عہد ہی کوئی نہ ہو تو کیا غم شکلی
سو اپنا اپنا راستہ اپنی خوشی بدل لیا
وہ اپنی راہ چل پڑی، میں اپنی راہ چل دیا
بھلی سی ایک شکل تھی بھلی سی اس کی دوستی
اب اس کی یاد رات دن نہیں مگر کبھی کبھی

ۛۛۛۛ

انسان جو اپنے دیکھتا ہے وہ نیند کا غمار ٹوٹنے پر خود
ہی ختم ہو جاتے ہیں مگر جو اپنے انسان اپنی آنکھوں میں
سجاتا ہے۔ ان کو شرمندہ تعبیر اسے خود ہی کرنا ہوتا ہے۔
امجد اسلام امجد کی سپنوں کی باتوں کا انتخاب نائلہ حیات
نے کوئٹہ سے کیا ہے۔

سپنے کیسے بات کریں

سپنے کیسے بات کریں!

خداشوں کی زنجیر پڑی ہے

نیند بھری سب آنکھوں میں
سپنے کیسے بات کریں!
جن لوگوں کا رستہ نکلتے
عمریں رزقِ خاک ہوئیں
اب وہ لوگ
اور ان کے سپنے دیکھنے والی
آنکھیں بجھ کر راکھ ہوئیں
راکھ کے اس انبار میں ہوں گے
کیسے کیسے زندہ خواب
خوابوں کی اس راکھ کو لیکن
چھیڑے کون.....
جس رستے پر چھاؤں نہ پانی
اس پر ڈالے ڈیرے کون
جس مٹی میں ریت ملی ہو
اس میں کیسے باغ لگائیں
دریا ہی پایاب ہو جب تو
اس میں کشتی کیا لے جائیں
خوشبو ایک آوارہ جھونکا
اس جھونکے کو گھیرے کون
کیسے دنیا کو تلاؤں
تم ہوتے ہو میرے کون

ۛۛۛۛ

زندگی کے سفر میں غم و خوشی اور ہجر و وصال وہ تو اتنا
لہریں ہیں جن کے سہارے زندگی کا سفر جاری ہے.....
ہر شخصِ وصل میں فراق اور فراق میں وصل کو ڈھونڈتا
ہے۔ یہی رنگِ اندازِ فاضلی کی غزل میں نظر آتا ہے۔ جسے
صائمہ نے لاہور سے منتخب کیا ہے۔

غزل

آج ذرا فرصت پائی تھی آج اسے پھر یاد کیا
بندگلی کے آخری گھر کو کھول کے پھر آباد کیا
کھول کے کھڑکی چاند بھرا چاند نے دلوں ہاتھوں سے

رنگ اڑائے پھول کھلائے چڑیوں کو آزاد کیا
بات بہت معمولی سی تھی الجھ گئی خاموشی سے
ایک ذرا سی ضد کی خاطر خود کو بہت برباد کیا
بڑے بڑے غم کھڑے ہوئے تھرتھرتے روکے دلوں میں
چھوٹی، چھوٹی خوشیوں سے ہی ہم نے دل کو شاد کیا
پڑھے لکھوں کی بات نہ مانی کام آئی حیرانی ہی
سنا ہوا کو پڑھا ندی کو موسم کو استاد کیا

ۛۛۛۛ

دنیا کی بے وفائیوں سے انسان جب اکتاتا ہے تو
مخلص دوست ڈھونڈتا ہے۔ انسان زندگی میں غلط
توقعات وابستہ کر کے بھی غم اٹھاتا ہے۔ غم کی کچھ ایسی
جھلک ہمیدہ ریاض کی نظم میں نظر آتی ہے۔ شاید ریاض کا
انتخاب اسلام آباد سے۔

اپنے دوست کے لیے

یہ زرد موسم کے خشک پتے
ہوا جنہیں لے گئی اڑا کر
اگر کبھی ان کو دیکھ پاؤ تو سوچ لینا
کہ ان میں ہر برگ کے نموں میں
زیاں گیا عرقِ شاخِ گل کا
کبھی یہ سرسبز کوئلیں تھے
کبھی یہ شاداب بھی رہے ہیں
کھلے ہوئے ہونٹ کی طرح نرم اور گلفستہ

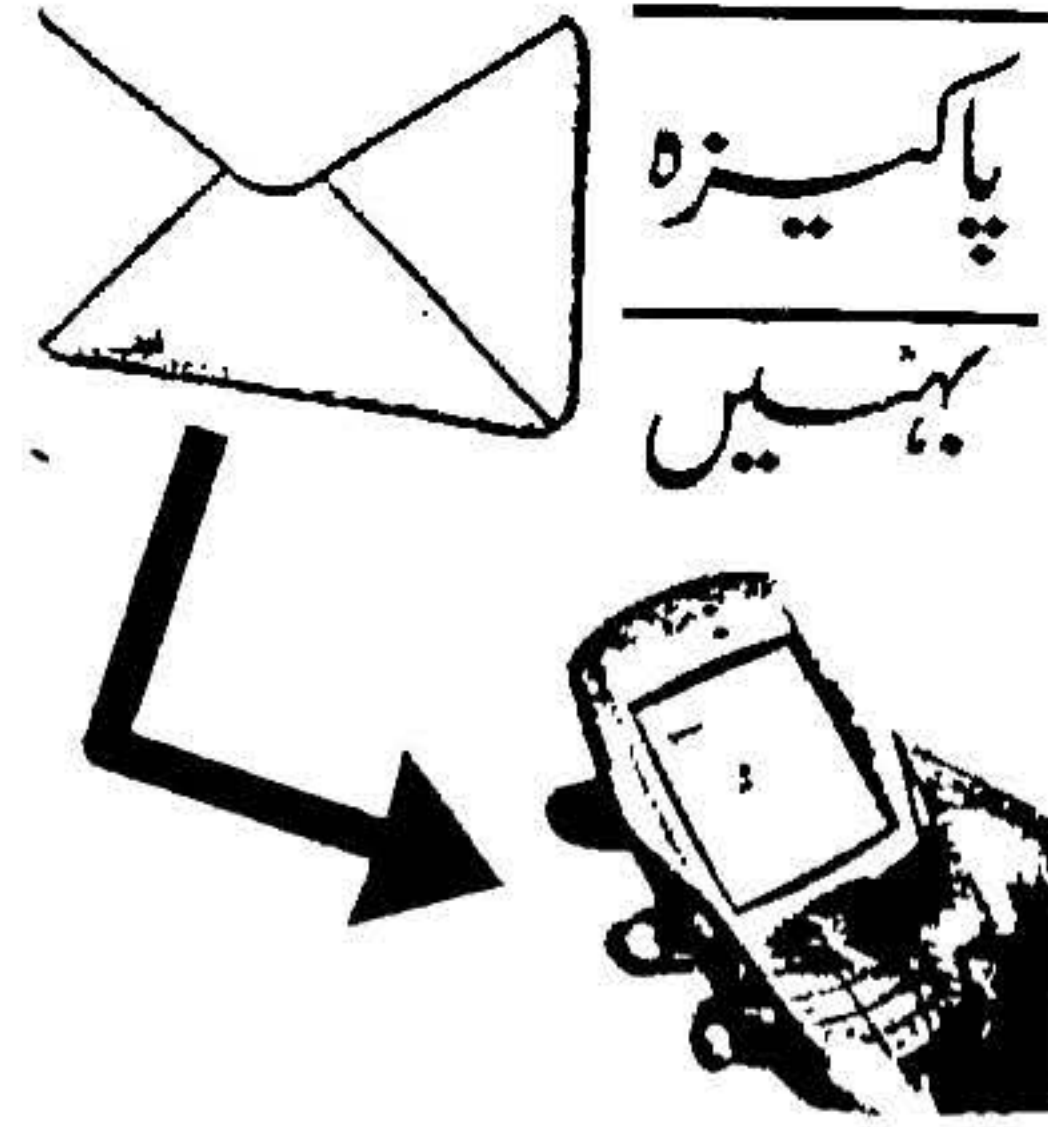
بہت دنوں تک یہ سبز پتے
ہوا کے ریلوں میں بے بسی سے تڑپ چکے ہیں
مگر یہ اب خشک ہو رہے ہیں
مگر یہ اب خشک ہو چکے ہیں
اگر کبھی اس طرف سے گزرو
تو دیکھ لینا

برہنہ شاخص ہوا کے دل میں گڑی ہوئی ہیں
یہ اب تمہارے لیے نہیں ہیں!

ۛۛۛۛ

سندھ

پاکیزہ
بہنیں



رب کا شکر

شکر ادا کرتے رہا کرو اس "رب" کا جو
برداشت سے زیادہ دکھ نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ
سکھ دیتا ہے۔

اپنی باجی کے لیے

بیدعا ہے تیری زندگی سنور جائے
ہر نظر میں بس پیار نظر آئے
تجھے جس خوشی کی تلاش ہے
اللہ کرے وہ خوشی خود تیری تلاش میں تیرے
پاس آئے، آمین۔

تحریر: نور افشاں شیخ، شکارپور

خوب صورت پیغام

1۔ اپنی خوشی کے لیے دوسروں کی مسرت کو
خاک میں نہ ملاؤ۔ (برٹرینڈ رسل)
2۔ جس میں ادب نہیں، اس میں سب برائیاں
ہی برائیاں ہیں۔ (مولانا روم)

ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

3۔ خدا شکستہ دلوں میں پایا جاتا ہے۔ (حضرت
علی ہجویری)

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلا نوالی

ایک بہت ہی اچھی بات

دنیا نصیب سے ملتی ہے اور آخرت محنت سے
لیکن لوگ محنت دنیا کے لیے اور آخرت کو نصیب پر
چھوڑ دیتے ہیں۔

از: حمیرا ہاشمی، بھکر

بچھڑ جانے والے پیاروں کے نام
کچھ تو بچھڑ گئے ہیں اور کچھ دیے مر گئے
ملا سے دانے ٹوٹ کے ہر سو بکھر گئے
خوشبو ہے جن کی آج بھی اس دل کے آس پاس
جان بہار لوگ تھے، جانے کدھر گئے

صوفیہ قر، کراچی

کچھ کھٹا کچھ میٹھا

مس! تم لیٹ کیوں آئے، اسکول آٹھ بجے
شروع ہوتا ہے پھر دیر کیوں کی؟
طالب علم! مس آپ میری اتنی فکر مت کریں
دوست شک کرتے ہیں۔

لڑکا! ڈارلنگ تمہارا نام اپنے ہاتھ پر لکھوں یا
دل پر۔

لڑکی! ادھر ادھر کیوں لکھتے ہو اگر سچا پیار کرتے
ہو تو اپنی جائداد کے پیپر زپر لکھ دو۔

مصباح رضا سعید، فیصل آباد

وقت وقت کی بات

ایک دور تھا کہ مرتی تھیں
ہزاروں لڑکیاں تجھ پر
مگر

جب سے آئے ہیں

تیرے سر پر سفید بال
تو بن گیا

انہی لڑکیوں کا بھائی جان.....

مرسلہ: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

گفت و شنید

ایک دن سردار جی ایک دکان میں خریداری
کر رہے تھے کہ تیل کا ڈبا اٹھا کر دکان دار سے
بولے۔

”اس تیل کے ساتھ میرا مفت گفت کدھر
ہے؟“

دکاندار نے کہا۔ ”اس کے ساتھ کوئی گفت نہیں
ہے باجی۔“

سردار جی منہ بسور کر بولے۔ ”اوائے، اس پر
لکھا ہے کوکسٹرول فری۔“

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

اپنا بنا لو

سنو..... اب بھی دقت ہے

تم مجھے اپنا لو
میں تمہیں دنیا کا
ہر سکھ دوں گی

تم اپنے دل سے پوچھو کسی کی نہ سنو
میں تمہارا ہر قدم پر ساتھ بھاؤں گی

میں مگر بھی تمہارا ساتھ
بھاؤں گی

تم مجھ سے ملو تو صحیح

کسی سے ڈرنا نہیں میں سب سے نمٹ لوں گی
میں تمہارے سب دکھ سمیٹ کہ تمہاری زندگی کو حسین
اور پر کیف بنا دوں گی۔ اب بھی وقت ہے، مجھے اپنے
دل میں بسا لو ورنہ بچھتاؤ گے۔

فقط۔ تمہاری صرف تمہاری۔ اپنی نماز

از اصف آصف، کراچی

اتنا کم نہ ہوتا!

اگر دنیا میں کوئی غم نہ ہوتا
کوئی بھی اتنا مستحکم نہ ہوتا

ہماری آنکھ میں آنسو نہ ہوتے
اگر لہجوں میں اتنا سم نہ ہوتا

کسی ٹھوکر کا اندیشہ نہ ہوتا
تو کوئی سلسلہ پیہم نہ ہوتا

ہوں کا جال آنکھوں پر تپتا ہے
وگرنہ عشق اتنا کم نہ ہوتا

شاعرہ..... مسز اسامہ ملک، راول پنڈی

مت پوچھو

قلم ہو تیغ ہو تیشہ کہ ڈال مت چھینو
کبھی کسی سے کسی کا کمال مت چھینو
ابھی بھاؤ نہ کینڈل نہ کیک کا ٹو ابھی
کچھ اور دیر میرا پچھلا سال مت چھینو
از: صبا نور، لیہ

بہار

میرے گرد ان دیکھا حصار ہے
میرے پیارے بچا کا پیار ہے
تو نہ آئے تو ہر طرف خزاں ہے
تو جو آئے تو ہر طرف پیار ہے

شاعرہ: روبینہ حیات مغل، کراچی

پیار

ایک ٹرک کے پیچھے لکھا ہوا دوسرے ٹرک کے
لیے..... فاصلہ رکھیں، نہیں تو پیار ہو جائے گا۔

از: خالدہ نسیم، پوکے

ماہنامہ پاکیزہ۔ مئی 2012ء

☆ ہما انصار..... کراچی
اس لیے روشن کیا ہے تیرے چہرے کا چراغ
دوپہر تاریک ہے میرے مقدر کی طرح
☆ یاسمین ناصر..... جہلم
میرے اندر خواہشیں پھرتی ہیں چوروں کی طرح
لیکن اس کے دھیان کو دعویٰ نگہبانی کا ہے
☆ نیر مہیب..... کراچی
شکوہ تو ایک چھیڑ ہے لیکن حقیقتاً
تیرا ستم بھی تیری عنایت سے کم نہیں
☆ مہنا زمنور..... کراچی
مانا کہ شہ رگ سے نزدیک ہے تو
میں یہ فاصلہ بھی کہاں چاہتا ہوں
☆ عالیہ..... حیدر آباد
ہمیں بھی سر بلندی کی تمنا تک کرتی ہے
مگر ہم دوستوں کو روند کر ادنچا نہیں ہوتے
☆ رضوانہ سمیع..... کراچی
اور اب تو خانہ دل میں ہجوم ہے ورنہ
کبھی یہاں بھی مسافر برائے نام آئے
☆ ماہین حنیف..... کراچی
حسن کو عشق کی در پردہ علامت لکھا
لوگ کہتے تھے میری بات میں مفہوم نہ تھا
☆ سونیا عزیز..... حیدر آباد
ایک نہ ایک دن ہجر کا موسم گزر رہی جائے گا
روک سکتا ہے کوئی کب وقت کی رفتار کو
☆ میمونہ عزیز..... اسلام آباد
وہ ایک لمحہ جو منسوب تیرے ہجر سے تھا
اس ایک لمحے میں صدیاں گزار بیٹھے ہیں
☆ عندلیب..... کوئٹہ
مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا سر بزم رات یہ کیا ہوا
میری آنکھ کیسے چمک گئی مجھے رنج ہے یہ برا ہوا
☆☆☆

☆ حلیمہ سعدیہ..... ٹوبہ ٹیک سنگھ
تم جو ہر بات پہ دیتے ہو پرندوں کی مثال
اس کا مطلب ہے کہ ہم شہرے ہجرت کر جائیں
☆ فرحت احمد..... کراچی
روز آ جاتا ہے میرے دل کو تسلی دینے
تجھ سے تو جانِ جاں تیرا خیال اچھا ہے
☆ ثنا غفار..... لاہور
مانا کہ میری روح میرے ساتھ ہو مگر
میرے دل و نگاہ سے مانوس بھی تو ہو
کب تک رہیں گے یونہی محبت میں فاصلے
اتنے قریب آؤ کہ محسوس بھی تو ہو
☆ رداحنیف..... کراچی
محبت میں کوئی صدمہ اٹھانا چاہیے تھا
بھلایا تھا جسے وہ یاد آنا چاہیے تھا
میری اور اس کی آرزو میں فرق یہ تھا
مجھے بس وہ اسے سارا زمانہ چاہیے تھا
☆ عائشہ اقبال..... کراچی
اب آپ کس لیے اتنے ملول ہوتے ہیں
دیا تھا رنج تو کچھ سوچ کر دیا ہوتا
☆ حلیقہ وسیق..... حیدر آباد
خواب تو خواب ہے خوابوں میں الجھنا کیسا
آنکھ کھلتے ہی چلے جائیں گے جانے والے
☆ فردوس جہاں..... کوئٹہ
رات گزری ہے ایسے منظر میں
چاند ڈوبا رہا سمندر میں
اس تغیر میں جو حیرت ہوں
سنگ ہے دستِ آئینہ مگر میں
☆ حلیقہ بیگ..... لاہور
رات ایک خواب سنایا تھا ہوا کو میں نے
صبح سے پھرتے ہیں تعبیر بتاتے ہوئے لوگ

اسے جانا تھا کوئی زخم ہی دے کر جانا
اس بہانے میں اسے یاد تو کرتا رہتا
☆ حنا رضا..... کوئٹہ
جو حیراں ہیں تمہارے ضبط پہ کہہ دو قتل اُن سے
جو دامن پر نہیں گرتا وہ آنسو دل پہ گرتا ہے
☆ ماثرہ..... قصور
اسے گنوا کے رہو اب خزاؤں کی زد میں
جو وہ نہیں ہے تو پھر موسم بہار بھی کیوں
☆ زرین رزاق..... شیخوپورہ
بڑا نہ مایے لوگوں کی عیب جوئی کا
انہیں تو دن کا بھی سایہ دکھائی دیتا ہے
☆ مدیحہ..... میاں چنوں
میں نے دیکھا ہے بہاروں کو چمن میں چلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا
☆ این ایس..... عارف والا
یوں تو پتھر کی بھی تقدیر بدل سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ اسے دل سے تراشا جائے
☆ فاطمہ غففر..... حیدر آباد
تمہاری سالگرہ جب مجھ کو یاد آئی
تجھی سے سوچ رہی ہوں تمہیں کیا پیش کروں
کوئی سنا کوئی وعدہ کوئی خوشبو کوئی پھول
یا تمہیں دل سے نکلتی یہ دعا پیش کروں
☆ نسرین یاسمین..... حیدر آباد
خدا کرے چکو مثالِ انجم تم
جو ہر سو کر دے اجالا وہ آفتاب رہو
پڑھے جو تم کو وہ تم کو نہ بھولنے پائے
محبوبوں سے جو مہکے وہ تم گلاب رہو
☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ
دامن بھی تر نہیں آنکھیں بھی غم نہیں
اتنا شدید غم ہے کہ احساسِ غم نہیں



میں اکثر گنگنائی ہوں

صغریٰ زیندی

☆ شائلہ گل..... لاہور
زندگی جس کی تمنا میں کئی
وہ میرے حال سے بیگانہ رہا
☆ نورین..... آزاد کشمیر
تمہارے شہر میں پہنچا تو ایک تماشا تھا
میں اپنے گھر سے تو نکلا تھا آدی بن کر
☆ مسرت..... جہلم
نہ جانے میرے تعاقب میں کون کون آئے
میں اپنے نقشِ کف پا ابھارتا جاؤں
جو میرے پاس ہے اپنے لیے بچا رکھوں
جو میرے پاس نہیں تجھ پہ وارتا جاؤں
☆ رانیہ سکندر..... ساہیوال
کبھی خوشی تو کبھی رنج بے شمار ملے
حیات ایک تھی لیکن بڑے تضاد ملے
☆ ناجیہ احمد..... پشاور
اجنبی کتنا اکیلا ہے محبت کا سفر
تو میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں ڈرتا رہتا
304 ماہنامہ پاکیزہ - مئی 2012ء

خوش ذائقہ

پاکیزہ پختیاں



مدراسی بریانی

اشیا، چاول، ایک کلو۔ گوشت، ایک کلو۔ تھی، ایک پاؤ۔ دہی، ایک پاؤ۔ دودھ، حسب ضرورت۔ نمائز، ایک پاؤ۔ ہر ادھیا، ایک گڈی۔ لال مرچ، چند ایک۔ الائچی چھوٹی، پانچ دانے۔ لہسن، آدھا پاؤ۔ ادھ، دو چھٹانک۔ ہری مرچ، آدھا پاؤ۔ پودینہ، ایک گڈی۔ سیاہ زیرہ، آدھا چائے کا چمچ۔ سفید زیرہ، دو چائے کے چمچ۔ لونگ، پانچ عدد۔ دارچینی، تین ٹکڑے۔ نمک، حسب ذائقہ۔ زعفران یا زرد رنگ، مناسب مقدار۔

ترکیب: پہلے تھی میں پیاز بھون کر اس میں ثابت ہری مرچ ڈال دیں پھر تھوڑی دیر بعد ادھیا اور پودینہ ڈال دیں پھر سفید زیرہ اور باقی گرم مسالا بھی ڈال دیں اور گوشت کو بھون لیں۔ اس میں نمائز اور دہی بھی ڈال دیں۔ جب اچھی طرح بھون لیں تو اس میں تقریباً تین کلو پانی ملا دیں اور پکے دیں جب..... گوشت گل جائے تو اب اس میں چاول دھو کر ڈال دیں۔ کچھ دیر تک پکے دیں۔ جب دم ہونے کے قریب آجائیں تو دم دینے سے پہلے دودھ میں زعفران

یا زرد رنگ گھول کر ڈال دیں اور مزید پکے دیں۔ جب چاولوں کی ایک کٹی رہ جائے تو دم پر لگا دیں اور پندرہ منٹ کے بعد اتار لیں۔ بریانی تیار ہے۔

نوٹ: لیموں کا رس بریانی کی لذت میں اضافہ کرتا ہے اور اس سے چاول کے دانے بھی الگ الگ رہتے ہیں۔

صفیہ جہانگیر..... حیدر آباد

شلمجھم کا قورمہ

اشیا، گوشت، آدھا کلو۔ شلمجھم، آدھا کلو۔ تھی، تین چھٹانک۔ لونگ، دس عدد۔ الائچی، چار عدد۔ لہسن، ایک گٹھی۔ پیاز کے لچھے، آدھا پاؤ۔ ادھ، ایک گرہ۔ ادھیا بھنا ہوا، دو ٹولہ۔ سرخ مرچ پس ہوئی۔ حسب ضرورت۔ لیموں کا رس، حسب ذائقہ۔ جاوتری، ذرا سی۔ دارچینی، تھوڑی سی۔ کالی مرچ، ایک عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ جائفل، ذرا سا۔

ترکیب: پہلے شلمجھم چھیل کر بڑے بڑے ٹکڑے کر کے کسی نوکدار چیز سے گود لیں پھر انہیں تھی میں الائچی ڈال کر سرخ کر کے نکال لیں اور پیاز کے آدھے لچھے تھی میں سرخ کر کے نکال لیں۔ بقیہ پیاز کو مسالے کے ساتھ ملا لیں۔ لہسن، پیاز کے آدھے لچھے، ادھ، ادھیا اور سرخ مرچ ایک ہی بار پیس لیں اور تھی جو شلمجھم تلنے اور پیاز سرخ کرنے سے بچ گیا ہے اس میں پانچ لونگ اور دو سبز الائچی ڈال کر کڑا لیں پھر گوشت کو دھو کر اس میں ڈال دیں اور بھون کر سرخ کر لیں۔ اس کے بعد باقی مسالے اور نمک حسب ضرورت ڈال کر بھونیں اور پانی ڈال کر گھٹنے کے لیے چڑھا دیں۔ جب گوشت گل جائے اور پانی جل جائے تو آدھا پاؤ دہی ڈال کر خوب بھونیں اگر ہو سکے تو ایک لیموں کا رس بھی ڈال دیں تاکہ قتلے بھی گل جائیں۔ آخر میں لال کی ہوئی پیاز، جائفل، جاوتری،

دارچینی، لونگ، کالی مرچ، ہری الائچی پیس کر ڈال دیں اور کیوڑے کا عرق بھی ملا دیں تاکہ خوشبو آئے۔ عطیہ رسول..... رکن منڈی بہاؤ الدین

دم مرغ

اشیا، چکن، آٹھ سو گرام۔ ادھ، ایک دو انچ کا ٹکڑا۔ لہسن، چھ سے آٹھ پوتھی۔ ہری مرچیں، تین سے چار عدد۔ بادام، پندرہ سے بیس عدد۔ پیاز، دو درمیانے سائز کی۔ تھی، چار چائے کے چمچ۔ دہی، ڈیڑھ کپ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ تیز پات، دو عدد۔ ادھیا پسا ہوا، ایک کھانے کا چمچ۔ زیرہ پسا ہوا، ایک چائے کا چمچ۔ جاوتری پس ہوئی، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ چھوٹی الائچی پس ہوئی، نصف چائے کا چمچ۔ دارچینی پس ہوئی، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ بالائی، نصف کپ۔

ترکیب: چکن دھو کر صاف کر لیں اور چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ ادھ اور لہسن چھیل کر دھولیں۔ ادھ، لہسن اور ہری مرچوں کو پیس لیں۔ بادام کو گرم پانی میں پندرہ سے بیس منٹ تک بھگو دیں۔ چھیل کر پیس لیں اور عمدہ پیسٹ بنالیں۔ پیاز کاٹ کر تھی میں ڈب فرائی کریں یہاں تک کہ رنگ سنہری ہو جائے اور عمدہ پیسٹ بنالیں۔ چکن کے ٹکڑوں کو دہی، ادھ، لہسن، ہری مرچوں کے پیسٹ اور نمک میں دو گھنٹے تک رکھیں پھر تھی گرم کر کے تیز پات ڈالیں اور بھگوئے ہوئے چکن کے ٹکڑے ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ گاڑھا شور باج جائے..... ادھیا اور زیرہ پسا ہوا، پس ہوئی پیاز اور نصف کپ پانی میں پیسے ہوئے بادام ڈالیں پھر ہلائیں۔ دہی کو ڈھکنے یا ایلمویم فوئل سے اچھی طرح ڈھانپ دیں اس طرح کہ بھاپ نکلنے نہ پائے۔ پندرہ منٹ تک آہستہ آہستہ پکائیں دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ دہی کو ڈھانپ دیں اور گوندے ہوئے آٹے سے بند کر دیں۔ بالائی آٹے پر پکائیں یہاں تک کہ خوشبو آنے لگے۔ دہی

خوش ذائقہ

کھول دیں اور جاوتری، چھوٹی الائچی، بڑی الائچی اور دارچینی سب پس ہوئی چھڑک دیں۔ تازہ بالائی ملائیں اور گرم گرم پیش کریں۔

نوٹ: دہی کو گوندے ہوئے آٹے کے ساتھ بند کر دیا جائے۔ جوں ہی ڈش تیار ہو جائے گی دہی سے خوشبو نکلنے لگے گی۔

میمونہ عزیز..... اسلام آباد

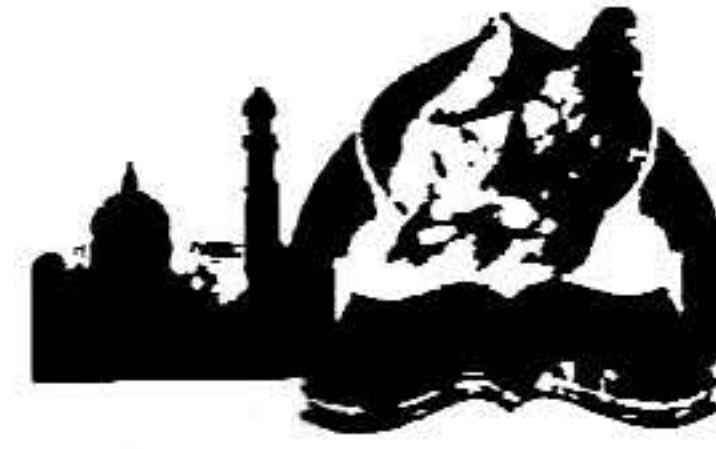
پالک پنیر

اشیا، پالک، دو بڑی گڈی..... پنیر، دو سو گرام۔ لہسن، آٹھ سے دس پوتھی۔ ہری مرچیں، دو سے تین عدد۔ تیل، تین کھانے کے چمچ۔ زیرہ، نصف چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ لیموں کا رس، ایک کھانے کا چمچ۔ بالائی، چار کھانے کے چمچ۔

ترکیب: ڈھیل نکال کر پالک کو اچھی طرح دھولیں۔ نمکین ابلتے پانی میں دو منٹ تک ڈبوئیں۔ ٹھنڈے پانی میں دوبارہ تازہ کریں۔ زائد پانی نچوڑ دیں اور ہری مرچوں کے ساتھ پیس لیں۔ پنیر کو کیوبز میں کاٹ لیں۔ لہسن کاٹ کر الگ رکھ لیں۔ ایک پین میں تیل گرم کریں زیرہ ڈالیں۔ جب ان کا رنگ بدلنے لگے تو کٹا ہوا لہسن ڈالیں اور آدھے منٹ تک بھونیں۔ پس ہوئی پالک ڈالیں اور ہلائیں اور ذائقہ چیک کریں اگر ضرورت ہو تو پانی ڈالیں۔ جب گریوی ابلنے لگے تو پنیر کے ٹکڑے ڈالیں اور اچھی طرح ملائیں۔ لیموں کا رس ڈالیں آخر میں بالائی ڈالیں۔ گرم گرم پیش کریں۔

نوٹ: پالک پنیر کا ذائقہ بہت زیادہ مسالاجات اور جڑی بوٹیوں کے بغیر اچھا آئے گا۔ بہترین نتائج کے لیے پالک کو بہت زیادہ نہ پکائیں کیونکہ اس سے نہ صرف پالک کا گہرا ہرا رنگ متاثر ہوتا ہے بلکہ ذائقہ بھی۔

سمیرا عنایت..... کراچی



والدین کے لیے دعا

ہر نماز کے بعد تین مرتبہ پڑھیں۔ (نبی اسرائیل - 24)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
رَبِّ ارْحَمْهُمَا کَمَا رَبَّیْنِیْ
صَغِیْرًا

(پروردگار! ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا)

علم میں اضافے کی دعا

وہ بچے جو پڑھنے میں بدشوق ہوں ان پر پانچ سات یا گیارہ مرتبہ پڑھ کر دم کریں۔ طالب علم خود بھی پڑھیں۔ ہر نماز کے بعد کم از کم تین بار پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ (سورۃ طہ..... 114)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا
(پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما)

خطا بخشی کے لیے

یہ بہت چھوٹی سی دعا ہے اسے آپ جلتے پھرتے بھی پڑھا کریں۔ سفر کے دوران، بستر پر لیٹے ہوئے بھی پڑھ سکتے ہیں۔ (سورۃ القلم، 29)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
سُبْحٰنَ رَبِّنَا اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ
(پاک ہے ہمارا رب، واقعی ہم گناہ گار تھے)

حاجات کو پورا کرنے کے لیے

دعا کا ایک طریقہ

ہر لمحہ حق تعالیٰ سے معافی مانگتے رہیں اقراری مجرم بن کر اور کسی فرض نماز کے وقت بعد نماز مصلے پر بیٹھ کر تین بار درود شریف پڑھ کر حسب ذیل اسما ایک بار پڑھیں۔
یا سُبُوْحُ یا قُدُّوْسُ یا غَوُوْرُ یا وَدُوْدُ یا صَدِّ یا عَزِیْزُ یا مُغْنِیُ یا تَاوِیْلُ

پھر تین بار درود شریف پڑھ کر اپنی حاجت طلب کریں اور ایک وقت مقرر کر کے بیٹھ کر روز دعا مانگیں۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ
الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

پانچ سو بار پڑھ کر حاجت کی دعا کر لیں اور گناہوں سے بہت بچیں۔

عیب جوئی

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الہمزہ کی پہلی اور دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ تباہی اور بربادی ہے ہر ایسے شخص کے لیے جو دوسروں کے عیب ڈھونڈنے والا ہو اور غیبت کرنے والا ہو۔ جو گن گن کر مال جمع کرتا جائے۔ (سورۃ الہمزہ 2-1)

اس سورہ میں ہم خواتین کے لیے بھی ایک بہت بڑی نصیحت ہے کہ خواتین کی محفلوں میں گرما گرمی ہی اس وقت ہوا کرتی ہے جب ہم کسی کا مذاق

اڑائیں، کسی کی غیبت کریں اور لوگوں میں وہ عیب نکالیں جو اس میں موجود ہیں یا موجود نہیں بھی ہیں یعنی بہتان لگائیں۔ لوگوں کی واہ واہ کے زیر اثر ہم خواتین ایسی باتیں کر جاتی ہیں جو پکڑ میں آسکتی ہیں اور ہم سب کو اس سے بچنا چاہیے اور وہ لوگ جو گن گن کر مال جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو وہ اپنی تباہی کا سامان خود پیدا کرتے ہیں۔ اپنے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرنے، صدقہ دینے اور نیک کام میں خرچ کرنے سے ہم اپنا مال پاک کر سکتے ہیں اور ایسے مال میں از خود برکت بھی ہوتی ہے۔ ہمیں ہمہ وقت یہی دعا کرنی چاہیے کہ ہر عمل اور ہر بات کے لیے اللہ تعالیٰ ہمیں نیک توفیق بھی عطا فرمائے کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا برا ہے، یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے جو عظیم ہے اور قدرت والا ہے، بے شک۔

اہل ایمان کی پہچان

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا چہرہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ پر بھروسا اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر دل سے ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز کی پابندی رکھے اور زکوٰۃ بھی ادا کرے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب وعدہ کریں تو اسے پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں سچے لوگ اور یہی لوگ متقی (پرہیزگار) ہیں (اس آیت میں یہ بات ذہن نشین کروائی گئی ہے کہ مذہب کی چند ظاہری رسموں کو ادا کرونا ضابطے کی خانہ چڑی کے طور پر اور چند مقررہ مذہبی اعمال انجام دے دینا ہی حقیقی نیکی نہیں ہے بلکہ

وقت

وقت بڑا زبردست اور ظالم کھلاڑی ہے۔ اس کے کھیل بڑے عبرت انگیز اور ہلاکت خیز ہوتے ہیں۔ یہ کبھی خوشیاں دیتا ہے تو کبھی بے شمار غم۔ کبھی ذلت دیتا ہے تو کبھی بے پناہ عزت۔ کبھی کبھی یہ بڑی سفاکی سے مارتا ہے۔ اس کی چالاکی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب سب کچھ ہو چکا ہوتا ہے، سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ یہ بڑی بے رحمی سے چاروں شانے چت کر ڈالتا ہے۔ اس سے کبھی کھیلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

از..... رفعت مبین رنی، کراچی

یہاں بیان کیے گئے اللہ کے احکامات پر عمل کرنے والے ہی حقیقت میں سچے اور پرہیزگار لوگ ہیں) (سورۃ البقرہ 2..... آیت - 177)

رشتہ

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: رشتہ صرف دو افراد پر ہو سکتا ہے، ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن دیا اور وہ اسے دن رات پڑھتا رہتا ہے اور اس پر (سننے والا) کہے کہ اگر مجھے بھی اس (قرآن) کا ایسا ہی علم ہوتا جیسا کہ اس شخص کو دیا گیا ہے تو میں بھی اسی طرح کرتا جیسا کہ یہ کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور اسے وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو (دیکھنے والا) کہے کہ اگر مجھے بھی اتنا (مال) دیا جاتا جیسے اسے دیا گیا ہے تو میں بھی اسی طرح کرتا جیسا کہ یہ کر رہا ہے۔ (صحیح بخاری شریف)

☆☆☆



(iii) جنس: خواتین کے مقابلے میں مردوں کو یہ مرض زیادہ ہوا کرتا ہے۔ درمیانی عمر کی عورتوں میں اس کا حملہ زیادہ دیکھنے میں آیا ہے۔۔۔۔۔ بار بار حمل کی وجہ سے بھی ذیابیطس کے ہونے کے امکانات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے بالخصوص مولیٰ عورتوں میں۔

Autoimmunediseases (iv) کی وجہ سے اور لہلہ کی دیگر خرابیوں کی وجہ سے کی خون ایڈیسن کی بیماری کی وجہ سے، تھائیرائیڈ گینڈ کی خرابی کی وجہ سے یہ مرض وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ (v) نقصان: اس بات کی شہادتیں بھی ہیں اور تجربہ گاہوں میں بھی اس بات کا تجربہ کیا گیا ہے کہ دائرس

Cotsackie B4 اس مرض کا موجب بنتے ہیں۔ یہ بات بھی نوٹ کی گئی ہے کہ کن بھیر (Mumps) کی وبا کے بعد یہ مرض زیادہ پھیلا۔ دائرس کے علاوہ وہ بیکٹیریا (Staphylococci) بھی اس مرض کا سبب بن سکتے ہیں۔ آتشک، گھٹھا، ملیریا، شدید نمونیا یا دیگر میعادی بخاروں کے بعد بھی اس مرض کے ہونے کے شواہد ملے ہیں۔ (vi) مٹا پائوزن کی زیادتی: یہ بات یقینی طور پر تو نہیں کہی جاسکتی البتہ ایسے کیسز ملے ہیں کہ جو موٹے تھے، ان کو ذیابیطس بھی تھی۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مٹا پامعاون سبب ہو سکتا ہے۔ (vii) غذا یا بیار خوری: بہت زیادہ کھانا یعنی ضرورت سے زیادہ اور اس کے ساتھ آرام طلب زندگی بسر کرنا، غذا میں چربی اور نشاستہ دار چیزوں کا زیادہ استعمال کرنا۔ اس قسم کی غذا کی عادتوں اور رہن سہن بھی ذیابیطس کا محرک بن جاتا ہے۔ (viii) کسی بھی قسم کی جسمانی محنت کرنے کے بعد جب کہ جسم گرم ہو جائے ٹھنڈا پانی پی لیا جائے۔ (ix) شراب پینا (x) دماغی محنت زیادہ کرنا مثلاً مصنفین، مدیران اخبارات، وکلاء وغیرہ (xi) کثرت جماعت (xii) سر، ریڑھ کی ہڈی یا پیٹ پر چوٹ لگنا (xiii) دماغ کے کسی حصے بالخصوص بطن چہارم میں رسوا کا ہونا۔ (xiv) رنج و غم، فکر و ترو یا صدمات بھی

موٹے ہو جاتے ہیں۔ اور جب انسولین صحیح یا مکمل طور پر نہیں بنتی ہے تو جسم نشاستے کو صحیح طور پر استعمال نہیں کر پاتا اور اس کے ساتھ ساتھ جسم کی پروٹین اور چربی بھی استعمال میں آنے لگتی ہے۔ اس کے باعث مریض کمزور ہونے لگتا ہے، جسے عام طور پر لوگ گھٹنا کہتے ہیں۔

دوسرا کیمیکل گلوکاگون خون میں انسولین کی مقدار کو کنٹرول کرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسولین کی زیادتی کی وجہ سے خون میں شکر کی مقدار کم ہو جائے۔

عام نارمل یعنی صحت کی حالت میں نہار منہ یعنی صبح بغیر کھائے خون میں شکر کی مقدار 70-110mg/dl اور کھانے کے 2 گھنٹے بعد 180mg/dl تک ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب کسی وجہ سے انسولین اور گلوکاگون کے عدم توازن کی وجہ سے شکر کی مقدار نہار منہ 110mg سے بڑھ جائے اور کھانے کے بعد 180mg سے بڑھ جائے تو ایسی صورت میں وہ شخص ذیابیطس کا مریض ہو جاتا ہے۔ یہ شکر خون کے علاوہ پیشاب میں بھی آسکتی ہے کیونکہ خون گردوں میں جا کر چھٹتا ہے اور چونکہ خون میں شکر کی مقدار بڑھی ہوئی ہوتی ہے لہذا یہ شکر پیشاب میں بھی خارج ہونے لگتی ہے۔

وجوہات:

ذیابیطس کیا ہوتی ہے، کیونکر ہو جاتی ہے یہاں تک ہم نے جان لیا لیکن اس کا کیا سبب ہوتا ہے اس بیماری کا ہمیں جائزہ لینا ہے۔ اسباب بیان کرتے وقت اس کی پھر دو اقسام بتائی گئی ہیں (i) پرائمری (2) سیکنڈری۔

1۔ پرائمری ذیابیطس:

پرائمری قسم کی ذیابیطس کی وجوہات نا حال معلوم نہیں ہو سکی ہیں۔ البتہ کچھ عوامل ہیں جن کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ ان میں (i) موروثی: ماں باپ یا ان کے خونی رشتے داروں میں ذیابیطس ہوگی تو اس امر کا عین امکان ہے کہ پیدا ہونے والے بچے ذیابیطس کا شکار ہو سکتے ہیں یا عمر کے کسی حصے میں ان کو ذیابیطس ہو سکتی ہے۔ (ii) عمر: ویسے تو یہ کسی عمر میں بھی ہو سکتی ہے لیکن زیادہ تر تقریباً 80 فیصد 40 سال کی عمر کے بعد ہوا کرتی ہے۔ لہذا اس کو بڑی عمر کی بیماری کہہ سکتے ہیں۔



from Nature
for Health

شواہے
ہومیوکلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

کرنے کے لیے توانائی فراہم کرتی ہے۔ لیکن بعض اوقات خون میں شکر کی مقدار کم ہو جاتی ہے یا بڑھ جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ہمارے پیٹ میں معدے کے نیچے ایک غدود ہوتا ہے جسے لہلہ کہتے ہیں۔ اس میں سے اور بہت سارے غذائی جوس نکلنے کے علاوہ دو کیمیکل نکلتے ہیں جن میں سے ایک کو آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں جی ہاں ”انسولین“ اور دوسرا گلوکاگون (Glucagon) انسولین کا کام خون میں شکر کی مقدار کو کنٹرول کرنا ہے۔ کیونکہ ہم دن بھر میں بہت ساری چیزیں کھا جاتے ہیں مثلاً روٹی، ڈبل روٹی، چاول، چینی اور اس سے بنی ہوئی چیزیں، گوشت، سبزی، پھل وغیرہ اور یہ سب چیزیں شکر میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوگا کہ جب ہم اتنا سب کچھ کھاتے ہیں تو جسم میں شکر کی مقدار کو انسولین کس طرح کنٹرول کرتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم میں ایسا نظام رکھا ہے کہ ہم جتنا کھاتے ہیں اس میں سے کچھ حصہ تو شکر میں توانائی کے لیے تبدیل ہو جاتا ہے باقی جسم میں پروٹین اور چربی کی صورت میں جمع ہوتا رہتا ہے اسی وجہ سے زیادہ کھانے والے لوگ زیادہ

ذیابیطس Diabetes

جسم کی تشوہ اور روزمرہ زندگی کے کام کی انجام دہی کے لیے ہم غذا کا استعمال کرتے ہیں۔ غذا ہمارے جسم میں جا کر بہت سارے کیمیائی عمل کے بعد گلوکوز (ایک قسم کی شکر) میں تبدیل ہو جاتی ہے جو خون میں شامل ہو کر جسم کے ہر حصے میں پہنچ جاتی ہے اور اس کو کام

ٹوکن

برائے شواہے ہومیوکلینک

جون 2012

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام:

پتا:



کھانے کے ساتھ اور فوراً بعد استعمال نہ کریں۔ کھانے سے پہلے اور کھانے کے 2 سے ڈھائی گھنٹے بعد پانی کا استعمال کریں۔ اس طرح کوئی کام کرنے کے بعد مثلاً کھیلنے کے بعد، دھوپ میں چل کر آنے کے بعد یا مباشرت کے فوراً بعد پانی کا استعمال نہ کریں۔ اس سے شوگر بھی ہو سکتی ہے اور بڑھ بھی سکتی ہے۔

۵۔ کھانے میں اور پینے میں ایسی چیزوں کا استعمال کریں جو زیادہ چکنی اور میٹھی نہ ہوں۔ کھانے کو سکون کے ساتھ بیٹھ کر اور خوب اچھی طرح چبا کر کھا لیں۔ بہت زیادہ بڑھی ہوئی شوگر میں ایک وقت کا کھانا مکمل طور پر ایک وقت میں نہ کھائیں بلکہ اس کے دو حصے کریں اور کچھ وقفہ سے استعمال کریں۔ اس طرح خون میں شوگر کی مقدار کو بڑھنے سے روکا جاسکتا ہے اور حیز اہمیت کو بھی۔ اس مرض میں کوئی غذائی جاسکتی ہے اور کوئی نہیں اور کس مقدار میں اس کے لیے چارٹ ملاحظہ فرمائیں۔

علاج:

ویسے تو یہ کہا جاتا ہے کہ شوگر کا کوئی علاج نہیں لیکن اگر اس کا سبب صحیح طور پر معلوم کر لیا جائے اور علامات کو صحیح طور پر جانچ لیا جائے تو پھر ایسا ہو میو پیٹھک علاج میں ممکن ہے کہ جن ادویات کے معضرات بھی نہ ہوں اور شوگر ایسی بہترین کنٹرول میں آسکتی ہے کہ چھوٹی موٹی بد پرہیزی سے شوگر فوری طور پر نہ بڑھے۔

شوگر کنٹرول کرنے کے لیے

استعمال ہونے والی ادویات

Acetic Acid, Lac Vacc Dift, Ars Boom, Thyoil, Acidphos, Syzygin, Vraniam Nit, Natumm, Alsenk Als etc.

ذیابیطس کے مریض کے لیے غذائی ہدایات
منوعہ اشیا

شکر یا چینی..... گڑ..... شہد..... مشائیاں..... جام، جیلی اور مارملیڈ..... کیک، جیسٹری..... بیکری کے بکٹ اور نان خطائی..... چاکلیٹ..... انڈے،

ماہنامہ پاکیزہ - مئی 2012ء

(iii) کبھی شوگر زیادہ آئے اور کبھی کم اور علامات و نشاں واضح ہوں تو اس میں آدی شش و پنج میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ آیا اسے شوگر کا مرض ہے یا نہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک ٹیسٹ کرایا جاتا ہے جسے Glucose Tolerance Test (GTT) کہتے ہیں۔ اس میں ایک خاص مقدار پانی میں ایک مخصوص مقدار جسم کے وزن کے حساب سے گلوکوز کی گھول کر پلائی جاتی ہے اور ۱۰۰ اور ۱۵۰ منٹ سے ڈیٹا پ و خون کو ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ اس طرح مکمل طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ آیا مریض کو شوگر ہے یا نہیں۔

(iv) جب (RBS یا FBS) نہار منہ اور کھانے کے بعد خون کے ٹیسٹ نارمل آئیں اور یہ محسوس ہونے لگے کہ آپ کی شوگر نارمل ہو چکی ہے اور کئی ہفتوں یہ سلسلہ جاری رہے تو اس کو کنفرم کرانے کے لیے خون کا ایک ٹیسٹ کرایا جاتا ہے جس سے 12 سے 16 ہفتوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ یہ ٹیسٹ مہنگا ہے اس لیے عام نہیں ہے۔ اس کا نام Haemoglobin A1C یا Glycosylate Haemoglobin ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا ٹیسٹ صرف تشخیص ہی کے لیے نہیں کیے جاتے بلکہ دوران علاج دوا کی مقدار کم یا زیادہ رکھنے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔

دیکھ بھال:

جس طرح کچھ امراض میں ادویاتی علاج کے ساتھ دیکھ بھال کی بڑی اہمیت ہوتی ہے بالکل اسی طرح ذیابیطس کے مرض کی دیکھ بھال کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ ۱۔ اپنے معالج سے مسلسل رابطہ رکھیں۔ اس کے مشورے پر عمل کریں اور خون میں شوگر کو ضرور چیک کرائیں۔ ۲۔ صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ خصوصاً جلد، دانت، آنکھیں، ناخن، پیر اور معمولی سے زخم کو بھی اہمیت دیں۔ ۳۔ ورزش کو اپنے روزمرہ کے کاموں کی فہرست میں شامل کر لیں۔

۴۔ پانی کا استعمال موسم اور کام کے لحاظ سے کریں کم سے کم 8 گلاس پانی روزانہ، یہ صاف ابلا ہوا ہو۔

v کپڑوں پر سفید داغ

vi فرج کی خارش

vii مردوں میں قوت باہ کم یا ختم ہو جاتی ہے۔ پیشاب میں شکر کی دھبے خراش حشفہ میں۔

viii آنکھوں سے صحیح نظر نہ آنا۔ موتیا بند کی شکایت ہو جاتی ہے۔

ix ہاتھ پیروں میں درد یا سن ہونے کی شکایت، ہاتھ پاؤں سرد لیکن تھیلیاں اور ٹکڑے گرم ہوتے ہیں۔

x بھوک بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یا "ہوکا" ہو جانا یعنی ابھی کھانا کھایا ہے کہ پھر بھوک لگنے لگتی ہے۔

xi دانت بوسیدہ ہو کر ڈھیلے ہو کر گر جاتے ہیں، سوڑھے پھول جاتے ہیں۔

xii منہ کا ذائقہ میٹھا سا ہوتا ہے۔

xiii سانس میں سے ایک خاص قسم کی میٹھی بو آتی ہے۔

xiv قبض کی شکایت عموماً رہتی ہے۔

xv درد سر کی شکایت رہتی ہے۔ مزاج چڑچڑا اور سستی رہتی ہے۔

xvi جلد خشک اس پر خارش اور بھوسی، جلد پر داغ یا جھائیاں پڑ جاتی ہیں۔ کبھی پھوڑے پھنسیاں Eczema یا Carbuncle کی شکایت ہو جاتی ہے۔

xvii عورتوں میں حیض بند ہو جاتا ہے۔

تشخیص:

مندرجہ بالا علامات و نشانیوں کی بنیاد پر ذیابیطس کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حتمی تشخیص کے لیے ضروری ہے کہ (i) خون میں شوگر کی مقدار معلوم کرائی جائے کہ وہ دو مختلف حالتوں میں نارمل کے مقابلے میں کتنی ہے۔ (۱) نہار منہ خون ٹیسٹ میں نارمل شوگر 70 ملی گرام تک ہونا چاہیے۔ ناشتے کے دو گھنٹے بعد خون ٹیسٹ میں شوگر کی نارمل مقدار 120 سے 180 ملی گرام تک ہونی چاہیے۔

(ii) پیشاب کا ٹیسٹ بھی کرایا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ گردے کتنی شوگر خارج کر رہے ہیں۔ نیز گردوں میں کوئی خرابی تو واقع نہیں ہوئی۔

وجہ بن جاتے ہیں۔

۲۔ سیکنڈری ذیابیطس:

اس قسم کے ذیابیطس میں یا تو کوئی مرضیاتی تبدیلی (Pathological) کے باعث یا کسی حالت کے علاج کے سبب یہ مرض لاحق ہوتا ہے۔

۱۔ لہلہ کی ذیابیطس: لہلہ کی موزش یا کمروزی کی وجہ سے لہلہ تہا ہو جاتا ہے جس سے انسولین میں فرق آتا ہے۔

۲۔ (الف) ہارمونز: ہمارے جسم میں موجود کچھ ہارمونز کے نامناسب اخراج کی وجہ سے بھی یہ مرض ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ ان میں گروٹھ ہارمون، ایڈرینوکورٹیکل ہارمون، ایڈائنالین ٹھائرائیڈ شامل ہیں۔ (ب) حمل: زمانہ حمل میں نارمل حمل کے دوران جب ایک ایسے محرک کا اخراج ہوتا ہے جو انسولین کی پیداوار و اخراج کو بڑھاتا ہے اور جب لہلہ اس مقدار کو پورا نہیں کر پاتا تو خون میں شوگر کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ یہ عموماً ان خواتین میں زیادہ ہوتا ہے جن کے خاندان میں ذیابیطس عام ہو یا بالعموم وقتی طور پر ہوتا ہے زچگی کے بعد یہ ٹھیک بھی ہو جاتا ہے۔

۳۔ ادویات کے استعمال سے: کچھ ادویات ایسی ہیں جن کے استعمال سے بھی یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ مثلاً کاربونیکیو اسٹرائیڈز اور پیشاب آور تھایازائیڈ۔

علامات و نشاں

۱۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ پیشاب کا ٹیسٹ کرنے پر پتا چلتا ہے کہ اس میں شکر موجود ہے جبکہ دیگر کوئی علامات نہیں ہوتیں۔

۲۔ کچھ مریض ایسے ہوتے ہیں جن میں ذیابیطس کی کچھ یا ساری علامات موجود ہوتی ہیں۔

i پیاس کی شدت جس کے ساتھ منہ خشک رہے۔

ii پیشاب کی زیادتی بالخصوص رات کو پیشاب زیادہ آنا۔

iii تھکن کا احسان/جلدی تھک جانا۔

iv وزن کا کم ہونا۔

ماہنامہ پاکیزہ - مئی 2012ء

ایک عدد	۲۲۔ ناشپاتی	ٹافیاں۔۔۔۔۔ کولڈ ڈرنکس، شربت، اسکوائش جوس۔۔۔۔۔
آدھا کپ	۲۳۔ قالہ	پھلوں کا رس۔۔۔۔۔ گنا یا گنڈیری۔۔۔۔۔ کھجور۔۔۔۔۔ آم۔۔۔۔۔
تین عدد	۲۴۔ بیر بڑے	انگور۔۔۔۔۔ شریفہ۔۔۔۔۔ انجیر۔۔۔۔۔ کشمش۔۔۔۔۔ گلوکوز۔۔۔۔۔
ایک عدد	۲۵۔ امرود	آکس کریم۔۔۔۔۔ پڈنگ اور کشرڈ۔۔۔۔۔ پیک شدہ
تین ادنس	۲۶۔ مرغی	فروت۔۔۔۔۔ شکر قندی۔۔۔۔۔ تلے ہوئے آلو۔۔۔۔۔ مکھن،
تین ادنس	۲۷۔ مچھلی	بالائی، میٹھا دودھ۔۔۔۔۔ ٹافیاں، باقر خانی، شیر مال،
تین ادنس	۲۸۔ بغیر چکنائی کا گوشت	پراٹھے۔۔۔۔۔ میٹھی ڈبل روٹی اور پاپے۔۔۔۔۔ خمری یا
ایک عدد	۲۹۔ انڈا (ابلا ہوا)	مندروں نان/روٹی

حسب ضرورت یا مقرر کی گئی مقدار میں لے سکتے ہیں۔

ایک عدد	۱۔ روٹی (درمیانی)
ایک سلاٹس	۲۔ ڈبل روٹی
چار سلاٹس	۳۔ بھوسی کی ڈبل روٹی
دو عدد	۴۔ بھوسی کی روٹی
تین عدد	۵۔ بھوسی کے بسکٹ
ایک عدد	۶۔ چاول (بچ نکالے ہوئے) ایک کپ (کپے ہوئے)
ایک ادنس	۷۔ کارن فلیکس / دلیا
آدھا کپ	۸۔ دالیں (پکی ہوئی)
آدھا کپ	۹۔ نوڈلز
آدھا کپ	۱۰۔ پتے والی سبزیاں (پکی ہوئی) آدھا کپ
آدھا کپ	۱۱۔ دوسری سبزیاں (پکی ہوئی) آدھا کپ
ایک عدد	۱۲۔ سیب
آدھا کپ	۱۳۔ تریوز / خربوزہ / سردہ / گراما
ایک عدد	۱۴۔ موٹی / مالٹا / کینو
ایک عدد	۱۵۔ چکوترا
۵-۶ عدد	۱۶۔ جاکن
۵-۶ عدد	۱۷۔ خوبانی
ایک عدد	۱۸۔ آڑو
آدھا کپ	۱۹۔ پیاز
ایک عدد	۲۰۔ کیلا چھوٹا
۲-۳ عدد	۲۱۔ آلو بخارا

مندرجہ ذیل غذائیں استعمال کر سکتے ہیں
پھلیاں (فرنج بین، گوار، سیم، لوبیا، باکلی، مشر،
بوٹ)۔۔۔۔۔ بھنڈی۔۔۔۔۔ بند گوبھی پھول گوبھی کدو، لوکی
گھیا، شندے۔۔۔۔۔ پالک ساگ، میتھی، ہرا دھنیا،
پودینہ، سلاڈ اور اردی کے پتے۔۔۔۔۔ ہری مرچ۔۔۔۔۔
گیموں۔۔۔۔۔ توری۔۔۔۔۔ کریلا۔۔۔۔۔ سفید، لال موٹی۔۔۔۔۔
ہری، سوکھی پیاز۔۔۔۔۔ بیکن۔۔۔۔۔ گکڑی،
کھیرا۔۔۔۔۔ شلجم۔۔۔۔۔ ٹماٹر۔۔۔۔۔ مکئی۔۔۔۔۔ بجنے ہوئے
چنے۔۔۔۔۔ انڈے کی سفیدی ایک عدد۔۔۔۔۔ سوڈا واٹر، سیکنج
بین۔۔۔۔۔ بخینی۔۔۔۔۔ جمنین بسکٹ۔